طاہرہ

یہ ناول بیٹی کے جہیز میں شامل ہونا چاہیئے

عنایت اللہ

پیش لفظ

ہر مصنف اس دعوے کے ساتھ کتاب لکھتا ہے کہ ایسی کتاب پہلے کبھی نہیں لکھی گئی، اور یہ ایک بے مثال شاہکار ہے۔ ہر مصنف اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کی کتاب کے درجنوں ایڈیشن بکیں گے۔ اس دعوے کی تصدیق اور تائید کے لیے علم و ادب کی کسی معروف شخصیت سے دیباچہ، پیش لفظ یا تعارف لکھوایا جاتا ہے جس میں تعریفوں کے پُل باندھے جاتے ہیں مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ پُل بڑے کمزور اور بے سہارا ہوتے ہیں۔ قارئین کسی ایک بھی پُل کو کھڑا نہیں رہنے دیتے۔

مصنف کی بدبختی یہ ہے کہ یہ فیصلہ کہ یہ کتاب پڑھنے کے قابل بھی ہے یا نہیں اُس قاری کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کی جیب پر مُصنف کا ہاتھ پڑتا ہے۔

میں یہ ناول کسی دعوے سے پیش نہیں کر رہا اور اس کی بے جا تعریف کسی بڑی زیادہ دیباچے لکھنے والی کسی پیشہ ور شخصیت سے دیباچے کی صُورت میں نہیں لکھوا رہا ہیں دیباچہ اس لیے بھی نہیں لکھوا رہا کہ قاری اور کہانی کے درمیان آجانا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ میں کہانی کے متعلق اپنی کوئی رائے نہیں دوں گا، کتاب کے متعلق دو چار باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ضرور سن لیں۔

اس کتاب کی قیمت ۳۹ روپے ہے جو زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں جتنا مواد دیا جا رہا ہے وہ ۵۵ روپے کا ہے۔ وہ اس طرح کہ بازار میں آپ کو جو کتابیں ملتی ہیں ان کے ہر صفحے پر انیس سطریں تحریر ہوتی ہے اور کتابت کھُلی کھُلی ہوتی ہے۔ بعض کتابیں انیس کی بجائے سترہ سطروں کی ہوتی ہیں۔ اس طرح کتاب کی ضخامت بڑی کر لی جاتی اور قیمت زیادہ رکھی جاتی ہے

یعنی کتاب کی ضخامت زیادہ اور مواد خاصا کم ہوتا ہے۔ ایسی کتاب کی مثال دوائی کی اُس شیشی کی سی ہے جس میں چند ایک گولیاں ہوتی ہیں اور باقی شیشی روئی سے بھری ہوتی ہے۔

اس کے مقابلے میں "طاہرہ" کو میں عام سائز سے بڑے سائز میں پیش کر رہا ہُوں۔ سترہ یا انیس کی بجائے اس کے ہر صفحے پر ستائیس سطریں ہیں۔ اس کے علاوہ کتابت باریک کرائی گئی ہے تاکہ بہت زیادہ مواد کم سے کم صفحوں میں دیا جا سکے۔ اگر میں اسے عام کتابوں کے انداز سے چھاپتا تو یہی کہانی جسے میں نے ساڑھے تین سو صفحوں میں سمیٹ لیا ہے چھ سو صفحوں پر پھیل جاتی او لاگت کے لحاظ سے اس کی قیمت چالیس روپے ہوتی ــــ میں نے شیشی میں روئی کی جگہ بھی گولیاں بھر دی ہیں۔

میں یہ وضاحت مصنّف کی حیثیت سے نہیں ناشر کی حیثیت سے کر رہا ہُوں۔ کاروباری نقطۂ نگاہ سے مجھے یہ کتاب عام کتابوں کے انداز سے پیش کرنی چاہیئے تھی لیکن میں نے کم پیسوں میں زیادہ سے زیادہ مواد دینے کی کوشش کی ہے۔ میرے پیشِ نظر کم از کم اس ناول کے متعلق کاروباری مفاد کم اور یہ خواہش زیادہ ہے کہ یہ گھر گھر پہنچے۔

یہ بھی پیشِ نظر رکھیے گا کہ یہ کتاب فوٹو آفسٹ پر چھاپی گئی ہے جس کے اخراجات عام چھپائی سے تین گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ سرورق چار رنگوں میں چھاپا گیا ہے۔ میں نے یہ اخراجات کتاب کو خوبصورت بنانے کے لیے برداشت کیے ہیں۔

اس کے باوجود اگر آپ قیمت زیادہ سمجھیں تو یہ میری اور ہر ایک ناشر کی ایسی مجبُوری ہے جس کا کوئی علاج نظر نہیں آرہا۔ کاغذ بے تحاشہ مہنگا ہو گیا ہے اور اُجرت کے ریٹ بجا طور پر کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جب آپ یہ ناول پڑھیں گے قیمت کے متعلق آپ کی شکایت رفع ہو جائے گی۔

عنایتُ اللّٰہ

مدیر "حکایت" لاہور

کمرۂ عروسی

کے عطر بیز سکوت میں، ساجدہ، سُرخ ساٹن میں لپٹی، جارجٹ کے سُرخ دوپٹے کی اوٹ میں نئے پلنگ پر بے حِس و حرکت بیٹھی تھی لیکن اس کے ذہن اور سینے میں بے ہنگم شور و غل بپا تھا۔ اُنگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ہونٹ لرز رہے تھے جنہیں اس نے بار بار دانتوں میں دبایا مگر ہونٹ لرزتے ہی رہے۔ آنکھیں بے چین اور دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی گردن جھکتے جھکتے گھٹنوں تک پہنچ گئی۔ ساجدہ نے دایاں رخسار دائیں گھٹنے پر رکھ دیا۔ روئی جیسا ملائم گال چمکیلی ساٹن سے پھسل گیا اور ساجدہ کے رُوئیں رُوئیں میں شرم و حجاب کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنے آپ میں سکڑ گئی۔

کمرے کے سکوت کو دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ نے مرتعش کیا۔ دروازہ کھُلا، بند ہُوا، چٹخنی چڑھی اور قدموں کی چاپ بڑھتے بڑھتے اس کے قریب پہنچ گئی۔ ساجدہ نے اُٹھ کے اسی گھر کو بھاگ جانا چاہا جہاں سے اسے اسی شام نہایت خاموشی سے ٹانگے پر بٹھا کر یہاں لایا گیا تھا۔ جب سے جوان ہوئی تھی ایک اجنبی مرد کے تصوّر کو دل و دماغ میں بسائے ہُوئے تھی۔ ایک اَن دیکھے، اَن جانے مرد کا [illegible] آنچل میں باندھے اُس نے حسین خواب دیکھے تھے اور آج اسی مرد کے قدموں کی آہٹ سے وہ لرز اُٹھی۔ اس کا ذہن خالی [illegible] گیا۔ [illegible] کا رعشہ تیز تر ہُوا جا رہا تھا کہ ایک جھٹکے سے اس کا گھونگھٹ دو مردانہ ہاتھوں نے یوں اٹھا کر پیچھے پھینک دیا جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکی کا پردہ اُڑ کر ایک طرف ہو جاتا ہے۔ ساجدہ نے چاہا کہ پلنگ سمیت زمین میں دھنس جائے۔ وہ گھونگھٹ گرا سکی نہ زمین میں دھنس سکی۔ پلکوں نے آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

اُسے قدموں کی چاپ ایک بار پھر سنائی دی جو اب دُور ہٹتی جا رہی تھی۔ ساجدہ نے شرم کے بوجھ سے جھکی پلکوں کو ہلکی سی جنبش دے کر اوپر اٹھایا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک قوی ہیکل مرد اس کی طرف پیٹھ کیے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ ساجدہ کو دھچکا سا لگا۔ تصوّرات کے محلات نے زلزلے کا ہلکا سا جھٹکا محسوس کیا۔ گوشت پوست کا اتنا بڑا مجسمہ اس کے خوابوں کے شہزادے سے مختلف تھا اور گھونگھٹ کا اس بے رُخی سے اُٹھا جانا بھی اس کے لیے حیران کُن تھا۔ شادی سے پہلے شادی شُدہ سہیلیوں نے اسے شبِ عروسی کے جو رُومان انگیز قصے سنائے تھے وہ من گھڑت قصے نظر آنے لگے۔

ساجدہ افسانے اور حقیقت کی بھول بھلیوں میں کھو چلی تھی کہ اس کے سامنے پیٹھ کر کے ٹہلنے والا جسیم مرد تیزی سے گھُوما۔ ساجدہ نے اسی تیزی سے نظریں جھکا لیں اور سر سے ہٹا ہُوا دوپٹہ کھینچ کر ماتھے تک لے آئی۔ نظروں نے

جھکتے جھکتے بہت کچھ دیکھ لیا تھا — گھنی مونچھیں، موٹی موٹی سُرخ آنکھیں، چوڑی پیشانی اور کھردرے سانولے چہرے سنجیدگی اور بے رُخی کے مِلے جلے اثرات — ساجدہ کے تصورات کے محلات میں شگاف پڑنے لگے۔ کمرے رومان آلود سکوت طول ہو گیا۔

”میں نے گھونگھٹ پیچھے کر دیا تھا....“ عطر بیز سکوت کو بھاری بھرکم مردانہ آواز نے اس طرح توڑ دیا جیسے ساکن جھیل میں کسی نے وزنی پتھر پھینک دیا ہو — ”اس کا پھر لٹک آنا بے معنی ہے۔ ہمارے درمیان اب پردے حائل نہیں ہو سکتے۔ شریعت نے تمام پردے چاک کر دیتے ہیں۔ دوپٹہ پیچھے کر دو اور میری طرف دیکھو.... میں تمہیں چند ایک باتیں چاہتا ہوں۔“

ساجدہ نے آہ لی، نظریں اور جھکا لیں۔ فضا میں صابن کے بے شمار بلبلے منڈلا رہے تھے جو یکے بعد دیگرے لگے۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ لذت آگیں تصورات، بے کلی کی وہ ساعتیں، پرلطف انتظار کی وہ راتیں، خواب اور وہ دل فریب سپنے جو وہ شادی سے پہلے دیکھتی رہی تھی، نہایت سُرعت سے یوں گزر گئے جیسے تیز رفتار گاڑی ٹھکر ٹھک، ٹھکر ٹھک کا شور و غوغا بپا کرتی، فراٹے بھرتی، زناٹے سے گزر جاتے اور گرد اور سیاہ دھواں پیچھے کچھ اسی قسم کی گرد ساجدہ کے گرد منڈلانے لگی اور اس گرد میں سے مردانہ آواز پھر گونجی — ”عورت کو خدا نے پیدا کیا ہے کی اطاعت کے لیے۔ تمہارا دوپٹہ ابھی تک نیچے ہے۔ میں نے کہا تھا میری طرف دیکھو....“ ساجدہ نے جھجکتے شرما جمال بیگ کی طرف دیکھا۔ ”یوں.... چہرے کے ساتھ دماغ اور دل کے بھی پردے اُٹھا دو تاکہ میرا ایک ایک لفظ اور سمجھ سکو۔“

جمال بیگ آہستہ آہستہ ساجدہ کی طرف بڑھنے لگا اور گویا ہوا۔ ”تم نے افسانے پڑھے ہوں گے اور فلمی گیت بھی ہوں گے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ....“ جمال کرسی گھسیٹ کر پلنگ کے قریب بیٹھ گیا.... ”میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا کہ میں افسانہ ہوں نہ فلمی گیت۔ ایک حقیقت ہوں جسے شاید تم پسند نہیں کرو گی۔ بہت کم لوگ مجھے پسند کرتے ہیں ہے میرے دفتر کا چپراسی بھی مجھ سے نالاں ہے۔ میں وہی کہتا ہوں جو میرے دل میں ہوتا ہے لیکن میرے دل میں وہ ہے جو لوگ سُننا نہیں چاہتے۔ میں سوسائٹی سے بیزار ہوں۔ سوسائٹی مجھ سے بیزار ہے....“

ساجدہ پر بے چینی کی اذیت رساں کیفیت طاری تھی۔ وہ جمال کے الفاظ کو سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہ چاہتی تھی کی رات وہ کچھ اور سمجھنا ہی نہ چاہتی تھی۔ وہ جمال کے قدموں میں پیار پیش کرنا چاہتی تھی جسے وہ دو سال سے قلب میں پالتی رہی تھی۔

”تم آج سے میری بیوی ہو اور میں تمہارا خاوند۔ میرا کام ہے روزی کمانا اور تمہارا کام ہے گھر چلانا، میری مرضی کے مطابق۔ معاشرہ میری مرضی کے خلاف ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکوں گا کہ تم بھی میری مرضی کے خلاف ہو جاؤ۔ میں گھر میں لغزشیں برداشت نہیں کر سکوں گا۔ تمہاری ایک لغزش معاف کر چکا ہوں۔ کیونکہ یہ پہلی لغزش تھی۔ میں توقع رکھوں آخری ہو گی....“

ساجدہ نے حیرت سے جمال کی طرف دیکھا۔ اس کی مضطرب آنکھوں میں ایک سوال لرز رہا تھا۔ جمال جان گیا تھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔ بولا.... ”میں کمرے میں داخل ہوا تو تم یوں بیٹھی رہی جیسے میری کچھ بھی اہمیت نہیں۔ اسے خاوند کا احترام نہیں کہتے۔ دفتر کے چپراسی کے خلاف بھی مجھے یہی شکایت ہے۔ بے شک میں کلرک ہوں اور چپراسی، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ اور بڑے صاحب کے سوا کسی کی تعظیم کو نہیں اٹھتا لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ میری تعظیم کو بھی اُٹھے.... تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوتیں۔“

ساجدہ نے تڑپ کے چاہا کہ مہندی بھرے ہاتھوں کو کہیں انگاروں پر رکھ دے۔ سُرخ سوٹ اور دوپٹے کو چیر پھاڑ کر مادر زاد ننگی ہو جائے اور چڑیل بن جائے لیکن کمزور نسوانیت نے اسے پلنگ کے ساتھ جکڑے رکھا اور جمال بیگ کے خشک، بھونڈے اور بھدے تحکمانہ الفاظ کمرے کی فضا میں بھٹکتے رومانوں کو یوں نگلتے رہے جیسے بازوں کا غول کبوتروں کے غول پر جھپٹ پڑا ہو۔ نوخیز جوانی کنوارپنے کے سپنوں کے کشت و خون پر ابھی دو ہی آنسو بہاتے بہتے کہ جمال کی تقریر ختم ہو گئی اور اس نے بے ہنگم سی انگڑائی لی۔ پھر ہاتھ لمبا کر کے بتی بجھا دی۔ ایک تلخ حقیقت گدھ کی طرح ساجدہ کے گرد منڈلانے لگی۔ اس کی رومانی امیدیں تہ در تہ سیاہی میں دب گئیں۔ اُمنگوں بھرے شباب پر بھیانک رات چھا گئی۔

صبح کی پہلی کرن نے کمرۂ عروسی کے روزن سے داخل ہو کر اس اندھیرے میں اُجالا بکھیر دیا۔ ساجدہ کی ازدواجی زندگی کی پہلی سحر یوں بے نور تھی جیسے اسے تیرہ و تار رات نے ڈس لیا ہو۔

پھر صبحیں طلوع ہونے لگیں — اُداس، ملول اور بے کیف — ساجدہ کی تمنائیں اور شادی سے پہلے کے اب راتوں کی تیرگی میں بھٹکنے۔ بھٹکتے رہے اور بھٹکتے ہی رہے۔ فریب خوردہ زندگی کو اس نے ماضی کے نقوش سے بہلانا چاہا لیکن یہ نقوش بہت پیچھے رہ گئے تھے اور وقت کی ریت آہستہ آہستہ ان پر تہیں جماتی جا رہی تھی۔ تنہائی نے اسے لرزتے ہوئے قصے سنا سنا کر بہلانا چاہا لیکن جمال کی سرد مہری اور خشک قسم کی سنجیدگی نے ان قصوں اور سپنوں کو بھی یوں زیر و بالا کر ڈالا جیسے تالاب کے شفاف پانی میں بھینس نے کود کر نیچے کا کیچڑ اوپر کر دیا ہو۔

”کیا تمہیں ہانڈی پکانا بھی میں سکھاؤں گا؟“ ایک شام کھانا کھاتے جمال نے ساجدہ کو کہا — ”سُرمہ سُرخی سے گھریلو کام کاج زیادہ ضروری ہیں.... ساجدہ اس دن ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی اور بناؤ سنگھار کر لیا تھا.... میری اجازت کے بغیر تمہارا باہر جانا سخت قابلِ اعتراض ہے۔ یہ گھر تمہاری دنیا ہے جس پر میری حکومت ہے۔ عورت کو حق حاصل نہیں کہ اس دنیا سے باہر قدم رکھے۔“

جمال نے یہ باتیں ایک دن کہیں۔ دوسرے دن بھی کہیں اور کرتے کرتے یہ باتیں روزمرہ کا معمول بن گئیں۔ شروع شروع میں ساجدہ نے اپنے آپ کو ان باتوں کے سانچے میں ڈھالنا چاہا۔ پھر جمال کو جواب دینے کی بھی کوشش کی۔ اس کا جواب دینا بھی تو جرم تھا۔ چنانچہ اس نے جمال کی ہر بات پر خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن ساجدہ کے خاموش رہنے سے جمال کی ایک حِس تشنہ رہتی تھی۔ اس کا فطری مطالبہ تھا کہ ساجدہ آگے سے بولتی رہے۔ بات سے بات نکلتی رہے

اور چیخنے چلانے اور غصّہ نکالنے کا موقع ملتا رہے۔

جمال بیگ کو ضرورت بھی ایک ایسے انسان کی جس پر وہ جی بھر کے غصّہ نکال سکے اور جس پر وہ حکومت کر سکے ابھی چند مہینوں کا بچّہ تھا جب اس کی ماں اسے باپ کے سپرد کر کے دنیا سے چل بسی۔ باپ نے چند مہینوں بعد سوتیلی ماں کی گود میں پھینک دیا۔ دو سال بعد باپ بھی مر گیا اور ایک سال بعد وہ سوتیلے باپ کے ہاتھ چڑھ گیا۔ اب بھی سوتیلی اور باپ بھی سوتیلا۔ گھر میں جب بچّے پیدا ہوتے تو جمال کی حیثیت ایک نوکر کی سی رہ گئی۔ دن کو ماں نے رات باپ نے پیٹا۔ دن بھر بچّوں کو اٹھاتے اٹھاتے پھرا اور رات کو باپ کی ٹانگیں دبانے بیٹھ گیا۔ بچّوں کے کھلونا تھا کسی نے ڈنڈا مار دیا اور کسی نے اس پر غلیل کی نشانہ بازی کر دی۔ اگر اس نے بچّوں کو ان حرکات سے اُنہوں نے رو رو کر ماں سے شکایت کی اور باقی کسر ماں نے پوری کی۔

وہ بچّوں کو ماں کی گود میں مچلتے۔ اونگھتے اور سوتے دیکھا کرتا تھا لیکن کوئی گود اُسے سلانے کو وا نہ ہوئی۔

گھر کے سارے برتن دھو کر جب وہ باورچی خانے میں ہی مُونجھ کی ڈھیلی کھاٹ پر لیٹتا تھا تو اس کے نرم نرم گالوں اور کولہوں پر، تھپّڑ، ڈنڈوں اور جُوتوں کی چوٹوں کی ٹیسیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں جب وہ لُو کے جھونکوں میں لیٹتا تھا تو اسے بند کمروں سے بجلی کے پنکھوں کی سِسک سِسک کی ٹھنڈی آوا دیا کرتی تھیں جو اُس کے سینے میں آگ لگا دیا کرتی تھیں۔

سوتیلے ماں باپ کے اس سلوک نے جمال میں بچپن کی عمر میں ہی تشدّد، نفرت اور عدمِ تعاون پیدا کر دیا نے نہایت سُرعت سے جذبۂ انتقام کی صورت اختیار کر لی۔ یہ محض اتفاق تھا یا جمال کی خوش قسمتی یا اس کے سو والدین کا خیال کہ وہ کچھ لکھ پڑھ کر اپنا ٹھکانہ کر لے کہ اسے سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ حصولِ تعلیم اس کا اضافی فرض کے گھریلو کاموں میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے دس سال جھاڑو دیا۔ چولہا جھونکا۔ برتن مانجھے اور گھر کے تمام جوتے اور لکھنے پڑھنے میں بھی مگن رہا۔

جب اس نے میٹرک پاس کیا تو لڑکپن جوانی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ جوانی کا آغاز اس کے سینے میں اٹھا کی مانند شور بپا کیے ہوتے تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ اس کا شعور بیدار ہو رہا تھا لیکن لاشعور کا تھا۔ اس کے تحت الشعور میں بچپن کی محرومی کے اثرات اور تلخ یادیں لڑکپن کے ٹیڑھے ٹیڑھے نقوش، محبّ تشنگی اور جذباتی رکاوٹ، زہریلا مواد جمع کرتے رہے اور اس کی صلاحیت اور جبلّت بھی اس زہر میں گھل مل گئی۔

ایک دن پچھلے پہر وہ چائے کے برتن دھو رہا تھا اور دماغ ماضی و حال کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا کہ اس ہاتھوں پر پڑی جن پر سرخ سرخ گوشت اُبھرا ہُوا تھا۔ اس نے چائے دانی رکھ کر دائیں ہاتھ کا گھونسہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی مارا۔ ایک ہاتھ کی قوت کو دوسرے ہاتھ کی طاقت نے پوری شدت سے روک لیا اور جمال نے جسم کی رگ رگ میں بے محسوس کیا۔ اُس نے کنکھیوں سے اپنے کندھوں کا جائزہ لیا۔ اس کے پاؤں میں پانی سے بھری چائے دانی رکھی تھی، میں اس نے اپنے چہرے کے عکس کو بڑے غور سے دیکھا۔ یہ چہرہ اب کسی بچّے کا نہیں ایک مرد کا چہرہ تھا وہ عکس کو

دیکھتا رہا کہ بجلی کی مانند اس کے سینے میں نفرت اور غصّے کا شعلہ بھڑکا۔ اُس نے پُوری طاقت سے چائے دانی پر گھونسہ دے مارا "چھن چھنن" کی دھماکہ نما آواز سے فضا لرز اٹھی۔ بڑے کمرے سے گرجدار آواز آئی۔

"جمال! یہاں آ!"

"دوسرے لمحے جمال سوتیلے باپ کے سامنے کھڑا تھا۔"

"کیا ٹوٹا؟"

"چائے دانی۔"

"سوتے ہوتے تھے کیا؟"

"جاگ رہا تھا!"

"پھر تو نے چائے دانی کیسے توڑی؟"

"گھونسہ مار کر۔"

"کیا بکتے ہو!" باپ حقے کی نے ایک طرف کر کے اُٹھا اور جمال کو تھپّڑ مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔

"خبردار!" جمال نے نہایت متانت سے کہا۔ "اب مجھ پر ہاتھ نہ اٹھانا۔"— جمال کی دونوں مٹھیاں بند ہو کر گھونسے بن گئیں۔

باپ نے اس کے بھرے بھرے ہاتھوں کے گھونسے دیکھے۔ پھر جمال کے چہرے کو ایک نظر دیکھا جس پر مردانگی کا رنگ اور غصّہ چھایا ہُوا تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ مگر گرج کر بولا۔ "نکل جا میرے گھر سے مردود!"

جمال کے ہونٹوں کے کونوں پر طنز بھری مسکراہٹ کی جھلک نمودار ہوئی۔ اس نے باپ کو گہری نگاہوں سے دیکھا— "بہت بڈھے ہو گئے ہو"— جمال نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا— "بیٹھ کر حقہ پیو۔ چند دن اور جی لو"— جمال کھل کر مسکرایا جس طرح جنگجو کمزور حریف کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد یہ اس کی پہلی مسکراہٹ تھی لیکن اس مسکراہٹ میں مسرّت کا فقدان تھا۔ وہ آہستہ سے گھوما اور دروازے کی طرف چل دیا۔

"اے نخے! موتے نے نئی چائے دانی..." سوتیلی ماں چیختی چلاتی کمرے میں داخل ہوئی۔ جمال دوسرے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ "اُدھر آ مسٹنڈے میں تیری باچھیں چیر دوں۔"

جمال رُکا۔ گھوم کر دیکھا۔ پھر کواڑ کھول کر باہر نکلا اور زور سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

دنیا کا ٹھکرایا اور خلق کا راندہ ہُوا جمال جب انسانوں کے انبوہ میں داخل ہُوا تو اسے ہر انسان نفرت و حقارت کا پتلا دکھائی دیا۔ دنیا کو وہ جس زاویے سے دیکھ رہا تھا وہاں سے اسے محبت اور زندگی کی رنگینیاں نظر آ ہی نہیں سکتی تھیں۔ اسے ہر سمت اذیّت ہی اذیت دکھائی دے رہی تھی۔ دماغ تعمیری فکر سے بیزار اور دل ٹوٹا ہُوا۔ نہ کوئی آس نہ سہارا— وہ حوادث کے سنگ و خشت۔ یہ احساس کا شیشہ!— تین دن وہ شہر کے ہنگامے میں مارا مارا پھرا۔ خالی پیٹ نے سوچنے کی رہی سہی قوت بھی سلب کر لی۔ اُس نے چاہا کہ گھومتے پھرتے انسانوں کے منہ نوچ لے اور ان کی بوٹی بوٹی سڑکوں پر بکھیر دے۔

تیسری رات وہ ایک بند ہوٹل کے بالمقابل دوکان کے تختے پر لیٹا کرب واضطراب سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے چند کُتے لڑ رہے تھے۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ جمال کی داخلی دنیا میں عتاب اور انتقام کے شعلے تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ روح تو کبھی کی مر چکی تھی۔ ہمت واستقلال اور صلح پسندی کے نام سے بھی وہ ناواقف تھا۔ اس کی خرابیاں اب سمٹ سمٹا کر دو روٹیوں اور سر چھپانے کی جگہ تک محدود ہو گئی تھیں۔ اُس نے کروٹ بدل کر لڑتے کتّوں کو دیکھا۔ اُنہوں نے بے ہنگم ادھم مچا رکھا تھا۔ کچھ ایسا ہی ادھم اس کی اپنی آسیب زدہ کائنات میں بپا تھا۔ وہ غصے سے اٹھا اور پوری طاقت سے ایک کُتے کے پیٹ میں ایسی لات جمائی کہ کتا وہیں گر کر تڑپنے لگا۔ جمال نے کتے کو تڑپتے اور مرتے دیکھا تو اسے سکون سا محسوس ہُوا۔ اعصاب سے جیسے کئی من وزن ہلکا ہو گیا۔ دوسرے کتے بھاگ گئے اور جمال ہوٹل کے سامنے ٹہلنے لگا۔

ذرا سی دیر بعد مُرغ نے پیامِ سحر سنایا۔ اُفق سے اُجالا پھُوٹا۔ شہر میں سرگوشیاں سنائی دینے لگیں جو بڑھتے بڑھتے شور بن گئیں۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر انسانوں کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ یہ شور، یہ ہما ہمی تیز تیز اور بلند تر ہوتی گئی اور اسی رفتار سے سُورج کی چمک میں اضافہ ہوتا گیا لیکن جمال کے دل و دماغ میں ابھی تک شبِ تار چھائی ہوئی تھی۔ وہ بدستُور ٹہل رہا تھا اس نے محسوس کیا جیسے وہ کئی میلوں کی مسافت طے کر آیا ہو۔ وہ قدم اٹھاتا ہی چلا جا رہا تھا کہ اسے ایک آواز نے روک لیا۔

"سنو!" جمال نے چونک کر بائیں طرف دیکھا۔ ہوٹل کا مالک اسے بلا رہا تھا۔ جمال دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا کہ وہ ابھی تک ہوٹل کے سامنے ٹہل رہا تھا۔

جمال اس کے پاس چلا گیا۔ ہوٹل میں لوگ ناشتہ کر رہے تھے۔ کھانوں کی خوشبو نے جمال کے پیٹ اور دماغ میں زلزلہ بپا کر دیئے۔

"تم صبح سویرے سے یہیں ٹہل رہے ہو۔" ہوٹل کے مالک نے مالکانہ لہجے میں کہا۔ "ڈیڑھ دو گھنٹوں سے میں تمہیں دیکھ رہا ہُوں۔ کسی کا انتظار ہے؟"

"یُوں ہی" ــــ جمال اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا اور نہ ہی اس کے دماغ میں اتنی سکت باقی تھی کہ فوری طور جواب دے سکتا۔ بولا "ویسے ہی.... انتظار تو کسی کا نہیں" ــــ وہ گھبرا گیا تھا۔

"کہاں رہتے ہو؟ کوئی کام دھندا کرتے ہو؟"

جمال کی آنکھیں چمک اُٹھیں جن میں بے قراری کی جھلک نمایاں تھی۔ اس نے ہوٹل کے مالک کو دیکھا۔ پھر ہوٹل کے اندر دیکھا جہاں لوگ ناشتے میں مصروف تھے۔

"رہتے کہاں ہو بابا؟ سنا نہیں تم" ــــ جمال خاموش رہا اور بے چینی عیاں تر ہو گئی ــــ "گھر سے بھاگ آتے ہو؟"

"سائیکل چور ہو گا" ــــ مالک کے پاس کھڑے ایک نوکر نے طنزیہ کہا۔

جمال نے بجلی کی سی سرعت سے اس مریل سے نوکر کی طرف دیکھا۔ پھر ہوٹل کے مالک کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ جمال نے مٹھیاں بھینچ کر نیچے والا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اس کی آنکھوں کی بے چینی میں غصے کی گہری سرخی آ گئی

بند مٹھیاں کانپنے لگیں اور اس نے ہوٹل کے مالک کی میز پر کانپتا ہُوا گھونسہ اس طرح رکھ دیا جیسے لوہار ہتھوڑا چلانے سے پہلے ہتھوڑے کو اہرن پر رکھتا ہے۔ مالک نے نوکر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور نوکر وہاں سے غائب ہو گیا۔

"وہ بکواس کرتا ہے۔" ہوٹل کے مالک نے جمال کو قدرے نرم لہجے سے کہا ــــ "ہوٹل میں نوکری کرو گے تم ــــ دس روپے تنخواہ ملے گی۔ روٹی اور چارپائی، بستر بھی ملے گا.... پہلے کہیں نوکری کی ہے؟"

"ہاں!" جمال کے رؤیں رؤیں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ــــ اس نے کہا ــــ "ایک گھر میں نوکری کی تھی۔ ویسے ہی چھوڑ دی ہے۔ مجھے رکھ لیں۔ تنخواہ منظور ہے۔"

اور جمال ہوٹل میں ملازم ہو گیا۔

میٹرک کا سرٹیفکیٹ ملنے تک جمال کہیں نہ کہیں سر چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے تین مہینے ہوٹل کے برتن صاف کیے۔ اَن دیکھے، اَن جانے، ہر پیشے اور ہر قماش کے لوگوں کے آگے کھانا رکھا۔ مالک کی ڈانٹ ڈپٹ سہی۔ دوسرے نوکروں سے کئی بار لڑائی جھگڑا کیا اور سکول کے گرد ہر تیسرے چوتھے روز سرٹیفکیٹ کے لیے چکر لگائے۔ اِس دوران اُس نے تین نوکروں اور دو گاہکوں کو بھی پیٹا۔ ایک بلّی کو دم سے پکڑ کر فرش پر پٹخ کر مار دیا اور بغیر مطلب کسی کے ساتھ بات نہ کی۔

آخر اسے میٹرک کی سند مل گئی۔ چند دنوں کی آوارہ گردی کے بعد اسے کلرکی کی اسامی مل گئی اور اسے لاہور سے جلال آباد بھیج دیا گیا۔ چالیس روپے ماہوار اس کے لیے کم نہ تھے۔ اس کی ضروریات روٹی کپڑے تک محدود تھیں۔ زندگی کی چاشنی سے وہ ناآشنا تھا۔ بظاہر خاموش مگر سینے میں آندھیاں اور طُوفان سمیٹے ہُوئے اس نے سادہ سی زندگی کرایہ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کر لی۔ گرد و پیش میں اُسے نفرت، حقارت اور بے مہری کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اسے ہر انسان میں نقائص ہی نقائص نظر آتے تھے۔ دفتر کے چپڑاسی سے لے کر بڑے صاحب تک اس کی نظر میں وحشی اور درندے تھے۔ وہ دن رات ایک انقلاب کی سکیمیں سوچتا رہتا تھا۔ اس کی ہر سکیم کی تان اس فیصلے پر ٹوٹتی تھی کہ فلاں فلاں اور فلاں کو قتل کر دیا جاتے۔

دفتر میں ہر کس وناکس سے لڑتے، جھگڑتے اور اُلجھتے، اس نے پانچ برس گزار دیئے۔ انسانوں کے اِس انبوہِ عظیم میں اسے اپنے جیسے تین چار "جمال" مل گئے جو معاشرہ تو معمولی چیز ہے نظامِ قدرت سے ہی نالاں تھے۔ ان کی محفل میں اگر محلّے کے بھنگی کے خلاف بات ہوتی تھی تو اسلامی ممالک کے ایک بلاک پر جا کر ختم ہوتی یا ایسے انقلاب پر جس میں خون ہی خون بہتا تھا۔ ہم خیالی اور مشترک نفسیاتی تشنگی کی بدولت وہ گہرے دوست تھے اور ایک دوسرے کے خیر خواہ اور ہمدرد۔ ان میں صرف جمال غیر شادی شُدہ تھا۔ باقی تینوں نے اور تینوں کی بیویوں نے بھاگ دوڑ کر جمال کی شادی ایک بیوہ ماں کی نازک اندام اور نازک خیال لڑکی سے کرا دی اور یوں ساجدہ جیسی نوخیز کلی جمال کے قدموں میں آ پڑی جس کے سینے پر پاؤں رکھ کر جمال نے چند دنوں ہی میں اس کی جوانی کی امنگیں مسل کے رکھ دیں۔ تصوّرات سے دل بہلانے والی لڑکی جمال کے جذبۂ انتقام کا نشانہ بن گئی۔

شروع شروع میں وہ ساجدہ کو صرف زبان سے کوستا ڈانٹتا رہا۔ پھر نوبت تھپڑ گھونسے تک جا پہنچی۔ ساجدہ نے

ماں سے شکایت کی۔ ماں لہو کے آنسو رو کر خاموش ہوگئی۔ ساجدہ کی فطرت صلح جو تھی۔ اُس نے جمال کو تلخ حقیقت سمجھ کر قبول کرلیا۔ گھونٹ سخت کڑوا تھا لیکن ساجدہ نے نگل ہی لیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ تھا نہ کوئی پناہ۔ شادی طے کرانے والے اور والیاں ایک طرف ہوگئی تھیں۔ ساجدہ نے مارپیٹ کے باوجود جمال کی خاطر تواضع، خدمت اور فرمانبرداری میں فرق نہ آنے دیا۔ رات رات اس کا سر دبایا اور لوں اپنی ہی ہستی کو مسلتے کچلتے ساجدہ نے اٹھارہ ماہ گزار دیئے۔

دوسرا سال اس کے لیے ایک تلخ حقیقت لے کے آیا۔ پیٹ میں ایک اور جان کو سنبھالے وہ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھی جمال کی باتیں اور لاتیں کھاتی تھی۔ ایک بار تو اس نے اپنا گلا گھونٹ لینا چاہا لیکن اس خیال نے اسے باز رکھا تھا کہ ایک اور ننھی سی جان کا خون ہوگا۔ وہ جان جس نے ابھی دنیا میں آنکھ ہی نہیں کھولی تھی اسے وہ اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

"بیٹا!" ایک دن ساجدہ کی ماں جمال کے پاس آئی اور کہا ـــــ "ساجدہ کی طبیعت اچھی نہیں۔ یہ آخری دن بڑی مصیبت کے ہوتے ہیں۔ ذرا تحمّل سے کام لینا۔ بچّے کی پیدائش کے بعد جو...."

"مَیں جانتا ہوں بچہ پیدا ہونے والا ہے"۔ جمال نے ساجدہ کی ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا ـــــ "اپنی بیٹی سے کہ دینا کہ لڑکا پیدا ہونا چاہیئے۔ مجھے لڑکی نہیں چاہیئے۔ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو اسے تم لے جانا۔"

"بیٹا!" ساجدہ کی ماں نے التجا کے لہجے میں کہا۔ "اس میں ساجدہ کا کیا اختیار ہے۔ وہی ہوگا جو خدا کو منظور ہوگا۔"

"میں اپنے گھر میں لڑکی کا وجود برداشت نہیں کروں گا۔ خدا کی مرضی میں میرا دخل نہیں۔ اپنے گھر میں تو میرا دخل ہے!"

"لڑکی ہوئی تو کیا قیامت آجائے گی، جمال بیٹا؟"

"قیامت؟" ـــــ جمال نے طنز بھرے لہجے میں کہا ـــــ "فتنہ، عورت سراپا فتنہ ہے۔ میں اپنے گھر میں فتنہ و فساد کو پرورش نہیں پانے دوں گا۔ میری سوتیلی ماں بھی عورت تھی۔ میری اپنی ماں بھی عورت تھی جو مجھے اس فریبی اور اجاڑ دنیا میں پھینک کر خود مر گئی تھی۔"

"بیٹا جمال!" ساجدہ کی ماں نے ڈرتے سہمتے کہا۔ "عورت نہ ہوتی تو...."

"تو میں اس ذلیل دنیا میں نہ آتا" ـــــ جمال نے غصے سے فقرہ پورا کیا اور کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا جس میں جمال کی پھولی ہوئی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ذرا سے توقف کے بعد بولا ـــــ "اپنی بیٹی سے پوچھ لینا اسے کس دن تمہاری ضرورت ہوگی۔"

ساجدہ کی ماں کمرے سے باہر آئی۔ دیکھا کہ ساجدہ چولہے کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ ماں بیٹی نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ دونوں کے سینوں سے آہیں نکل کر ہوا میں تحلیل ہوگئیں۔

"گھبراؤ نہیں امّی!" ساجدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ـــــ "وہی ہوگا جو خدا کو منظور ہوگا فکر نہ کرو۔ ان کی عادت کچھ ایسی ہی ہے۔ اس جمعرات کو آجانا۔"

ماں نے ٹھنڈی سانس لی اور چلی گئی۔

جمعرات کو ماں ساجدہ کے پاس پہنچ گئی۔ شام ہو رہی تھی۔ ساجدہ اور اس کی ماں کرب و اضطراب کے عالم میں آنے والے لمحات کے انتظار میں روحانی بے چینی میں مبتلا تھیں جیسے قتل کا مجرم عدالت میں فیصلہ سننے کا منتظر ہو۔ جمال نہایت سکون سے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ ماں اور بیٹی کو ایک ایک لمحہ موت کے قریب گھسیٹ رہا تھا۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے کبھی تو یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ وقت کو پیچھے کھینچ کھینچ کر ہلکان ہو رہی ہیں اور کا ہے ان کے چہروں سے ایسی بے بسی ٹپکنے لگتی تھی جیسے اُنہوں نے اپنی مجبور ہستیوں کو وقت کے تیز دھارے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہو۔

جمعہ کی شام تھی۔ ساجدہ کو درد اُٹھا تو وہ لیٹ گئی۔ ماں چولہے سے ہانڈی اتار کر ضروری اشیا جمع کرنے میں مصروف ہوگئی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور کچھ اسی قسم کا اندھیرا ساجدہ کی آنکھوں کے سامنے پھیلتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ماں نے جمال کے آگے روٹی رکھی اور روندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹا! دُعا کرو، خدا تمہاری مراد خیریت سے پوری کرے۔"

جمال نے خاموشی سے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"بیٹا! کہو۔ آمین!"

"دائی کی ضرورت ہو تو بلا لو اور بچہ پیدا ہوتے ہی مجھے اطلاع دینا" ـــــ جمال نے لاپرواہی اور رُوکھے پن سے کہا۔ وہ کچھ اور کہنے ہی لگا تھا کہ ساجدہ کے کمرے سے اس قسم کی چیخ اور غراٹے بلند ہوتے جیسے بکرا ذبح ہو رہا ہو۔ ماں بھاگ کر اس کے پاس گئی۔

آہ و بکا اور چیخ و پکار میں رات گزر گئی۔ سحر کا حسین وقت تھا۔ قدرت کی رعنائیاں انگڑائیاں لے کر جاگ رہی تھیں۔ اُفق سے پھوٹتی سپیدی کی کرنیں سیاہ پردوں کو لپیٹ رہی تھیں ننھی سی ایک جان نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ اس کے کانوں نے سب سے پہلی بات جو سُنی وہ مؤذّن کی اذان تھی ـــــ "اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے"۔ ـــــ ننھی سی یہ جان بہت ننھی سی تھی لیکن اللہ کا بہت بڑا پیام۔

ساجدہ بے سُدھ پڑی تھی۔ ماں کا دل بیٹھ گیا جسم لرز گیا۔ ساجدہ نے آنکھیں کھولیں اور ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ساجدہ نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ صبح کی سپیدی سورج کی کرنوں میں تحلیل ہوگئی۔ جمال کی آنکھ کھُلی تو اس کے کانوں میں بچّے کے رونے کی آوازیں پڑیں۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ ساجدہ کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ خاموشی سے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ جمال نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا خبر ہے؟" ـــــ جمال نے متانت سے پوچھا۔

"خدا کو یہی منظور تھا" ـــــ ساجدہ کی ماں نے کہا ـــــ "لڑکی پیدا ہوئی ہے۔"

"تو لے جاؤ اسے" ـــــ جمال نے فیصلتہً کہا۔

"بیٹا!" ـــــ ساجدہ کی ماں نے روندھی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "وہ تمہاری بیٹی ہے۔ ذرا دیکھو تو کتنی خوبصورت...."

"اسے لے جاؤ" ـــــ جمال نے گرج کر کہا۔ "ابھی.... کھڑی مُنہ کیا دیکھ رہی ہو؟"

"بیٹا جمال ہوش میں آؤ۔"

"میں پوری طرح ہوش میں آگیا تو پچھتاؤ گی" ـــ جمال نے اسے کنکھیوں دیکھتے ہوئے کہا ـــ "لڑکی کو یہاں سے لے جاؤ۔"

"بیٹا! محلّے اور دنیا والے کیا کہیں گے کہ باپ نے...؟"

"دنیا کچھ نہیں کہے گی" ـــ جمال نے کہا ـــ "دنیا کچھ نہیں کہتی۔ کہے بھی تو مجھے پروا نہیں۔ جب مجھ پر سوتیلی ماں اور سوتیلے باپ اور ان کی اولاد نے ظلم ڈھاتے تھے تو بھی دنیا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ دنیا بھی خاموش تھی دنیا کا خدا بھی خاموش تھا"

جمال نے ویران سی ہنسی ہنس کر کہا ـــ "تم نے اپنی بیٹی اس لیے میرے ساتھ بیاہی ہے کہ میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ تم مجھ پر قابض ہونا چاہتی تھیں اور یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ تم بھی اور تمہاری بیٹی بھی مجھے کوستی رہتی ہو۔"

جمال خاموش ہو گیا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ آنکھیں گہری سرخ ہو گئیں اور پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ آتے جیسے اس کے سینے میں رکی ہوئی بجلیاں یکبارگی کوند اٹھی ہوں۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا ـــ "لے جا بچی کو ورنہ میں تجھے بھی قتل کر دوں گا" ـــ وہ ایسی خوفناک آواز سے بولا کہ ساجدہ کی ماں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ جمال پر دیوانگی کا عالم تھا۔ ساجدہ کی ماں جانتی تھی کہ جمال چٹان ہے جو اپنی جگہ سے ہلے گی نہیں۔

وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر ساجدہ کے پہلو سے بچی کو اٹھا لاتی اور صحن میں آ کھڑی ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ بچی کا گلا گھونٹ دینا جمال کے لیے معمولی سی بات ہے۔ جمال اپنے کمرے کے دروازے میں بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح کھڑا پھنکار رہا تھا۔

"ایک بار پھر سوچ لے۔ دنیا کے سامنے منہ نہ کر سکو گے" ـــ ساجدہ کی ماں نے غصّے سے کہا۔

دنیا کی بچّی! دُور ہو جا میری نظروں سے" ـــ جمال نے بے پناہ عتاب سے کہا۔

"میں بچّی کو لے جا رہی ہوں"۔ ساجدہ کی ماں نے انتہائی غصّے سے کہا "یاد رکھنا جمال یہی بچی تجھے کفن پہنائے گی۔"

جمال کا جسم لرز اُٹھا۔ ساجدہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ جمال کو اچھی طرح دیکھ رہی تھی۔ ڈر ڈر کر اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ جمال دانت پیس کر خاموشی اور تیزی سے ساجدہ کی ماں کی طرف بڑھا۔ ساجدہ جمال کی اس چال سے واقف تھی۔ دا

تنتے میں ایک دو مرتبہ [illegible]

لیکن اس کی ماں پر کسی کا ہاتھ اُٹھے۔ یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ نقاہت کا یہ عالم کہ چارپائی پر کروٹ بدلنا محال تھا۔ ابھی دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ اس نے بچّی کو جنم دیا تھا۔ اس بے بسی او نقاہت میں وہ چارپائی سے اُٹھی۔ جمال اور ماں میں دو قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ ساجدہ دوڑی اور چیل کی طرح جمال پر جھپٹی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ صحن میں دو دلدوز چیخیں بلند ہوئیں۔ ساجدہ جمال کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدموں میں الجھی تو جمال گھٹنوں کے بل اس کے پیٹ پر گرا اور ساجدہ کی ماں بچی کو اُٹھائے چیختی چلاّتی بھاگ گئی۔

ان دو نسوانی چیخوں نے محلے کی فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کیا اور فضا پھر ساکن ہو گئی۔ محلّے والوں کے لیے یہ چیخیں نئی نہیں تھیں۔ اس گھر سے اس قسم کی چیخ و پکار آئے دن بلند ہوتی رہتی تھی۔ لوگ جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ جن کے دلوں

میں انسانی ہمدردی کا جذبہ تھا۔ وہ ناک سکیڑ کر زیرِ لب جمال کو کوس لیا کرتے تھے بعض فحش گالی بھی بڑبڑا دیا کرتے تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ جا کر اس کا ہاتھ روکتا یا بیچ بچاؤ کرتا۔ آج بھی پڑوس والوں نے دو چیخیں سنیں تو وہ یوں اپنے کام میں مصروف رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہاں تو ہر روز یہی کچھ ہوتا تھا۔

ساجدہ کی ماں بچی کو سینے سے لگائی بھاگتی دوڑتی اپنے گھر پہنچ گئی۔ اس کے رونے چلاّنے پہ محلّے کی عورتیں جمع ہونے لگیں۔ ماں نے سسکیوں اور ہچکیوں میں جمال کے سلوک برتاؤ کے قصّے اور آج کی واردات سُنائی۔ عورتوں نے انگلیاں دانتوں تلے دبائیں۔ کانوں پر ہاتھ رکھے۔ جمال کو گالیاں دیں۔ قانونی چارہ جوئی کے مشورے دیتے۔ اظہارِ ہمدردی کیا۔ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ عورتوں نے سنائی۔ مردوں نے سُنی۔ محلّے میں چار چار پانچ پانچ ٹولیاں، عورتوں کی الگ مردوں کی الگ تبادلۂ خیالات کرنے لگیں۔

ساجدہ کی ماں کے ہاں عورتوں کا ہجوم کم نہ ہونے پایا تھا کہ جمال کے محلّے کا ایک لڑکا اطلاع لے کے آیا کہ ساجدہ مر گئی ہے اور جمال گھر میں نہیں ہے۔ ماں نے نوزائیدہ بچی کو بڑی زور سے بھینچ لیا اور چیخ مار کر رہ گئی۔ اس کے گرد چمگادڑوں کی مانند شور و غوغا کرتی عورتوں پر سناٹا چھا گیا۔

"شکر کا کلمہ پڑھو پھوپھی خاتون!" ایک عورت نے سکوت توڑا۔ "بے چاری کے پاپ کٹ گئے۔"

"سچ کہتی ہو بُوا!" دوسری نے تائید کی۔ "اللہ میاں نے مظلوم کو پناہ میں لے لیا۔"

لیکن ماں کی ممتا کے لیے یہ سب تسلّیاں جھوٹی تھیں۔ ساجدہ ماں کے لیے مرے ہوئے باپ کی نشانی تھی جو نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی اور جاتے جاتے چند گھنٹوں کی بچی، گوشت کا لوتھڑا، ماں کی گود میں پھینک گئی۔ ماں نے چند عورتوں کو ساتھ لیا اور ساجدہ کے گھر گئی۔ معلوم ہوا کہ ساجدہ نے جمال کے قدموں میں جان دی ہے۔

اسے مرے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے مگر جمال واپس نہ آیا۔ شام تک اس کا انتظار کیا گیا۔ ساجدہ کی ماں کے ہونٹ غم نے سی دیتے تھے محلّے والوں نے کفن دفن کا انتظام کیا اور رات کے اندھیرے میں مرحومہ کو دنیا کے اندھیرے سے نکال کر قبر کے اندھیرے میں روپوش کر دیا گیا۔ رات گزری، دن گزرا، ایک بھی، دوسرا بھی، تیسرا بھی لیکن جمال لوٹ کے نہ آیا۔ ساجدہ کی ماں آسودہ حال تھی۔ مالک مکان کو کرایہ ادا کیا اور گھر کا سامان اٹھوا کر اپنے گھر لے گئی۔

ساجدہ کی ماں ـــ خاتون ـــ نے ساجدہ کی نشانی کو سینے سے لگا لیا۔ تمام تر توجہ، محبت اور دلچسپیاں ننھی پر مرکوز کر دیں۔ جب بھی دیکھو، بچی اور دودھ کی بوتل گود میں لیے بچی سے باتیں کر رہی ہے۔ وقت نے مرہم کا کام کیا۔ جوں جوں بچی بڑی ہوتی گئی۔ خاتون کے سینے کے داغ دھلتے گئے۔ کچھ باقی رہا تو اپنے لخاوند اور ساجدہ کی یاد جو ہلکا سا درد بن کر سینے میں رہ گئی۔ بچی اس درد کا بھی درماں ثابت ہوئی۔ خاتون نے بچّی کا نام طاہرہ پروین رکھا اور اسے طاہرہ بیٹی کے نام سے پکارنے لگی۔ بھولی بسری وہ لوریاں بھی یاد آ گئیں جو اُس نے بیس برس گزرے ساجدہ کو دی تھیں۔ ان ہی لوریوں کی تان پر خاتون نے طاہرہ بیٹی کو ہلارے دے دے کر دو سال گزار دیتے۔ دو برس کی طاہرہ گڑیا تھی۔ دودھیا رنگت، سرمئی نشیلی آنکھیں۔ نازک باریک

ہونٹ لمبوتری گردن۔ سیدھا کھڑا قد۔ قدرت نے جیسے اپنی معصومیّت اور حسن ننھی میں سمو دیا تھا۔ جب وہ گلی میں کھیل رہی ہوتی تو راہ جاتے لوگ اسے رک کر دیکھتے تھے، چلتے اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے تھے۔ بعض کے منہ سے ہمدردی کے چند جملے بھی نکل جاتے تھے۔

"بے چاری!"

"روپ دینے والے نے لیکھ بھی ایسے ہی لکھے ہوتے۔"

"باپ دیکھو اور بچّی دیکھو۔"

"اللہ تیری شان۔"

"یہ بچّی کس کی ہے؟"

"اللہ بخشے لیفٹیننٹ خیر دین کی دوہتی ہے۔ ماں مرگئی ہے بے چاری کی۔"

"اور باپ؟"

"مرہی گیا سمجھو۔ ایسے باپ نہ ہی ہوں تو بہتر ہے۔"

"ہمّت ہے خاتون کی۔" ایک عورت نے کہا۔

"پیسہ ہو تو ہمّت بھی آجاتی ہے...." دوسری نے دیوار پر تھوکتے ہوئے کہا۔ "اللہ کا دیا تھوڑا نہیں۔ دو مکان کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ زمین اتنی کہ سال بھر کا آٹا نکال کر ہر فصل پر ہزار بارہ سو روپیہ گھر آجاتا ہے۔"

"جمال کا کچھ پتہ چلا؟" ایک دن ایک عورت نے خاتون سے باتوں باتوں میں پوچھا۔

"گرے کنوئیں میں مردود۔" خاتون نے دکھ بھرے غصے میں جواب دیا "میری بلا سے۔ پتہ ہو تو کیا؟ دو ڈھائی برس گزر گئے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آیا۔"

"کہتے ہیں نوکری چھوڑ گیا تھا۔" عورت نے کہا "جس دن ساجدہ بہشتن نے دم دیا تھا، اس دن سے لوٹا ہی نہیں.... اور بہن خاتون!" عورت نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "یہ بات بھلا سچ تھی کہ ساجدہ کے مرنے کے آٹھ دس روز بعد مانجھیوں نے دریا سے ایک لاش نکالی تھی۔ کہتے تھے کہ چہرہ اور اوپر کا دھڑ بگڑا کھایا ہوا تھا۔ لوگوں نے مشہور کر دیا تھا کہ جمال کی لاش ہے۔ ہم نے تو بہن اتنا عرصہ تم سے یہ بات پوچھی ہی نہیں کیا فائدہ گڑے مُردے اکھاڑنے کا۔"

"یہ تو دُنیا بھر کو معلوم ہے کہ پولیس نے مجھے بھی لاش کی شناخت کے لیے بلایا تھا"۔ خاتون نے کہا۔

"تو پھر؟" عورت نے بے تابی سے قریب سرکتے ہوئے پوچھا "جمال کی تھی نا!"

"گلی سڑی لاش کو میں کیسے پہچانتی۔ کپڑا اوپر تھا نہیں۔ ننگ دھڑنگ لاش تھی۔ شک ہوتا تھا کہ اسی کی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ دُوں۔ یہ جمال کی لاش ہے، پھر سوچا تھا نے والے اٹھا میرے حوالے کر دیں گے۔ کون مصیبت مول لیتا۔ میں نے کہہ دیا تھا یہ جمال کی لاش نہیں، مگر معلوم ہوتا تھا اسی کی ہے۔"

"جنہوں نے لاش دیکھی تھی کہتے تھے کہ اسی کی تھی۔ بعض تو یقین سے کہتے تھے کہ جمال دریا میں چھلانگ لگا گیا تھا۔" عورت

نے کہا "مرنہ جاتا تو کہیں نظر تو آتا۔"

خاتون کا شوہر جوانی میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ محبت اور ایثار کا یہ عالم کہ اس نے بھرپور جوانی کو خاوند کی یادوں کے حوالے کر دیا تھا۔ دوسری شادی کا نام نہ لیا۔ وہ ماضی کے حسین لمحات میں بھٹک جایا کرتی تھی۔ ان طویل اور سپاٹ برسوں میں خاتون نے جانے کتنی راتیں آنسوؤں کے دھارے میں بہا دی تھیں لیکن وہ طاہرہ بیٹی کو اس محرومی کے احساس سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اسے ساجدہ کے نام سے ہی بیگانہ رکھنے کا تہیّہ کر لیا۔ خاتون کا سنگار دان تو برسوں گزرے اُجڑ گیا تھا لیکن طاہرہ بیٹی کو اس نے گڑیا کی طرح بنوا سنوار کر رکھا۔ اس کے سینے میں جانے کتنے درد بھرے گیت تڑپ رہے تھے لیکن طاہرہ کو اس نے وہ وہ لوریاں دیں جن میں یاسیت کی جگہ سوز تھا۔ محبت تھی، عشق تھا۔ خدا کا نام تھا اور جن میں زندگی کی تپش تھی۔ خاتون کے رگ و ریشے میں دُکھ بھری کہانیاں رچی ہوئی تھیں لیکن طاہرہ کو جو وہ قصے سنایا کرتی تھی ان میں مسرت، شجاعت اور خودداری کی جھلک غالب ہوتی تھی لیکن ہر کہانی میں ایک شہزادے اور شہزادی کا ذکر ضرور آتا تھا۔ ایسے میں خاتون پر رقت سی طاری ہو جاتی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتی تھی۔ ان کہانیوں میں اس دیو کا ذکر ہرگز نہ ہوتا تھا جو پریوں کو اُٹھا کر لے جاتا ہے۔

سوتے جاگتے، ہنستے کھیلتے، لوریوں کی تان پر اور کہانیوں کی روانی میں پانچ برس گزر گئے۔ طاہرہ کو سکول بھیجنے کا وقت آن پہنچا۔ خاتون نے محسوس کیا کہ وہ معصوم بچی کو ہر روز پانچ چھ گھنٹوں کے لیے نظروں سے اوجھل نہ کر سکے گی۔ ساجدہ کو تو خاتون نے گھر میں ہی قرآن اور اُردو کی دو تین کتابیں پڑھا دی تھیں۔ وہ زمانہ کچھ اور تھا اور طاہرہ کے وقت زمانے کا رُخ ہی بدل چکا تھا۔ نئے رجحانات اور نت نئے ترقی پسند خیالات بیدار ہو رہے تھے۔ وقت کے تقاضے بدل رہے تھے۔ لباس کے ساتھ ساتھ لوگوں کی چال ڈھال بھی بدلتی جا رہی تھی۔ خاتون کو اچھی طرح یاد تھا کہ ایک بی اے پاس لڑکے نے ساجدہ کو محض اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ وہ میٹرک نہیں حالانکہ اس وقت انگریزی تعلیم کو بے حیائی سمجھا جاتا تھا۔ خاتون کو خیال آیا کہ مرحومہ اگر میٹرک پاس ہوتی تو شاید اس مظلومیّت کا شکار نہ ہوتی۔

ایک صبح خاتون حسبِ معمول جاگی۔ ناشتہ کیا۔ اتنے میں طاہرہ بھی جاگ اٹھی۔ آنکھیں ملتی پانچ سالہ بچّی کو دیکھ کر خاتون زیرِ لب مُسکراتی۔ اس نے طاہرہ کو نہلا دُھلا کر ناشتہ کرایا۔ سپارے کی دو سطریں پڑھائیں اور پوچھا — "طاہرہ بیٹی! اسکول پڑھنے جاؤ گی؟"

"ہاں امّی جان!" طاہرہ نے خوشی سے اچھل کر کہا "میں سکول جایا کروں گی۔ بڑی بڑی موٹی موٹی کتابیں پڑھا کروں گی.... مجھے تصویروں والی کتاب لا دو نا امّی!"

"میری اچھی بیٹی!" خاتون نے لپک کر طاہرہ کو گود میں دبوچ لیا اور اُسی روز اُس نے طاہرہ کو لڑکیوں کے سکول میں داخل کرا دیا۔ طاہرہ کے لیے سکول کا ماحول اجنبی تھا لیکن وہ دو ہی روز میں ہم جماعت لڑکیوں میں گھل مل گئی۔ اس کی طبیعت شگفتہ تھی۔ ذہانت کی بھی کمی نہیں تھی۔ خاتون اسے بنا سنوار کر نت نئے کپڑے پہنا کر سکول بھیجا کرتی تھی۔ خاتون کی زندگی میں نیا رچاؤ اور نئی بیداری پیدا ہو گئی۔ طاہرہ کی تعلیم میں وہ اس طرح دلچسپی لینے لگی جیسے وہ اسی مقصد کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ اس

کی تمام تر مصروفیات کا مرکز طاہرہ اور طاہرہ کا بستہ بن گیا۔ سکول بند ہونے کے وقت وہ دروازے میں بیٹھ جاتی اور بے صبری سے ہر چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے اس جھرمٹ کا انتظار کرنے لگتی جس میں طاہرہ ہنستی اچھلتی ساری لڑکیوں کے لیے ہنسنے کا سامان پیدا کرتی آ رہی ہوتی تھی۔ خاتون کے لیے یہ چند لمحات زندگی کے خوبصورت ترین لمحات ہوا کرتے تھے۔ وہ بڑھ کے طاہرہ کو گود میں اٹھا لیتی۔ گھر لاتی۔ کھانا کھلاتی۔ اس کی تختی دھوتی اور اس سے سکول کی باتیں پوچھنے بیٹھ جاتی تھی۔

چار سال گزر گئے۔

طاہرہ مسلم گرلز ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہو گئی۔

طاہرہ کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ خاتون کے دل میں ساجدہ کی یاد بیدار ہوتی جا رہی تھی۔ اس یاد کے ساتھ ہی طاہرہ کے مستقبل کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے سکول بھیج کر وہ اکثر وقت زمانے کی بھول بھلیوں میں کھو جاتی۔ ایک وہ وقت جو گزر گیا تھا۔ ایک وہ وقت جو آ رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ طاہرہ کے پیار میں وہ ساجدہ کو بھول گئی ہے لیکن طاہرہ جوں جوں بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نقوش اور خدوخال نکھر کر ساجدہ کی صحیح تصویر بنتے جا رہے تھے، اور ساجدہ کی یاد روز بروز نکھرتی آ رہی تھی جس نے خاتون کو از سرِ نو ملول اور اداس کر دیا۔ وہ تنہائیوں میں روتی۔ چھپ چھپ کے آہیں بھریں۔ ساجدہ کے انجام پر اپنے آپ کو کوسا بھی۔ اسے اپنا خاوند بھی یاد آتا تھا لیکن اس نے یہ رنج و غم، یہ تلخ یادیں اور ملال طاہرہ سے چھپاتے رکھا اور اسے یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ انسانی زندگی میں یاسیت اور اداسیوں کا بھی دخل ہوتا ہے اور بھولی بسری یادیں انسان کو آگے بڑھنے سے روک بھی لیا کرتی ہیں۔

طاہرہ جب پہلی جماعت میں تھی تو اس نے اپنے ابا جان کے متعلق پوچھا تھا۔ خاتون نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ لڑائی میں مارے گئے تھے اور یہ تو طاہرہ کو یقین تھا ہی کہ خاتون ہی اس کی ماں ہے۔ خاتون نے کبھی بھولے سے بھی اس پر ظاہر نہ ہونے دیا تھا کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ محلے کی عورتوں کو بھی منتیں کر کر کے اس نے قائل کر لیا تھا کہ وہ طاہرہ پر یہ راز فاش نہ ہونے دیں۔ ماں کا نہ ہونا کا عجیب خوش نصیبی تھی کہ محلے کے کسی فرد نے طاہرہ پر یہ حقیقت ظاہر نہ ہونے دی۔ ماں بیٹی سادہ اور خاموش سی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ روٹی کپڑے اور طاہرہ کے سکول کے اخراجات کے سوا کوئی فالتو خرچ نہ تھا۔ دو مکانوں کے کرائے اور فصل کی آمدنی سے خاتون نے شہر کے دوسرے کنارے طاہرہ کے نام ایک دو منزلہ مکان بنوانا شروع کر دیا۔

وقت گزرتا گیا۔ چند اور لمبے لمبے سال گزر گئے۔ خاتون اور طاہرہ پرانا مکان کرائے پر دے کر نئے مکان میں آ گئیں۔ زمین بھی تھی۔ اب آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ طاہرہ آٹھویں جماعت میں پہنچ گئی۔ عمر چودہ برس سے تجاوز کر رہی تھی۔ بے فکری اور چین سے پرورش پانے کی وجہ سے طاہرہ چودھویں سال میں سولہ سترہ برس کی دوشیزہ لگتی تھی۔ سیدھا کھڑا قد، لمبی گردن، سپیدی مائل چہرے پر دل نشین خدوخال، موزوں پیشانی، ستواں ناک، نپے تلے ہونٹ اور ان ہونٹوں پر زیرِ لب تبسم جو طلوعِ صبح کی طرح سارے چہرے کو پُر نور بنائے رکھتا تھا۔ حُسن کا یہ پیکر معصومیت، ذہانت، وقار اور ایک گونہ جلال کے لطیف پردے میں لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جسم میں چھریرا پن، پاؤں میں پھرتی اور ہاتھوں میں سلیقہ تھا۔ دیکھنے والے ایک قسم کے تقدس سے متاثر ہوتے تھے۔

طاہرہ نے اسی عمر میں ہی مزارعین کی نگرانی اور زمین اور مکانوں کی آمدنی کا حساب کتاب رکھنا شروع کر دیا تھا۔

گھر میں لڑکی جوان ہو رہی ہو تو بھولے بسرے، مرے کھپے رشتہ دار بھی آ رشتے جگاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا برادری تک سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ ایسی کڑیاں آ ملاتے ہیں کہ سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار معلوم ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا سلسلہ خاتون کے گھر بھی شروع ہو گیا۔ رشتہ دار آتے تھے اور دو ایک روز مہمان رہ کر اور طاہرہ کو پانچ دس روپے دے کر چلے جاتے تھے۔ خاتون امیدواروں کی اس قطار کو صفائی سے ٹالتی رہی۔ اُس نے ان میں سے کسی کا بھی لڑکا نہ دیکھا تھا نہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ساجدہ کا رشتہ باہر دینے سے اسی برادری اور انہی رشتہ داروں نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ یہ تو اس کی خوش بختی تھی کہ وہ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ ورنہ وہ لوگ جانے اس کا کیا حشر کرتے۔ وہ اور تو کچھ کر نہ سکے تھے سوائے اس کے کہ انتقاماً ساجدہ کی وفات پر کوئی نہ آیا تھا۔ خاتون نے بہت حد تک اطمینان کا سانس لیا تھا کہ ایک ناگوار سی پابندی سے گلو خلاصی ہو گئی لیکن اب وہی برادری والے دل ہی دل میں خاتون کی وہ لغزش معاف کر کے از سرِ نو رشتہ جوڑنے آ گئے۔ سب کو چودہ سال بعد ساجدہ کی موت کا "بے حد رنج" ہوا۔ خاتون، تصنع، فریب اور جھوٹی ہمدردیوں کے اس تانے بانے سے صفائی سے بچتی رہی۔

طاہرہ جب پڑھ رہی ہوتی تو خاتون اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگ جاتی تھی۔ دو تین بار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے یہ خیال ستانے لگا کہ لڑکیاں پرایا مال ہوتی ہیں۔ اس خیال سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ بے اختیار چاہنے لگی کہ طاہرہ

کو سینے سے چپکا لے اور زندگی کے باقی دن اسی طرح گزار دے۔ بعض اوقات ایک انوکھی سی خواہش اس کے دل میں تڑپتی — "کاش! وقت اسی جگہ رک جاتے اور طاہرہ بڑی نہ ہو" — لیکن وقت رُک نہ سکا اور طاہرہ نویں جماعت میں پہنچ گئی۔

نئی کلاسیں شروع ہوئے ابھی چند دن گزرے تھے کہ ایک دن طاہرہ سکول سے واپس آئی تو اپنے ساتھ کھدر کے کپڑوں میں ملبوس ایک سیدھی سادھی سی لڑکی کو گھر لائی اور خاتون کو بتایا کہ یہ عفّت ہے۔ آٹھویں جماعت تک اس کے ساتھ پڑھتی رہی ہے اور اب ماں اسے نویں میں داخل نہیں کرا رہی کیونکہ وہ بہت غریب ہے۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ پڑھنے کے شوق کے علاوہ عفّت کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ دس جماعتیں پاس کر لے تو کسی سکول میں استانی ہی لگ جائے یا دو چار لڑکیوں کی ٹیوشن کر کے ماں کا سہارا بن سکے۔

خاتون نے دونوں کو کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر طاہرہ نے خاتون کو دوسرے کمرے میں لے جا کر کہا —
"امّی جان! میں عفّت کو اپنے خرچ پر پڑھانا چاہتی ہوں۔ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ ورنہ بے چاری کی زندگی برباد ہو جائے گی..... ہم سے پہلے اسے میرے کپڑوں میں سے اچھا سا جوڑا دیں۔ اس کے پاس یہی کپڑے ہیں جو پہنے ہوتے ہیں۔"

خاتون شاید اپنے طور پر یہ ذمہ داری قبول نہ کرتی، لیکن ایثار کی راہ میں طاہرہ کا یہ پہلا قدم تھا جسے خاتون روکنا نہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں ایک دو باتیں آئیں لیکن اس نے خندہ پیشانی سے طاہرہ کا کہا مان لیا اور عفّت کو طاہرہ کے اچھے کپڑوں میں سے ایک جوڑا اور ایک دوپٹہ دیا جسے عفّت نے طاہرہ کے اصرار پر جھجکتے شرماتے لے لیا اور خاتون نے عفّت سے کہا — "کل تم سکول نئی کلاس میں چلی جانا اور کتابوں کی فکر نہ کرنا۔ ہم لے دیں گے..... طاہرہ بیٹی! کل اس کی فیس کے پیسے لے جانا۔"

عفّت کے آنسو پھوٹ آئے۔ وہ تھوڑی دیر بعد گھر چلی گئی۔

شام کو عفّت کی ماں عفّت کو ساتھ لیے اور کپڑوں کا جوڑا اٹھائے خاتون کے گھر آئی۔ غریب اور نادار سی یہ ماں حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔

"آؤ بہن!" خاتون نے چولہے کی آگ تیز کرتے ہوئے مسکرا کر اس کا استقبال کیا — "ارے نیچے کیوں بیٹھ گئی ہو۔ اٹھو چارپائی پر بیٹھو..... طاہرہ بیٹی! باہر آؤ۔ دیکھو عفّت آئی ہے۔"

"عفّت کو یہ کپڑے آپ نے دیئے ہیں؟" عفّت کی ماں نے کپڑوں کا جوڑا چارپائی پر رکھتے ہوئے ملول سی سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں بہن! میں نے ہی دیئے ہیں" — خاتون نے جواب دیا — "یہ بے چاری تو لے ہی نہیں رہی تھی۔ ہم نے زبردستی دیئے تھے۔"

"خدا آپ کو بہت دے بی بی!" — عفّت کی ماں نے شکریے کے لہجے میں کہا — "میں بیوہ ہوں اور سخت غریب لیکن خیرات قبول نہیں کروں گی۔"

"ہٹ پگلی کہیں کی!" — خاتون نے پیار بھرے غصے سے کہا اور اُٹھ کر کپڑے عفّت کی ماں کی گود میں رکھ دیئے۔ "عفّت میری بچی کی سہیلی ہے اور میں نے اسے اپنی بچی سمجھ کر یہ کپڑے دیئے ہیں۔ خیرات کاہے کی؟ خبردار جو کپڑے واپس کیے

تو۔ سیدھی اُوپر ہو کر بیٹھ۔ کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔ عفّت تمہاری بیٹی ہے تو کیا اس کا مجھ پر کوئی حق نہیں؟"

"اگر یہ بات ہے تو میں عفّت کو اپنے گھر رکھ لوں گی" — طاہرہ نے عفّت کو بازوؤں میں لے کر کہا — "بس تم جاؤ۔ اب عفّت ہماری ہو گئی ہے۔"

عفّت کی ماں پر خاتون اور طاہرہ کی ہمدردانہ بے تکلّفی کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ اس کے آنسو پھوٹ آئے۔ اس نے آنسوؤں کی روانی میں بتایا کہ اس کا خاوند تیس برس کی عمر میں جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس کی پنشن چھ روپے ماہوار ملتی ہے۔ دو روپے کوٹھڑی کے کرائے کے چلے جاتے ہیں اور پانچ چھ گھروں میں محنت مزدوری کر کے عفّت کے سکول کا اور دونوں کے پیٹ کا خرچ پورا ہو جاتا ہے۔

"قسم اٹھوا لو بی بی!" — اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "جو آج تک کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا ہو۔ ہم قسمت کے مارے اولاد کو پڑھا کر کیا کریں گے۔ آٹھویں تک نبھایا۔ آگے اپنے بس میں نہیں۔ لڑکی جوان ہے۔ کسی گھر میں اوپر کے کام پر لگوا دوں گی۔ بھانڈا برتن مانجھ کر اپنا پیٹ تو بھر لیا کرے گی۔"

"آٹھ جماعتیں پڑھ کر لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھے گی؟..... تُف ہے" طاہرہ نے طنزاً کہا۔ "عفّت کو ہم آگے پڑھائیں گے اور سکول کی اُستانی بنائیں گے، پھر تمہیں بھی گھر گھر کی مزدوری نہیں کرنی پڑے گی۔"

کھانا تیار ہو چکا تو ماں بیٹی کو خاتون اور طاہرہ نے بڑی مشکل سے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد طاہرہ نے یہ تجویز پیش کی کہ عفّت اور اس کی ماں ان ہی کے گھر میں چلی آئیں اور کرائے کی کوٹھڑی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں۔ خاتون نے پھر محسوس کیا کہ یہ ذمہ داری معمولی نہیں لیکن وہ طاہرہ کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے بھی طاہرہ کی تائید کی۔ عفّت کی ماں اتنے بڑے احسان سے سر بچانا چاہتی تھی لیکن طاہرہ کی ضد اور خاتون کے اصرار نے معاملہ طے کر لیا۔

دوسرے دن عفّت کی ماں تنگ و تاریک کوٹھڑی کو چھوڑ کر خاتون کے ہاں آ گئی۔ عفّت طاہرہ کے ساتھ رہنے لگی اور اس کی ماں کو باورچی خانے کے ساتھ والا کمرہ خالی کر دیا گیا۔ عفّت نویں جماعت میں داخل ہو گئی۔

عفّت کی ماں گھر کے کام کاج میں خاتون کا ہاتھ بٹانے لگی۔ خاتون کو تیسرے روز پتہ چلا کہ وہ دن میں تھوڑی دیر کے لیے دو چار گھروں میں کام کر آتی ہے۔ وہ مفت کی روٹیاں کھانے سے گریز کرتی تھی۔ خاتون نے اسے روک دیا اور اسے زمینوں، فصلوں، مزارعین کی نگرانی اور مکانوں کے کرائے کی فراہمی پر لگا دیا۔ اس طرح خاتون کی مصروفیت کم ہو گئی اور عفّت کی ماں کی نوکری بھی لگ گئی۔

طاہرہ اپنی کلاس میں تین بہترین طالبات میں شمار ہوتی تھی لیکن وہ کتابوں کا کیڑا نہیں تھی۔ سکول کی بزمِ ادب کی وہ روحِ رواں تھی۔ کھیلوں۔ دوڑوں میں اوّل نہیں تو دوسرے درجے پر ضرور رہتی تھی اور ڈرامے کھیلنے کا تو اُسے جنون تھا۔ اسی کی انگیخت تھی کہ سکول میں لڑکیوں نے چار ڈرامے کھیلے تھے جن میں سے ایک طاہرہ کا لکھا ہُوا تھا۔ ورنہ مریل سی ٹھنگنے قد کی ہیڈ مسٹریس میں اتنی زندگی کہاں کہ اس کے سامنے لڑکیاں ہنستی کھیلتیں۔

پڑھائی میں عفّت بھی اچھی خاصی تھی۔ آٹھویں جماعت تک وہ بجھی بجھی رہی۔ غربت نے سینے سے جینے کی اُمنگ اور دل سے جیسے ولولہ ہی چُوس لیا تھا۔ بچپن میں ہی عفّت کو ان مجبوریوں اور معذوریوں کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ وقت کے تلاطم

میں بہی جارہی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کس سمت جارہی ہے اور منزل کہاں ہے۔ آج سکول آئی ہے، خدا جانے کل آسکے گی یا نہیں۔ ایک طرف تعلیم کا شوق جسے وہ دبانے سے قاصر تھی، دوسری طرف معاشی بدحالی جو اس کی جذبات اور صلاحیت کو آٹے کی طرح پیس رہی تھی مُفلسی نے اُسے کمتر تو بنا ہی دیا تھا۔

ایک دن ماں نے اسے غصے میں یہ کہ "کر تیری جگہ خدا مجھے لڑکا دے دیتا تو پرائے گھروں کے برتن تو نہ مانجھنے پڑتے" سے کمتری کے اندھیرے غار میں دھکیل دیا تھا۔ لڑکیوں سے وہ الگ تھلگ رہتی تھی ——— چُپ چاپ، خاموش اور گم سُم۔ ہیڈ مسٹرس نے اسے کئی بار تنبیہہ کی تھی کہ سکول میں اچھے کپڑے پہن کر آیا کرے۔ عفت نے اس کی یہ تنبیہہ ہر بار سُنی اور سر جھکا کر رہ گئی، کچھ کہہ نہ سکی۔

طاہرہ کے گھر میں رہ کر جب عفت اچھے کپڑے پہننے لگی، کھانے پینے کو اچھا اور پیٹ بھر کر ملنے لگا۔ ٹھکانہ اور ہر طرح کا آرام گیا تو وہ اس طرح بدل گئی جس طرح کیچڑ میں سے موتی نکال کر دھو لیا جاتا ہے۔ چہرے سے اُداسیاں ڈھل گئیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ نے آکر بے چینی کا تاثر دھو ڈالا۔ آنکھیں چمک اُٹھیں۔ زردی مائل رخساروں پر گلابی رنگت نمودار ہونے لگی۔ جھکی ہُوئی گردن سیدھی ہو گئی جیسے اعصاب سے منوں وزن اُٹھ گیا ہو۔ دماغ ناگوار خیالات سے آزاد ہُوا تو عفت تعلیم کے شوق سے کتابوں میں گھس گئی لیکن احساسِ کمتری نہ گیا۔ لڑکیوں کے جھمگٹے سے کتراتا نہ گیا۔ وہ ہنسی کھیل سے گریز کرتی اور زیادہ دیر پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ طاہرہ کو اس کی یہ عادت اچھی نہ لگتی تھی۔ کئی بار اس نے اسے غصے سے ڈانٹا اور آہستہ آہستہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کر زندگی کی ہما ہمی کے قریب لے آئی۔

ایک سال گزر گیا۔

طاہرہ اور عفت اب دسویں جماعت میں تھیں۔ امتحان میں چھ ماہ باقی تھے۔

غلام مُلک کے نیم مُردہ انسان جو کبھی کے انگڑائیاں لے رہے تھے جاگ اُٹھے۔ ان کی سرگوشیاں فلک شگاف نعرے بن گئیں۔ ان نعروں کو کچلنے کے لیے انگریز نے بندوقوں اور جیلوں کے منہ کھول دیئے۔ فرنگی نے کئی سینے چھلنی کیے۔ لاکھوں کو کال کوٹھڑیوں میں بند کیا لیکن سینوں میں جو ولولہ اور روحوں میں جو بیداری پیدا ہو چکی تھی، اس پر نہ گولی نے اثر کیا نہ ہی اسے گرفتار کیا جا سکا۔ آگ بھڑک اٹھی تھی۔ بچے بچے کی زبان پر "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ تھا۔ یہ نعرہ زبانوں سے نہیں سینوں سے اٹھتا تھا۔ ہر وہ ہندوستانی جو مسلمان تھا۔ غریب اور امیر، تندرست اور مریض، ہر رنگ اور ہر جنس، کیا بچہ کیا بوڑھا، بلند عزم لیے، بلند آواز سے پاکستان مانگ رہا تھا۔ وہ انگریز سے بھیک نہیں اپنا حق مانگ رہا تھا اور انگریز کو خبردار کر رہا تھا ——— "یہ گھر میرا ہے اس میں انگریز نہیں رہے گا۔"

ہر کوچہ، ہر گلی، ہر بازار، ہر چوک اور ہر گھر میں ایک ہی موضوع پر باتیں ہونے لگیں ——— پاکستان ——— کہیں جلسے تھے کہیں جلوس اور ہنگامے۔ لوگ نئی نئی اصطلاحوں سے روشناس ہُوتے ——— کرفیو۔ دفعہ ۱۴۴۔ تحریک اینٹی پاکستان، رائٹس (فسادات) فائرنگ، لاٹھی چارج گیس اور گرفتاری۔

ہر صبح اور ہر شام ہندوستان کے حالات یوں نئی سے نئی کروٹ بدل رہے تھے جیسے ہوا کے تیز جھونکوں کے سامنے ایک کتاب کھول کر رکھ دی جائے۔ ہندی مسلمان کی تواریخ تیزی سے ورق الٹ رہی تھی۔ انسانوں کا خون ارزاں ہو گیا۔ شہر میں ہنگاموں کے بگولے اُٹھنے لگے۔ صبح ایک بازار میں لاٹھی چارج ہوتا تھا تو شام دو تین جگہوں پر گولی چلنے کی خبر آجاتی تھی۔ نعروں کی گونج اور گولیوں کی تڑاخ کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ یہ ۱۹۴۶ کا دور تھا جب ہماری جنگِ آزادی عروج پر پہنچ گئی تھی۔

طاہرہ بھی مسلمان تھی، باشعور اور حساس۔ وہ ہر روز سنا کرتی آج اتنے مُسلمان ان ہنگاموں میں کھو گئے ہیں۔ ان کی ماؤں بہنوں اور بیویوں کو اس نے دروازوں میں بیٹھے آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کون کہاں ہے۔ جیل میں، ہسپتال میں یا دوسری لاشوں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں ستلج میں بہا دیا گیا ہے۔

وہ دن طاہرہ کی زندگی کا اہم ترین دن تھا جس دن ان کے مکان کے بالمقابل رہنے والوں کا جوان بیٹا جو بی۔ اے کے آخری سال میں تھا صبح ایک جلوس کے ساتھ گیا اور دوپہر کو بہت سے آدمی ننگی چارپائی پر اس کی لاش گھر لاتے۔ وہ جلوس کے پیش پیش تھا کہ پہلی ہی گولی کے چھرّے کھوپڑی کے پار ہو گئے۔ لاش کے پیچھے ایک ہجوم تھا جس میں زیادہ تر کالج کے طلبا تھے طاہرہ کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ کسی نے بڑھ کر چہرے سے چادر ہٹائی۔ طاہرہ کا دل ایسی شدت سے دھڑکا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ آنسوؤں کے دھندلکے میں وہ اور کچھ نہ دیکھ سکی۔ اس کے کانوں نے وہ کہرام، وہ چیخیں اور دلدوز بین سُنے جو شہید کے گھر سے اُٹھ اٹھ کر عرش کا سینہ چیر رہے تھے۔ دوسرے کمرے سے عفت بھاگی ہُوئی آئی۔

"عفت!" ——— طاہرہ نے رندھی ہُوئی آواز سے کہا ——— "کمال شہید ہو گیا ہے۔"

"کمال شہید ہو گیا ہے؟"

"کون؟.... کمال؟" ——— خاتون بھاگتی ہُوئی نیچے گئی۔

"یہ خون ضائع نہیں ہو گا" ——— طاہرہ نے دریچے کی طرف بیٹھ کر کے زیرِ لب کہا اور خلاؤں میں گھورنے لگی۔ ہلکی سی اس سرگوشی میں ایک عزم تھا۔ طاہرہ کی آنکھیں جو ایک لمحہ پہلے آنسوؤں سے تر تھیں سینے کی حرارت سے خشک ہو گئیں۔ چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے اور سینہ اُبھر اُبھر کر بیٹھنے لگا۔ نازک سی ہستی زلزلے کے کئی جھٹکوں سے لرز اُٹھی۔

عفت گم سم دریچے کے پاس کھڑی کبھی سامنے والے گھر سے اُٹھتے نالے سنتی کبھی طاہرہ کے چہرے کو دیکھتی جس کی سپید پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ آنکھیں بے حس و حرکت ایک نقطے پر مرکوز تھیں۔ عفت نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔ "بے چارہ بی۔ اے کا امتحان دینے والا تھا۔"

طاہرہ چونک اُٹھی۔ ایک ثانیے کے لیے گرد و پیش کو دیکھا اور زیرِ لب کہا ——— "اس نے سب سے کٹھن امتحان پاس کر لیا ہے.... خوش نصیب ہے کمال!"

طاہرہ چلمن میں سے سامنے والے مکان کے باہر والے کمرے میں دیکھنے لگی جو کالج کے طلبا سے کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ صحن سے اٹھتے ہُوتے نالے یزداں کے قدموں تک پہنچ رہے تھے۔ طاہرہ کو معلوم تھا یہ خونی کھیل کیوں کھیلا جا رہا ہے۔ پردوں کے پیچھے کون ہے اور سٹیج پر کیا ہو رہا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس سٹیج پر کیونکر پہنچ سکتی ہے۔ گو وہ

جذبات سے مغلوب ہو گئی تھی لیکن ان پر عمل کا رنگ چڑھانا چاہتی تھی۔ پہلے وہ کمرے میں ٹہلی۔ رُکی، چلی، چل کر رُکی، پھر لیٹ گئی اور چھت پر نظریں گاڑے گہری سوچ میں کھو گئی۔ عفت دریچہ بند کر کے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں پُراسرار سکوت چھا گیا۔

"عفت!" — طاہرہ نے چھت پر نظریں جمائے ہوئے کہا — "ذرا سی ہمت کرو۔"

"کیا؟"

"سامنے بیٹھک میں جو لڑکے بیٹھے ہوئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بلا لاؤ۔"

"نہ طاہری!" — عفت نے شرماتے ہوئے کہا — "بھلا میں اتنے سارے لڑکوں کے سامنے کیونکر جا سکوں گی" — عفت نے پوچھا — "مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ ہم اس جنگ میں کس طرح شریک ہو سکتی ہیں۔"

"یہ تو مردوں کا کام ہے" — عفت نے کہا — "ہم عورتیں کیا کر سکتی ہیں؟ اگر یہ کام عورتوں کا ہوتا تو اب تک عور باہر نہ نکل آتی ہوتیں؟"

"شاید تمام عورتیں چولہوں پر بیٹھی یہی کچھ سوچ رہی ہیں اور اپنی اپنی جگہ پتھروں کی طرح پڑی ہیں۔" طاہرہ نے کسی حد تک سے کہا اور خاموش ہو گئی۔ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور عفت کو کہا — "جاؤ ذرا امی کو بلا لاؤ۔"

"گلی میں اتنے مرد گھوم رہے ہیں۔" لیکن طاہرہ کے تیور بھانپ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا بلا لاتی ہوں۔" وہ دوسرے کمرے میں گئی۔ برقعہ اوڑھ کر جب طاہرہ کے قریب سے گزری تو طاہرہ نے اس کا برقعہ پکڑ لیا۔

"اسے اتار جاؤ۔" طاہرہ نے تحکمانہ سنجیدگی سے کہا — "دو قدم پر دروازہ ہے اور تم دو قدم برقعے کے بغیر چل نہیں سکتیں"

"نہ بھئی طاہری!" — عفت نے رُوٹھنے کے لہجے میں کہا — "مجھے شرم آتی ہے۔"

"عفت!" اُس نے اس کا برقعہ چھوڑ کر متانت سے کہا۔ "وہ وقت آنے والا ہے کہ تم ان دیکھے انجانے مردوں کے ہجوم میں اس حالت میں پڑی ہو گی کہ تمہارے بدن پہ قمیص بھی نہیں ہو گی۔ اپنے آپ کو بدترین حالات کے لیے ابھی سے تیار کر لو۔ چلو برقعہ اتار دو اور بھاگ کر گلی پار کر جاؤ۔ بس تمہاری جھجک دور ہو جائے گی۔"

عفت شرمائی تو بہت لیکن طاہرہ کی حوصلہ افزائی سے وہ برقعے کے بغیر گلی پھلانگ گئی اور خاتون کو بلا لائی۔

"امی جان! مجھے ایک کام کی اجازت دیں۔" طاہرہ نے ملول مگر پُرعزم لہجے میں کہا۔

"کیا؟"

"سامنے بیٹھک میں سے کسی لڑکے کو بلا لائیں۔"

"کیوں؟"

طاہرہ امی کا استعجاب دیکھ کر فوراً سنبھل گئی۔ جذبات کے اس طوفان میں بھی اس نے محسوس کر لیا کہ وہ ماں کو الجھن میں ڈال رہی ہے۔ اس نے کہا۔ "ذرا اُس سے آج کے حادثے کی کہانی سنیں گے۔ کتنا ظلم ہے امی جان!"

"کہانی کیا ہے بیٹی!" — خاتون نے کہا — "کمال جلوس کے آگے آگے تھا۔ پولیس نے گولی چلائی اور بے چارہ شہ

ہو گیا؟"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں، امی جان!" — طاہرہ نے بچوں کی طرح کہا — "میں ساری باتیں سننا چاہتی ہوں۔ بلا لائیے نا کسی کو۔ حرج ہی کیا ہے؟"

خاتون کے لیے طاہرہ کی یہ ضد عجیب تھی۔ وہ ایک نوجوان لڑکے کو نوجوان بیٹی کے پاس کیسے لا بٹھاتی لیکن طاہرہ نے بہت سی باتیں کہہ سن کر خاتون کو منا ہی لیا اور وہ ایک لڑکے کو بلا لائی۔

نوعمر سا یہ لڑکا جب کمرے میں داخل ہوا تو طاہرہ اور عفت کو دیکھ کر جھجک گیا۔ طاہرہ نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"معاف کیجئے..." طاہرہ بولی "ہم آپ سے کمال کی موت کی تفصیلات پوچھنا چاہتی ہیں۔"

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ سارے ہندوستان میں ہر روز مسلمان جلوس نکالتے ہیں۔" لڑکے نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "اسی طرح آج ہم نے جلوس نکالا..." اور لڑکے نے ساری کہانی سنائی۔

"کیا لڑکیاں بھی اس جلوس میں شریک ہو سکتی ہیں؟" طاہرہ نے پوچھا اور کہا "ہم دونوں مسلم گرلز ہائی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتی ہیں۔ ہم چاہتی ہیں کہ..."

"اچھا میں سمجھ گیا آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔" لڑکا اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا "میں اپنی جماعت کے لیڈر کو اُوپر بھیجتا ہوں۔ اس سلسلے میں وہی آپ کو ہدایات دے سکتا ہے۔ امی جی!" لڑکا خاتون سے مخاطب ہوا "آپ اجازت دیں تو میں دوسرے لڑکے کو اُوپر بھیج دوں؟"

"بھیج دو، بیٹا" — خاتون نے دبی آواز سے کہا جیسے وہ لڑکوں کا اس طرح کھلم کھلا آنا پسند نہ کرتے ہوئے بادلِ نخواستہ اجازت دے رہی ہو۔

"میں حیران ہوں تم یہ باتیں پوچھ کر کرو گی بھی کیا؟" — خاتون نے پوچھا۔

"امی جان! سب کچھ تو بتا چکی ہوں" — طاہرہ نے مُسکرا کر جواب دیا — "آپ کے سامنے ہی تو پوچھ رہی ہوں۔"

اتنے میں کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک خوبرُو، خوش پوش اور خوش وضع نوجوان کمرے میں داخل ہوا اور آداب بجا لایا۔ طاہرہ اسے دیکھ کر جھینپ گئی۔ اس کے نکھرے ہوئے دل کش خد و خال سے ایک پختہ عزم مرد کا رعب اور جلال پھُوٹ رہا تھا۔ وہ ہمت و استقلال اور مردانگی کا پیکر معلوم ہوتا تھا۔ طاہرہ نے اسے دیکھا تو اس پر سناٹا سا چھا گیا۔ زبان گنگ ہو گئی۔ ایک وہ لڑکا تھا جو ابھی اُوپر آیا تھا اور طاہرہ کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا اور ایک یہ لڑکا کہ جسے دیکھ کر طاہرہ پر رعب طاری ہو گیا۔

دو چار سیکنڈ تک کمرے میں سکوت چھایا رہا۔ طاہرہ جہاں بیٹھی تھی بیٹھی ہی رہی۔ لڑکا جہاں کھڑا تھا کھڑا ہی رہا۔ عفت ایک کونے میں اور خاتون دروازے کے ساتھ۔ طاہرہ نے شرم و حجاب سے جھکی نظروں کو ذرا سا اٹھا کر اس پیکر کو ایک بار پھر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی نگاہیں اس کے پاؤں سے اُوپر نہ اُٹھ سکیں۔

"بیٹھ جاؤ، بیٹا!" — خاتون کی آواز نے سکوت توڑا۔

"مجھے ارشد کہتے ہیں"۔۔۔۔ لڑکا طاہرہ سے مخاطب ہُوا۔۔۔ "اکرم نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ آپ مُسلم گرلز ہائی سکول
ھتی ہیں۔۔۔۔ آپ کا نام؟"

"طاہرہ"۔

"ہمیں عورتوں کے تعاون کی سخت ضرورت ہے لیکن وہ باہر نکلنے سے جھجک رہی ہیں۔۔۔" ارشد نے سنجیدگی سے
کالج کی چند ایک لڑکیاں ہیں، اگر ان کے ساتھ چند اور لڑکیاں شامل ہو جائیں تو ایک جلوس عورتوں کا نکالا جا سکتا ہے۔ اس
چند روز بعد زیادہ لڑکیاں اور عورتیں باہر نکل آئیں گی۔ اس سلسلے میں پہل کرنے کے لیے باہمت لڑکیوں کی ضرورت ہے
اگر آپ ساتھ دے سکیں تو بات بن سکتی ہے۔۔۔۔ کیا آپ اپنے سکُول کی کچھ اور لڑکیوں کو بھی تیار کر سکتی ہیں؟"

"امید ہے آٹھ دس لڑکیاں تیار ہو جائیں گی"۔۔۔۔ طاہرہ نے جواب دیا۔

"ہماری سکیم تیار ہے"۔۔۔۔ ارشد نے خود اعتمادی سے کہا۔۔۔ "لڑکیوں کے جلوس کی صُورت میں ہم ان کی حفاظت
کے لیے ساتھ ہوں گے بلکہ یہ جلوس مردوں کا ہی ہوگا۔ ضرورت یہ ہے کہ اس جلوس کی قیادت لڑکیاں کریں"۔

"امّی جان!"۔۔۔۔ طاہرہ نے ارشد کی بات کاٹتے ہوئے خاتون سے کہا۔۔۔ "ارشد صاحب کے لیے چائے تو بنائیں"۔

خاتون باورچی خانے کی طرف گئی تو طاہرہ نے ارشد سے کہا "ہماری امّی کے لیے یہ باتیں عجوبہ سی ہیں۔ آپ کل ہمیں مسلم
ہائی سکول کے باہر ملیں ہیں اور عفّت۔۔۔۔ یہ عفّت ہے، میری سہیلی۔۔۔۔ ہم دونوں آپ کو کل گیارہ بجے سکول کے باہر ملیں
چھُٹی تو دیر سے ہوتی ہے لیکن ہم کسی بہانے جلدی نکل آئیں گی"۔

"اور میں کالج کی دو لڑکیوں کو ساتھ لیتا آؤں گا۔ کل کی ملاقات کے بعد آپ کا تعلق انہی کے ساتھ رہے گا"۔ ارشد نے کہا

"میں بہت مصروف رہتا ہُوں۔ میں ان دنوں عورتوں کے جلوس کے لیے ہی پریشان ہو رہا ہوں"۔

عفّت ابھی کمرے کے اسی کونے میں کھڑی ارشد کو گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ارشد نے ایک بار اس کی طرف دیکھا
تو اس نے نظریں جھکا لیں اور ارشد نے طاہرہ کو ہندوستان کے کونے کونے کی خبریں سنانی شروع کر دیں۔ قائدِاعظم کے لائحہ عمل
کو وضاحت سے بیان کیا اور بتایا کہ کس طرح ہندوستان کے مُسلمان جاگ اُٹھے ہیں، مسلمان کیا چاہتے ہیں اور جو کچھ وہ چاہتے
ہیں وہ کس طرح لے کے رہیں گے۔ قائدِاعظم نے مسلمانوں کو ایک نعرہ دے دیا ہے۔۔۔۔ "پاکستان یا موت"۔۔۔۔ مسلمانوں
نے اس نعرے کی گونج سے انگریز کی مشینری کے کل پُرزے بیکار کر دیتے ہیں۔ انگریز کے ایوانوں میں زلزلے کے جھٹکے محسوس
ہونے لگے ہیں۔

ارشد نے اسے تفصیلاً بتایا کہ کس طرح انگریز اور ہندو نے مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور مسلمان اس گٹھ جوڑ کا
مقابلہ سینہ تان کر کر رہے ہیں۔ مسلمانوں سے جیلیں بھر گئی ہیں۔

اتنے میں خاتون چائے کی ٹرے اٹھائے آگئی اور وہ بھی ارشد کی باتیں سننے لگی۔ ارشد کے بولنے کا انداز اب تقریر کا سا ہو
گیا تھا جس کے پیچھے تُلے الفاظ رُوح میں اُترتے محسوس ہوتے تھے۔ خاتون ان باتوں میں ایسے محو ہو گئی جیسے بچہ کہانی سنتے
وقت تصور میں اس کہانی کا جزو بن جاتا ہے۔ مُرجھاتے ہُوئے چہرے پر ایک تناؤ اور ماضی کی حسین یادوں سے بھرپُور بوڑھے

ذہن میں ایک ہل چل شروع ہو گئی۔ طاہرہ اور عفّت بھی جہانِ دگر میں پہنچ چکی تھیں۔ جب ارشد نے کہا۔۔۔ "لاہور میں عورتوں پر
اشک آور گیس چھوڑی گئی اور پولیس نے بے ہوش لڑکیوں اور عورتوں کو بے دردی اور بے شرمی سے اُٹھا اٹھا کر لاریوں میں
پھینکا۔۔۔" تو خاتون کے رعشہ گیر ہاتھوں نے کرُسی کے بازُو کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کے بازو کی رگیں اس طرح اُبھر آئیں
جیسے ابھی لاہور پہنچ جانا چاہتی ہو۔

ارشد کہہ رہا تھا۔۔۔ "پشاور میں مردوں کا ایک جلوس گورنمنٹ ہاؤس کی عمارت کے اُوپر لہراتا ہُوا یونین جیک اتارنے کو
بڑھا تو پولیس نے گولی چلانے کا اعلان کر دیا۔ جلوس رُک گیا اور چند قدم پیچھے ہٹ آیا۔ ایک نوجوان لڑکی نے مردوں کی پسپائی دیکھی
تو ہجوم کو چیرتی 'اللہ اکبر' کا نعرہ بلند کر کے وہ آگے بڑھی اور گورنمنٹ ہاؤس تک پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا۔
پولیس کے کئی سپاہی اس کی طرف لپکے تو لڑکی نے جلوس کو مخاطب کر کے کہا۔۔۔ 'اگر اس عمارت پر یہ جھنڈا نہ لہرایا گیا تو اے
مردو!۔۔۔' وہ اسی قدر کہنے پائی تھی کہ پولیس کے سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا لیکن مردوں میں نئی زندگی اور نیا ولولہ جاگ اٹھا اور وہ
پولیس پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے لڑکی کو پولیس سے چھین لیا اور اس کے ہاتھوں سے جھنڈا بھی سنبھال لیا۔ لاٹھی چلی۔ گولی چلی۔ مجاہد
گرے اور نصف گھنٹے کی خونریزی کے بعد انگریز کی سفید عمارت پر سبز پھریرا لہرا رہا تھا۔۔۔"

خاتون کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ عفّت کے آنسو نکل آئے اور طاہرہ اپنے اور ارشد کے درمیان پھیلے ہُوئے خلا میں کھو گئی۔
اس خلا میں اسے سبز جھنڈے لہراتے نظر آ رہے تھے۔ اس خلا میں اُسے نوجوان لڑکیاں پھٹتے ہُوئے گیس کے بموں کے زہریلے
دُھوئیں میں بے ہوش ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ اس خلا میں اسے انگریز اور ہندو نظر آ رہا تھا اور اس خلا میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔
قائدِاعظم کو دیکھا۔ محترمہ فاطمہ جناح کو دیکھا۔ اس نے بہت کچھ دیکھا اسے یوں لگا جیسے وہ اسی جہاد کے لیے پیدا ہُوئی تھی۔

"محمد بن قاسم کون تھا؟ صلاحُ الدّین ایوّبی کون تھا؟" ارشد کہہ رہا تھا "طارق بن زیاد کیا تھا؟ انسان تھے۔ فرشتے نہیں تھے۔
طاہرہ! آپ محمد بن قاسم ہیں۔ عفّت! آپ طارق بن زیاد ہیں۔ امّاں جی! آپ وہ ماں ہیں جس نے صلاح الدّین ایوّبی کو جنم دیا تھا۔ اماں
جی! آپ وہ ماں ہیں جس نے اپنے شہید بیٹے کو صرف اس لیے بخشنے سے انکار کر دیا تھا کہ تیر اُس کی پیٹھ پر لگا تھا اور ماں نے کہا تھا
کہ میرا بیٹا بھاگتے ہُوئے مارا گیا ہے۔ تیر اس کے سینے میں لگنا چاہیئے تھا"۔

"کاش! میرا ایک بیٹا ہوتا"۔۔۔۔ خاتون نے لرزتی ہُوئی آواز میں کہا۔

"آپ کے دو بیٹے ہیں"۔۔۔۔ ارشد نے پُرجوش لہجے میں کہا۔۔۔۔ "طاہرہ اور عفّت"۔

چائے کی پیالیوں میں سے دُھواں اُٹھ اٹھ کر ختم ہو گیا۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ وقت گزرتا گیا لیکن طاہرہ نے محسوس کیا جیسے
وقت کا ایک لمحہ بھی آگے نہیں بڑھا۔

دوسرے دِن گیارہ بجے ارشد چار لڑکیوں کو ساتھ لیے مُسلم گرلز ہائی سکول کے باہر کھڑا طاہرہ کا انتظار کر رہا تھا۔ چند منٹ
بعد طاہرہ اور عفّت آگئیں اور ارشد نے چاروں لڑکیوں سے ان کا تعارف کرایا۔ یہ چاروں لڑکیاں شکل وصُورت، چال ڈھال، لباس
اور بول چال سے اُونچے گھرانوں کی معلُوم ہوتی تھیں لیکن طاہرہ کے چہرے پر جو رعنائی تھی وہ سب پر ہلکا سا احساسِ کمتری مسلّط

کر گئی۔

عفت پر جھینپ سی طاری تھی، وہ اپنے آپ میں سکڑ رہی تھی۔ حالانکہ وہ شکل و صورت اور لباس میں ان چاروں سے کم نہیں تھی۔ ارشد نے ہلکا سا ہنسی مذاق جو شروع کیا تو اجنبیت اور جھینپ کم ہو گئی۔ وہ چل پڑے۔ چاروں لڑکیاں آگے آگے اور ارشد، طاہرہ اور عفت کے درمیان پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ بھرے بازار میں سے گزر رہے تھے جہاں ہر دس بارہ قدم کے فاصلے پر لاٹھیوں سے مسلح پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ دکانوں پر لوگوں کی بھیڑ تھی۔ لوگ اس طرح سودا سلف خرید رہے تھے جیسے آج کے بعد انہیں سودا نہیں مل سکے گا یا بازار بند ہو جائیں گے یا قحط پڑ جائے گا۔ مسلمانوں کی دکانوں پر سبز جھنڈے لہرا رہے تھے۔ زیادہ دکانداروں نے سبز قمیضیں پہن رکھی تھیں۔

چاروں لڑکیاں بغیر برقعے کے تھیں۔ طاہرہ اور عفت برقعے میں۔ جب وہ ایک بوڑھے حلوائی کی دکان کے سامنے سے گزریں تو بوڑھے نے جوش میں آکر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "پاکستان زندہ باد" ۔۔۔ ارشد نے اسی طرح ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کا جواب دیا۔ "زندہ باد پاکستان" ۔۔۔ اور اُس نے دیکھا کہ عفت نے برقعے کا نقاب نیچے پھینک دیا تھا۔ ارشد نے ایک غیر متوقع بے تکلفی سے جس میں جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی، اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ "کل سے آپ بغیر برقعے کے بازار میں نکلا کریں گی۔ یہ پردہ وردہ اب ختم سمجھیں ..... کیوں طاہرہ صاحبہ، اماں جی کو اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"ہوگا بھی تو وہ کچھ نہیں کہیں گی" ۔۔۔ طاہرہ نے جواب دیا۔

عفت کا سارا جسم کانپ اُٹھا۔ اس کے رگ و ریشے میں انوکھی سی ایک لہر دوڑ گئی اور اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے۔ اس وقت تک وہ مرد کے ہاتھ کے لمس سے ناآشنا تھی۔ اس کا باپ بچپن میں مر چکا تھا اور بھائی تھا نہیں۔ سترہ برس کی عمر تک ایک بھی مرد، باپ یا بھائی یا کوئی اور اس کی زندگی میں ایک ثانیے کے لیے بھی نہیں آیا تھا۔ ارشد کی گرفت ڈھیلی تھی۔ عفت نے ایک جھٹکے سے ارشد کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا کے بھاگ جانا چاہا لیکن اس میں بھاگ جانے کی ہمّت اور جرأت نہیں تھی۔

"یہ تمام دکاندار جیل میں بند ہیں" ۔۔۔ ارشد نے چند ایک بند دکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بتایا۔ "یہ سارا بازار مسلمانوں کا ہے۔ دو چار روز بعد باقی دکانیں بھی بند ہو جائیں گی۔ مسلمان پاکستان کے نام پر بچوں کی روزی بھی قربان کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں کچھ شہید بھی ہو چکے ہوں لیکن کسی کو معلوم نہیں۔"

یہ قافلہ بازار سے نکل کر ایک گلی میں داخل ہوا۔ گلی کے دونوں طرف دو دو تین تین منزلہ مکان تھے جن کی بالکنیوں کے جنگلوں کے ساتھ ریت کی چھوٹی بوریوں اور اینٹوں کی دیواریں سی بنی ہوئی تھیں۔ بعض مکان ایسے بھی تھے جن کی کھڑکیاں اینٹوں سے بند کر دی گئی تھیں۔ اس طرح ہر مکان قلعہ بنا ہوا تھا اور ہر بالکنی باقاعدہ مورچہ۔ ہر مکان کے اُوپر کانگرس کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔

"یہ ہندوؤں اور سکھوں کا محلّہ ہے" ۔ ارشد نے عفت کی طرف دیکھ کر کہا ۔۔۔ "ان لوگوں کو علم ہے کہ چند دنوں کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ ان کی عورتیں بھی اُس وقت کے لیے تیار ہیں اور یہ مورچہ بندی پیش بندی ہے۔ ان گلیوں میں خون بہے گا۔ ایک ایک مکان کے ایک ایک کمرے میں جنگ ہوگی۔ ان لوگوں کے پاس روپیہ ہے اور اتحاد۔ یہاں گھر گھر میں بندوق اور تلوار ہے۔ ان

لوگوں نے عالمی جنگ کے دوران جو دولت ٹھیکیداریوں اور بلیک مارکیٹ میں کمائی ہے وہ آج مطالبۂ پاکستان کو کچلنے کے لیے لگا دی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے چند ایک مسلمان ایسے بھی ہیں جنہوں نے جنگ میں خوب ہاتھ رنگے ہیں۔ وہ یہ فرض کر کے کہ مسلمان پاکستان نہیں بنا سکیں گے انگریز اور ہندو کے متحدہ محاذ میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان میں وہ جاگیردار بھی ہیں جنہیں انگریز نے اپنی قوم سے غداری کے صلے میں جاگیریں دی تھیں۔ یہ مسلمان انگریز کے زر خرید غلام ہیں۔"

عفت نے سر جھکا لیا اور طاہرہ نے ایک سراے نما حویلی کے بند دروازے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "یہاں کوئی فیکٹری ہے کیا؟ اندر سے ٹخ ٹخ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں تو آج پہلی بار اس محلّے میں آئی ہوں۔"

"یہ ہندو اور سکھ لڑکیاں گتکے اور لٹھ بازی کی مشق کر رہی ہیں" ۔۔۔ ارشد نے جواب دیا ۔۔۔ "دو اُستاد ہر روز انہیں مشق کرانے آتے ہیں۔ یہ سراے ایک ہندو کی ہے اور اُس نے اسے اسی کام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ شام کو مرد تلوار بازی کی مشق کرتے ہیں ..... طاہرہ!" ۔۔۔ ارشد نے پوچھا ۔۔۔ "آپ کے ہاں بندوق تو نہیں ہے؟"

"ہے" ۔۔۔ طاہرہ نے جواب دیا ۔۔۔ "ابّاجان مرحوم کی دونالی بندوق ہے۔ کارتوس بھی ہیں۔ ایک بار اتی نے دکھائی تھی۔"

"ارے! میں نے آپ سے ابّاجان کے متعلق تو ابھی پوچھا ہی نہیں" ۔۔۔ ارشد نے چونک کر کہا۔

"وہ جنگ میں مارے گئے تھے" ۔۔۔ طاہرہ نے جواب دیا ۔۔۔ "میں نے تو مرحوم کی صورت بھی نہیں دیکھی۔"

"آپ بندوق چلانا سیکھ لیں" ۔۔۔ ارشد نے کہا ۔۔۔ "اور عفت کو بھی سکھا دیں۔ اچھی طرح ہاتھ بٹھا لیں۔ دونالی بندوق کے نشانے کی زیادہ مشق کی ضرورت نہیں۔ چھرّے پھیل کر کسی نہ کسی کو توڑ ہی لیتے ہیں۔ صرف دھماکے اور دھکے کی عادی ہو جائیں۔"

"لیکن مشق کریں کہاں؟" ۔۔۔ طاہرہ نے پوچھا۔

"سنو جاری!" ارشد نے آگے آگے جاتی لڑکیوں سے کہا اور ایک رک گئی۔ "طاہرہ کے پاس دونالی بندوق ہے۔ انہیں بھی ساتھ لے جایا کرو۔ دیکھئے طاہرہ! جاری بھی کبھی پستول لے کر باہر جاتی ہے اور مشق کرتی ہے۔ آپ بھی اس کے ساتھ بندوق لے کر چلی جایا کریں۔"

عفت نے ایک بار پھر ارشد کو دیکھا اور چند ثانیے دیکھتی ہی رہی۔ وہ طاہرہ سے مخاطب تھا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" ۔۔۔ طاہرہ نے پوچھا۔

"نیشنل گارڈ کے ہیڈ کوارٹر میں" ۔۔۔ ارشد نے جواب دیا ۔۔۔ "ہاں آپ کا تعارف سالار سے کرائیں گے۔"

"آپ ساتھ رہیں گے نا؟" ۔۔۔ طاہرہ نے شرمیلے سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں! میں ساتھ ہوں گا" ۔۔۔ وہ ہنس دیا ۔۔۔ "گھبرائیں نہیں۔ یہ جھجک ایک دو روز میں دور ہو جائے گی ... کیوں عفت؟"

عفت نے اس کی طرف پھر کنکھیوں دیکھا اور مسکرا دی۔

"وہاں آپ کو پرسوں کے جلوس کا پروگرام بتایا جائے گا" ۔۔۔ ارشد نے کہا۔

وہ محلے سے نکلے تو سامنے ایک میدان تھا۔ میدان سے آگے ایک اور محلہ شروع ہوتا تھا۔ یہ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ وہ میدان پار کر کے ایک گلی میں داخل ہوئے تو ہر مکان کے اُوپر سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔ گلیوں میں بچوں کی ٹولیاں ہاتھوں میں کاغذ کی سبز جھنڈیاں

اٹھاتے "پاکستان زندہ باد" اور "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے جلوس جلوس کھیل رہے تھے بعض بچوں نے سبز قمیضیں پہن رکھی تھیں۔

ارشد کا قافلہ گلی میں سے ہوتا ایک حویلی کے سامنے جا رکا۔ یہ ایک قلعہ نما حویلی تھی جس کے اُوپر بہت بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ سب اندر چلے گئے۔ سامنے وسیع صحن تھا جس کے چاروں طرف برآمدہ اور برآمدے میں متعدد کمرے تھے۔ صحن میں بے شمار آدمی چارپائیوں پر بیٹھے حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ برآمدوں میں نیشنل گارڈ کے باوردی رضاکار بھاگ دوڑ رہے تھے۔ حویلی کا ہر کمرہ یا تو دفتر بنا ہوا تھا یا اس میں چارپائیاں رکھ کر رہائشی کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ صحن برآمدوں اور کمروں میں ایک زندگی متحرک تھی اور یہ حرکت بہت تیز تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وقت تیزی سے اُڑ رہا ہے اور یہ لوگ بھاگ کر وقت سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔

اب ارشد آگے آگے تھا اور تمام لڑکیاں پیچھے۔ ارشد نے بلند آواز سے السلام علیکم کہا اور لڑکیوں نے ہاتھ کے اشارے سے زیرِ لب سلام کیا۔ صحن میں ایک گونج سنائی دی ——"وعلیکم السلام"۔ یہ گونج اُن سیاہ بادلوں کی گرج سے ملتی جلتی تھی جو افق سے اٹھ کر موسمِ بہار کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ سیاہ بادل اپنے ساتھ بہار کا نکھار لاتے ہیں، نئی زندگی اور پُرکیف خنکی لاتے ہیں۔ یہ گرج دائمی مریضوں کو بھی ایک بار بستر سے نکال لیتی ہے۔ اس گرج میں ایک عزم ہوتا ہے ——"میں برسنے کے لیے آئی ہوں"۔

طاہرہ اور عفت کو یوں لگا جیسے وہ اس طوفان بگریباں گونج کی لپیٹ میں آگئی ہوں اور دوسرے ہی ثانیے انہوں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ اس گونج کا حصہ بن گئی ہوں۔ اس گونج میں انہیں ایسی زندگی محسوس ہوئی جو اُن شب و روز سے بالکل ہی مختلف تھی جو انہوں نے اس حویلی میں قدم رکھنے تک گزاری تھی۔ اس زندہ گونج میں داخل ہونے سے پہلے وہ عورتیں تھیں، بے بس لڑکیاں، کمزور، نحیف، نازک، جو کسی مرد کا سامنا کرنے سے گریز کرتی تھیں اور جو ہر لمحہ کسی نہ کسی مرد، باپ، بھائی یا خاوند کی محافظت میں رہنا چاہتی تھیں۔ اس لمحے سے پہلے وہ برقعے کی سیاہ اوٹ میں ہی چھپا رہنا چاہتی تھیں جیسے یہی چند گز کپڑا ان کا محافظ تھا۔ جب اُنہوں نے حویلی میں اتنے مردوں کو دیکھا تھا تو وہ ارشد کے قریب ہو گئی تھیں۔ دونوں کے قدم رک سے گئے تھے لیکن چٹانوں کو لرزہ براندام کر دینے والی گونج نے ان کا استقبال کیا تو ان کی نسوانی جھجک، خوف اور احساسِ بے بسی یوں ڈھل گیا جس طرح سُورج کی گرم کرنوں سے صبح کی دھند غائب ہو جاتی ہے اور چمن کا پتا پتا نکھر آتا ہے۔

ان میں نوجوان تھے، جوان بھی اور بوڑھے بھی تھے۔ طاہرہ اور عفت نے یوں محسوس کیا جیسے کسی نے ان کے کانوں میں کہا ہو "یہ تمہارے بھائی ہیں، یہ تمہارے باپ ہیں"۔ طاہرہ نے عفت کی طرف دیکھا اور عفت نے طاہرہ کی طرف دونوں مُسکرا دیں۔

اس گونج نے ایک زندگی پر پردہ گرا دیا اور دوسری کا پردہ اُٹھا دیا۔

ارشد نے ایک کمرے کی چق اٹھائی تو اندر سے جواب ملا "ساتھ والے کمرے میں بیٹھئے۔ صرف دس منٹ... انہیں فارغ کر لوں"۔—— ارشد کی جماعت دوسرے کمرے میں چارپائیوں پر جا بیٹھی۔ دس بارہ منٹ بعد نیشنل گارڈ کے ایک سپاہی نے انہیں باہر سے کہا "سالار بلا رہے ہیں"۔—— ارشد لڑکیوں کو ساتھ لے کر سالار کے دفتر میں چلا گیا۔

نیشنل گارڈ کا سالار احترام کے لیے اُٹھا۔ دوسری چار لڑکیوں نے تو اسے پہلے دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ طاہرہ اور عفت کے لیے یہ شخصیت اجنبی تھی۔ بھرا بھرا سرخ و سفید چہرہ، سیدھے کندھے، چھ فٹ سے اُوپر قد، عمر بمشکل اٹھائیس برس ہوگی۔ اس کے سامنے میز پر چند ایک فائلیں رکھی تھیں اور ان کے درمیان کاغذوں کا ایک پلندہ۔ کرسی کے عقب میں دیوار کے ساتھ ہندوستان کا نقشہ لٹک رہا تھا جس پر جلال آباد کے مقام پر ایک پن اور پن کے ساتھ سبز کاغذ لگا ہوا تھا۔

ارشد اور لڑکیاں کرسیوں پر بیٹھ گئیں تو سالار بھی بیٹھا۔

"وقت بہت کم ہے اور میں ویسے بھی تقریر کے موڈ میں نہیں...." سالار نے تعارف اور دیگر تکلفات کو نظرانداز کرتے ہوتے اس انداز سے بات شروع کی جس طرح کوئی بیوپاری فیصلہ کُن لہجے میں کہتا ہے۔ "پانچ روپے دو آنے مَن۔ ایک پیسہ کم نہ ہوگا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ پرسوں اس شہر کے مسلمان ایک تاریخی جلوس نکال رہے ہیں؟" سالار نے لڑکیوں سے پُوچھا اور کاغذوں کے پلندے کو الٹ پلٹ کر ایک کاغذ سامنے رکھ لیا۔

"جی ہاں!" کالج کی ایک لڑکی نے جواب دیا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ اس جلوس کی قیادت لڑکیوں کو کرنی ہے؟"

"معلوم ہے"

"اور یہ بھی معلوم ہے کہ لاٹھی چارج ہوگا؟"

"معلوم ہے"

"اور یہ بھی کہ گیس بھی چھوڑی جائے گی؟"

"جی ہاں!"

"اور یہ بھی کہ شاید پولیس گولی بھی چلائے؟"

"جی ہاں!"

"اور یہ بھی کہ آپ کا زخمی یا شہید ہو جانا یا پولیس کی لاری میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو جانا بھی متوقع ہے؟"

"سب کچھ معلوم ہے"

سالار نے طاہرہ اور عفت کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا —— "آپ دونوں بالکل خاموش ہیں"

"یہ سکول کی لڑکیاں ہیں" —— ارشد نے جواب دیا —— "ان کی ہمت ہے کہ یہاں تک آگئی ہیں۔ دونوں دسویں جماعت میں ہیں۔ ان کے ساتھ آٹھ دس اور لڑکیاں بھی تیار ہو جائیں گی"

طاہرہ نے فضا کے تقدس اور حالات کی اہمیت اور شدت کا اندازہ کر لیا تھا۔ ایک سرور تھا جو اُس پر چھا گیا تھا۔ وہ بھول چکی تھی کہ وہ اُن لڑکیوں میں سے ایک ہے جنہیں پردوں کے پیچھے چھپائے رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ کچھ حجاب تو وہ صحن میں جھٹک آئی تھی، باقی یہاں ڈھل گیا۔ اُس کے دل و دماغ نے تو جیسے حویلی میں داخل ہونے تک کی زندگی کو اگل کر اس

نئی زندگی کی سرگرمیوں کو قبول کرلیا تھا۔ عفت پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی لیکن وہ رہ رہ کر ارشد کے پُرشباب چہرے اور اس کے مردانہ حُسن کو دیکھ رہی تھی۔

"پرسوں آپ دن کے تین بجے جتنی لڑکیاں ساتھ لاسکیں ملائیں اور سبزی منڈی کے چوک میں جمع ہوجائیں" ـــــ سالار نے کہا ـــــ "یا یوں کیجیے ارشد صاحب! آپ کسی موزوں جگہ ان لڑکیوں کو جمع کرلیں۔ یہ کام آپ کا ہوگا۔ سب کے گھروں کی دُوری نزدیکی کا جائزہ لے لیں لیکن وقت کی پابندی لازمی ہے.... تین بجے بعد دوپہر سبزی منڈی کے چوک میں.... نیشنل گارڈ نے بڑی مشکل سے آٹھ عورتوں کا بندوبست کیا ہے۔ عورتوں کا باہر نکلنا اور خصوصاً آج کل کے حالات میں ناممکن ہورہا ہے۔ اگر عورتوں کا پہلا جلوس کامیاب ہوگیا تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہر روز سینکڑوں عورتوں کا جلوس نکل سکے گا..." سالار سوچ میں پڑگیا اور پنسل سے کاغذ پر لکھنے لگا "آٹھ.... آپ کے ساتھ دس ہوں گی۔ اٹھارہ... چھ آپ ہیں... چوبیس...."

"چھ اور شامل کرلیجیے" کالج کی ایک لڑکی نے کہا۔

"گویا تیس کا اندازہ ہے" ـــــ سالار نے کہا۔

"دوپٹے سبز ہونے چاہئیں؟" ـــــ ارشد نے پوچھا۔

"بالکل سبز"... سالار نے فیصلہ کُن کہا "جھنڈے وہیں دیئے جائیں گے۔ ہم نے ایک لمبے رستے کا انتظام کر رکھا ہے۔ مرد لڑکیوں کے گرد رستے کا گھیرا ڈالے رکھیں گے۔ حفاظت کا مکمل بندوبست ہے۔ آپ اپنے ساتھ پانی میں بھیگے ہُوتے دوپٹے یا چادریں ضرور لائیں۔ گیس کے حملے کی صورت میں یہ دوپٹے اور چادریں سر، چہرے اور گردن کے گرد لپیٹ لیں۔ مرد جان توڑ کر آپ کی حفاظت کریں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے، بلکہ یہ ہوگا کہ جب پولیس آپ کو گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے گی تو مرد ایک ایک لڑکی کو پولیس کے ہاتھ سے چھین کر جلوس میں ہی گم کردیں گے۔ ہوسکتا ہے پانچ منٹ کے عرصے میں آپ بیسیوں مردوں کے ہاتھوں میں جائیں۔ ایسے وقت آپ شرم میں نہ آجانا۔ وہ سب آپ کے بھائی اور باپ ہیں۔ وہ آپ کو پیچھے کرکے اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں گے....

"ہمارا اُس روز کا پروگرام یہ ہے کہ ہم تھانے پر قبضہ کریں گے اور پاکستان کا جھنڈا لہرائیں گے۔ اسی وقت دوسری پارٹی کچہری پر جھنڈا چڑھائے گی۔ پھر ڈاک خانے پر بھی اسی طرح جھنڈا چڑھایا جائے گا۔ پولیس تھانے کی حفاظت کے لیے ہر جتن کرے گی۔ چونکہ ہمارے شہر میں یہ اقدام اپنی نوعیت کا پہلا ہوگا اس لیے ڈر ہے کہ لوگ اس مسلح مزاحمت کے آگے ٹھہر نہ سکیں گے۔ اس صورت میں ہمیں ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو وہاں اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر ایک تقریر کرکے بھاگتے ہُوتے مردوں کو روک لے اور ان کے خون کو گرما دے...."

سالار نے کاغذوں کو الٹ پلٹ کر ایک کاغذ نکالا اور کالج کی لڑکیوں کے سامنے رکھ دیا۔ اس کاغذ پر دس بارہ فقرے لکھے ہُوتے تھے۔ سالار نے کہا ـــــ "تقریر اس قسم کی ہونی چاہیئے۔ محض جذباتی۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، یہ دَور جذبات کا ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ آپ میں سے کون سی لڑکی یہ کام کرسکے گی۔ ہوسکتا ہے اس کی نوبت نہ ہی آئے لیکن ہمیں ہر طرح کی پیش بندی کرلینی چاہیئے۔"

چاروں لڑکیوں نے کاغذ پر جھک کر تحریر پڑھی اور ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ کوئی مسکرادی، کسی نے گھبراہٹ کا اکھڑا ہُوا سانس لیا اور کسی نے کچھ بھی نہ کیا۔ سالار سمجھ گیا یہ کام ان چاروں کی ہمت سے باہر ہے۔ اُس نے طاہرہ اور عفت کی طرف دیکھا تو ارشد نے کاغذ طاہرہ کی طرف سرکا دیا۔ طاہرہ نے تحریر پڑھتے ہی خوداعتمادی سے کہا "میں بول لوں گی۔"

"شاباش!" ـــــ سالار نے کہا ـــــ "آپ اس ہجوم میں تنہا نہیں ہوں گی۔ کوئی نہ کوئی آدمی آپ کو ہدایات دیتا رہے گا.... ارشد صاحب! باقی پروگرام کا تو آپ کو علم ہے نا؟.... خوب.... کالج کا کیا حال ہے؟"

"بچہ بچہ بیدار ہے۔ جلوس کے ساتھ سارا کالج ہوگا۔"

"بہت خوب!" ـــــ سالار نے کہا ـــــ "تو آپ لوگ جاکر تیاری کرلیں۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔"

"ہاں بیٹی! بات تو میں ساری سمجھ گئی ہوں" ـــــ خاتون نے طاہرہ کی ساری باتیں سن کر کہا "میں یہ بھی سمجھ گئی ہوں کہ اس جلوس کا مقصد کیا ہے اور لڑکیوں کی شمولیت کس قدر ضروری ہے.... لیکن.... لیکن بیٹی!...."

"لیکن یہ کہ آپ ڈر رہی ہیں کہ آپ کی بیٹی ماری جائے گی" طاہرہ نے ہنس کر کہا۔ اس کی ہنسی نے فضا کا کھچاؤ اور خاتون کی گھبراہٹ کو بہت حد تک کم کردیا ـــــ اُس نے کہا ـــــ "لیکن یہ نوبت نہیں آئے گی، جیسا کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں مرد ہماری پوری طرح حفاظت کریں گے۔"

خاتون خلاؤں میں تکنے لگی۔ اس خلا میں اسے جانے کیا نظر آیا کہ اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ بے نور آنکھیں روشن ہوتی جارہی تھیں۔ جسم ساکت و جامد تھا لیکن اس سکوت اور جمود میں ایک طوفان انگڑائیاں لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد خاتون کے ہونٹ تھرتھرائے۔ بوڑھا سینہ ایک بار زور سے دھڑکا اور خاتون نے بے ساختگی سے دوپٹے کا پلّو دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر کہا ـــــ "اللہ میری بچی کو فتح دے۔ آمین۔ اللہ میری بچی کے بھائیوں کو فتح دے۔ آمین" بُوڑھی عورت کی آواز میں جلالی رقّت کا رنگ پیدا ہوگیا۔ وہ لرزتی آواز میں بولی "اللہ مسلمانوں کو فتح دے۔ آمین" اور خاتون کے آنسو نکل آتے۔ اس کی باقی دعائیں حلق میں ہی اٹک کے رہ گئیں۔

طاہرہ اُٹھ کر خاتون سے بغل گیر ہوگئی اور اسے بھینچ کر کہا ـــــ "میری پیاری امّی!"

جلال آباد کا شہر، جہاں دو روز بعد تاریخی جلوس نکلنے والا تھا چند مہینوں سے اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد اور قائدِ اعظم زندہ باد کے نعروں اور ہندوؤں کے جے کاروں سے گونج رہا تھا۔ خود رَو پودوں کی طرح سبز جھنڈے اُبھر آتے اور منڈیروں پر لہرا رہے تھے۔ شہر کی آبادی میں صرف بیس ہزار مسلمان اور باقی ہندو اور سکھ تھے۔ یہ شہر چاروں طرف سے سکھوں کے چھوٹے چھوٹے دیہات میں گھرا ہُوا تھا۔ اس طرح شہر کے بیس ہزار مسلمان اسّی نوّے ہزار سکھوں اور ہندوؤں کے نرغے میں تھے۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں جہاں سرگرمی، دوڑ دھوپ اور انتھک جدوجہد تھی، وہاں تلخ سا کھچاؤ اور خوف و ہراس بھی تھا۔ گذشتہ مہینے کے آغاز سے اس شہر میں مسلمانوں کے جلوسوں پر لاٹھی چارج بھی ہونے لگا تھا اور دو بار گولی بھی چل چکی تھی۔

یہ ۱۹۴۶ کا تاریخی سال تھا۔ قائدِ اعظم نے محسوس کر لیا تھا کہ انگریز ہندوستان کو تو آزادی دینے پر آ گیا ہے مگر وہ مسلمانوں کی الگ مملکت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ ہندو پورے ہندوستان کا مالک بننے اور مسلمانوں کو غلام بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان حالات میں قائدِ اعظم نے ڈائریکٹ ایکشن کا حکم دیا تھا تاکہ انگریز اور ہندو کو معلوم ہو جاتے کہ مسلمان کیا کچھ کر سکتا ہے۔

ہندوستان کے قریہ قریہ سے مطالبۂ پاکستان کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب اس آواز نے جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی——خونچکاں جنگ جس میں ہر روز مسلمان شہید، زخمی اور قیدی ہو رہے تھے۔ کئی شہروں اور قصبوں سے گاڑیاں روکنے اور پاکستانی جھنڈے لہرانے کی خبریں آ رہی تھیں۔ جلال آباد کے مسلمان بھی اب اسی نوعیت کے حملے کی تیاری کر رہے تھے۔ پشاور کی خبر نے کہ کس طرح ایک لڑکی نے گورنمنٹ ہاؤس پر مسلمانوں کے پسپا ہوتے ہوئے ہجوم کو اس پر قابض کر دیا تھا جلال آباد کے مسلمانوں کو تڑپا کے رکھ دیا اور نیشنل گارڈ نے ایک طوفانی جلوس کا انتظام کر لیا۔

نیشنل گارڈ کے دفتر سے لوٹ کر طاہرہ اپنی داخلی دنیا میں انوکھی سی تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ عجیب و غریب سے خیالات اسے بیکل بنا رہے تھے۔ گاہے اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگتا جیسے چھوٹا سا دل پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا اور گاہے ایسا سکون جیسے طاہرہ بادلوں کے بہت بڑے سفید ٹکڑے پر فضا کی وسعتوں میں اڑی جا رہی ہو۔ اس بے قراری میں اور اس سکون میں ہیجان بھی شامل تھا۔

طاہرہ ارشد کے خیال میں کھو گئی۔ اس خیال نے اسے ہلارے دیئے۔ پیغام سناتے اور پل بھر میں یہ خیال ایک سائے کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر یہ سایہ اس کے ذہن کے پردوں پر گھومنے پھرنے لگا۔ پھر اس نے تخیلات کے اس سائے کے ساتھ ایک اور سایہ دیکھا۔ اس نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ یہ سایہ اس کا اپنا تھا۔ وہ اس منظر کو دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں سائے ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے۔

اس نے محسوس کیا جیسے اس کے قریب ہی آٹا پیسنے والی مشین چل رہی ہو——دھک، دھک، دھک، دھک——وہ اچک کر اس خواب بیداری سے بیدار ہو گئی۔ یہ مشین اس کے پھڑکتے ہوئے سینے میں چل رہی تھی۔ دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو ہتھیلی ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گئی۔ ایک آہ اس کے سینے سے نکلی اور اس آہ نے نکل کر جیسے اسے پھولوں کی تازگی، بہار کا کیف اور نیند کا خمار بخش دیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے ایک حقیقت نے اس کے تصورات پر قبضہ کر لیا——پرسوں دن کے تین بجے!

وہ اٹھ بیٹھی۔ بارے اس کا کلیجہ دہل گیا اور وہ گھبرا گئی——مردوں کی قیادت، ہزاروں مرد، پولیس، لاٹھی چارج، گولی، گرفتاری، حوالات، جیل، امی جان——اس پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس کی اس وقت کی حالت اس سپاہی سے ملتی جلتی تھی جس نے میدانِ جنگ میں ذرا اونگھ کر گھر کی لطافتوں کا خواب دیکھا ہو اور وہ ہوائی جہازوں کی ہولناک گڑگڑاہٹ اور توپوں کی ہیبت ناک گرج سے جاگ اٹھا ہو اور اس کے چاروں طرف بارود پھٹ رہا ہو۔

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی اور خیالوں کی افراتفری میں بالائی منزل کی کھڑکی تک پہنچ گئی۔ اس نے کھڑکی کھولی ہی

تھی کہ سامنے کے گھر سے اسے کمال کی بہن کے رونے کی آواز آئی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کھڑکی سے لے کر کمال شہید کے دروازے تک پھیلے ہوئے خلا میں دیکھنے لگی۔ وہاں اسے خون ہی خون نظر آیا اور لاشوں کے ڈھیر کے اوپر ایک جھنڈا لہراتا دکھائی دیا——خون سرخ تھا اور جھنڈا سبز——اس جھنڈے کو ایک آدمی نے لیٹے لیٹے تھام رکھا تھا۔ اس آدمی کے جسم سے خون پھوٹ رہا تھا۔ طاہرہ نے اس آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"اوہ!"——اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی رگ رگ میں تناؤ پیدا ہو گیا جیسے ایک عظیم خطرے کے مقابلے کو تیار ہو گئی۔ گھبراہٹ نہ رہی۔ ہراس نہ رہا——کمال کی بہن کے رونے کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی——طاہرہ پرسوں دن کے تین بجے کے لیے تیار ہو گئی۔

پولیس کو مسلمانوں کے پروگرام کا علم ہو چکا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ نواحی دیہات کے بھی مسلمان جلال آباد میں جمع ہو کر اس پروگرام میں شامل ہو رہے ہیں۔ تھانیدار نے دیہات کے نمبرداروں کو تھانے میں بلا کر نمبرداریاں چھین لینے کی دھمکیاں دیں۔ پٹواریوں کو بلا کر ڈرایا دھمکایا اور انہیں مخالفانہ پروپیگنڈے کی ترکیبیں بتائیں۔ پھر شہر اور دیہات کے دس نمبریے غنڈوں کو جمع کر کے انہیں دیہات کے مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیلانے کے لیے بھیج دیا۔ تھانے والوں نے نمبرداروں، پٹواریوں، جاگیرداروں، یونینسٹ پارٹی کے عہدیداروں پنشن یافتہ صوبیداروں اور جمعداروں کو بلا کر لمبا چوڑا لکچر دیا اور انہیں بتایا کہ اگر مسلمانوں نے جلوس نکالا تو انگریز ان پر گھوڑے دوڑائے گا۔ لاہور سے ٹینک بھی آ رہے ہیں۔ دیہات کو آگ لگا دی جائے گی۔ لوگوں کو درختوں کے ساتھ پھانسی دی جائے گی۔ عورتوں کو بے عزت کیا جائے گا اور اس کام کے لیے گورا فوج آ رہی ہے۔ فصلوں پر ٹینک پھیر دیئے جائیں گے اور تمہاری زمینیں چھین لی جائیں گی۔

تھانیدار نے انگریز کے ان حواریوں اور حاشیہ برداروں کو (جن میں دس نمبریے بدمعاش خاص اہمیت رکھتے تھے) وعدہ دیا کہ اگر انہوں نے جلوس کو ناکام بنا دیا تو انہیں انعام ملے گا اور جو دس نمبریا زیادہ کام کرے گا اسے دس نمبر سے ہٹا دیا جائے گا۔

ان لوگوں سے فارغ ہو کر تھانیدار نے امرتسر ٹیلیفون کیا:

"کل صبح تک جلال آباد میں کم و بیش دو سو مسلح سپاہی پہنچ جانے چاہئیں..... جی..... جی ہاں..... مجسٹریٹ صاحب نے سارا کام میرے سر پر ڈال دیا ہے۔ حالات سخت خراب ہیں۔ پرسوں جلوس کے ساتھ عورتیں بھی ہوں گی..... صرف دو سو..... اس وقت میرے پاس صرف دو سو سپاہی ہیں..... نہیں حضور! یہ کیسے کافی ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کا پروگرام معمولی نہیں۔ یہ عام جلوس نہیں ہوگا۔ پرسوں وہ گاڑی بھی روکیں گے..... پنجاب میل..... آپ کو معلوم ہے کہ اسی گاڑی پر پرسوں آئی جی صاحب گزر رہے ہیں..... سنیے! ہیلو! امرتسر! ہاں! سنیے..... اگر سکھ رجمنٹ کی ایک کمپنی آ جائے تو حالات پر بہت جلد قابو پایا جا سکتا ہے..... جی ہاں! جی..... جی حضور..... میں نے پٹواریوں اور نمبرداروں کو بلا کر سختی سے خبردار کر دیا ہے لیکن مجھے ان مسلمان نمبرداروں اور پٹواریوں پر بھروسہ نہیں۔ وہ تھانے میں آ کر ہماری بات کرتے ہیں اور گاؤں میں جا کر پاکستان کے نعرے لگاتے ہیں..... نہیں جی! یہ مشکل ہے۔ اگر میرے سٹور میں وردیاں ہوتیں تو میں گاؤں سے سکھوں کو بلا کر سپاہی بنا دیتا۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلتا لیکن اتنی وردیاں نہیں

ہیں..... وہ تو معمولی ہے حضور! مسلمانوں کی نمبرداریاں صرف تین ہیں باقی سب سکھ نمبردار ہیں..... معلوم ہوتا ہے یہ سالے مسلمان پاکستان بنا کے ہی رہیں گے..... جی ہاں!..... بنائیں جی بنائیں، ہمیں تو اپنی تھانیداری کی فکر ہے..... نہ جی یہ بھی تو دیکھتے کہ سکھوں کے علاقے میں مسلمانوں کا زور، واہگورو کا بھی کچھ خیال کریں..... اچھا..... اچھا حضور..... بڑی کرپا حضور..... مجسٹریٹ صاحب کو میں بتا دوں گا..... کل دس بجے تک؟ یہ ٹھیک ہے..... ست سری اکال!"

دوسری صبح جلال آباد کی فضا میں غیر معمولی تناؤ اور سرگرمی تھی۔ ہر کوئی بھاگنے دوڑنے کے موڈ میں تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ گھر گھر میں کل کے جلوس اور مظاہرے کی اطلاع پہنچائی جا چکی تھی۔ لاہور نیشنل گارڈ کی ہائی کمانڈ سے احکام آ چکے تھے۔ لوگ سودا سلف خریدنے میں اس طرح مصروف تھے جیسے دوکانیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی نیشنل گارڈ کے رضاکار پیدل بھاگے بھاگے اور تانگوں پر ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر اڑے جا رہے تھے۔ پولیس کے سپاہی چار چار کی ٹولیوں میں شہر میں گشت کر رہے تھے۔ سورج آہستہ آہستہ اوپر اُٹھتا آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کی مصروفیت اور چال ڈھال میں تیزی اور سورج کی سی تمازت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ہندو اور سکھ دوکانوں میں بیٹھے، بھاگتے دوڑتے مسلمانوں کو قہر آلود اور خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہیں کہیں چند ہندو اور سکھ پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ سر جوڑے کھڑے نظر آتے تھے۔ دوپہر تک بازاروں کی بھیڑ میں اضافہ ہو گیا۔ شہریوں میں اب دیہاتی بھی نظر آنے لگے۔ ادھر پولیس کی نفری میں اضافہ ہو گیا۔ امرتسر سے پولیس کے دو سو مسلح سپاہی پہنچ چکے تھے۔

طاہرہ اور عفت سکول نہ گئیں۔ وہ گھر گھر گھوم رہی تھیں۔ کسی گھر سے انہیں مایوس کن جواب ملا اور وہ منہ بسورتے ہوئے نکل آئیں اور کسی گھر سے وہ ہنستی کھیلتی نکلیں۔ طاہرہ کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر وہ نام لکھتی اور مٹاتی چلی جا رہی تھی۔ ایک گھر میں وہ کسی کے باپ کے ساتھ بحث میں اُلجھی ہیں تو دوسرے گھر میں کسی کی ماں بہن یا ساس کی منتیں کر رہی ہیں۔

خاتون اور عفت کی ماں، اپنے گھر میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ خاتون گاہے رنجیدہ ہو جاتی اور دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ کھل اُٹھتا لیکن وہ ہر کیفیت اور ہر حال میں عفت کی ماں کو تسلیاں دے دے کر سمجھا رہی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے، ورنہ اور چند دنوں تک یہاں سکھوں کی بادشاہی ہو جائے گی۔ وہ ہماری لڑکیوں کو اٹھا لے جائیں گے پھر ہماری مسجدیں اصطبل بن جائیں گی اور خدا کا نام لینا جرم قرار دے دیا جائے گا مسلمان ہندوستان میں اپنا حصہ مانگ رہے ہیں جہاں وہ خدا اور قرآن کی حکومت قائم کریں گے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کسی مسلمان کو مطالبہ پاکستان پر قائل کرنے کے لیے زیادہ پسینہ نہیں بہانا پڑتا تھا۔ ایک جوش تھا اور ایک جذبہ کہ امڈتے سیلاب کی طرح ہر کسی کے سینے میں موجزن ہو گیا تھا جس نے بات سنی، ہاں کر دی اور تھوڑی دیر بعد اس کی منڈیر پر سبز جھنڈا لہرانے لگا۔ ہر مسجد میں ہر نماز کے بعد پاکستان کے لیے دعائیں، ہر جمعہ کے خطبہ میں پاکستان کا ذکر، ہر محفل میں پاکستان کی باتیں اور حد یہ کہ قبرستانوں اور خانقاہوں پر چرس پینے والے ملنگوں نے بھی "تری" اور "یا علی ہُو" کے نعروں کے ساتھ "پاکستان زندہ باد" کا اضافہ کر لیا تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی بساط کے مطابق مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا۔ کوئی چاقو سے، کوئی لاٹھی سے، کوئی دونالی بندوق سے، بعض خالی ہاتھ اور خالی نعروں سے اور بعض قلم سے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو مطالبہ پاکستان

کے سیاسی پس منظر کو سمجھتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنہیں پاکستان کی صرف جغرافیائی پوزیشن سمجھ آسکی تھی جو سیاسیات سمجھنے سے قاصر تھے وہ چند موٹی موٹی باتیں ہی سمجھ گئے تھے اور جو کچھ بھی نہ سمجھ سکے وہ صُوبہ بہار کے حادثہ کو نہایت اچھی طرح سمجھتے تھے مسلمانوں کا یہ قتلِ عام ایسی دلیل تھی جس کے سامنے تمام سیاست اور منطق ہیچ تھی۔ وہ بہرحال، بہر صورت اور بہر قیمت پاکستان بنانے پر تُل گئے تھے۔

اور امرتسر سے بیس میل دُور جلال آباد کی فضا کا یہ ارتعاش صرف ایک شہر کا نہیں تھا۔ یہ پُورے ہندوستان کا ارتعاش تھا۔ چھوٹا سا یہ شہر ہندوستان بھر کی تصویر پیش کر رہا تھا۔

اسی روز پچھلے پہر جلال آباد کی سڑکوں اور گلیوں میں پولیس کے ساتھ سکھ رجمنٹ کے سپاہی بھی نظر آنے لگے۔ نمبر گیارہ سکھ رجمنٹ کی ایک کمپنی پہنچ گئی۔ فوج کو دیکھ کر مسلمانوں کے پاؤں اور دماغ کی حرکت اور تیز ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ڈھنڈورچی گلے میں ڈھول لٹکائے گلی گلی ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا:

"ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگلے حکم تک کسی گلی یا بازار میں سوائے مسجد، مندر، گوردوارے اور گرجے کے پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اکٹھا ہونا جرم ہے، مرد، عورت یا بچہ۔ لاٹھی چاقو یا کوئی ہتھیار لے کر شہر کی حدود میں نہ چلے پھرے ورنہ گرفتار کیا جاوے گا۔ رات کے دس بجے سے صبح پانچ بجے تک کوئی آدمی باہر نہ نکلے ورنہ حوالۂ پولیس ہووے گا۔ یہ مجسٹریٹ صاحب کا حکم ہے حکم عدولی کرنے والا سخت سزا پاوے گا۔"

ڈھنڈورچی جب مسلمانوں کی ایک گلی میں داخل ہُوا تو اسے چند عورتوں نے گھیر لیا اور پوچھا کیا بات ہے؟ ڈھنڈورچی نے مونچھوں کو تاؤ دے کر ادھر اُدھر دیکھا اور کہا "کل دن کے تین بجے مسلمانوں کا جلوس نکلے گا جس میں ہر مرد، عورت اور بچہ شامل ہو کر ثواب دارین حاصل کرے۔ کوئی مسلمان مرد جلوس میں شامل نہیں ہووے گا، دوزخ میں جاوے گا۔ کل تین بجے سبزی منڈی کے چوک میں۔"

ڈھنڈورچی جلدی جلدی قدم اُٹھاتا آگے نکل گیا۔ عورتیں سر جوڑ کر کھسر پھسر کرنے لگیں اور دوسری گلی سے آواز آ رہی تھی..... "پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اکٹھا ہونا جرم ہے۔ کوئی آدمی، مرد یا عورت یا بچہ۔ لاٹھی، چاقو.....!"

تمام رات شہر پر پُراسرار خاموشی طاری رہی۔ رات کے اس سکوت میں صرف فوجیوں اور پولیس کے سپاہیوں کے بڑے بڑے بوٹوں کی دھمک، دھمک سنائی دیتی تھی یا کسی کتے کے بھونکنے کی آواز۔ ورنہ سکوت تھا۔ ایک خاموشی اور اس خاموشی میں لپٹے ہوئے سینکڑوں مکان بے جان بھوتوں کی طرح کھڑے تھے لیکن مکانوں کے اندر ہل چل تھی، حرکت اور ولولہ تھا۔ باہر کی فضا سوئی سوئی اور اندر کی دنیا جاگ رہی تھی۔ صرف ٹمٹماتے ستاروں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے محلوں میں چھتوں کے اوپر کچھ سائے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ یہ سائے تمام رات متحرک رہے۔

دوسری صبح سورج ہر روز کی طرح طلوع ہوا۔ اُوپر اُٹھا سائے چھوٹے ہونے لگے۔ دن کے بارہ بجے۔ ایک
اور جب دو بجے تو سبزی منڈی کی دوکانوں پر گاہکوں کی بھیڑ نظر آنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس بھیڑ میں نوجوان لڑکیاں
آنے لگیں۔ لوگوں نے ان لڑکیوں کو کنکھیوں دیکھا اور مُسکرا دیتے۔ اڑھائی بج گئے ـــ انسانوں کے انبوہ میں جھنڈے
دکھائی دینے لگے۔

پولیس اور فوج کی بھاری تعداد سبزی منڈی میں گشت کرنے لگی۔ دوکانیں ایک ایک کر کے بند ہو گئیں۔ منڈی
ملحقہ گلیوں، راستوں اور سڑکوں سے جیسے سیلاب اُمڈ آیا ہو۔ منڈی کے اُس سرے سے اِس سرے تک انسان ہی ا
اور سبز جھنڈے دکھائی دے رہے تھے۔ نیشنل گارڈ کے باوردی رضا کار اس ہجوم میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے
میں دیہاتی بھی نظر آنے لگے۔ وہ گلیوں سے اُمڈے ہی چلے آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھیں
سرکاری اعلان کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔ وہ تو اس سرکار کے ہی منکر تھے اور وہ اس سرکار کے قانون کو تہس نہس کرنے
آئے تھے۔ ان کی سرکار اب صرف ایک انسان تھا ـــ قائدِ اعظم!

بعض آدمی پیٹھوں پر پانی کے بھرے حمام باندھے اور ہاتھوں میں گلاس اُٹھائے پسینے میں شرابور لوگوں کو
پلا رہے تھے۔ سبزی منڈی سے پیچھے والا بازار بھی اب انسانوں سے اَٹ گیا تھا اور ابھی تک اس انبوہِ عظیم میں اض
ہوتا جا رہا تھا۔ دوکانوں کی چھتوں، مکانوں کی منڈیروں، بالکنیوں اور بالائی منزلوں کی کھڑکیوں سے عورتیں اور
چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے۔

ہزارہا انسانوں کا یہ ہجوم جم کر رہ گیا۔ فوج اور پولیس جلوس میں سے نکل کر سبزی منڈی کے دونوں سروں پر جم
گئی۔ جلوس کا رخ اور نیشنل گارڈ کے ہراول دستے سبزی منڈی کے اس طرف تھے جو بڑی سڑک سے ملتا تھا۔ ہزا
میں کچھ ہل چل سی پیدا ہوئی۔ پیچھے والوں نے سمجھا شاید پولیس مداخلت کر رہی ہے۔ ایک نے بانگِ بلند نعرہ جو ما
ہزارہا سینوں سے نکلے ہوئے "اللہ اکبر" کے دو مقدس لفظوں نے جلال آباد کو بنیادوں تک ہلا دیا۔ پیچھے والے لوگ
آگے بڑھنے کو بیتاب تھے، آگے والوں کو دھکیلنے لگے۔ جھنڈے اور بلند ہو گئے۔ نیشنل گارڈ کے رضا کاروں نے
(جو نظم وضبط اور ہدایات پر مامور تھے) بڑی مشکل سے جلوس کے عقبی حصے کو قابو میں کیا اور انہیں بتایا کہ لڑکیوں کو آگے

لے جایا جا رہا ہے اور جلوس آگے بڑھنے ہی والا ہے۔

جلوس کے آگے پچاس کے قریب نوجوان لڑکیاں لائی گئیں۔ سب کے دوپٹے سبز تھے اور سب نے
کمر کے ساتھ ایک ایک بھیگا ہوا دوپٹہ لپیٹ رکھا تھا۔ لڑکیوں کو چھ چھ کی قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا اور ارد گرد کوئی تیس
نیشنل گارڈ کے رضا کاروں نے مضبوط موٹا رسّہ تان لیا۔ اس کے پیچھے ساٹھ ستر باوردی رضا کار تھے اور لڑکیوں کے
آگے چار رضا کار گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ چار سوار شہر کے چُنے ہوئے لڑاکے، پھرتیلے اور جانباز تھے۔ ان میں دو باکسر،
ایک پہلوان اور ایک فٹ بال کا کھلاڑی تھا۔ کچھ تو ان کے جسموں کی ساخت ہی تاریخ کے جنگجوؤں سے ملتی جلتی تھی
لیکن جاذب نگاہ وہ نُور تھا جو ان کے چہروں اور آنکھوں سے شعلے برسا رہا تھا۔ ان میں ایک سالار تھا۔ ان کے ہاتھوں
میں جھنڈے تھے جو دراصل نیزے تھے اور ان کی نوکیں جھنڈوں میں چھُپی ہوئی تھیں۔

طاہرہ اور عفت کالج کی لڑکیوں کے ساتھ تیسری قطار میں تھیں۔ ماحول نے دونوں کی جھجک ختم کر دی تھی۔ طاہرہ
نے کان میں سرگوشی سی محسوس کی۔ اس نے دیکھا۔ ارشد کے ہونٹ اس کے کانوں کو تقریباً چھو رہے تھے۔ طاہرہ نے چہرہ
اُدھر کیا تو دونوں کی سانسیں ٹکرا گئیں۔ عفت نے اس طرف دیکھا تو ارشد نے ہاتھ لمبا کر کے اس کے کندھے پر رکھا اور کہا
"خدا حافظ" طاہرہ نے جیسے خواب میں کہا ـــ "فی امان اللہ"

پولیس اور فوج جلوس کا رستہ روکے کھڑی تھی۔ پولیس کے چار انسپکٹر اور سکھ رجمنٹ کا گورا لیفٹیننٹ بھاگ دوڑ رہا تھا۔
مجسٹریٹ بھی پہنچ گیا۔ چاروں انسپکٹر اور گورا لیفٹیننٹ اس کے گرد جمع ہو گئے صورتِ حال کے پیشِ نظر انہوں نے فیصلہ
کیا کہ جلوس کو روکا نہ جائے اور حالات کے مطابق کاروائی کی جائے۔ مجسٹریٹ نے اشارہ کیا تو پولیس کی ایک موٹر جس کی
چھت کے اُوپر دو لاؤڈ سپیکر نصب تھے سامنے آئی۔ مجسٹریٹ نے موٹر میں بیٹھ کر مائیکروفون پر اعلان کیا۔

"جلوس کو آگے بڑھنے کی اجازت ہے مگر سب کو خبردار کیا جاتا ہے کہ کوئی مظاہرہ
شہری امن کو خطرے میں ڈالنے کے لیے کیا گیا تو بغیر نوٹس پہلے لاٹھی چارج ہوگا۔ پھر گولی چلائی
جائے گی۔ عورتوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ان کی عزت اور جان کی حفاظت ہمارے ذمے
نہیں ہوگی۔۔۔"

"ہماری عزت کا محافظ خدا ہے" ـــ ایک لڑکی نے چلا کر کہا ـــ ساتھ نیشنل گارڈ کے ایک رضا کار نے جوش
میں آ کر نعرہ لگا دیا جس کے جواب میں ایک گونج نے جیسے آسمان کو بھی ہلا دیا ہو۔ مجسٹریٹ کا اعلان فلک شگاف نعروں
میں کھو گیا۔ چاروں سواروں نے جھنڈے بلند کیے اور سالار کے اشارے سے جلوس آگے بڑھ کر دائیں طرف مڑ گیا۔

کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ نعرے تیز تر اور بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ آگے چار جانباز گھوڑوں پر سوار، گھوڑوں
کی تیز چال، پیچھے لڑکیوں کا ترتیب وار دستہ، اس کے گرد نیشنل گارڈ کے رضا کار رسّہ تانے ہوئے اور اس کے پیچھے
حدِ نگاہ تک انسانی سروں اور جھنڈوں کا سیل۔ لڑکیوں کے نعرے، مردوں کا جوش اور اس منظر پر سینکڑوں ہزاروں جھنڈوں
کا سبز سایہ۔

"کانگرس ——— مُردہ باد"

"پاکستان ——— زندہ باد"

"انگریز راج ——— مُردہ باد"

"قائداعظم ——— زندہ باد"

"لے کے رہیں گے ——— پاکستان"

فرش سے عرش تک کی وسعت دہل رہی تھی، یزداں بھی مُسکرا رہا تھا۔

مجسٹریٹ پولیس کی موٹر میں بیٹھا آگے آگے جا رہا تھا نصف پولیس اور فوج جلوس سے آگے اور نصف جلوس کے پیچھے تھی۔ پولیس لاٹھیوں سے مسلح تھی اور فوج کے پاس رائفلیں اور سٹین گنیں تھیں۔ جب جلوس اسلامیہ کالج سے آگے بڑھ کر اس دوراہے پر پہنچا جہاں سے ایک سڑک تھانے کی طرف اور دوسری ریلوے سٹیشن کی طرف جاتی تو مجسٹریٹ نے موٹر روک لی۔ چاروں گھوڑے بائیں طرف گھومے تو مجسٹریٹ اور پولیس افسروں کے چہروں کے تاثر بدلنے لگے۔ جلوس کا رُخ تھانے کی طرف تھا۔ تھانے کے بالمقابل کچہری تھی۔ ان دونوں جگہوں کی حفاظت لازمی تھی۔ پولیس جلوس کی راہ میں حائل ہو گئی۔ جلوس رُک گیا۔ مجسٹریٹ کی موٹر سے اعلان ہُوا کہ جلوس اس طرف نہیں جائے گا۔ سالار نے آگے ہو کر مجسٹریٹ کو کہا ——— "ہمارا مظاہرہ بے ضرر ہو گا۔ اگر جلوس کو روکا گیا تو شاید مظاہرے کی صُورت بدل جائے۔"

"میں خبردار کرتا ہوں کہ جلوس یہاں سے آگے اس سڑک پر نہ جائے" ——— لاؤڈ سپیکر بولا۔

"جلوس اسی سڑک پر جائے گا اور مظاہرہ پُرامن ہو گا" ——— سالار نے بارعب جواب دیا۔

"میں جلوس کو دس منٹ کی مہلت دیتا ہُوں ...." لاؤڈ سپیکر پھر چیخا۔ "اگر جلوس منتشر نہ ہُوا تو لاٹھی چارج ہو گا۔"

پولیس لاٹھیاں سنبھال کر جلوس کے سامنے آ گئی۔

سالار نے ایک رضاکار کو پاس بلا کر کان میں کچھ کہا اور رضاکار بھاگتا ہُوا لڑکیوں کے درمیان آ کر بولا ——— "کوئی بہن تقریر کر سکتی ہے؟ ہو سکتا ہے یہیں مقابلہ ہو جائے۔ ڈر ہے لوگ بھاگ اُٹھیں گے۔ یہاں کسی لڑکی کا بولنا بے حد ضروری ہے۔"

"یہ پہلے سوچ لینا چاہیئے تھا" ——— ایک لڑکی نے کہا ——— "کسی کو تقریر لکھ کے دے دی ہوتی۔"

"میرے پاس لکھے ہُوئے چند ایک فقرے ہیں" ——— طاہرہ نے ایک کاغذ دکھاتے ہوئے کہا ——— "لیکن میں زبانی بولوں گی۔"

چند رضاکاروں نے کسی سے ایک سٹول لے لیا۔ طاہرہ کو اُٹھا کر اس پر کھڑا کر دیا گیا۔ چار رضاکار بھی پاس ہی کھڑے ہو گئے۔ دو لمحے تو طاہرہ کو یوں لگا جیسے اس کا حلق خشک ہو گیا ہو اور کوئی چیز اس میں اٹک گئی ہے۔ اس نے تھوک نگلا لیکن حلق خشک ہی رہا۔

"بولو طاہرہ!" ایک جانی پہچانی آواز اس کے کانوں میں پڑی اور ساتھ ایک نعرہ بلند ہُوا ——— "نعرۂ تکبیر" ——— "اللہ اکبر"

"میرے بزرگو اور میرے بھائیو!" ——— جانے وہ کون سی قوت تھی جس کے اثر سے طاہرہ کی آواز میں مرد کا رعب پیدا ہو گیا تھا۔ پھیپھڑوں کا زور لگا کر بولی۔ "امتحان کا وقت آ پہنچا ہے ....." وہ کاغذ کو مٹھی میں دباتے زبانی بول رہی تھی۔ جلوس پر سناٹا چھا گیا۔ ہزارہا انسانوں نے جیسے سانسیں ہی روک لی تھیں۔ سڑک کے کنارے ایک دو منزلہ مکان کی کھڑکی میں سے پھولوں کا ایک ہار سنسناتا ہُوا آیا اور طاہرہ کے کندھوں پر آ گرا۔ ایک رضاکار نے لپک کر ہار طاہرہ کے گلے میں ڈال دیا۔ لوگوں نے اُوپر دیکھا۔ کھڑکی بند ہو چکی تھی۔

"..... خُدا کی راہ میں پہلی رکاوٹ ایک مجسٹریٹ اور چند بندوقوں کی صُورت میں ہمارے سامنے آ کھڑی ہُوئی ہے۔ ہمارا رُخ مغرب کی طرف ہے اور ہمیں مشرق کی طرف جانے کو کہا جا رہا ہے۔ کیا یہ ہزاروں مقدّس جھنڈے چند ایک بندوقوں کے خوف سے اپنا رُخ موڑ لیں گے؟ ....."

"نہیں موڑیں گے"۔ ہجوم میں سے دو تین آوازیں بلند ہُوئیں۔

"یہ جھنڈے مغرب کی طرف جائیں گے" ..... کئی اور آوازیں۔

"میرے بھائیو اور بزرگو!" ——— طاہرہ کی آواز بلند ہو گئی۔ "..... پہلی گولی اس بیٹی کے سینے میں لگے گی ....." اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ہجوم میں ایک گرجدار سرسراہٹ پیدا ہُوئی اور ایک سے چینی۔ جلوس میں سے ایک آدمی دو آدمیوں کے کندھوں پر کھڑا ہو گیا اور زور سے بولا ——— "ہماری بچی کہ رہی ہے۔ پہلی گولی اس کے سینے میں لگے گی۔"

جلوس کے پچھلے حصے میں ایک اور آدمی گرجا ——— "ہماری بچی کہ رہی ہے پہلی گولی اس کے سینے میں لگے گی۔"

"گولیاں ہم کھائیں گے۔ گولیاں ہم کھائیں گے" ——— ایک شور ——— "جھنڈے اوپر کرو۔"

"مردو! بچیوں کو پیچھے کر لو۔"

"آگے بڑھو۔"

"جلوس کیوں رک گیا ہے؟"

"بچّی کو سنبھال لو۔"

"بہن کو نیچے اتار لو۔"

"جلوس مغرب کی طرف آگے بڑھے گا" ——— سالار کی دبنگ آواز گرجی۔ نیشنل گارڈ کے کئی رضاکار دکانوں کے تختوں پر بھاگتے نظر آئے۔ وہ اعلان کر رہے تھے "صبر کرو مسلمانو! جلوس آگے بڑھے گا حکم مِل گیا ہے۔ شاباش مجاہدو! بے صبر نہ ہونا۔"

"لڑکیوں کا خیال رکھنا" ——— کئی آوازوں نے کہا۔

"وہ ہماری حفاظت میں ہیں" ——— نیشنل گارڈ نے جواب دیا۔

طاہرہ جب میز سے اُتری تو دو کانپتے ہُوئے نسوانی بازوؤں نے اسے دبوچ لیا اور اس کے پسینے سے شرابور چہرے پر بوسوں کی بارش ہونے لگی۔ اس نے دیکھا اس کی امّی خاتون زار و قطار روتی اس کی بلائیں لے رہی تھی ——"میری بچی۔ میری طاہرہ بیٹی۔ تو میرا بیٹا ہے۔ تو نے آج میری ساری حسرتیں پوری کر دی ہیں۔ تیرا باپ مر... یہ دیکھ تیرے باپ۔ یہ دیکھ اپنے بھائی۔ تو ان کی بیٹی ہے۔ تو ان کی بہن ہے۔ دیکھ یہ تیری عزت کی خاطر کس طرح... دے رہے ہیں۔ میری بچی"—— اس کے ہاتھ میں تھرموس بوتل تھی۔ کارک کھول کر بوتل کی پیالی سے اسے شربت...

طاہرہ کا خیال تھا کہ امی گھر میں بیٹھی پریشان ہو رہی ہوگی لیکن اسے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ جلوس کے ساتھ سا... شربت کی بوتل اٹھائے جا رہی تھی۔ خاتون نے پھر عفت کو گلے سے لگایا اور اسے شربت پلایا۔ نیشنل گارڈ کے رضا کار نے اسے کندھوں سے تھام کر ایک طرف کر لیا اور کہا۔ "اماں جی! آپ میرے ساتھ رہیں"۔

خاتون پیچھے ہٹ آئی اور دور سے طاہرہ کو دیکھنے لگی۔

طاہرہ نے جلوس میں تلاطم کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ آگے سے جلوس رکا ہُوا تھا اور پیچھے کا یہ حال جیسے سیلاب آگے مضبوط دیوار آ گئی ہو اور پیچھے سے لہریں اُٹھ اُٹھ کر سیلاب کو دیوار توڑنے پر مجبور کر رہی ہوں۔ پولیس والے لاٹھیاں اور فوجی رائفلیں تان کر سامنے کھڑے تھے۔ مجسٹریٹ پولیس انسپکٹروں کو ہدایات دے رہا تھا۔ فوجی دستے کا کمان... ایک انگریز لیفٹیننٹ تھا۔ جسے مجسٹریٹ نے محض لیفٹیننٹ یا اپنا ماتحت سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہاں مجسٹریٹ کی حکو... تھی اور یہ انگریز اس کے حکم کا پابند تھا۔ جلوس کے نعروں اور پہاڑوں کا دل چیرنے والی للکار سے کانوں پڑی آواز سنائی دیتی تھی۔ مجسٹریٹ اور انگریز لیفٹیننٹ میں کچھ ترش کلامی شروع ہو گئی۔ دس منٹ کبھی کے گزر چکے تھے۔ دونوں افس... میں اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔

مجسٹریٹ نے کسی قدر غصّے میں آ کر لاؤڈ سپیکر والی موٹر جلوس کے قریب کر لی۔ ابھی وہ اعلان کرنے ہی والا... انگریز لیفٹیننٹ نے اسے غصّے میں کہا ——"میں اعلان کرتا ہُوں۔ آپ ذرا خاموش رہیں"—— پیشتر اس کے کہ... اسے روکتا اور کہتا کہ "یہاں میرا حکم چلے گا، تم میرے ماتحت ہو"—— لیفٹیننٹ مائیکروفون ہاتھ میں لے کر ایک کر... کی چھت پر کھڑا ہو گیا اور فرنگی اردو میں بولا ——"ہم تم لوگ کو گولی مار دے گا۔ ہم تم لوگ کا یہ لڑکی اٹھا لے جاتے گا... کو"...."لیفٹیننٹ راجرس!" مجسٹریٹ چلاتا ہُوا موٹر میں سے نکل آیا اور موٹر کے پائیدان پر کھڑا ہو کر انگریزی میں کہنے لگ... کے لیے ایسے الفاظ مت کہو۔ ورنہ یہ لوگ تمہاری بوٹی بوٹی کر دیں گے"۔

مجسٹریٹ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ لیفٹیننٹ کی چھاتی پر کوئی چیز آ کر لگی۔ اسی قسم کی ایک اور چیز منہ پر لگی۔ اس نے منہ... سہلا کر نیچے دیکھا۔ موٹر کی چھت پر دو زنانہ جُوتیاں پڑی تھیں۔ ایک الٹی، ایک سیدھی۔ زنانہ دستے میں کتی اور لڑکیاں... ہُوئی سینڈل اتار رہی تھیں کہ سالار نے انہیں روک دیا۔

"میں ان لوگوں سے نپٹنا جانتا ہُوں"—— انگریز نے کہا۔

"تم غلطی کر رہے ہو"—— مجسٹریٹ نے اسے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "یہ مسلمان ہیں۔ یہ عورت کی بے عزتی برد...

نہیں کریں گے"۔

"ہمارے پاس رائفلیں اور سنگینیں ہیں"—— انگریز نے رعب سے کہا ——"سُنو مجسٹریٹ! جلوس کو مت روکو۔ انہیں کھلے میدان میں آنے دو۔ میں ان کو مار کے دم لوں گا"۔

"نہیں!"—— مجسٹریٹ نے کہا ——"میں جلوس کو آگے نہیں جانے دوں گا۔ سنتے نہیں ہو وہ انگریزوں کو گالیاں دے رہے ہیں؟ انگریزی حکومت کی بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں انہیں یہیں منتشر کر دوں گا"۔

"دیکھو مجسٹریٹ!" لیفٹیننٹ نے انگریز حاکم کی طرح کہا ——"جلوس کو آگے جانے دو۔ میں انہیں سنبھال لوں گا"۔

"میں اس علاقے کا مجسٹریٹ ہوں"—— مجسٹریٹ نے تحکمانہ لہجے میں کہا ——"یہ میری ذمہ داری ہے۔ یہاں میرا حکم چلے گا۔ جلوس آگے نہیں جاتے گا۔ میں گولی چلانے کے حق میں نہیں، لاٹھی چارج کروں گا"۔

"شٹ اپ یُو انڈین!"—— انگریز لیفٹیننٹ نے کہا ——"تم مجسٹریٹ چھوڑ ہندوستان کے کسی صُوبے کے گورنر ہی کیوں نہ ہو پھر بھی تم انگریز کے محکوم ہو۔ تم ہندوستانی مجسٹریٹ اور میں انگریز لیفٹیننٹ ہُوں"۔

"تم سنتے نہیں وہ کنگ جارج کو گالیاں دے رہے ہیں؟"—— مجسٹریٹ نے بوکھلا کر کہا ——"میں برداشت نہیں کر سکتا"۔ مجسٹریٹ کے حکم میں اب چاپلوسی اور ٹوڈی پن آ گیا۔

"میں جانتا ہوں یہ مسلمان ہیں اور ان میں جوش زیادہ ہے"—— لیفٹیننٹ نے کہا اور طنزیہ لہجے میں کہنے لگا "کنگ رچرڈ صلاح الدین کو شکست دینا جانتا ہے"۔ اور انگریز کی گردن تن گئی۔

پاس ہی ایک مسلمان پولیس انسپکٹر کھڑا تھا۔ اس نے مُسکرا کر انگریز کو آہستہ سے کہا ——"مجھے ڈر ہے کنگ رچرڈ اپنی طاقت کا غلط اندازہ لگا رہا ہے"۔ انسپکٹر کی آواز میں ایک طنز تھی جسے لیفٹیننٹ نہ سمجھ سکا اور آہستہ سے کہا —— "شٹ اپ یُو انسپکٹر"۔

اور لیفٹیننٹ نے مائیکروفون میں یہ اعلان کر کے کہ جلوس آگے جا سکتا ہے، مجسٹریٹ کی حکومت چھین کر فوجی حکومت کا اعلان کر دیا۔

سیلاب کے سامنے سے دیوار ٹوٹ گئی۔ لاؤڈ سپیکر والی موٹر آگے نکل گئی۔ پولیس اور فوج آگے چل پڑی اور اس کے پیچھے مجسٹریٹ اس طرح جا رہا تھا جیسے جنازے کے ساتھ جا رہا ہو، سر جھکاتے ہُوئے اور افسردہ۔ لیفٹیننٹ نے آگے جا کر اپنے جمعدار، صوبیدار اور پولیس انسپکٹروں کو اکٹھا کر کے ہدایات دیں اور تمام فوجی تیز قدم آگے چلے گئے۔ اِدھر جلوس کے قدم بھی تیز ہو گئے۔ لیفٹیننٹ کا ارادہ تھا کہ تھانے سے ذرا اس طرف جو کھُلا میدان ہے وہاں لاٹھی چارج کر کے جلوس کو پھیلا دیا جاتے گا اور پھر گولی چلائی جاتے گی۔ مسلمان اس سکیم سے آگاہ نہیں تھے۔ وہ گونج، گرج اور فلک شگاف نعروں کے ساتھ بڑھے جا رہے تھے۔ جلوس میں جوش تو پہلے ہی تھا لیکن جس وقت سے طاہرہ نے دو چار فقرے بول کر مسلمانوں کو للکارا تھا۔ اس جوش میں غیض و غضب اور آتشیں ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔

میدان صرف ایک سو گز دور رہ گیا اور لیفٹیننٹ نے فوجی دستہ روک کر پھیلا دیا۔ پھر پولیس کے انسپکٹر انچارج کو

اشارے سے اپنے قریب بلایا۔

بغیر وردی سی۔آئی۔ڈی کے سپاہی بھی جلوس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک نے موقعہ دیکھ کر نیشنل گارڈ ایک رضاکار کے کان میں کچھ کہا۔ رضاکار نے بھاگ کر سالار کو کچھ کہا۔ سالار کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ کانوں کان ایک پیغام کے آخر تک پہنچ گیا۔ جلوس کے راہنما سوار اور لڑکیوں کا دستہ کھلے میدان سے بیس پچیس گز کے فاصلہ تک پہنچ چکا تھا۔

اس مقام سے تھانے تک ایک راستہ میدان میں سے جاتا تھا اور دوسرا بائیں طرف کی کھلی گلی سے۔ اُدھر لیفٹیننٹ فوجی دستے اور پولیس کو ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ اِدھر جلوس بائیں طرف گھوم کر گلی میں داخل ہو گیا۔ آن کی آن میں جلوس میں سے چار پانچسو آدمیوں نے آگے بڑھ کر لڑکیوں کو لوزینگہ محفوظ کر لیا۔ اب جلوس چل نہیں رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا۔ لڑکیوں کو بھی ان کے ساتھ دوڑنا پڑا۔ لیفٹیننٹ نے جب دیکھا کہ جلوس اس کی توقع کے مطابق میدان میں نہیں آ رہا تو وہ بوکھلا گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے دستے کو گلی کے دوسرے سرے پر راستہ روکنے کے لیے بھیج دیا۔ چونکہ ہدایات پوری نہیں دی گئی تھیں، اس لیے پولیس بھی بھیڑوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگ اٹھی۔ پیشتر اس کے کہ فوجی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچتے جلوس گلی میں سے نکل کر تھانے سے دو سو گز کے فاصلے تک پہنچ چکا تھا۔

"وہ دیکھئے! اُدھر سے بھی لوگ آ رہے ہیں۔" ایک سکھ پولیس انسپکٹر نے ہڑبڑا کر کہا۔

لیفٹیننٹ نے دیکھا کہ آدھا جلوس میدان کی طرف سے آ رہا تھا۔ نیشنل گارڈ کی سکیم نے جلوس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مجسٹریٹ ایک طرف کھڑا فوجی حکومت پر مسکرا رہا تھا۔ وہ کوشش کرتا تو شاید اس صورت حال پر قابو پا لیتا لیکن وہ انگریز لیفٹیننٹ کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔ لیفٹیننٹ پاگلوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ پولیس الگ منتشر ہو گئی۔ فوجی دستہ ایک طرف کھڑا تھا۔ اِدھر گلی میں سے جلوس نکل کر کھلے علاقے میں بکھر گیا۔ اُدھر میدان کے رستے آنے والے مسلمانوں نے ایسی صورت اختیار کر لی جیسے تنگ رستے سے آتا ہوا سیلاب کھلے علاقے میں پھیل جاتا ہے اور جگہ جگہ جزیرے بن جاتے ہیں۔ پولیس اور فوج کی مرکزیت ختم ہو گئی۔

لیفٹیننٹ فوج کو چھوڑ کر پولیس کے دو انسپکٹروں کی طرف آ رہا تھا کہ وہ جلوس میں گھر گیا۔ تقریباً تین سو گز کے علاقے میں انسان ہی انسان تھے اور ان پر جھنڈوں کا سایہ۔ انگریز لیفٹیننٹ جھنڈوں کے سائے میں ہی کہیں گم ہو گیا۔

جلال آباد کا تھانہ ایک قلعہ نما پرانی عمارت تھی۔ چھت پر باقاعدہ مورچے بنے ہوئے تھے۔ دیواریں پتھروں کی اور دروازہ لوہے کا تھا۔ اس کے بالمقابل پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر کچہری کی عمارت تھی۔ دونوں کے درمیان میدان اور میدان میں سے پکی سڑک گزرتی تھی۔ دونوں عمارتوں کے اُوپر انگریز کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ تھانے کے سامنے بڑ کا صدیوں پرانا درخت اور درخت کے سائے میں عرضی نویسوں اور وکیلوں کے منشیوں کی میزیں اور تخت پوش رکھے تھے۔ بنچ اور ٹوٹی پھوٹی کرسیاں بھی تھیں۔

جلوس اس میدان میں پہنچ گیا۔ حدِ نگاہ تک جھنڈے ہی جھنڈے نظر آ رہے تھے۔ فوج اور پولیس کی جمعیت بکھر گئی تھی اور ان کا خود ساختہ کمانڈر لاپتہ تھا۔

"اگر کچھ گڑبڑ ہو گئی تو جوابدہ آپ ہوں گے۔ اس لیفٹیننٹ سے کوئی جواب طلبی نہیں کرے گا۔" ایک پولیس انسپکٹر نے مجسٹریٹ کو خبردار کیا۔

مجسٹریٹ کسی حد تک خوش بھی ہوا کہ لیفٹیننٹ لاپتہ ہے اور سول حکومت بحال ہو گئی ہے۔ اس نے فوراً انسپکٹروں اور فوجی سرداروں کو حکم دیا "تھانے اور کچہری کو گھیر لو۔ دروازے اندر سے بند کر لو۔ فوجی بندوقوں میں پانچ پانچ کارتوس بھر لیں۔ پولیس لاٹھی چارج کے لیے تیار ہو جائے۔"

مجسٹریٹ لاؤڈ سپیکر والی موٹر میں بیٹھ کر کچہری اور تھانے کے درمیان آ گیا۔ پولیس اور فوج تھوڑی سی جدوجہد کے بعد تھانے اور کچہری کے سامنے پہنچ گئی۔ فوجیوں نے بندوقوں میں گولیاں بھر لیں۔ گولیاں چھروں والی تھیں۔

"میں جلوس کو خبردار کرتا ہوں کہ بدامنی کا مظاہرہ کیا گیا تو لاٹھی چارج کیا جائے گا۔ پھر بغیر نوٹس گولی چلا دی جائے گی۔"

چاروں گھوڑسوار سنی ان سنی کر کے تھانے کی طرف بڑھنے لگے۔ لڑکیوں کو پیچھے کر لیا گیا تھا۔ بے شمار دیہاتی چہروں کو چادروں میں لپیٹے، لاٹھیاں تانے لڑکیوں کے اردگرد کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں سے یوں لگتا تھا جیسے لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے والے کو کچا چبا ڈالیں گے۔ گھوڑسواروں کے پیچھے ہزاروں چہرے غیض و غضب اور خاموشی سے چلے ہی آ رہے تھے۔

"میں آخری بار اعلان کرتا ہوں کہ جلوس دو منٹ کے اندر نہ رکا تو لاٹھی چارج ہو گا۔"

جلوس موٹر سے دس قدم دور رہ گیا۔

"ایک۔"

سپاہیوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں۔ جلوس موٹر کو چھو رہا تھا۔

"دو۔"

سپاہی آگے بڑھے۔

"تین.... لاٹھی چارج۔"

جلوس تھانے کی طرف ٹوٹ پڑا اور لاٹھی چارج شروع ہو گیا۔ چاروں گھوڑسوار چیخ چیخ کر جلوس کو ہدایات دے رہے تھے۔ جن دیہاتیوں کے پاس لاٹھیاں تھیں وہ آگے بڑھنے لگے لیکن سامنے کے خالی ہاتھ لوگ پولیس کی لاٹھیوں کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے تھے۔ یہ پسپائی ایسی افراتفری سے ہو رہی تھی کہ آگے بڑھنے والوں کے لیے رکاوٹ بن گئی اور پندرہ منٹ بعد مسلمان تھانے سے دو تین سو گز دور ہٹ آئے۔ تیس چالیس آدمی زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ ہجوم دور دور تک پھیل گیا۔ مجسٹریٹ اور پولیس انسپکٹر تیزی سے ہر طرف بھاگ دوڑ رہے تھے۔

نیشنل گارڈ کا سالار گھوڑے پر سوار پسپا ہوتے ہجوم کو جوش دلا دلا کر روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہجوم ایک بار پھر آگے بڑھا۔ مجسٹریٹ نے فوج کو حکم دیا کہ رائفلیں لے کر سامنے آ جائیں۔ جب سکھ فوجیوں کا دستہ رائفلیں سیدھی کر کے سامنے آیا تو ہجوم رک گیا۔

لڑکیوں کی پارٹی میں سے ایک لڑکی بھاگ کر سالار کے پاس گئی۔ اس کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر اس کے بازو کا سہارا لے کر اس کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس نے سالار سے کہا ۔۔۔ "گھوڑا آگے لے چلو۔۔۔ تھانے کی طرف"۔۔۔ گھوڑا اچھل پڑا "بس روک لو" گھوڑا ہجوم اور فوج کے درمیان آ رکا۔ لڑکی سالار کے سر پر ہاتھ رکھ کر گھوڑے پر کھڑی ہو گئی۔ سالار نے ایک بازو پیچھے کر کے لڑکی کی ٹانگوں کے گرد لپیٹ دیا اور اسے اپنی پیٹھ کے ساتھ لگا لیا ۔۔۔ یہ طاہرہ تھی۔

"خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا مجاہدو!۔۔۔" طاہرہ جسم کی تمام تر قوت کے زور سے چیخی "تم پسپا ہو گئے ہو۔ تم بھاگ گئے ہو۔ کافروں کی دس لاٹھیوں کے سامنے تیس ہزار مسلمان بھاگ گئے ہیں۔ یہ دیکھو [illegible] نشان [illegible] قومی [illegible] کافروں کے قدموں میں پڑی ہے [illegible] میرے بھائیو اور بزرگو۔۔۔" طاہرہ نے اپنا سبز دوپٹہ سر سے اتار کر ہوا میں لہرایا اور پہلے سے زیادہ جوش سے کہا "آؤ اور اپنی بیٹی کو گولی کھاتے دیکھو۔ تمہیں میرے ننگے سر کی قسم۔۔۔"

"گرفتار کر لو ۔۔۔" مجسٹریٹ کا لاؤڈ سپیکر گرجا۔

دو سپاہی گھوڑے کی طرف بھاگے۔ سالار نے جھنڈا آگے کر لیا ۔۔۔ اس جھنڈے میں نیزہ چھپا ہوا تھا۔ پیچھے سے ایک گھوڑ سوار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا دونوں سپاہیوں کی طرف سرپٹ بھاگا۔ پیشتر اس کے کہ مجسٹریٹ یا دونوں سپاہی سمجھ سکتے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے، ایک سپاہی جھنڈے میں چھپے ہوئے نیزے کی نوک سے اور دوسرا گھوڑے کی زد میں آ کر گرا ہوا تھا۔ گھوڑ سوار اسی رفتار سے باقی فوجیوں میں سے گزرتا تھانے کی اوٹ میں چلا گیا۔ سالار کا گھوڑا وہیں رکا رہا اور طاہرہ اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ دو سپاہی اور آگے بڑھے۔ ادھر سے ایک اور گھوڑ سوار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ یہ گھوڑا دونوں سپاہیوں کو گرا ہی رہا تھا کہ ایک گولی چلی۔ ہجوم نے دیکھا کہ گھوڑا سرپٹ بھاگا جا رہا تھا لیکن سوار گھوڑے کی پیٹھ پر اوندھے منہ ہو گیا تھا۔ جھنڈا زمین پر گر پڑا تھا۔ ہجوم ٹوٹ پڑا۔

"فائر ۔۔۔" لاؤڈ سپیکر چلایا۔

سالار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور رائفلوں کی زد میں سے نکل آیا۔

گولیوں کی پہلی بوچھاڑ سے نعرے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے لیکن سمندر امڈ آیا تھا۔ ایک راؤنڈ اور فائر ہوا۔ ہجوم سے پہلا پستول فائر ہوا اور دیہاتیوں نے لاٹھیوں سے جوابی حملہ شروع کر دیا۔ رائفلوں کے مقابلے میں لاٹھیاں چل رہی تھیں اور اکا دکا پستول فائر ہو رہا تھا۔ زخمی مسلمانوں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا اور مسلمان، فوجی دستے اور پولیس کو دباتے چلے آ رہے تھے۔ پانچ پانچ راؤنڈ فائر ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں نے فوجیوں کو از سر نو رائفلیں بھرنے کی فرصت نہ دی۔ پیچھے تھانے کی دیوار تھی، سامنے سے مہیب لہروں کی طرح مسلمان بڑھے چلے آ رہے تھے۔ سپاہی پس کے رہ گئے۔ اگر دس مسلمان گرے تو دس لاٹھیاں اور ایک آدھ رائفل ضرور چھین لی گئی۔

مجسٹریٹ تھوڑی دیر بعد مائیکرو فون پر واویلا کر رہا تھا "فائر، فائر"۔

تھانے کے آہنی دروازے کو توڑنا ایک مسئلہ تھا۔ لاٹھیوں سے تو وہ ٹوٹنے سے رہا لیکن جو جذبہ باہر کے ہجوم کو

آتشیں لاوا بنائے ہوئے تھا اس کی تپش تھانے کے اندر پہلے سے موجود تھی۔ چند ایک مسلمان اہل کار جو جلوس میں شریک نہ ہو سکے تھے، اندر سے سرکار کا کام کر رہے تھے وہ وہاں بیٹھے بیٹھے قوم کی یہی خدمت کر سکتے تھے کہ اندر سے دروازہ کھول دیں۔

چند منٹ بعد لوہے کے دروازے کی اندر والی زنجیریں نکال دی گئیں۔ دوسرے ہی لمحے مسلمانوں کا ہجوم تھانے کے صحن میں تھا۔ اتنے میں جلوس کے ایک حصے نے کچہری کی عمارت پر انگریزی جھنڈا پھاڑ کر پاکستان کا جھنڈا چڑھا دیا اور کچہری کی کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹنے شروع ہو گئے جنہیں کچہری کے کاغذات سے دلچسپی تھی انہوں نے کاغذوں سے پورا پورا انصاف کیا اور جانے کتنے ہی مقدموں کا فیصلہ دیا سلائی نے کر دیا۔

تھانے میں داخل [illegible] کچہری [illegible] چڑھ گئے۔ [illegible] انگریزی کے جھنڈے کے ٹکڑے ہواؤں میں اڑ رہے تھے اور اس کی جگہ طاہرہ سبز جھنڈا چڑھا رہی تھی۔ اس کے بعد ڈاک خانے کی پیشانی کو بھی سبز پھریرے سے سجایا گیا۔ پھر پنجاب میل جو ابھی سٹیشن پر رکی ہی تھی۔ ہجوم نے جا کر روک لی اور دو گھنٹے روکے رکھی۔ انجن کے ماتھے پر پاکستان کا جھنڈا نصب کر کے دو اڑھائی سو مسلمان گاڑی میں بیٹھ گئے جنہوں نے امرتسر تک گاڑی کو جگہ جگہ زنجیر کھینچ کر روکا اور گاڑی نے پچیس میل کا فاصلہ چار گھنٹوں میں طے کیا۔

سارے ہندوستان میں یہی کچھ ہو رہا تھا۔

انگریز کی مشینری رکنے لگی تھی۔ شاہی محلات میں بھی زلزلوں کے جھٹکے محسوس ہونے لگے تھے۔ انگریز کے پاؤں اکھڑنے لگے تھے۔ انگریز نے ہندو کا سہارا لینا چاہا تھا لیکن بات بن نہ سکی۔ ہندو اور انگریز جو سودا بازی کر رہے تھے اسے مسلمانوں نے طے نہ ہونے دیا۔ ایک لمبے تڑنگے، دبلے پتلے انسان نے کروڑوں مسلمانوں کے نیم مردہ جسموں میں وہ روح پھونک دی تھی کہ انگریز کا قانون ہندوستان کی گلی گلی میں مسلمانوں نے کچل ڈالا تھا۔ سرحدی پٹھانوں نے بندوقوں سے مظاہرہ کیا تو بنگالی مسلمانوں نے بانس کی لاٹھیوں سے کام لے لیا۔ سندھیوں اور بلوچیوں نے خالی ہاتھ سرکار کے نظام کو ہلا دیا تو پنجابیوں نے لاٹھیوں اور پستولوں سے مسلح جلوس نکالے۔ جیلوں میں جگہ تھی نہ راشن۔ اب وہ وقت بھی آ گیا کہ پولیس نے گرفتاریوں سے منہ موڑ لیا اور انگریز اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا۔

جلال آباد میں ایک انگریز لیفٹیننٹ گم ہو گیا۔ یہ لیفٹیننٹ راجرس تھا، سکھ دستے کا کمانڈر۔

اسی رات جب خاتون اور عفت کی ماں، طاہرہ اور عفت کے جسم سہلا رہی تھیں اور رہ رہ کر مجاہد بیٹیوں کی بلائیں لے رہی تھیں، شہر کے باہر قبرستان کے کونے میں مست ملنگوں کے چنڈو خانے میں دیا جل رہا تھا۔ بند کمرے کی اندرونی فضا چرس کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ لاپتہ انگریز لیفٹیننٹ اس دھوئیں کے بادلوں میں، دونوں ہاتھ رسی سے بندھے ہوئے چارپائی پر بیٹھا ملنگوں کو کوس رہا تھا۔ چاروں ملنگ اس کی طرف ذرہ بھر توجہ نہیں دے رہے تھے۔

چنڈو خانے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ملنگوں نے اور انگریز نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک مسلمان پولیس انسپکٹر

داخل ہو رہا تھا۔

"ہیلو لیفٹیننٹ راجرس!" انسپکٹر نے اندر آ کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ——"کنگ رچرڈ کو جرس کا دھواں اچھا تو نہ لگتا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے تمہارے لیے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں تھی۔"

لیفٹیننٹ زور سے گرجا ——"میں یہاں سے نکل کر تمہیں نوکری سے برخاست کرا دوں گا۔"

"لو صاحب! کش لگاؤ" —— ایک ملنگ نے جھوم کر حقہ لیفٹیننٹ کے سامنے کیا تو لیفٹیننٹ نے لات مار کر حقہ الٹا کر دیا۔ ملنگ نے اُلٹے ہاتھ سے اس کے مُنہ پر ایسا گھونسہ جمایا کہ اس کا سر پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا۔

"آج پندرہ مسلمان شہید ہوئے ہیں۔" انسپکٹر نے لیفٹیننٹ سے کہا۔ "دو سو کے قریب زخمی ہوئے ہیں لیکن انگریز کے خیراتی ہسپتال میں ایک بھی نہیں گیا۔ نیشنل گارڈ کے رضا کار، مرد اور عورتیں، ان کی مرہم پٹی اور تیمارداری اپنے بنائے ہوئے ہسپتال میں کر رہے ہیں اور تمہارا جو نقصان ہُوا ہے وہ بتاتے مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے۔"

"سنو انسپکٹر! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میرے ہاتھ کھول دو۔"

"انگریز کا حکم معذور ہو گیا ہے" —— انسپکٹر نے نرم سے لہجے میں کہا اور ملنگوں کو اپنی زبان میں کہا —— "سالے کو بھوکا مار دو.... یہیں کہیں گڑھا کھود کر دبا دینا...."

ملنگوں نے ماتھوں پر ہاتھ رکھ کر فدویانہ سلام کیا اور کہا —— "جو حکم سرکار، کہو تو آج...."

"جیسے مناسب سمجھو۔ یہ تمہارے حوالے ہے اور اگر اسے چھوڑ دیا" —— انسپکٹر نے تھانیداری رعب سے کہا۔ "تو تم چاروں ایک ہی گڑھے میں دبا دیے جاؤ گے۔"

انسپکٹر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ روپے کا نوٹ ملنگوں کے سامنے پھینک کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ذرا سا رُکا اور گھوم کر لیفٹیننٹ کو دیکھا۔ "معاف رکھنا لیفٹیننٹ راجرس! میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں" اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد رات کے اندھیرے میں چار ملنگ ایک گڑھے میں مٹی ڈال کر زمین کے ساتھ ہموار کر رہے تھے۔ پاس ہی گیدڑوں نے ایک بار چیخ و پکار اور آہ و زاری کی اور رات پھر خاموش ہو گئی۔

جب یہ اطلاعیں گورنر پنجاب کے پاس پہنچیں تو وہ ذرہ بھر حیران نہ ہُوا۔ جلال آباد میں کوئی نرالی بات تو نہیں ہُوئی تھی۔ گورنر کے سامنے سارے پنجاب کی رپورٹیں ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں جنہیں اب اس نے پڑھنا ہی چھوڑ دیا تھا نہ ہی اس میں اب یہ روئیداد پڑھنے کی ہمت تھی، لیکن اس نے انگریزی حکومت کا مُنہ رکھنے اور محض خفت مٹانے کی خاطر جلال آباد والوں کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر ہمارا لیفٹیننٹ زندہ واپس نہ مِلا تو....

لیکن اس الٹی میٹم میں جان نہیں تھی —— یہ انگریزی حکومت کے نزع کا وقت تھا۔ جلال آباد میں اس الٹی میٹم نے ہلکا سا ارتعاش بھی پیدا نہ کیا۔

دوسری صبح طاہرہ اور عفت حسبِ معمول سکول گئیں۔ سکول کی لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔ کوئی اُسے مبارک دے

رہی تھی، کوئی کل کی تفصیلات پوچھ رہی تھی اور باقی اسے رشک و حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ سب کے دل میں ایک ہی خواہش تھی۔ "کاش! طاہرہ کی جگہ میں ہوتی۔" یہ خواہش ایک ارادے کی صُورت میں لڑکیوں کے دلوں میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

چند ایک استانیوں نے بھی اسے مبارک باد دی لیکن ٹھنگنی سی ہیڈ مسٹریس نے اسے دفتر میں بلا کر سخت تنبیہہ کی اور کہا —— "اگر اب مجھے رپورٹ ملی کہ تم نے کسی جلسے یا جلوس میں حصہ لیا ہے تو سکول سے نکال دوں گی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ حکومت اس سکول کو دس ہزار روپیہ سالانہ گرانٹ دے رہی ہے۔ انگریز کا نمک کھا کر تم انگریزوں کے خلاف زبان کھولتی ہو؟"

طاہرہ خاموش رہی، خاموشی سے بہتر اور کوئی جواب نہ تھا۔ ہیڈ مسٹریس نے اس خاموشی کو نیم رضا یا طاہرہ کی شکست سمجھا لیکن وہ دیکھ نہ سکی کہ طاہرہ نے اس خاموشی میں کتنے طوفان چھپا لیے ہیں۔

چھٹی کے بعد ایک جواں سال استانی، نجمہ، طاہرہ کو اپنے گھر لے گئی۔ طاہرہ نے نجمہ سے ہیڈ مسٹریس کی دھمکی کا ذکر کیا تو نجمہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ طاہرہ تین گھنٹے بعد نجمہ کے گھر سے نکلی۔ دُوسرے دن مسلم گرلز ہائی سکول میں زمین دوز گرلز سٹوڈنٹ فیڈریشن قائم ہو گئی اور سکول میں ایک خاموش تحریک کا آغاز ہو گیا۔

نیشنل گارڈ نے اب جمعہ کو جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی کہ ہر جلوس کی قیادت عورتیں کیا کریں گی۔ اِدھر سکول میں تھانے والوں کی چٹھی آئی کہ آئندہ جمعہ کو یونینسٹ پارٹی کا ایک وزیر اور لاہور کا کمشنر دورے پر آ رہے ہیں اور سکول کی تمام لڑکیاں استقبال کے لیے دن کے دو بجے ریلوے سٹیشن پر پہنچ جائیں۔ یہ اطلاع ان تمام سکولوں کو اور دونوں کالجوں کو بھیجی گئی۔ جنہیں حکومت باقاعدہ گرانٹ دیتی تھی۔ ہیڈ مسٹریس نے تمام لڑکیوں کو یہ ہدایت دے دی جسے تمام نے خاموشی سے سن لیا۔ ہیڈ مسٹریس اس ڈسپلن پر بہت خوش تھی۔

جمعہ کا دن آیا۔ حسبِ معمول گھنٹی بجتی رہی لیکن سکول کے اندر اور باہر سکوت سا طاری رہا۔ نہ بچیوں کا شور نہ ہنگامہ۔ صرف ہیڈ مسٹریس، تین استانیاں اور چھوٹی جماعتوں کی کوئی چار پانچ بچیاں کمروں میں داخل ہُوئیں۔ پانچویں جماعت سے دسویں جماعت تک کی صرف چھ لڑکیاں حاضر تھیں۔ ہیڈ مسٹریس کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کا یہ عالم کہ بلاوجہ استانیوں سے دست گریباں ہو رہی تھی۔ اسی میں اس نے دوات انڈیل کر میز کا ستیاناس کر لیا۔ چپڑاسی کو بلایا اور بھول ہی گئی کہ کیوں بلایا تھا۔ وہ دو منٹ اس کے سامنے کھڑا رہا کہ ہیڈ مسٹریس نے اسے ڈانٹ دیا کہ کیوں کھڑے ہو۔ اس کے جانے کے بعد اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہنیاں میز پر گری ہوئی سیاہی پر رکھ دیں جب سیاہی کی نمی باریک قمیض کے کپڑے سے ہو کر کہنیوں کو محسوس ہوئی تو اس نے چپڑاسی کو بلا کر پھر ڈانٹا —— "کمبخت تجھے میز صاف کرنے کو بلایا تھا اور تم بھاگ گئے۔" دن کے بارہ بجے تک ننھی سی ہیڈ مسٹریس نے سکول میں اودھم مچائے رکھا اور سکول بند ہونے کی گھنٹی بج گئی۔

دوپہر کے دو بج کر پچیس منٹ پر لاہور کی طرف سے آنے والی ایکسپریس جلال آباد سے ایک میل دُور تھی کہ مسلمانوں کا جلوس سٹیشن سے ایک فرلانگ تک پہنچ گیا۔ جلوس کے آگے آگے سینکڑوں چھوٹی چھوٹی بچیاں اور نوجوان لڑکیاں تھیں جن کے ہاتھوں میں سیاہ جھنڈیاں تھیں۔ سامنے طاہرہ اور عفت نے ایک جھنڈا جس کے دونوں طرف بانس لگے ہُوئے تھے اُٹھا رکھا تھا۔ نجمہ ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ جھنڈے پر لکھا تھا —— "مسلم گرلز ہائی سکول جلال آباد۔ یونینسٹ پارٹی مُردہ باد۔"

پاکستان زندہ باد۔"

لڑکیوں کے اس جلوس کے دائیں، بائیں اور پیچھے سینکڑوں باوردی رضا کار تھے۔ ننھے سے اس جلوس کے پیچھے ہزارہا مردوں کا جلوس تھا۔ وہی گونج دار نعرے اور وہی جوش۔ مجسٹریٹ نے نقضِ امن کی صورت میں لاٹھی چارج کا اعلان کیا تو سالار نے آگے جا کر مجسٹریٹ کو کہا ——— "یہ جلوس پرامن مظاہرہ کرے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کوئی بدامنی نہیں ہو گی۔ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کوئی مرد نہیں جاتے گا۔ صرف بچیاں جائیں گی۔ اگر پولیس نے دعوت دی تو شاید تھانے اور کچہری والا منظر بن جاتے اور گاڑی کی بے گناہ سواریاں مصیبت میں پڑ جائیں۔"

مجسٹریٹ نے مجسٹریٹی رعب تو رکھا لیکن وہ جلتی پر تیل ڈالنے کا بھی قائل نہ تھا۔ سالار کے ساتھ اس نے زبانی معاہدہ طے کر لیا کہ کوئی مرد پلیٹ فارم تک نہ جاتے۔ مجسٹریٹ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ جلوس ریلوے سٹیشن کے ارد گرد پھیل گیا اور گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ ایک وزیر اور لاہور کا کمشنر جلال آباد کے دورے پر آ رہے تھے۔

گاڑی رکی تو پولیس نے ان کے کمپارٹمنٹ کو گھیر لیا اور انہیں باہر آنے سے روک دیا۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف سیاہ جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ انگریز کمشنر نے بند کمپارٹمنٹ کی کھڑکی سے مجسٹریٹ اور پولیس افسروں کو خوب ڈانٹا۔ سبھی تھر تھر کانپ رہے تھے۔ کمشنر نے اُٹھ کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوتے کہا ——— "آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مجمع کس طرح پرامن رکھا جاتا ہے۔ تم یہ پالیسی اختیار کرتے تو گزشتہ ہفتے جلال آباد میں اتنا نقصان نہ ہوتا۔"

کمشنر نے کمپارٹمنٹ کے کھلے دروازے میں سے باہر کا منظر دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ پلیٹ فارم پر چھوٹی چھوٹی بچیاں اور لڑکیاں سیاہ جھنڈیاں اُوپر اٹھاتے ——— "انگریز راج مردہ باد"۔ "ٹوڈی وزیر مردہ باد"۔ "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگا رہی تھیں۔ نیشنل گارڈ اور لوگوں کا ہجوم پلیٹ فارم کی حدود سے باہر نہایت خاموشی سے کھڑا تھا۔

کمشنر کی جہاندیدہ اور تجربہ کار نگاہوں نے جب سینکڑوں بچیوں کو دیکھا تو چند لمحے دیکھتا ہی رہا۔ اس کی ہلکی سبز آنکھیں ذرا سی بند ہوئیں اور اس کے چہرے پر ایک اور رنگ آ گیا۔ وہ دروازہ بند کیے بغیر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سر جھکا لیا جیسے ہزاروں مسلمانوں کے جلوس کی پُرامن خاموشی اور بچیوں کا ننھا سا ہنگامہ ایک بوجھ بن کر اس کی گردن پر آ پڑا ہو۔ اس نے گردن ذرا سی گھما کر مجسٹریٹ کی طرف دیکھا جو مزید عتاب کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"آپ نے اچھا کیا جو اس جلوس پر تشدد نہیں کیا" ——— کمشنر نے بامعنی آہستگی سے کہا۔

"کیوں اچھا کیا ہے؟" ——— یونینسٹ وزیر نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی خاطر اچھل کر کہا ——— "گولی کیوں نہیں چلائی؟"

"وہ بچیاں ہیں" ——— کمشنر نے وزیر کو کہا ——— "تمہاری بچیاں۔ جو تمہیں پسند نہیں کرتیں۔ وہ تمہارا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کر رہی ہیں۔"

باہر کا ماحول ننھے ننھے اور نسوانی نعروں سے لرز رہا تھا۔

کمشنر اُٹھا اور گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ ذرا سا مسکرایا اور طاہرہ اور عفت کے قریب گیا۔ وہ انگریزی میں پوچھا کہ اس جھنڈے پر کیا لکھا ہُوا ہے۔ بچّہ نے ترجمہ کر کے اسے بتایا تو کمشنر نے پہلے طاہرہ پھر عفت کے گال تھپکاتے اور مُسکرا کر آگے چل پڑا۔ پیچھے سے ایک پولیس انسپکٹر نے اسے چیخ کر کہا "حضور! آگے نہ جاتیے گا" کمشنر نے گھوم کر دیکھا اور خاموشی سے آگے چل پڑا۔

لڑکیاں جھنڈیاں لہرا لہرا کر نعرے لگا رہی تھیں۔ کمشنر آہستہ آہستہ لڑکیوں اور بچیوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ کسی کے سر پر ہاتھ رکھتا، کسی کے گال پر ہلکی سی تھپکی دیتا، کہیں ذرا سا رکتا اور تھوڑی دُور جا کر واپس آ گیا۔ پلیٹ فارم سے باہر کا ہجوم ایک انگریز کی ان حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ کمشنر نے ہجوم کی طرف دیکھا اور بازو اوپر کر کے الوداعی انداز سے لہرایا۔ اس کے جواب میں ہجوم نے "پاکستان زندہ باد" کا وہ نعرہ لگایا کہ ماحول لرز اٹھا۔ کمشنر خاموشی سے اپنے ڈبے میں آ گیا۔ گاڑی کا گارڈ اور انجن کا ڈرائیور بابر ـے حکم کے منتظر تھے۔ گاڑی کو صرف تین منٹ رُکنا تھا اور کمشنر او۔ وزیر کو یہیں اُترنا تھا مگر نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔

"گاڑی چلاؤ" ——— کمشنر نے گارڈ سے کہا ——— "ہم یہاں نہیں اتریں گے"۔

جب انجن نے سیٹی بجائی تو دو لڑکیاں ہاتھوں میں سیاہ جھنڈا اٹھائے آگے بڑھیں اور اسے ڈبے کے ساتھ کہیں لگانے لگیں۔ پولیس انسپکٹر جھنڈا چھیننے کے لیے لپکا۔ کمشنر نے روک دیا اور جھنڈا لڑکیوں کے ہاتھ سے لے کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ جب گاڑی پلیٹ فارم سے نکلی تو کمشنر نے جھنڈا زمین پر پھینک دیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے یونینسٹ وزیر سے کہا ——— "جب کوئی تحریک بچوں تک پہنچ جاتی ہے تو اسے کچلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ انگریزوں کی غلطی ہے کہ وہ ابھی تک ہندوستان میں پاؤں پسارے ہوتے ہیں۔"

"آپ انگریز ہیں؟" ——— وزیر نے غصے سے کہا ——— "میں ہوتا تو گولی چلوا دیتا۔"

کمشنر نے مسکرا کر جواب دیا ——— "میں انگریز ہُوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں گولی سے بہتر علاج سوچ سکتا ہوں... مسلمانوں کا مطالبہ اب گولی سے دب نہ سکے گا۔"

گاڑی کی ٹھک ٹھک زیادہ تیز اور بلند تر ہو گئی۔

جلوس کی یہ عظیم ترین فتح تھی۔ جلوس پُرامن طریقے سے منتشر ہو گیا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ طاہرہ تھکی ماندی اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹی خیالوں کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ عفت اس کی طرف پیٹھ کیے کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ طاہرہ سوچ رہی تھی کہ جان اور عزت کو خطرے میں ڈال کر اسے ہنسنے کھیلنے کے دن کیوں بھول گئے ہیں؟ نعرے لگا کر لاٹھیوں اور رائفلوں کے سامنے اسے مسرت اور رُوحانی کیف کیوں محسوس ہوتا ہے؟ وہ کون سی قوت ہے جو اسے ہزاروں مردوں کے سامنے بے دھڑک بولنے پر اُکسا رہتی ہے؟ یہ تبدیلی کیوں کر پیدا ہوئی؟ اس نے سوچا — "کیا یہ جذبہ میری رُوح کے ساتھ پیدا ہوا تھا؟ کیا مرا بچپن مر گیا ہے؟ مرگیا ہے تو میں مطمئن اور مسرور کیوں ہوں؟ خطروں سے مجھے کیوں اُنس ہو چلا ہے؟"

اُسے معلوم نہ تھا کہ امی خاتون نے اسے جو لوریاں دی ہیں ان میں جذباتیت بہت کم تھی۔ اسے جو کہانیاں سنائی تھیں ان میں خاتون نے یاسیت، مایوسی، شکست خوردگی اور جذبات پرستی کو کبھی آنے ہی نہ دیا تھا۔ خاتون نے اسے گڑیوں سے کم کھیلنے دیا تھا اور اسے اس کے نانا کی چھتیس انچ لمبی کرپچ (فوجی تلوار) زیادہ دکھائی تھی اور کرپچ سے وابستہ شجاعت سے بھرپور کئی داستانیں اسے سنائی تھیں۔ طاہرہ کی شخصیت انہی داستانوں کے سانچے میں ڈھل گئی تھی بعض لمحے ایسے بھی آتے کہ اس نے وقت و زمانہ سے بھی آگے نکل جانا چاہا۔

"عفت!"

عفت بظاہر کتاب پڑھ رہی تھی لیکن کھوئی ہوئی وہ بھی خیالوں میں تھی۔ طاہرہ کی آواز سن کر وہ خواب بیداری سے چونک اُٹھی — "کیوں طاہری؟"

طاہرہ جھینپ گئی۔ وہ عفت سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اتنے دنوں سے ارشد نہیں آیا۔ ذرا کی ذرا جلوس میں دیکھا تھا پھر ملا ہی نہیں لیکن اس نے نہ پوچھا۔

"کیا بات ہے طاہری؟" عفت نے پوچھا۔

"معلوم نہیں کیا بات تھی"... طاہرہ نے ہنس کر کہا — "بھول گئی ہوں۔ یاد کر لوں۔"

"طاہری!" — عفت نے پوچھا — "اتنے دنوں سے ارشد نظر نہیں آیا؟"

"زخمی ہو گیا ہوگا" — طاہرہ نے یوں کہا جیسے اسے ارشد کے زخمی ہونے نہ ہونے سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

"اللہ نہ کرے،" عفت نے کہا اور کتاب بند کر دی۔ پھر دل ہی دل میں اُس نے ارشد کی سلامتی کے لیے جانے کتنی دعائیں کیں۔

دوسری صبح جب سکول کھُلا اور کلاسیں شروع ہوئیں تو ہیڈ مسٹرس نے استانی نجمہ، طاہرہ، عفت اور نویں، دسویں جماعت کی دس بارہ لڑکیوں کو دفتر میں بلا کر نوٹس دیا — "آج سے تم سب کے نام سکول سے خارج کر دیتے گئے ہیں اور نجمہ! تم آج تک کی تنخواہ وصول کر لو۔ تمہاری ملازمت آج سے ختم ہے۔"

تمام لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں اور ہیڈ مسٹرس کرسی پر اچھلنے لگی۔ نجمہ اور لڑکیاں ہنستی ہوئی دفتر سے نکلیں۔ نجمہ نے رک کر کہا — "ہیڈ مسٹرس صاحبہ! میری تنخواہ آپ ہی لے لیں۔ ہو سکتا ہے حکومت سکول کی گرانٹ بند کر دے۔" اور وہ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے سکول سے نکل گئی۔

اگلی صبح سکول کھُلا تو ہیڈ مسٹرس حاکمانہ چال سے جو اس کی اصل چال سے زیادہ بھدی تھی دفتر میں آئی تو دیکھتے ہی دیکھتے سکول کی بے شمار لڑکیاں اُس کے دفتر کے سامنے جمع ہو گئیں۔ سکول کے در و دیوار "مسز قریشی مُردہ باد" کے نعروں سے لرزنے لگے۔ ہیڈ مسٹرس پُورے حاکمانہ جلال سے باہر نکلی لیکن لڑکیوں کے بے ہنگم نعروں میں اس کا جلال دیئے کی طرح بجھ گیا۔ گھنٹہ بھر کے اُودھم کے بعد ہیڈ مسٹرس نے یہ حکم جاری کیا کہ نجمہ کو بحال کیا جاتا ہے اور دوسری لڑکیوں کو بھی سکول آنے کی اجازت ہے۔

"لیکن میں یہ بتا دینا چاہتی ہوں" — اُس نے چشمہ اتارتے ہوئے کہا — "اگر حکومت کی طرف سے باز پرس ہوئی تو میں کسی کی ذمہ داری نہیں لوں گی۔"

"اور ہمارا دوسرا مطالبہ یہ ہے" — ایک لڑکی نے کہا — "آج سے سکول کی عمارت پر پاکستانی جھنڈا لہرائے گا اور صبح دعا کے بعد ساری لڑکیاں جھنڈے کو سلامی دیا کریں گی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا" — ہیڈ مسٹرس نے نرمی سے کہا۔ "اس سکول کو گورنمنٹ گرانٹ دیتی ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے..... یہ ہو گا..." ایک شور "یہ مسلم سکول ہے۔ پاکستانی جھنڈا زندہ باد۔" وہ شور کہ ہیڈ مسٹرس پر غشی کی حالت طاری ہونے لگی۔

"میں اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتی" — ہیڈ مسٹرس نے بصد مشکل کہا۔

"اس کی ذمہ داری ہم لیتی ہیں" — ایک اور لڑکی نے کہا۔

اُسی روز سکول پر پاکستانی جھنڈا چڑھا دیا گیا اور اُس روز سے ہیڈ مسٹرس بیمار سی رہنے لگی۔ سکول میں سٹوڈنٹ یونین کے باقاعدہ اجلاس شروع ہو گئے۔ نجمہ اس کی صدر تھی۔ طاہرہ سیکرٹری اور عفت خزانچی۔

ان تینوں لڑکیوں کی دلچسپی کی اب دو ہی جگہیں تھیں۔ نیشنل گارڈ کا ہیڈ کوارٹر اور سکول۔ ایک جگہ سے ہدایات لے کر دوسری جگہ پہنچانا۔ طاہرہ اور عفت کے شب و روز ہی بدل گئے تھے۔ خاتون اور عفت کی ماں نے بھی یہ تبدیلی خندہ پیشانی سے قبول کر لی تھی۔ ہر جلوس کے ساتھ پانی یا شربت کی فلاسک اٹھائے اٹھائے جانا خاتون کا معمول بن گیا تھا۔

دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ سیاسی حالات اس سے کہیں زیادہ تیزی سے بدل رہے تھے۔ انگریز بوکھلایا ہوا
ہندو محض خفت مٹا رہا تھا۔ مسلمانوں کو بہت فریب دیتے گئے لیکن مسلمان کے سینے میں جو ولولہ پیدا ہو گیا تھا، اس
سامنے چالبازیاں اور سودا بازیاں خس و خاشاک سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی
اگر قائداعظم بھی کہتے "مسلمانو! اس مطالبے سے دست بردار ہو جاؤ اور یہ تحریک بند کر دو" تو مسلمان ان کی ایک نہ
کیونکہ پاکستان کے غرض و مقصد کو جلال آباد کے چرسی ملنگ بھی سمجھ چکے تھے۔ گو اُن کا اندازہ اپنا تھا۔ مسلمانوں کو اب منزل
دینے لگی تھی۔

نجمہ، طاہرہ اور عفت نے اب نیشنل گارڈ کی حفاظت میں عورتوں کے جلوس الگ نکالنے شروع کر دیئے۔ انہوں
عورتوں کو گھروں سے نکال لیا تھا لیکن جلال آباد میں پولیس نے کسی عورت کو گرفتار نہ کیا۔

ارشد انہیں ملتا رہا۔ کبھی نیشنل گارڈ کے دفتر میں کبھی سکول کے باہر لیکن وہ جب بھی آیا تینوں اکٹھی ہوتی تھیں۔ نجمہ
اور عفت کے لیے ارشد ایک مرکزی نقطۂ نگاہ بن گیا تھا۔ وہ جلال آباد سٹوڈنٹ فیڈریشن کا سیکرٹری تھا۔ اس کے دن رات
بھاگ دوڑ میں گزرتے تھے۔ نجمہ ارشد سے دو تین سال بڑی تھی اور غیر شادی شدہ۔ وہ ارشد میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ بعض
جب کبھی نجمہ یا طاہرہ کے گھر بیٹھے ہوتے اور ارشد جانے کے لیے اُٹھتا تھا تو نجمہ بے تکلفی سے اس کا بازو پکڑ کر بٹھا لیتی
ایسی بے تکلفی دیکھ کر طاہرہ اور عفت شرم سے جھینپ جاتی تھیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب ارشد تینوں لڑکیوں کے درمیان بیٹھا تھا، باتیں سیاسیات سے ہٹ کر گپ شپ
داخل ہو گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ارشد کی مزاجی شگفتگی کا انکشاف ہوا۔ ایسے میں وہ بالکل ہی بدلا ہوا انسان دکھائی دیتا تھا
سیاست اور ان ہنگاموں سے ذرہ بھر دلچسپی نہ ہو اور یہ پہلا موقع تھا کہ تینوں لڑکیاں کھل کر ہنسیں۔ ارشد جانے کے
اُٹھا تو تینوں میں سے کوئی بھی نہ چاہتی تھی کہ وہ چلا جاتے۔ اُنہوں نے اسے باری باری ذرا سی دیر اور رکنے کے لیے کہا
وہ جانے پر ہی مُصر تھا۔ نجمہ بے تاب اور بے قابو ہو کر اُٹھی اور رسمی شرم و حجاب کو نظر انداز کرتے ہوئے ارشد کو کندھوں
پکڑ لیا۔

"نہ جاؤ ارشد!" اس نے ایسے پیار بھرے لہجے میں التجا کی کہ ایک بار تو ارشد کانپ گیا — "خدا کے لیے نہ جاؤ
نجمہ اس کے اور قریب ہو گئی۔ طاہرہ اور عفت شرم کے مارے اپنے آپ میں سکڑ گئیں "تم میری آنکھوں کے سامنے
کرو۔ میں تمہیں جی بھر کے دیکھا کروں ..."

نجمہ کے سینے کے جیسے بند ٹوٹ گئے تھے اور اسے اپنے آپ پر قابو ہی نہ رہا تھا۔ اُس نے ارشد کو کندھوں
پکڑ رکھا تھا اور ارشد اسے گھبراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نجمہ کی آنکھوں میں دو آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے جذ
میں کہا — "میرے دل کے قریب آؤ ارشد! ایک ایک دھڑکن سُنو"... اور نجمہ نے ارشد کو سینے سے لگا کر اس کی پیشانی
لی اور کہا — "تم میرے شہید بھائی کی تصویر ہو"

طاہرہ اور عفت کی شرم اور جھینپ ختم ہو گئی — انہیں یوں لگا جیسے دو بہن بھائی طویل جدائی کے بعد ملے ہوں۔
ارشد کا جسم پہلے اس گرفت میں ڈھیلا تھا۔ قمیض کے اندر اُس نے پسینہ بھی محسوس کیا تھا۔ "شہید بھائی" کا نام سنتے ہی اُس
کے بازو نجمہ کی کمر کے گرد لپٹ گئے۔

"سلیم تمہارا ہم عمر تھا" — نجمہ نے رقت آمیز لہجے میں کہا — "یہی رنگ، یہی نقش، یہی قد، یہی ہنسی۔ اُس کی طبیعت
تمہاری طرح ہی ہنسنے ہنسانے والی تھی۔ وہ میرا ایک ہی بھائی تھا جو پانچ مہینے ہوتے لاہور پولیس کی گولی سے شہید ہو گیا
ہے۔ تم مرحوم کی صحیح تصویر ہو، ارشد! یوں روٹھ کے اُٹھ نہ جایا کرو"

ارشد کے آنسو نکل آئے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور نجمہ چارپائی پر۔ کمرے میں اداس اداس سا سکوت چھا گیا۔ ایسا سکوت
جس میں نجمہ کے بہتے ہوئے آنسو بھی جیسے سنائی دے رہے تھے۔

"سلیم کو میں نے شاید دیکھا تھا" — ارشد نے جھکے ہوئے سر کو اٹھا کر کہا — "لیکن اس کی شہادت کا مجھے علم نہیں تھا"
"آپ نے تو کبھی ذکر ہی نہیں کیا؟" — طاہرہ نے نجمہ سے کہا۔

"ضرورت ہی نہیں سمجھی" — نجمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا اور آہ لے کر کہا — "ابھی اس سے زیادہ ضروری
کام کرنے کا وقت ہے"

"کسی وقت دُکھ سُکھ کی بھی کہنی سننی چاہیئے" — عفت نے کہا — "ہمیں کیا پتہ تھا کہ آپ دل میں غم کے پہاڑ
اُٹھاتے پھرتی ہیں"

"ہم تو آپ کو ہنستا کھیلتا اور ہر وقت اچھلتا کودتا دیکھتی تھیں" — طاہرہ نے کہا۔

"بھائی کی قبر پر رونے کا بہت وقت ہے" — نجمہ نے کہا — "ارشد کو دیکھ کر آج دو آنسو نکل آتے ہیں ورنہ
کہاں رونے والی تھی" — اُس کے چہرے کا رنگ جو سفیدی مائل تھا سُرخ ہو گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی — "میں اُس
روز روؤں گی جس دن پاکستان بن جائے گا۔ جس دن لاہور کے اسمبلی ہال پر پاکستان کا جھنڈا چڑھے گا میں اُس دن بھائی کی
جا کر روؤں گی اور روکے ہوئے اِن آنسوؤں سے شہید بھائی کی قبر ٹھنڈی کر دوں گی۔ میں بھائی کو خوش خبری سناؤ
دیکھ تیرا خون رنگ لایا ہے۔ دیکھ مسلمانوں نے ..." نجمہ کی آواز حلق میں ہی اٹک کے رہ گئی اور وہ آنسوؤں کو بھائی کی
کے سامنے لیے محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئی۔ سر جھک گیا اور سبز دوپٹہ پیشانی پر لڑھک آیا۔

"اوہ!" — ارشد نے گھڑی دیکھی تو چونک کر بولا — "دس بجنے میں بیس منٹ باقی ہیں۔ کرفیو کا وقت ہو رہا ہے
چلیئے۔ آپ کو بھی جانا ہو گا"

نجمہ اُٹھی اور مسکرا کر زیرِ لب کہا — "آپا" اور ارشد کے قریب جا کر اس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دی "اب آپا کہنے
پہلے کیا تھی میں؟"

آن کی آن میں محفل میں ایک بار پھر مسرت بھری سنجیدگی آ گئی۔
سب نے مسکرا کر ایک دوسرے کو الوداع کہی۔

جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۷ ——

ہندوستان میں جنگِ پاکستان عروج پر پہنچ رہی تھی اور پنجاب میں اس کے شعلے بلند تر ہو رہے تھے۔ میں انگریزوں کی پروردہ جماعت یونینسٹ پارٹی کی وزارت تھی جس کا وزیرِ اعلیٰ خضر حیات ٹوانہ تھا۔ مسلمان اس وزارت سے استعفیٰ مانگ رہے تھے۔ ہر روز جلوس نکلتے اور مظاہرے ہوتے تھے جن میں انگریز اور ہندو کی ذہنیت اور بیداری کے خواب خشک لکڑیوں کی طرح جل رہے تھے۔ جلوسوں پر پولیس کے حملے۔ لاٹھی چارج، گولیاں، تھانوں کی حوالاتوں میں مسلمان لیڈروں کو بند کر کے زدوکوب کرنا، عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر پولیس کی لاریوں میں ... تحریکِ پاکستان کو کچلنے کے ظالمانہ طریقے روزمرہ کا معمول تھا۔ مگر انگریز کی مزاحمت اور ہٹ دھرمی ڈھیلی پڑ گئی۔ ہندو نے تلخ سی آہ لی اور انگریز کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر چپ ہو گیا۔ ٹوانہ وزارت مستعفی ہو گئی۔

ہندوؤں اور سکھوں نے شکست خوردہ ہو کر ایک اوچھی چال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنے محلوں، مکانوں میں قلعہ بندیاں شروع کر دیں۔ گھروں میں اسلحہ، برچھیاں اور کرپانیں جمع کر لیں۔ یہ تو درونِ پردہ تھا اور باہر ان کے لیڈروں نے مسلمانوں کی چاپلوسی شروع کر دی۔ گاندھی کو ایک مدت بعد خیال آیا کہ صوبہ بہار میں ہزارہا مسلمانوں کو ہندوؤں نے اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ ہندو نہیں تھے۔ گاندھی کے آنسو نکل آتے اور مہاتما جی نواکھلی کی گلیوں میں جھاڑو دینے گئے جہاں انہیں شبہ ہوا تھا کہ سانحۂ بہار کا ردِعمل ہندوؤں کے خون کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے لیکن مسلمان گرگٹ کے آنسوؤں سے واقف تھے۔

طاہرہ تو اب سوتی بھی کم تھی۔ گرلز سٹوڈنٹ فیڈریشن اور بوائز سٹوڈنٹ فیڈریشن کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کے لیے اُسے دن رات بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی۔ آئے دن اسے ایک تقریر تیار کرنی پڑتی تھی۔ کوئی فیڈریشن کے اجلاس کے لیے اور کوئی جلوس کے لیے۔ پڑھائی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ میٹرک کے امتحانات ختم ہو چکے تھے نتیجے بھی نکل آئے لیکن طاہرہ اور عفت امتحان میں شامل ہی نہ ہوئیں۔ انہیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی۔ نجمہ بھی دن رات اسی چکر میں رہتی تھی۔

ہندو نے بھاگتے چور کی لنگوٹی پکڑ لی اور انگریز کو پنجاب کے دو ٹکڑے کر جانے پر آمادہ کر لیا۔

نئے چاند کا ایک کونہ سیاہ بادل کے کنارے سے نکلتا دکھائی دیا۔

۳ رجون ۱۹۴۷ کے روز تقسیمِ ہند کا اعلان ہو گیا۔

مشرقی پنجاب کے مختلف حصوں سے ہندو مسلم فساد کی خبریں آنے لگیں جو فرقہ وارانہ فساد نہیں بلکہ مسلمانوں کا قتلِ عام تھا۔ ہندو اور سکھ اوچھے ہتھیار لے کر نکل آتے اور مسلمانوں کے اکیلے دکیلے گاؤں میں کشت و خون شروع کر دیتے۔ مسلمان اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اس سے زیادہ اہم اور پاکیزہ مہم میں مصروف رہے تھے۔ وہ ہندو جو کل تک مسلمان کو ہندوستانی بھائی کہتا تھا آج مسلمان کے خون کا پیاسا ہو گیا اور وہ مسلمان جو علیحدہ قومیت کے قائل نہیں ہوتے تھے

وہ بھی اس عملی دلیل سے قائل ہو کر "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔

ایک صبح ارشد طاہرہ کے گھر آیا اور اسے بتایا کہ شام چار بجے نیشنل گارڈ کے دفتر میں ایک غیر معمولی اجلاس ہوگا۔ "مردوں کا اجلاس ابھی شروع ہو رہا ہے اور دوپہر تک ختم ہو جائے گا۔" ارشد گھبرایا ہوا تھا اس نے کہا۔ "اور شام چار بجے عورتیں جمع ہوں گی۔ چند نہایت ضروری باتیں ہیں۔ اب آپ کو بندوق کی شدید ضرورت پڑے گی۔ لڑنے اور مرنے مارنے کا وقت آ گیا ہے۔ آج کی میٹنگ کا موضوع یہی ہے ... میں بہت جلدی میں ہوں، آپ آپا نجمہ کو بھی ساتھ لیتی آئیں۔"

شام چار بجے جب نجمہ، طاہرہ اور عفت نیشنل گارڈ کے دفتر والی حویلی میں داخل ہوئیں تو حویلی کا صحن، مردوں عورتوں اور لڑکیوں سے اٹا پڑا تھا۔ مرد باہر نکل رہے تھے اور عورتیں جمع ہو رہی تھیں۔ طاہرہ نے مردوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ یہ وہی چہرے تھے جنہیں وہ کل تک دیکھتی رہی تھی۔ ان باوقار، پُرعزم اور پُرجلال چہروں پر آج اجنبی سا ایک تاثر تھا۔ مردوں کی چال ڈھال میں اب پہلی سی پھرتی کم ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ پُراسرار سا ضروری پن آ گیا تھا۔ وہ سب جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ حویلی میں کل تک والا جوش و خروش نہیں تھا۔ قہقہے بجھے بجھے سے تھے اور ماحول پر گھٹی ہوئی سنجیدگی طاری تھی۔

عورتیں چارپائیوں، بنچوں اور کرسیوں پر بیٹھ رہی تھیں۔ مرد باہر نکل گئے تو حویلی کا بڑا دروازہ بند ہو گیا۔ صحن میں صرف عورتیں اور نیشنل گارڈ کے چند ایک رضاکار رہ گئے۔ بے شمار عورتیں جنہیں بیٹھنے کو جگہ نہ ملی برآمدوں میں کھڑی تھیں۔ اس اجتماع میں نوجوان لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ایک برآمدے میں نیشنل گارڈ کا بارعب سالار کھڑا رضاکاروں سے باتیں کر رہا تھا۔

"میری بہنو!" سالار اجتماع سے مخاطب ہوا اور عورتوں پر سناٹا چھا گیا۔ "ہم نے ہندوستان کے دو ٹکڑے کر کے پاکستان بنا لیا ہے ..."

"پاکستان" —— ایک بے ساختہ چیخ —— "زندہ باد" —— ایک فلک شگاف نعرہ۔

"آپ نے جو کچھ کیا ہے، آپ نے جو کچھ کر دکھایا ہے وہ ایک معجزہ ہے۔ اگر بہنیں بھائیوں کا ہاتھ نہ بٹاتیں تو شاید مسلمان ایک صدی اور انگریز اور ہندو کی غلامی میں کراہتا رہتا۔ اب اس سرزمین پر پاکستان کا جھنڈا لہرائے گا ... لیکن میں آپ کو نہایت افسوس سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم جلال آباد پر پاکستانی پرچم ..." سالار کی آواز حلق میں اٹک کے رہ گئی اور اس پر رقت طاری ہو گئی ... "ہم ..." اس نے سینے کا پورا زور لگا کر الفاظ کو باہر دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس کا صحت و جوانی سے بھرپور جسم دو لفظوں کو زبان پر نہ ہی لا سکا۔ سب پر رنج آلود خاموشی طاری ہو گئی۔ سالار کا سر جھک رہا تھا لیکن اس نے ایک جھٹکے سے سر اوپر کر لیا اور اُس کی سرخ آنکھوں نے سینکڑوں سوالیہ اور منتظر نظروں کا سامنا کیا۔ اس کے جسم نے جھرجھری لی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ دبنگ آواز میں بولا ... "لیکن ہم جلال آباد پر پاکستانی جھنڈا نہیں لہرا سکیں گے۔"

عورتوں کے اجتماع میں یوں کھسر پھسر شروع ہو گئی جیسے ہوا کے تیز جھونکے خشک گھاس میں سے گزر رہے ہوں۔ یہ سرسراہٹ ذرا بلند ہوئی —— سرگوشیاں —— پھر آوازیں صاف ہونے لگیں اور اجتماع میں بے چینی پیدا ہو گئی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارا جہاد ناکام رہا ہے۔ ہم نے منزل پالی ہے۔ ہم نے ایک گھر بنالیا ہے جسے ہم اپنا گھر کہہ سکتے ہیں۔ وہ گھر جو انگریز کے آسیب سے پاک ہے۔ جس چمن کو ہمارے لہو اور پسینے نے سینچا ہے وہ ہمارا منتظر ہے۔ اب یہ نشیمن ہمیں چھوڑ دینا ہے۔ جلال آباد کی گلیوں میں اب ہم اجنبی ہیں۔ خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ ہمارا چمن واہگہ سے افغانستان کی سرحدوں تک اور کشمیر کی چوٹیوں سے بحیرۂ عرب کے ساحل تک پھیلا ہوا ہے.... اگر جلال آباد لُٹ گیا تو کیا غم .... وقت کم ہے اور میں جذباتی باتوں سے نکل کر حقائق کی طرف آتا ہوں....

"پہلی حقیقت یہ ہے کہ آپ نے تاریخ اسلام میں ایسے باب کا اضافہ کیا ہے جو خون سے لکھا گیا ہے۔ آپ نے اسلام کی تاریخ کو زندہ کیا ہے۔ یہ خونی باب ہماری آنے والی نسلوں کا خون گرمایا کرے گا....

"آپ نے جلوسوں میں جس نظم و نسق، حوصلے، استقلال اور باہمی ہمدردی کے جذبے کا مظاہرہ کیا ہے، شدید ضرورت ہے کہ اس جذبے کو آنے والے حالات میں برقرار رکھا جائے۔ آج تک ہماری مہم ایک اجتماعی مہم تھی لیکن آج کے بعد ہمیں ایک اور مہم کا آغاز کرنا ہے۔ وہ مہم ہے جلال آباد کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر بخیریت لاہور پہنچنا...."

مجمع پر ہیبت ناک سکوت طاری ہو گیا۔ عورتیں اب ایک دوسری کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھیں۔

"....یہ مہم ایسی ہے جو ہمیں اپنے بل بوتے پر سر کرنی ہو گی۔ یہ بھی متوقع ہے کہ آج رات ہی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ہم میں نفسا نفسی اور بھگدڑ مچ جائے۔ عین ممکن ہے ماں اپنے بچوں کو اور بھائی اپنی بہن کو ہی بھول جائے اور جس طرف منہ آئے سب بھاگ اٹھیں...."

عورتوں کے اجتماع پر موت کا سایہ پھیل گیا۔

"....میں آپ بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مردوں کے سہارے کا انتظار نہ کریں۔ اپنی جان اور عزت کی خاطر اُسی نظم و نسق کا مظاہرہ کریں جس کا آپ نے جلوسوں میں کیا ہے۔ آپ پولیس اور فوج کے لاٹھی چارج اور گولیوں کے سامنے سینہ سپر رہی ہیں اور منتشر نہیں ہوئیں.... اور اب آنے والے حالات میں اگر آپ پڑوسی کی مدد نہ کر سکیں تو کم از کم اپنے خاندان کے افرادِ مل کر ان حالات کا دوش بدوش مقابلہ کریں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ عورتیں مردوں کے سہارے کی محتاج نہ رہیں۔ آپ میں خون ہے۔ آپ میں قوتِ ایمان ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی بہن خدانخواستہ تین چار کافروں کے ہاتھ میں آجائے اور بے بس ہو جائے تو اس بہن کو آخر دم تک لڑنا ہو گا۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو آپ سب کے پاس ایسا سامان ضرور موجود ہونا چاہیے کہ آپ...." سالار کی آواز ایک بار پھر کہیں دب گئی "اور ایسے میں آپ...." زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ساکت و جامد عورتوں میں لطیف سی ہل چل پیدا ہوئی۔ ایک کونے سے ایک نسوانی اور پُرعزم آواز آئی "اور ہم قوم کی عزت کے نام پر قربان ہو جائیں گی۔"

سالار نے اُس طرف دیکھا۔ یہ نجمہ بول رہی تھی۔ اُس کے قریب سے ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی —

"پاکستان" اور خاموش ہجوم میں جیسے دھماکہ ہوا ہو — "زندہ باد۔"

سالار ایک بار پھر تن گیا.... "میں یہی کہنا چاہتا تھا لیکن میری عزیز بہنو!...." سالار کی آواز میں عجیب سا جلال پیدا ہو گیا "لیکن میری عزیز عصمتو! مسلمان یوں ہونے نہیں دے گا۔ میرے رضاکار آخری مرد ہوں گے جو جلال آباد سے نکلیں گے۔ سبز وردی میں ملبوس میرے یہ شیر...." اس نے بازو لمبا کر کے اپنے دائیں طرف اشارہ کیا جہاں بیس کے قریب رضاکار سر جھکائے کھڑے تھے اور اب ان کے سر اونچے ہو گئے تھے....

"یہ شیر جلال آباد سے اُس وقت نکلیں گے جب ان کی وردیاں لال سُرخ ہو جائیں گی....

"اگر میں جذباتی تقریر میں بہ گیا تو جذبات میں ہی بہتا چلا جاؤں گا۔ میں اب مطلب کی دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہندو شکست کھا کر بوکھلا گیا ہے اور وہ مسلمانوں کے بچے بچے کو قتل کرنے پر اُتر آیا ہے۔ نواحی دیہات کے سکھ جلال آباد پر حملہ کرنے کی تیاری مکمل کر چکے ہیں۔ امرتسر اور امرتسر کے گرد و نواح میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو چکا ہے۔ سکھوں کے پاس برچھیاں اور کرپانیں ہیں اور جگہ بہ جگہ پولیس اور فوج بھی ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ یہ طوفان جلال آباد کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مسلمان بے جگری سے لڑ رہے ہیں اور کٹ رہے ہیں۔ ہماری تعداد کم ہونے کے علاوہ ہمارے پاس اسلحہ اور ہتھیاروں کی کمی ہے۔ کافروں کی زیادہ تر توجہ عورتوں پر ہے۔ ہندو نہتے مسلمانوں کا خون بہا کر خفت مٹانے کی کوشش کر رہا ہے....

"دوسری بات یہ ہے کہ آپ مردوں کے ساتھ ساتھ رہیں اور وقت آ لگے پر مردوں کے دوش بدوش لڑیں۔ افراد میں نفسا نفسی پیدا نہ ہونے دیں۔ ہم نے مردوں کو تمام ہدایات دے دی ہیں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا مقصد صرف لڑنا مرنا اور مارنا ہی نہیں بلکہ یہاں سے نکل کر بخیر و خوبی پاکستان پہنچنا ہے۔ زیورات اور نقدی پہلے سے علیحدہ کر کے باندھ رکھیے اور گھر کی کسی دوسری چیز کا لالچ نہ کیجیے۔ گھروں سے وابستہ جذبات کو یکسر فراموش کر دیجیے ورنہ یہ کمزوری آپ کو گھروں سے نکلنے نہ دے گی....

مزید ہدایات آپ کو مرد دیں گے۔ آپ سب کے پاس ایک چاقو چھری یا خنجر ضرور ہونا چاہیے۔ مرد برچھیاں وغیرہ فراہم کرنے میں مصروف ہیں اور نیشنل گارڈ کے پاس جس قدر فالتو لاٹھیاں اور برچھیاں ہیں وہ ہم نے گھروں میں پہنچانی شروع کر دی ہیں۔ آخر میں میں آپ بہنوں کو عارضی طور پر الوداع کہتا ہوں۔ ہم انشاء اللہ لاہور میں ملیں گے۔ میں آپ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ خوفزدہ نہ ہونا میری بہنو! خدا آپ کے ساتھ ہے۔"

"پاکستان" — دو تین آوازیں۔

"زندہ باد" سب کی آواز۔

شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ عورتیں دو دو، تین تین، چار چار کی ٹولیوں میں گھروں کو جا رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر طرح طرح کا تاثر تھا۔ خوف کا، وقار کا، رنج کا بھی، ایثار کا بھی، جھجک بھی تھی اور عزم بھی۔ بعض کی آنکھیں اس طرح ساکن تھیں جیسے

آنے والے حالات کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ نجمہ، طاہرہ اور عفت، طاہرہ کے گھر والی گلی میں پہنچیں تو انہوں نے دیہات کے سکھوں کا ایک گروہ گلی میں آتا دیکھا۔ سب کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں اور وہ تیز قدم چلے آ رہے تھے۔ طاہرہ نے پوچھا "برچھیاں وغیرہ لے کر چلنا تو خلافِ قانون ہے؟" نجمہ نے جواب دیا "آج قانون مر گیا ہے"۔ اور تینوں ایک طرف ہو گئیں۔ دس بارہ سکھوں کا یہ گروہ تینوں لڑکیوں کو کنکھیوں گھورتا اور زیرِ لب مسکراتا آگے نکل گیا۔

"اب ہمیں ان جنگلیوں کا مقابلہ کرنا ہے" ——— طاہرہ نے کہا۔

"تمہارے گھر میں مرد بھی کوئی نہیں، طاہرہ!" نجمہ نے کہا ——— "ارشد کو ہی بلا لو"

"نہیں!" ——— طاہرہ نے جواب دیا ——— "ہمارے پاس بندوق اور ایک کرچ ہے"

"خیر! کچھ بندوبست ہو جائے گا" ——— نجمہ نے کہا ——— "اچھا خدا حافظ"

"خدا حافظ" ——— طاہرہ نے نجمہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "اگر رات خیریت سے گزری تو صبح ملیں گے"

۱۰

خاتون اور عفت کی ماں نے آنے والے متوقع حالات کی روداد سنی تو اُن کے دل بیٹھ گئے۔ خاتون کو جلال آباد کے نواح میں پھیلے ہوئے اپنے کھیت اور شہر میں کرائے پر چڑھے ہوئے مکان بے چین کرنے لگے۔ ہزاروں روپوں کی مالیت کی یہ جائداد اور سینکڑوں روپے ماہوار کی یہ آمدنی چھوڑنے کے لیے دل گردے کی ضرورت تھی۔ طاہرہ نے خاتون کی اندرونی کیفیت کو بھانپ لیا۔ اس نے کہا ——— "ہم جتنی جائداد یہاں چھوڑ کے جائیں گے اتنی ہی پاکستان میں مل جائے گی" اور اس نے بہت سی باتیں کر کے امی کا دھیان ادھر سے ہٹا لیا۔

یہ بھی غنیمت تھی کہ خاتون کو زیورات بنوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنا اور ساجدہ مرحومہ کے زیورات محفوظ رکھے تھے۔ کے علاوہ دس ہزار کے زیورات طاہرہ کے لیے بنوا رکھے تھے۔ جب سے ارشد ان کے گھر میں بے تکلفی سے آنے جانے لگا تھا خاتون نے دل ہی دل میں جہیز کی طویل فہرست تیار کر لی تھی جس میں تین ہزار روپے کا تو صرف ایک ہار شامل تھا۔ خاتون کی نظروں نے وہ رنگ بھی بھانپ لیا تھا جو ارشد کو دیکھتے ہی طاہرہ کے چہرے کو دل کش تر بنا دیا کرتا تھا۔ طاہرہ کو یہ معلوم تھا کہ اس کی امی، ارشد کی ماں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر چکی تھی لیکن دونوں ماؤں کے درمیان ابھی رسمی باتوں کا پردہ حائل تھا۔

خاتون نے طاہرہ کی باتیں سن کر دل ہی دل میں اندازہ کر لیا تھا کہ اس وقت گھر میں کوئی پچیس ہزار کے زیورات موجود ہیں۔ یہ تو طاہرہ کا اصرار تھا کہ خاتون نے کچھ نقدی بنک میں جمع کرا دی تھی ورنہ خاتون کو بنکوں اور ڈاک خانوں سے خدا واسطے کا بَیر تھا۔ طاہرہ کو خوش کرنے کی خاطر اس نے تھوڑا سا روپیہ بنک میں جمع کرانا شروع کر دیا تھا پھر بھی اپنے دل کو خوش رکھنے کے لیے اُس نے آٹھ ہزار کے قریب روپیہ رضائیوں والی بڑی پیٹی میں سب سے نیچے والی رضائی کی تہوں میں چھپا رکھا تھا۔ رضائی لیفٹیننٹ خیر دین مرحوم کی محبوب رضائی تھی اور مرحوم کی وفات کے بعد خاتون نے اسے مرحوم کی یادگار کے طور پر سنبھال کے رکھ دیا تھا۔ یہ خاتون کا بنک تھا اور طاہرہ کو اس کا علم ہی نہیں تھا۔ ان ہنگامی حالات میں خاتون کو ایک گونہ اطمینان ہوا کہ اس قدر روپیہ اور زیورات ہاتھ میں ہیں جو نئی جگہ کام آئیں گے۔

سورج جلال آباد کے شہر اور مضافات میں پھیلی ہوئی کرنیں سمیٹ کر اُفق کی سمت جا رہا تھا۔ شہر کی گلیوں اور گرد و نواح میں موت کے سائے منڈلانے لگے۔ شام کے دھندلکے کے ساتھ ہی لوگوں نے شہر میں بے شمار غیر مانوس چہرے دیکھے۔ شہر کے ارد گرد اونچی فصلوں میں بھی سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ شام پر سناٹا طاری تھا۔ گلیوں میں ہولناک خاموشی تھی۔ اکّے دُکّے لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے نظر آتے تھے۔ ستارے بھی بجھے بجھے دکھائی دے رہے تھے۔ مسلمانوں کے گھروں میں مردوں کا یہ حال تھا جیسے بلی ہوا کی خنکی میں آنے والی بارش کو سونگھ کر بچوں کو اُٹھا اٹھا کر محفوظ جگہ پہنچانے میں سرگرم ہو جاتی ہے۔

رات کی تاریکی گہری ہو رہی تھی ——— طاہرہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ چٹخنی کھلی تھی۔ دستک کے ساتھ ہی ارشد داخل ہوا۔ اس کے ساتھ مسلم نیشنل گارڈ کا ایک رضاکار تھا۔ دو برچھیاں رضاکار کے ہاتھ میں اور ایک ارشد کے ہاتھ میں تھی۔ ارشد کے شگفتہ چہرے پر ڈراؤنی سی سنجیدگی طاری تھی۔ اس نے اندر سے دروازے کی دونوں چٹخنیاں چڑھا دیں۔

"خیریت ہے؟" ——— ارشد نے طاہرہ سے پوچھا اور خاتون سے مخاطب ہوا ——— "اماں جی! ہم آج رات آپ کے پاس گزاریں گے"

"آؤ بیٹا!" خاتون نے اُس کی پیٹھ پر پھر رضاکار کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ——— "آج نہیں، ہر رات یہیں گزارو"

"ہر رات تو اب لاہور میں گزرے گی" ——— ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "آج کی رات خیریت سے گزر جائے تو سہی" ——— اُس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا ——— "خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو ڈراؤنی خبریں سنانے لگا ہوں ... اوپر کے دیہات میں ہندوؤں اور سکھوں نے صفایا کر دیا ہے۔ چند ایک مسلمان بچ بچا کر نیشنل گارڈ کی حویلی میں آ گئے ہیں۔ باقی مسلمان لاہور کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ بہت ظلم ہو رہا ہے، اماں جی! لاہور پہنچنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ شہر کے لوگوں نے ابھی ابھی کوٹھوں پر چڑھ کے دیکھا ہے۔ دیہات کو آگ کے شعلے چاٹ رہے ہیں۔ آج رات جلال آباد کی باری ہے۔ ہم لوگ تیار ہیں۔ مسلمانوں نے چند پستول اور بندوقیں اکٹھی کر لی ہیں۔ باقی گھروں میں لاٹھیاں اور برچھیاں ہیں ... میں ان صاحب کو ساتھ لے کر آپ کے ہاں آ گیا ہوں"

"اور تمہارے گھر میں؟" ——— خاتون نے پوچھا۔

"وہاں اللہ کا نام ہے" ——— ارشد نے کہا ——— "گھر کے تمام افراد پچھلے پہر نکل گئے ہیں۔ صرف میں آپ کے لیے پیچھے رہ گیا ہوں۔ خدا انہیں خیریت سے لاہور پہنچا دے"

"اللہ تجھے زندگی دے بیٹا" ——— خاتون نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

طاہرہ اور عفت نے چونک کر ارشد کی طرف دیکھا اور دونوں کے سر جھک گئے۔

"اور نجمہ؟" ——— عفت کی ماں نے پوچھا۔

"ان کے ہاں بھی مردوں کا انتظام کر دیا گیا ہے" ارشد نے جواب دیا "میں وہاں سے ہو آیا ہوں۔ نجمہ نے مجھے تاکیداً کہا تھا کہ میں بہت جلدی آپ کے ہاں پہنچ جاؤں"

دروازے پر بے ہنگم دستک ہُوئی تو سب کی آنکھیں ساکن ہوگئیں۔ کمرے میں بھیانک سکوت چھا گیا۔ کوئی کسی کا
دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ دستک پھر ہُوئی جیسے دروازہ توڑا جا رہا ہو۔ نیشنل گارڈ کے رضاکار نے برچھی ہاتھ میں لے کر کھڑکی کا
ذرا سا کھولا اور باہر دیکھا۔ دو آدمی دروازے کو پیٹ رہے تھے۔

"کون ؟"

"تم کون ہو؟ ہم بی بی کے مزارعے ہیں۔" باہر سے ہانپتی ہُوئی آواز آئی۔

خاتون نے دروازہ کھولا۔ دو مزارعے ہانپتے کانپتے کمرے میں داخل ہُوئے۔ کمرے کا جائزہ لیا اور اطمینان کا سانس لیا
[illegible] فرش پر [illegible] بیٹھ گئے۔

"سکھ پانی کی طرح ٹھاٹھیں مارتے چلے آ رہے ہیں" — ایک مزارع نے کہا — "پار والے تو سمجھتے کہ پار ہو گئے۔
ہم نے نتھو، کرمے اور خیرے کو وہیں چھوڑا اور بی بی، آپ کی طرف بھاگے۔ سوچا گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔"

"مُورکھو! عورتوں اور بچوں کو بھی ساتھ لے آتے نا!" — خاتون نے انہیں کہا۔

"عورتوں اور بچّوں کو نیشنل گارڈ والے شام کو ہی لے گئے تھے۔ کہتے تھے یہ عورتیں اب تمہیں لاہور میں ملیں گی۔
ان کا تو ہمیں کوئی فکر نہیں۔ بھاگ سکتی ہیں۔ بھوکی بھی رہ سکتی ہیں۔ ہمیں تو آپ لوگوں کا ڈر تھا، بی بی! اللہ کا شکر ہے کہ سب
زندہ ہو۔ باہر نکلنے کا کوئی حال نہیں رہا۔"

"سنو اصغر!" ارشد نے نیشنل گارڈ کے رضاکار سے کہا — "تم ذرا ہمت کرو۔ یہاں ہم چار آدمی ہو گئے ہیں۔ اِتنوں کی
ضرورت نہیں۔ تم جاؤ۔ قمر دین رنگریز کا مکان جانتے ہو؟ .... ارے وہ قمرو للاری کو نہیں جانتے؟ .... ہاں وہی .... وہ بیمار
ہے۔ گھر میں اس کی ماں اور بیوی ہے۔ تم ان کے پاس پہنچ جاؤ۔"

"اچھا جی!" — رضاکار اٹھا اور کہا — "اللہ بیلی۔"

"اور یہ لو" — ارشد نے اسے روک کر دوسری برچھی بھی دیتے ہُوئے کہا — "مجھے یقین ہے اُن کے گھر میں
بھی نہیں ہوگا۔ دونوں برچھیاں لے جاؤ۔"

رضاکار رات کے بھیانک اندھیرے میں گم ہوگیا۔

رات کا سکوُت جو رضاکار کے قدموں سے مرتعش ہُوا تھا ایک بندوق کے دھماکے سے لرز اُٹھا۔ یہ لرزا ابھی تھما
تھا کہ سینکڑوں پستولوں اور بندوقوں کے مُنہ کھول دیئے گئے۔ خاتُون نے بھاگ کر ٹرنک کھولا۔ بندوق اور کارتوسوں کی
پیٹی ارشد کو دے دی۔ کارتوسوں کے چار اور ڈبّے فرش پر لا رکھے۔ ارشد اُٹھا اور بندوق بھر لی۔ پھر عورتوں کو ہدایات
دینے لگا۔

"امّاں جی! آپ اور خالہ اوپر چلی جائیں اور خاموشی سے لیٹ جائیں۔"

دونوں عورتیں اُوپر والی منزل میں چلی گئیں۔

"طاہرہ! یہ برچھی سنبھال لو.... عفت! لو یہ برچھی.... اور بھُول جاؤ کہ تم لڑکیاں ہو۔ اب تم مرد ہو۔" ارشد کھل کر مُسکرا

اُس کی یہ مسکراہٹ اُس کی ہر مسکراہٹ سے نرالی تھی۔ "اور تم دونوں ....." وہ مزارعوں سے مخاطب ہُوا۔ "اپنی جگہ ہوشیار رہنا۔
جیسے میں کہوں ویسے کرنا۔"

وہ خود کھڑکی ذرا سی کھول کر بندوق ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوگیا۔ خاتون بھاگتی نیچے آئی۔ ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھا
اور اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ آٹھ دس منٹ بعد ارشد باہر نکلا اور خاتون رضائیوں والی
پیٹی بند کر کے پھر اُوپر چلی گئی۔

طاہرہ اور عفت نے پوچھنا چاہا کہ امّی نے کمرے میں لے جا کر ارشد کو کیا کہا ہے لیکن ماحول کا بھیانک تناؤ اس قدر
[illegible]
تھے۔ خُدا کے نیک بندے ایک کڑے امتحان میں سے گزر رہے تھے۔ کُتّے چیخ چیخ کر بھونک رہے تھے۔ شہر میں بندوقوں
اور پستولوں کے دھماکوں، جے کاروں اور مظلوموں کی چیخ و پکار سے کانوں کے ساتھ دل کے پردے بھی پھٹے جا رہے تھے۔
بیشتر گلیاں اور مسلمانوں کے گھر میدانِ کارزار بن چکے تھے۔ اس شور و غل، آہ و بکا اور درندوں کی جنگلی چنگھاڑیں اللہ اکبر کے
نعرے بھی سنائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک آواز کسی اونچی چھت سے آتی تھی — "مسلمانو! جم کے مقابلہ کرنا۔ خدا تمہارے
ساتھ ہے۔"

ارشد نے آواز پہچان لی۔ یہ نیشنل گارڈ کا نعرہ باز تھا جس کے سامنے مائیکروفون کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

خاتون پھر بڑبڑاتی ہُوئی نیچے آئی "میں نے اُوپر سے دیکھا ہے، اُس طرف شہر میں آگ لگی ہُوئی ہے"۔

"بی بی! گھبراؤ نہیں" — ایک مزارعے نے خاتون کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "ہم کس لیے ہیں؟" اور خاتون کو پھر اُوپر
بھیج دیا — "اب چھت پر نہ جانا، بی بی!" — مزارعے نے زور سے کہا۔

شہر میں موت کی دِل ہلا دینے والی چنگھاڑیں اور شیطان کے کرخت قہقہے اس قدر بلند اور اس قدر زیادہ ہو گئے
تھے کہ کمرے میں بات کرنے کے لیے چیخنا پڑتا تھا۔ یہ شور اس گلی میں بھی آن پہنچا۔

"بتی بجھا دو" — ارشد نے کہا اور عفت نے بتی بجھا دی۔ گلی میں بتی جل رہی تھی اور لمبے لمبے سائے نظر آنے لگے۔
ایک دھماکہ۔ کمرہ مہیب گُونج سے کانپ گیا۔ ارشد نے پہلی گولی چلائی۔ پھر دوسری اور چشم زدن میں بندوق میں
دو کارتوس بھر لیے۔ گلی میں لمبے لمبے سائے رک گئے اور ان میں دو سائے کم ہو گئے۔ "واہگورو کی فتح" تھم گئی۔ سائے بکھر کر
دیواروں کے ساتھ ہو گئے۔ کمال مرحُوم کی کھڑکی میں سے ایک گولی چلی — ایک اور گولی — کئی اور گولیاں گلی میں بھاگتے
قدموں کی آوازیں۔ پھر خاموشی جیسے شہر کا قیامت خیز شور تڑپ کر رہا تھا۔ دس منٹ بعد گلی میں پھر وہی شور اور دو منٹ
بعد طاہرہ کے مکان کا دروازہ اس طرح بج اُٹھا جیسے اسے ہاتھی ٹکریں مار رہے ہوں۔ ارشد کی بندوق خاموش رہی لیکن
سامنے والے مکان کا پستول آگ اُگلتا رہا۔

"بوا خاتون!" سامنے کے مکان سے ایک مردانہ آواز چلائی — "گھبرانا نہیں، ہم ابھی زندہ ہیں" — لیکن ان کا بھی دروازہ
ٹوٹ رہا تھا۔

"تم دونوں ایک کواڑ کے ساتھ اور دوسرا دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔" ارشد نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا "بتی جلا دو۔ بتی جل گئی۔ "تم دونوں۔ طاہرہ اور عفت، ڈیوڑھی میں دروازے کے بالکل سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ۔ بھاگو۔ ڈیوڑھی کی بتی جلا دو۔ برچھیاں تھام لو۔"

دروازہ ٹوٹنے والا تھا۔

"نہیں!" طاہرہ نے لرزتی آواز سے کہا — "میرے پاس ابا جان کی کرپچ ہے۔" اس نے سرہانے کے نیچے سے کرپچ اُٹھائی اور ڈیوڑھی میں بھاگ گئی۔

ارشد نے دروازے سے ذرا ایک طرف ہو کر چٹخنی کھولی اور پیچھے ہٹ گیا۔ پانچ چھ سکھ اندر داخل ہوتے ا... ساتھ ہی کواڑوں کے عقب سے دونوں مزارعوں کی کلہاڑیاں حرکت میں آگئیں۔ ارشد پانچ گز دُور دائیں طرف دیوار کے ساتھ بندوق لیے کھڑا تھا۔ دروازے میں چھ لاشوں کا ڈھیر لگ گیا۔ ان کے اُوپر سے کود کر پانچ چھ اور سکھ اندر آگئے۔ پیشتر اس کے کہ وہ برچھیاں سنبھالتے مزارعوں کی کلہاڑیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔

طاہرہ اور عفت دروازے کے بالکل سامنے دس گز دُور دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ باہر سے آنے والے سکھ بتی کی روشنی میں انہیں دیکھ کر ان پر ہی جھپٹا مارنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ موت کواڑوں کے عقب میں منتظر ہے۔

ارشد بندوق بھر رہا تھا کہ ایک سکھ جو کلہاڑیوں سے بچ گیا تھا کرپان سیدھی کر کے اس کی طرف لپکا۔ دوسرے ہی لمحے طاہرہ کی کرپچ اس کے پہلو میں داخل ہو گئی۔ اِدھر عفت ایک کے پیٹ سے برچھی نکال رہی تھی۔ دروازہ لاشوں سے مکمل طور پر بند ہو گیا تھا۔

ڈیوڑھی میں دُھواں پھیلنے لگا لیکن کسی نے اُس طرف توجہ نہ دی۔ جب دُھواں آنکھوں کو لگنے لگا تو ارشد نے بھاگ کر کمرے میں دیکھا۔ کمرے میں آگ لگی ہوئی تھی اور شعلے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ کسی نے کھڑکی میں سے تیل یا پٹرول پھینک کر آگ لگا دی تھی۔

طاہرہ کے کانوں میں ارشد کی صرف یہ آواز پڑی — "اماں جی اور خالہ کو نیچے لے آؤ" — پھر دُھواں اس قدر پھیل گیا کہ ڈیوڑھی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اسی طرح سامنے کے مکان کی کھڑکیوں میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ارشد نے گلی میں جھانکا۔ گلی جلتے ہوئے مکانوں کے شعلوں سے دن کی طرح روشن تھی۔ موت کی اس خیرہ کن روشنی میں پانچ چھ سکھ کی بکھری ہوئی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ "واہگورو کی فتح" اور "جے کارے" دوسرے محلے میں منتقل ہو گئے تھے۔

دُھواں پھیلتا گیا اور طاہرہ کی آنکھوں کی یہ حالت جیسے اب کھل نہ سکیں گی۔ دُھواں، ہر طرف دھواں ہی دھواں۔ آنکھیں بند کیں تو دھواں، آنکھیں کھولیں تو بھی دُھواں اور اسی دُھواں دھار میں ایک رات، ایک دن، دُوسری رات، دوسرا دن، ایک اور رات اور کتنی اور راتیں گزر گئیں۔

پھر طاہرہ کو یوں لگا جیسے دھوئیں کے بادل چھٹ گئے اور فضا صاف ہو گئی ہو۔ آسمان کی نیلاہٹ نکھر آئی ہو۔ اُس نے آنکھیں کھولیں تو دھواں بھی غائب اور دھوئیں کی بُو بھی غائب تھی — اس دھوئیں نے بہت کچھ چاٹ لیا تھا۔ طاہرہ کی متاعِ عزیز نگل لی تھی۔ اس کا جلال آباد، اس کی گلیاں، اس کا دو منزلہ مکان، لہلہاتے کھیت، اس کی کتنی سہیلیاں، اس کی امّی خاتون، عفت کی ماں اور ایک مزارعہ۔ اس سے چھن گئے تھے۔ پاکستان نے اس سے اتنی بڑی قربانی لی تھی جو کبھی اس کے تصور میں بھی نہیں آئی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے اُسے یُوں لگا جیسے دھوئیں نے وہ نعرے اور جلوس بھی نگل لیے ہیں جو جلال آباد کے در و دیوار کو ہلا دیا کرتے تھے وہ جوش و خروش اور وہ ہنگامے بھی شاید اسی دھوئیں کی نذر ہو گئے تھے جو طاہرہ نے مردوں کے پسپا ہوتے ہجوم کو آگ بگولہ کر کے تھلنے کی دیواروں سے ٹکرا کر برپا کیے تھے۔

طاہرہ نے یہ سب کچھ محسُوس کیا لیکن معاً اس کی ہستی میں ایک احساس تڑپ کے بیدار ہو گیا — نہیں! وہ سب کچھ زندہ ہے۔ اس کے سینے میں، اس کے رگ و ریشے میں زندہ ہے، وہ ولولہ، وہ عزم، سبز جھنڈے کا وہ احترام۔ پاکستان کی خاطر وہ جذبۂ ایثار مرا نہیں۔ یہ مر سکتا ہی نہیں، مرتے تو انسان ہیں۔ طاہرہ نے اپنے جسم میں پھر سے ایک تپش محسُوس کی۔ وہ جُھکا ہُوا سر اُونچا کر کے بیٹھ گئی۔ اس کی ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی۔ جوڑ جوڑ سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے سامنے فرش پر ایک بوسیدہ کمبل بچھائے عفت سوئی ہُوئی تھی۔ طاہرہ نے اُس کی صورت دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ اس کی اپنی صورت کیسی ہو گی۔ بال بکھر کر جڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پر خشک تہ جم گئی تھی۔ چہرے پر سلوٹیں پرچھائیاں اور آنکھوں کے نیچے سیاہی آگئی تھی۔ پاؤں ننگے۔ قمیض جگہ جگہ سے پھٹی ہُوئی دوپٹہ غائب تھا۔ وہ ایک فراخ کمرے میں تھیں جس کے فرش پر چار پھٹے پرانے کمبل بچھے ہوئے تھے۔ ارشد اور مزارعہ غائب تھے۔ طاہرہ نے اپنا جسم گھسیٹ کر اُٹھایا اور دروازے میں سے باہر کا منظر دیکھا۔

وہ لاہور میں والٹن کے رفیوجی کیمپ میں تھی۔

اس کے سامنے فوجی بارکیں بے ترتیبی سے بکھری ہُوئی تھیں۔ بارکوں کے برآمدوں میں، کمروں میں اور سڑکوں کے کنارے انسانوں کا مفلوک الحال ہجوم سو رہا تھا یا جاگ کر اس طرح اِدھر اُدھر، اُوپر نیچے اور آگے پیچھے دیکھ رہا تھا جیسے یہ ہجُوم اِس دیس میں اجنبی ہو۔ بہت سے ننگ دھڑنگ بچے، تھکان اور خوف و ہراس کی ماری ہُوئی لڑکیاں اور عورتیں، چیتھڑوں میں ملبُوس

مرد، برتن ہاتھ میں اٹھائے تیزی سے آجا رہے تھے۔ مردوں میں بے شمار ایسے تھے جن کے سروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں یا بازو رومال میں باندھ کر گردن سے لٹکائے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑے خون آلود تھے، کچھ لنگڑا کر چل رہے تھے بعض ضعیف بڈھے برآمدوں میں بیٹھے خلاؤں میں تک رہے تھے۔

اس ہجوم کا ظاہری حال علیہ بھاگی ہوئی، شکست خوردہ بے ترتیب فوج کا سا تھا لیکن طاہرہ کے ویران ہونٹوں پر جانے کہاں سے مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جانتی تھی یہ فوج شکست خوردہ نہیں۔ فاتح ہے۔ طاہرہ کی مسکراہٹ ذرا کی ذرا پھیلی پھر سکڑ گئی۔ وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا جسم کے پٹھے اور اعصابی نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ اس نے دماغ پر زور دیا مگر اس کے ذہن میں دھواں پھیل گیا۔ ویسا ہی دھواں جو اس کے گھر کی ڈیوڑھی [illegible] تھا۔ اس دھوئیں میں اس کے سامنے پھیلا ہوا یہ ہجوم [illegible] کئی روز پہلے کا دھواں یاد آ گیا۔ اس دھوئیں میں سے ایک آواز اسے پھر سنائی دی جو شاید ارشد کی تھی —— "اماں جی اور خالہ کو نیچے لے آؤ۔"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟" طاہرہ کی پیشانی کے شکن ٹیڑھے ہو گئے۔ اسے یاد آیا "ہاں! پھر صبح ہو گئی تھی اور ہم جلال آباد سے باہر بھاگتے ہوئے لوگوں میں شامل ہو گئے تھے۔"

اسے وہ ساری باتیں اور اس واردات کی ساری تفصیلات یاد نہیں آ رہی تھیں۔ طاہرہ نے آنکھیں بند کر کے پھر ذہن کے دھندلکے میں جھانکا جیسے بھولے بسرے خواب کو یاد کر رہی ہو لیکن اس خواب کی کڑیاں جڑنے کی بجائے بکھرتی ہی جا رہی تھیں۔ اس نے دماغ کو خشک لیموں کی طرح نچوڑا اور چند قطرے نکال ہی لیے۔

"سکھوں کے ایک گروہ سے جھڑپ ہوئی تھی.... طاہرہ نے برچھیوں اور کرپانوں کا مقابلہ کرچ سے کیا تھا.... ارشد اور دو مزارعے ساتھ تھے.... بھاگتی عورتوں اور بچوں کا قافلہ بکھر گیا تھا.... لاشیں بچوں کی.... چیخیں عورتوں کی.... مقابلہ، مردوں .... دھماکے، بندوقوں اور پستولوں کے.... گھوڑوں کی سرپٹ دوڑ.... اندھیرا.... دھواں.... گھپ اندھیرا.... باجرے اور مکئی کے پکے فصل انسانوں اور گھوڑوں نے روند ڈالے تھے.... اونچے فصلوں میں عصمتیں چھپ گئی تھیں.... لٹ بھی گئی تھیں.... ہاں! ہاں! یاد آیا.... ارشد اور مزارعے نے دو لڑکیوں کو تین سکھوں سے آزاد کرایا تھا.... وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟ کدھر چلی گئیں تھیں؟ طاہرہ کو یاد نہیں آ رہا تھا.... دریا کا کنارہ.... ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا.... پھر اندھیرا.... پھر جھڑپ.... پھر اندھیرا.... جانے کتنے دن گزر گئے تھے، جانے کتنی ہی راتیں۔ طاہرہ کے سامنے یادوں کی کڑیاں پھر بکھر گئیں۔ اس نے انہیں چننا جوڑنے لگی.... پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے.... بھوک لگی تھی، پیاس بھی.... امی خاتون گر پڑی تھی.... ارشد نے کندھوں پر اٹھا لیا تھا.... پھر حملہ.... امی کو طاہرہ نے کندھوں پر اٹھا لیا تھا.... پھر اندھیرا.... چیخیں، چنگھاڑ، کرپانوں، برچھیوں اور کلہاڑیوں سے تصادم.... پھر؟ کیا ہوا تھا پھر؟.... عفت کی امی غائب تھی.... ایک مزارعہ غائب تھا.... کہاں چلے گئے تھے وہ؟ اوہ! اس نے سر جھکا لیا۔ اسے یاد آ گیا.... اس نے، ارشد، عفت اور دوسرے مزارعہ نے دو گڑھے کھود کر عفت کی امی اور مزارعہ کو دفن کر دیا تھا۔ فاتحہ پڑھی تھی۔ عفت نے اپنا سبز دوپٹہ اپنی امی کی قبر پر ڈال دیا تھا اور طاہرہ نے اپنا دوپٹہ مزارعہ کی قبر پر ڈال کر اوپر پتھر رکھے تھے.... پھر؟.... وہ بھی شاید کیمپ تھا!.... اسی طرح.... کتنے دن گزر گئے تھے؟ جانے کتنے دن! یاد نہیں.... شاید ایک ہی رات.... وہاں بھی حملہ ہوا تھا.... اور بندوق؟ ارشد کے پاس بندوق تھی؟.... نہیں! گر گئی تھی؟ چھن گئی تھی؟.... جانے کہاں رہ گئی تھی!.... وسیع میدان.... دور دور تک بکھرے ہوئے انسان.... بھاگتے ہوئے، گرتے ہوئے، تعاقب کرتے ہوئے، مقابلے میں جم کے لڑتے ہوئے.... پھر دھواں.... بھیانک خواب کا تانا بانا دھوئیں میں الجھ گیا.... کچھ یاد نہیں.... اوہ! انا للہ وانا الیہ راجعون.... امی خاتون نے آخری ہچکی لی تھی.... قبر کھدی تھی.... فاتحہ پڑھی تھی لیکن سبز دوپٹہ کوئی نہ تھا.... امی کہاں رہ گئی ہے؟ کس دیس میں؟ کس مٹی میں؟.... آنسو.... ہچکیاں.... سسکیاں.... اور؟ .... پھر کیا ہوا تھا؟.... ہیبت، ہول، کلیجے منہ کو آتے تھے.... کیوں؟ یاد آ گیا.... ایک شور تھا.... ایک مسلسل گرج.... سامنے حد نظر تک پھیلا ہوا دریا تھا.... لہریں گرد اوپر اٹھتی تھیں اور وہ ہیبت ناک شور کہ طاہرہ نے بھی ایک بار ارشد کی گردن پکڑ کر خوف سے بھینچ لی تھی.... پیچھے موت کے قہقہے تھے، آگے دریا تھا.... طاہرہ کو صرف اسی قدر یاد آیا کہ اس کے کان میں آواز آئی تھی —— "میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔ مضبوطی سے پکڑ لو" —— اس نے عفت کو مزارعے کی پیٹھ کے ساتھ چپکے ہوئے دیکھا تھا.... پھر اور کچھ نظر نہ آیا.... پانی خون کو منجمد کر رہا تھا.... ڈوب جانے کا خوف اور تیر نکلنے کا حوصلہ منجمد خون کو گرما رہا تھا.... لہریں۔ اوپر سے گزرتی ہوئیں۔ ارشد اور طاہرہ ان کے اوپر سے گزرتے ہوئے.... گا ہے لہروں کے رحم و کرم پر لہروں کے ساتھ بہتے.... مزارعہ اور عفت لاپتہ.... پانی، ہر طرف پانی پھر دھواں، گہرا دھواں.... یادوں کی کڑیاں پھر ٹوٹ گئیں۔ کڑیاں پھر جڑنے لگیں، کہیں کہیں سے.... وہ خود تیری تھی.... ارشد نے اسے پکڑا تھا.... وہ اکٹھے تیر رہے تھے.... وہ ارشد کی پیٹھ پر سوار تھی.... کنارا دور تھا یا کنارا تھا ہی نہیں.... پانی نے سب کچھ نگل لیا تھا.... مزارعے کو بھی، عفت کو بھی.... نہیں!.... ڈوبے پانی کی پہاڑیوں پر دکھائی دیتے تھے.... لاشیں تھیں یا زندہ؟ تھے انسان!.... پھر کیا ہوا تھا؟.... دو تین کڑیاں تڑاخ سے ٹوٹ کر بکھر گئیں.... اور کنارا.... اور پھوڑے کی طرح دکھتے جسم.... مزارعہ بے ہوش عفت کو اٹھائے ان کی طرف آ رہا تھا.... وہ لیٹ گئے تھے.... دھوپ تیز تھی.... دھوپ گرم.... سکون، چین، نیند کا خمار...." ہم نے منزل پالی ہے۔" ارشد کی بے ساختہ آواز.... وہ سو گئے تھے.... دماغ اس قدر شل کہ نیند میں جلال آباد کا خواب بھی نہ دیکھ سکے تھے.... جلال آباد بہت دور رہ گیا تھا.... دنوں اور راتوں کی مسافت.... مصائب کی راہ...." آہ! امی تو نے مجھے اس ننھی بچپنے کی عمر میں کتنا پکا حوصلہ دیا تھا۔ خدا تجھے...." آنسوؤں کی دھند.... آہوں کا دھواں.... دھواں آہستہ آہستہ پگھلنے لگا.... آسمان کی نیلاہٹ نکھر آئی.... ایک ہجوم.... مفلوک الحال.... حواس باختہ.... ایک کارواں.... لٹا ہوا.... تھکان سے چور.... چہروں پر گرد کارواں کی تہیں.... ٹھنڈے سانس.... گرم آنسو.... مردہ ہونٹ.... آنکھیں بے نور.... لیکن سینے منور اور دل زندہ...." یہ لاہور کا ریفیوجی کیمپ ہے".... ہر سمت ایک ہی صدا۔" ہم نے منزل پالی ہے".... "یہ ہمارا پاکستان ہے۔"

طاہرہ نے سکون آمیز آہ لی اور آنکھیں بند کر لیں جیسے کسان ہل چلا کر، بیج ڈال اور فارغ ہو کر کھیت کے کنارے فتح و سکون کا سانس لے کر سو جاتا ہے۔

اس نے اپنی گردن کے گرد ایک بازو کا گھیرا محسوس کیا۔ طاہرہ نے اسے بھی تصور سمجھا لیکن کسی کی اکھڑی ہوئی سانسیں

"طاہری!"

"ہوں!"

"بیاہ کرو گی؟"

"شاید..... کیوں عفت! اس ماحول میں تمہیں بیاہ کا خیال کیسے آ گیا ہے؟"

"میرا خیال مستقبل سے بھی آگے نکل گیا ہے طاہرہ! میں سوچ رہی تھی کہ ہم دونوں کا بیاہ ہو جائے گا تو ہمارے بچے پیدا ہوں گے، پھر ہم انہیں بتایا کریں گی نا کہ ہم نے پاکستان کس طرح حاصل کیا تھا۔"

"ہاں عفت! ہم مائیں نہیں گی تو اپنے بچوں کو جنوں اور پریوں کی کہانیاں نہیں سنایا کریں گی۔ ہم نے ایک نئی کہانی تخلیق کی ہے جو ہم بچوں کو سلانے کے لیے نہیں جگانے کے لیے سنایا کریں گی۔"

"یہ لو لڑکیو!" ارشد کی شگفتہ آواز نے کمرے میں موسیقی بکھیر دی۔ "آؤ ناشتہ کر لو۔"

طاہرہ اور عفت نے گھوم کر دیکھا۔ ارشد ہاتھ میں چھوٹی سی ایک بالٹی اور المونیم کے ٹیڑھے پچکے سے گلاس اٹھائے رے میں داخل ہوا۔ مزارعہ کے ہاتھ میں روٹیاں اور سالن تھا۔ یہ لوگ ان ٹوٹے ٹیڑھے برتنوں سے مانوس ہو گئے تھے ان کو تین وقت ان میں کھانا آتا تھا اور انہیں یہاں آئے کئی روز گزر گئے تھے۔ ارشد کے بھی کپڑے پھٹ چکے تھے۔ ں چڑے ہوتے اور گرد آلود تھے۔ دریا کے سیلابی پانی کی مٹی اس کے بالوں میں جمی ہوتی تھی۔ صرف منہ دھلا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ پانی ہی کہاں تھا کہ سر بھی دھو لیں۔

چاروں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ مزارعہ نے حسبِ عادت ایک روٹی پر ذرا سا سالن رکھ کر علیحدہ بیٹھنا چاہا ن طاہرہ نے غصے میں آ کر ڈانٹ دیا — "تمہیں ہر روز کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ساتھ بیٹھ کے کھایا کرو۔ وہ مزارعہ ین ال آباد میں رہ گیا ہے۔ یہ پاکستان ہے۔ یہاں بادشاہ اور مزارعہ ایک ہی رکابی میں کھاتے ہیں۔ تم اب ہمارے نوکر نہیں ۔" اور مزارعہ دیہاتی ہنسی ہنس کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ایک وہ ارشد کہ جلال آباد میں اس کے چہرے پر ہر وقت پرعزم اور باوقار سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ وہ بیٹھا ہوتا تھا ھی یوں لگتا تھا جیسے اس کا جسم مصروف ہے اور بھاگ دوڑ رہا ہے اور اب وہ ارشد کہ رفیوجی کیمپ میں پہنچتے ہی ہیئت بدل ڈالی۔ تھکان زدہ ہونٹوں پر تبسم۔ زبان پر مزاح، آنکھوں میں شوخی اور شرارت اور ہاتھوں میں چلبلاپن۔ اس کی ں باتیں اور حرکتیں کھلنڈرے لڑکوں سے ملتی جلتی تھیں۔ اب وہ چند منٹ سے زیادہ سنجیدہ نہیں رہتا تھا۔ مزارعہ کو سادہ لیکن میراثیوں اور سکھوں کے سینکڑوں لطیفے اسے زبانی یاد تھے۔ ذرا سا چھیڑ دو اور کمرہ قہقہوں سے بھر جاتا تھا۔

وہ دن بھی گزر گیا۔ رات نے لوری دے کر پناہ گزینوں کو سلا دیا۔

مزارعہ اور عفت جلدی سو گئے۔ ارشد اور طاہرہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ستمبر کی رات کی خنک چاندنی کمرے روشن دانوں میں سے جھانک رہی تھی۔ کمرے میں چاندنی نے رومان بکھیر دیئے تھے۔ ارشد اور طاہرہ بھول ہی گئے تھے ا اینٹوں کے غیر ہموار فرش پر لیٹے ہوئے ہیں۔ کرنیں چلتی سرکتی ارشد کے سینے تک پہنچ گئیں۔ اس کی قمیص پھٹی ہوئی اور تن

اس کے بائیں گال کو لطیف جھونکوں کی طرح چھو رہی تھیں۔ اسے قرار سا محسوس ہوا — دیکھا، عفت اس کے سا لگی کھڑی تھی۔

"آنکھ کھل گئی، عفت؟"

"ہاں! ایک جاتی۔"

"جانے کتنے دن گزر گئے ہیں۔"

"آٹھ یا دس دن۔"

"نہیں! زیادہ!"

"شاید زیادہ!"

"امی یاد آتی ہیں؟"

"بہت کچھ یاد آتا ہے۔"

"بھول جاؤ۔"

"تو اور کیا!"

"اب نیا گھر بسے گا۔"

"نئے لوگ ہوں گے۔"

"زندگی ہی نئی ہو گی۔"

"خوبصورت زندگی۔"

"خوش باش زندگی۔"

"پاکستان۔"

"ہماری سرزمین۔"

"اپنا دیس۔"

"اللہ سلامت رکھے۔"

"یہاں کب تک رہیں گے؟"

"چند دن اور!"

"ارشد نے بتایا تھا؟"

"ہاں!"

"مکان مل جائے گا؟"

"بہت خوبصورت!"

کھلے تھے۔ پسینے نے سیلاب کی مٹی کے نشان سینے سے دھو ڈالے تھے اور سینے کی سرخی مائل سپیدی نکھر آئی تھی۔

"نیند نہیں آرہی، طاہرہ؟"

"نہیں۔ بالکل ہی نہیں۔ باہر چلیں؟"

"گھومنے کو جی چاہتا ہے؟"

"ہاں!"

"چلو۔"

اور تھوڑی دیر بعد وہ رفیوجی کیمپ سے ذرا دور ریلوے لائن کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ چمکتے پانی کی دھار لکیروں کی طرح، ریلوے لائن حدِ نگاہ تک سیدھی چلی گئی تھی۔ پورے چاند نے سوئی ہوئی دنیا پر سفید اور لطیف پردہ ڈال دیا تھا اور اس پردے میں سے ہر چیز کا حسن جھانک رہا تھا۔ چاندنی خاموش تھی۔ درخت اور کھیت خاموش تھے۔ ساری کائنات پر سکوت طاری تھا۔ رات کی لذت آگیں خنکی میں طاہرہ اور ارشد جاگ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ذرا ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے لیکن دل قریب۔ بہت ہی قریب۔ جانے کس طرح ارشد کا ہاتھ طاہرہ کے ہاتھ میں چلا گیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں الجھ گئیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک چہرے پر چاندنی پوری طرح پڑ رہی تھی اور دوسرے پر اپنے ہی چہرے کا سایہ تھا۔ اس چہرے کا تاثر سائے میں بھی اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے تاثرات تو اندھیرے میں بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ دیکھے نہیں جاتے، محسوس کیے جاتے ہیں۔

دونوں ہاتھوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دونوں ہاتھوں نے ایک دوسرے کو دبایا۔ پھر جانے کس نے پہل کی اور جانے کس کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ طاہرہ کا سر ارشد کے سینے پر تھا۔ اس کے جڑے ہوئے اور مٹی سے اٹے ہوئے بالوں میں ارشد کی انگلیاں خوبصورت سانپوں کی طرح رینگ رہی تھیں۔ پھر باتیں ہوتی رہیں۔ باتیں ہی باتیں۔ جلال آباد میں پہلی ملاقات کی باتیں۔ پہلے جلوس سے لے کر رفیوجی کیمپ تک پہنچنے کی باتیں۔ ان باتوں کے دوران ارشد نے طاہرہ کو ایک بار پھر وہ نوٹ اور زیورات دکھائے جو خاتون نے اس رات گھر پر سکھوں کے حملے سے پہلے اسے کمرے میں لے جا کر اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ اس روز سے ارشد نے انہیں کمر کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ ایک روز اس نے دو الگ تھلگ ویرانے میں جا کر نوٹوں کو دھوپ میں پھیلا کر خشک کر لیا تھا۔

ارشد نے طاہرہ کو بتایا کہ ابھی اسے اپنے خاندان کا پتہ نہیں چلا۔ یہ یقین ضرور تھا کہ وہ لوگ بخیر و خوبی لاہور پہنچ گئے ہیں اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ انہوں نے مکان کا بھی بندوبست کر لیا ہوگا۔ ارشد نے طاہرہ کو یہ بھی بتایا کہ اب ان کی زندگی کا ایسا دور شروع ہونے والا ہے جو فردوس کی زندگی سے کم نہ ہوگا۔

پھر پیار کی باتیں چل پڑیں اور چلتی ہی رہیں۔ چاند نے دونوں پر کیکر کے درخت کا سایہ ڈال دیا اور خود اس کی اوٹ میں ہو گیا۔ چاند کو بھی معلوم تھا کہ یہ دونوں اللہ کے سپاہی ہیں۔ فاتح ہیں۔ میدان جنگ کے تھکے ہوئے ہیں۔ یہ چوری کی ملاقاتیں کرنے والے لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا نہیں۔

اس رات کے بعد طاہرہ کے دل و دماغ میں جلال آباد اور امی خاتون کی تصویریں دھندلی ہونے لگیں اور ارشد کا خیال سوچ و فکر پر غالب آنے لگا۔ خواب بھی سہانے ہو گئے اور رفیوجی کیمپ کی گھٹن اور کوفت بھی ختم ہو گئی۔

ایک دن طاہرہ ارشد کے سامنے کھڑی تھی تو اس نے ارشد کی پھٹی ہوئی قمیض کے کھلے ہوئے گریبان کو پکڑ کر عجیب سی بے تابی سے کہا — "کب آئے گا وہ دن جب میں تیری قمیض کے بٹن ان ہاتھوں سے لگاؤں گی؟" اس کے لہجے میں بیقراری تھی۔ اس نے نیچے والا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور ارشد نے نہایت آہستگی سے اس کے گال پر تھپکی دی اور مسکرا کر گریبان چھڑا لیا۔

طاہرہ نے ارشد کو کئی بار کہا — "اتنے پیسے پاس ہیں، اپنے لیے ایک تہبند، قمیض اور جوتوں کا ایک جوڑا لے آؤ۔ تمہیں ہر روز باہر جانا پڑتا ہے۔" لیکن ارشد نے ہر بار ٹال دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک وہ اچھے سے مکان میں نہ چلے جائیں، اچھے کپڑے نہیں بنوائیں گے اور ایک بار اس نے کہا تھا — "میں سب سے پہلے تمہارے اور عفت کے کپڑے بنواؤں گا۔"

ارشد روزمرہ کی طرح اپنے خاندان کی تلاش میں لاہور کی خاک چھاننے کے لیے نکل گیا۔ طاہرہ اور عفت وقت گزارنے کی خاطر گپوں میں مصروف ہو گئیں۔ مزارعہ کہیں کیمپ کی سیر کو نکل گیا تھا۔ عفت نے طاہرہ سے پوچھا — "طاہری! سچی بتاؤ! ارشد تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

طاہرہ کو یہ سوال عجیب سا لگا۔ اس نے عفت کا دل بہلانے کی خاطر مسکرا کر پوچھا — "کیوں؟ تجھے اچھا نہیں لگتا؟"

"کیوں نہیں!" عفت نے کہا — "خدا کی قسم طاہری! ارشد بہت ہی پیارا آدمی ہے لیکن... لیکن طاہری!" عفت کا تاثر بدل گیا اور ذرا سے توقف کے بعد بولی — "ارشد کب تک ہمارے ساتھ رہے گا۔ اپنے خاندان کا پتہ ملتے ہی وہ اپنے گھر جا رہے گا اور ہم اکیلی کہاں ماری ماری پھریں گی؟"

"ایسا نہیں ہوگا، عفت!" طاہرہ نے اسے بتایا — "ہم اب ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ میں تیری شادی اپنے ہاتھوں کروں گی۔ اتنا زیور دوں گی کہ دنیا تجھے دیکھے گی۔ اور تیرے لیے وہ خاوند تلاش کروں گی کہ تمام عمر جنت میں گزارو گی۔ وہ تجھے بنگلے میں رکھے گا۔"

"اور تمہاری شادی؟"

"ارے میری بھی ہو جائے گی۔ بخدا مجھے اپنے سے زیادہ تیری فکر ہے..." طاہرہ نے بڑی بہنوں کے پیار سے کہا — "میں نے تمہاری زندگی کا ذمہ اٹھایا ہے، عفت! میں تو تمہارے لیے بڑی سے بڑی قربانی کر سکتی ہوں اور کہو تو اپنا دل بھی نکال کر تمہیں دے دوں۔"

عفت کے آنسو نکل آئے۔

"کیوں؟" طاہرہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا اور اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ عفت اس کی آغوش میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ "یہ آنسو کیوں؟"

"سوچتی ہوں طاہری! امی مرتے مرتے لیے کیا کچھ کر گئی ہیں"

"بہت کچھ..." طاہرہ نے پوچھا۔ "کیوں؟ شک ہے تمہیں؟"

"نہیں شک تو نہیں"... عفت نے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مسلتے ہوئے مدل سے لہجے میں کہا۔ "...ہوں کوئی ایسا دوراہا نہ آجائے کہ ہم الگ الگ ہوجائیں۔ کون جانے کل کیا ہوگا۔ انسانوں کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔"

"یہ کیا قصہ لے بیٹھی ہو تم؟" — طاہرہ نے غصے سے کہا — عفت کا یہ اندازِ تکلم اس کے لیے اجنبی

"یوں ہی خیال آتا ہے، طاہری!" — عفت نے آہ بھر کر کہا — اس کی آواز میں اداسی تھی۔

عفت طاہرہ سے بہت ہی مختلف تھی۔ اس نے زندگی کے چودہ برس یعنی بچپن کا تمام تر دور، ماں کے ساتھ اندھیری کوٹھڑی میں تہ در تہ غربت میں گزارے تھے۔ ماں لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھ کر اور اوپر کا کام کر کے چند روٹیاں کماتی تھی۔ اسی میں عفت پلتی بھی تھی جب غریب لڑکیاں چاؤ چونچلے اور نت نئی فرمائشوں سے ماں باپ کا کر دیتی ہیں۔ اس عمر میں عفت نے محلے کے اچھے گھروں کی اُترن پہنی تھی۔ یہ محرومیاں آسیب کی طرح شخصیت اور کردار رہتی اور دل و دماغ کو وہموں اور وسوسوں سے بھرے رکھتی ہیں۔

طاہرہ نے عفت کو اندھیری غربت سے نکال کر برتری کی راہ دکھائی تھی۔ اس نے اسے اچھے دن اور پرسکون دکھائیں جس کے اثر سے عفت بظاہر وہ عفت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ صورت جس پر سانولے سائے منڈلاتے رہتے کر حسن و شباب کا شاہکار بن گئی تھی۔ غربت کے بوجھ سے جھکی گردن تن کر اس کی خوبصورتی کو دلنشیں بنا رہی تھی۔ چال میں خود اعتمادی اور شان سی پیدا ہو گئی تھی۔ بال جو سرسوں کے گاڑھے تیل سے چپکے رہتے تھے، دھل کر ریشم کے تار بن اور اب عفت حسن و جمال میں طاہرہ کا مقابلہ کرتی تھی۔ دونوں کے ظاہری حسن میں بہت معمولی فرق تھا۔

پھر بھی اوائل کے تلخ اثرات لاشعور سے اُبھر ہی آتے۔ رفیوجی کیمپ میں ان اثرات اور لڑکپن کی گھناؤنی اسے اس شک میں ڈال دیا کہ طاہرہ اور ارشد اسے راہ میں ہی چھوڑ دیں گے۔ یہ شک ایک احساس بن کر اسے پریشان لگا۔ اس احساس کی محرک شاید اس کی پھٹی پرانی قمیص اور ظاہری حال حلیہ تھا۔ اس قمیص نے شاید اس کے ذہن پرانی یاد تازہ کر دی تھی، حالانکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ طاہرہ اور ارشد بھی اسی حال میں ہیں — "لیکن اس قدر زیور اور ارشد اور طاہرہ کے پاس ہے"... عفت نے سوچا — "اس میں میرا کیا حصہ ہو سکتا ہے؟ اس پر میرا تو کوئی جلال آباد کی بات اور تھی۔ وہاں تو طاہرہ کی امی کی بے انداز آمدنی تھی۔ مجھ جیسی چھ اور لڑکیاں اس آمدنی میں آسا پل سکتی تھیں اور اب تو یہی زیور اور روپیہ ہے کب تک چلے گا؟"

طاہرہ ماہرِ نفسیات نہیں تھی۔ وہ سمجھی کہ ماں کی موت نے، قتلِ عام کی ہیبت اور ہولناکی نے اور بے نے عفت کو مغموم اور پریشان کر دیا ہے۔ وہ اسے تسلی دلاسہ دینے لگی اور سمجھی کہ اس نے اسے بہلا لیا ہے مگر چہرہ بتا رہا تھا کہ جو وہم اس کے ذہن میں سما گیا ہے اسے وہ بیان نہیں کرنا چاہتی یا اس کے پاس اظہار الفاظ نہیں۔

رفیوجی کیمپ کی زندگی کاہلی اور تعطل کی زندگی تھی۔ پاکستان سے متعلق احترام اور جذبات تو اپنی جگہ تھے اور یہی ان اجڑے ہوئے لوگوں کا سہارا تھا لیکن چھوڑے ہوئے گھروں کا خیال، بچھڑے ہوئے عزیزوں کی یاد اور مستقبل کا فکر اپنی جگہ ایک حقیقت تھی — اٹل اور تلخ — ایک وہ تھے جو راہ میں شہید ہوئے۔ دوسرے وہ جو زخمی ہوئے اور تیسرے وہ جنہیں کچھ بھی نہ ہوا لیکن ایک خوف و ہراس ان کے اعصاب کو ابھی تک کچل رہا تھا۔ وہ رات سوتے میں بھی بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے تھے۔ اس خوف و ہراس کے علاوہ یہ بوجھ بھی ایک سوال بن کر ان پر سوار تھا — "اور اب؟"

اب یہ لوگ ایسے مقام پر کھڑے تھے جہاں سے اپنے گھروں کو واپس جانے کا تو سوال ہی ختم ہو چکا تھا لیکن نئے گھروں میں جانے کا سوال بھی تو ابھی سوال ہی تھا۔ یہ سوال کیمپ کے ہر باشندے کی آنکھوں میں جھلکتا تھا اور بعض تو سراپا سوال بنے دن بھر کیمپ میں گھومتے رہتے تھے۔ جہاں چار آٹھ آدمی اکٹھے کھڑے دیکھے وہاں جا کان لگاتے شاید کوئی تازہ خبر کان میں پڑ جائے لیکن وہاں تو ابھی تک ایک ہی خبر ہر روز دہرائی جا رہی تھی — "آج فلاں جگہ کے اتنے سو پناہ گزیں آئے ہیں"۔

سردیاں سکھوں کے جتھوں کی طرح تیزی سے چلی آ رہی تھیں اور ان لوگوں کے پاس سوائے بوسیدہ فوجی کمبلوں کے کچھ بھی نہ تھا۔ کیمپ کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی اور اب لوگ بلند آواز سے پوچھنے لگے تھے — "ہمیں کب بسایا جائے گا؟" یہ سوال پوچھنے اور اسی موضوع پر باتیں کرنے کے سوا ان لوگوں کے پاس اور کوئی کام نہ تھا۔ سیاست دان اس دور کو عبوری دور کہتے ہیں لیکن یہ لوگ تو کچھ بھی عبور نہیں کر رہے تھے۔ فارغ بٹھا دیے گئے تھے۔ قوم کا ایک بازو ہی مفلوج ہو گیا تھا۔ جن کے بازو لمبے تھے وہ کرشن نگر، سنت نگر اور ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے گھروں تک از خود پہنچ گئے تھے اور جن کا ملا تھا ان کا صرف خدا تھا۔ خدا کے گھر میں صرف ایک حجرہ تھا جس میں مُلا کا بسیرا تھا۔

پھر بھی لوگ ایک امید کے بل بوتے پر کبھی کبھار مُسکرا ہی لیتے تھے۔

ارشد اپنے خاندان کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ مزارعہ بھی گھوم پھر کر کمبل پر بچھ گیا تھا۔

"چلو ذرا اڑوس پڑوس کی خیر خبر لیں"۔ طاہرہ نے عفت سے کہا "اتنے دن ہوتے یہاں آتے ہوئے کسی سے کبھی بات تک نہیں کی"۔

انہوں نے دائیں طرف دیکھا۔ بڑی لمبی بارک کے لمبے برآمدے میں، عورتوں، بچوں اور تھکے ماندے مردوں کی ٹولیاں بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں یا خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔ طاہرہ اور عفت برآمدے سے نیچے نیچے، برآمدے کے ساتھ ساتھ، آہستہ آہستہ چل پڑیں۔ وہ ان بے خانماں کنبوں کو دیکھتی جا رہی تھیں لیکن انہیں کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ ہوش تھا کہ دوسرے کو دیکھے۔ وہاں تو اپنا حال ہی نہ دیکھا جاتا تھا۔

"بغیر پیسے دھیلے کے مکان میں جا بیٹھنے سے کیا فائدہ؟" طاہرہ کے کانوں میں ایک مردانہ آواز پڑی۔

اس نے دائیں طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی ایک سے کہہ رہا تھا — "سو دو سو کا بندوبست ہو جاتے تو چھابڑی ایسی بغیر روزگار مکان میں جا بیکار ہے۔ کیمپ میں دو وقت کی روٹی تو مل جاتی ہے"۔

طاہرہ نے رک کر عفت کو بھی روک لیا۔ دونوں اس کُنبے کو دیکھنے لگیں۔

"آؤ بی بی بیٹھو.... اکیلی ہو کہ مرد بھی ساتھ ہیں؟" ایک عورت ان سے مخاطب ہُوئی۔ "تم دونوں بہنیں معلوم
دونوں ان کے پاس فرش پر بیٹھ گئیں۔ طاہرہ نے کہا — "ہم جلال آباد سے آئے ہیں۔ مرد ساتھ ہیں۔"
یہ موقع کہانیاں سنانے کا نہیں تھا۔ کہانیاں بھی نئی نہیں تھیں۔ سب کے سینے پر ایک ہی کہانی لکھی ہُوئی
سب ایک ہی کہانی اٹھاتے اٹھائے پھرتے تھے۔

"آپ کو شاید مکان مِل گیا ہے؟" — طاہرہ نے پُوچھا — "آپ کہہ رہے تھے۔"

"ہاں بیٹی!" عورت نے کہا۔ "مکان تو مِل گیا ہے۔ اللہ خوش رکھے، اپنے رشتہ دار لاہور میں پہلے سے موجود
نے ایک مکان کو تالا لگا لیا ہے۔ کل دیکھ بھی آئے ہیں لیکن وہاں جا کر کریں گے کیا؟ ترن تارن میں چھوٹی سی دوکان
بچے کا پیٹ بھر جاتا تھا۔ اب پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ یہ دیکھتے! چار بچے ہیں۔ اُوپر سے سردی چڑھی آرہی ہے۔ بھو
مرے تو جاڑے میں مرجائیں گے۔" عورت کے آنسو نکل آتے۔

"آپ کو کتنا روپیہ چاہیئے؟" — طاہرہ نے پُوچھا — "آپ کم از کم کتنے میں دکان کھول سکتے ہیں؟"

"یہ تو سوچنا ہی بیکار ہے"، بچوں کے باپ نے فرش پر بے چینی سے کروٹ بدلی اور کہا۔ "پیسے کا ہی تو سوال
اس سوال کا کوئی حل نہیں۔ سچی بات ہے کہ قلی گیری ہوتی نہیں۔"

"نہیں! میں ویسے ہی پوچھ رہی ہوں" — طاہرہ نے کہا — "اللہ کارساز ہے انسان ہمت تو کرتا ہے۔"

"دوکان کھولوں تو ایک ہزار روپیہ چاہیئے" — اُس نے آہ لے کر جواب دیا — "ہزار کی دوکان میں پانچ سا
روز کے نکل آتے ہیں اور چھابڑی کے لیے تو سَو دو سَو بھی بہت ہیں لیکن چھابڑی میں جھک جھک زیادہ ہوتی ہے
ان بچوں کا فکر کھاتے جا رہا ہے۔ بی بی! ذرا دیکھو تو! بڑا بچہ پانچویں میں پڑھتا تھا اور چھوٹا تیسری میں۔ اب یہ اجڑ کے
گئے اور تمام عمر مزدوری یا چپڑاس کرتے رہ گئے۔ جانے میں نے کیا کیا سوچا تھا۔"

"فکر نہ کریں" — طاہرہ نے حوصلہ افزا خود اعتمادی سے کہا۔ "اب تو اپنی حکومت ہے۔ کوئی بھوکا نہیں
کوئی بچہ بغیر تعلیم کے نہیں رہے گا۔ ہم نے جو خون پسینہ بہایا ہے ائیگاں نہیں جائے گا۔"

"ہاں، بی بی!" — اس نے کہا — "میں مایوس تو نہیں ہوں۔ اس سبز جھنڈے پر بھروسہ ہے۔"

"ہاں! یہ بات!" — طاہرہ نے کہا — "ہم نے پاکستان بنایا ہے، جھک تو نہیں ماری۔"

مرد باتیں کرتا رہا اور طاہرہ اس کے بچوں کو دیکھتی رہی۔ بچوں نے ماں کو روٹی کے لیے پریشان کرنا شروع
ماں انہیں ٹال رہی تھی۔ طاہرہ یہ منظر زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور عفت کو لیے واپس آگئی۔

ارشد دن کے پچھلے پہر واپس آیا۔ پسینے میں نہایا ہُوا۔ آتے ہی انگور سے بھرا ہُوا لفافہ لڑکیوں کے سا
کر بولا — "آج پہلی بار ہوٹل میں روٹی کھائی ہے اور تمہارے لیے انگور لایا ہوں.... آجا بیٹھے!" اُس نے
مسکراہٹ سے مزارعہ کو بھی بلایا۔

"کچھ پتہ چلا؟" — طاہرہ نے انگور کا لفافہ پھاڑ کر پھیلاتے ہُوئے کہا۔

"اسی خوشی میں تو انگور لایا ہُوں" — ارشد نے خوشی سے بھرپور آواز میں بتایا — "ابا جان کے ایک واقف کار
اتفاق سے مِل گئے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ میرا سارا خاندان راوی روڈ پر کہیں ایک بہت بڑی کوٹھی میں مقیم ہے۔ ابا جان
کو اسی محکمے میں اسی پوسٹ پر لے لیا گیا ہے لیکن اس آدمی کو کوٹھی کا پورا پتہ معلوم نہیں تھا۔ پھر میں ابا جان کے دفتر گیا۔
معلوم ہُوا وہ دس روز کی چھٹی پر ہیں۔ کوٹھی کا وہاں بھی کسی کو پتہ معلوم نہ تھا۔ اب سات آٹھ روز اور خاک چھاننی پڑے گی۔"

"کیمپ میں انگور بے جا سا لگتا ہے" — طاہرہ نے عام سے لہجے میں کہا — "بخدا لوگوں کی حالت بہت
بُری ہے۔ آئندہ یہ عیاشی یہاں نہ کرنا کہیں مکان مِل گیا تو دیکھا جائے گا۔"

پھر طاہرہ نے اس آدمی کے متعلق جس کے پاس وہ آج بیٹھی رہی تھی تفصیلات سنا کر — "میرا خیال ہے کہ —
ایک ہزار روپیہ دے دیا جائے۔ بے چارہ روزگار کا بندوبست کر لے گا، ورنہ اس کے چار بچے سردی میں مرجائیں گے۔ اسی
بے روزگاری کی وجہ سے وہ مکان میں نہیں جا رہا۔"

اسی رات ٹمٹماتے دیئے کی روشنی میں وہ آدمی اور اس کی بیوی، ارشد، طاہرہ، عفت اور مزارعہ کی محفل میں بیٹھے ہوئے
تھے اور طاہرہ اسے کہہ رہی تھی۔ "یہ ایک ہزار روپیہ قرض نہیں ہے۔ کل ہی مکان میں چلے جاؤ اور دوکان کا بندوبست کر لو۔"

"اور دیکھو، بڑے میاں!" ارشد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تحکمانہ لہجے میں کہا — "میں وہاں آکر دیکھوں گا۔ اگر
ایک ہفتے کے اندر تم نے دوکان نہ کھولی اور اس رقم کو گھر بیٹھے بیٹھے پیٹ کی نذر کر دیا تو سُن لو! پولیس کے حوالے کر دوں گا۔
سُن رہے ہو نا؟"

"میرے مالک!" — آدمی نے ہاتھ جوڑ کر فدویانہ انداز میں کہا — "میرے بچے ساری عمر تجھے اور تیری ان بہنوں
کو دعائیں دیتے رہیں گے۔"

طاہرہ اور عفت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مُسکرا دیں۔

دوسرے دن ایک خاندان آباد ہونے کے لیے جا رہا تھا۔ اُنہوں نے ایک بار پھر طاہرہ اور ارشد کو الوداعی سلام
کہا اور دعائیں دیں اور نئی زندگی کی طرف روانہ ہو گئے۔

"چلو ایک ہزار روپیہ ٹھکانے لگا" — ارشد نے اطمینان کی آہ لے کر کہا۔

"میں تو کہتی ہوں کہ باقی روپیہ بھی اسی قسم کے مستحق لوگوں کو دے دیا جائے" — طاہرہ نے کہا — "اور زیورات
اپنے لیے رہنے دیں۔"

"طاہرہ! تم بہت سادہ لڑکی ہو" — ارشد نے کہا — "مستحق لوگوں کی تلاش بڑی مشکل ہے۔ مجھے ڈر ہے یہ لوگ
یہ حرام کا روپیہ سمجھ کر یوں ہی برباد کر دیں گے۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ یہ روپیہ اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا جائے
ضرورت کے مطابق ادا کیا جائے۔ جذبات میں دینا محض برباد کرنے والی بات ہے۔"

یہ رات بھی ہر رات کی طرح خاموش ہو گئی۔ ارشد اور طاہرہ اپنے دونوں ساتھیوں کو سوتا چھوڑ کر چاندنی میں لیٹی

ہُوئی اس حسین خاموشی میں گم ہو گئے۔ جہاں وہ گذشتہ رات جا بیٹھے تھے۔ گذشتہ رات انجن کی وسل نے انہیں محبت کی بے خودی سے جگا دیا تھا لیکن وہ آج ریلوے لائن سے دور کھُلے میدان میں بیٹھ گئے جہاں ہر طرف پھیلے ہُوئے گھاس کی روح افزا بھینی بھینی خوشبو رومان جگا رہی تھی۔ پنجاب کی خنک رات کا رومان عروج پر تھا۔ طاہرہ نے ارشد کی طرف دیکھا اور چند ثانیئے اسے دیکھتی ہی رہی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ارشد پر طاری تھی۔

وہ خاموش تھے لیکن ان کے دل خاموش نہیں تھے۔ سینوں میں ہل چل تھی۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیاں ایک [illegible] ان کے سامنے [illegible] میدان تھا جس کے [illegible] طرف ریفیوجی کیمپ کی [illegible] تھیں اور بارکوں کے برآمدوں میں مشرقی پنجاب کا سارا حُسن، ساری زندگی کی گہما گہمی اور ہما ہمی قید ہو کے رہ گئی تھی۔ لہلہاتے فصلوں میں رقص کرتے ہیر وارث شاہ کے بول۔ مرزا صاحباں کی بولیاں۔ لڑکیوں کے الہڑ گیت۔ بچّوں کے معصوم قہقہے، دوشیزاؤں کی ککلی۔ کبڈی کے ڈھول، گھوڑوں کی دوڑ اور مشرقی پنجاب کی تمام تر موسیقیت اور سرگرمی سمٹ سمٹا کر ان مخروطی چھتوں کے نیچے سو گئی تھی۔ ارشد کو آج پہلی بار محسوس ہُوا کہ وہ روح پرور ہنگامے مجبور ہوتے جا رہے ہیں۔

"خاموش رہو گے آج؟" —— طاہرہ نے خوابناک آواز میں پوچھا۔

ارشد نے طاہرہ کی طرف دیکھا اور بازو اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔ اس نے آہ لی، کوئی جواب نہ دیا۔

"کیوں؟" —— طاہرہ تڑپ اُٹھی۔

"بعض اوقات دل بوجھل سا ہو جاتا ہے" —— ارشد نے دکھی ہُوئی مسکراہٹ سے کہا —— "سوچتا ہُوں یہ مجبور زندگی کیا ایک بار پھر ہنس کھیل سکے گی؟"

"یہ مجبور تو نہیں!" —— طاہرہ نے کہا۔

"نہیں!" —— ارشد بولا —— "میرا وہ مطلب نہیں۔ ہم نے شہیدوں کا خون دے کر ایک نئی زندگی حاصل کی ہے۔ میرا مطلب اس رچاؤ سے ہے جو مشرقی پنجاب کے در و دیوار اور گندم کے ایک ایک خوشے میں تھا۔ وہ بات پیدا نہ ہو سکے گی، طاہرہ! سوچتا ہُوں یہ مجبور تمدّن دال روٹی کے دھندے میں ہی دم نہ توڑ دے۔ وہ دیس چھوڑنے کا تو مجھے کوئی رنج نہیں۔ یہ خوشی اپنی جگہ ہے لیکن انسانوں کی وہ بیساختہ مسکراہٹیں۔ وہ اڑتے ہُوئے دوپٹے، وہ مونچھوں پر تاؤ، وہ گیت، وہ جھولے....."

"الف اَج دی رات سہاگ والی ہِٹکے کی جاناں کیہڑا رنگ ہوسی"

کیمپ کے اس کونے سے ایک سریلی اور پُرسوز آواز بلند ہُوئی۔ رات کا سکوت بھی وجد میں آ گیا۔ چاندنی جھوم اٹھی۔ موسیقی محسوس لہروں کی طرح ارشد اور طاہرہ کے گرد منڈلانے لگی۔ طاہرہ کے جسم نے جھرجھری لی اور وہ ارشد کے قریب ہو گئی۔

"وہ زندگی زندہ ہے ارشد!

"اسی فیر نہ آ کے کھیڈنا اسی تُساں بھلا بھلیوڑہ سنگ ہوسی"

دل مرا نہیں کرتے، ارشد! سینوں سے نکلی ہُوئی موسیقی کی تانیں مُردوں کو بھی جگا دیتی ہیں"

"کوئی گل دسو جیہڑی یاد رکھاں جدوں باز تساں دل تنگ ہوسی"

"تیری آواز مکے اور مدینے" ارشد نے سکُون کی آہ لی اور اپنا گال طاہرہ کے سر پر رکھ دیا۔ کسی سینے سے نکلی ہُوئی نغمے کی لمبی تان چاندنی کی لطیف لہروں پر تیر رہی تھی۔ سبز گھاس کی پتیاں لرزہ براندام تھیں۔

"میلے فیر محمد قسمتاں دے کِتھے شمع تے کِتھے پتنگ ہوسی"

"یہ لوگ زندہ ہیں" —— ارشد نے جوش میں کہا۔

"ہم سب زندہ ہیں" —— طاہرہ نے وجد میں کہا۔

خاموشی —— طویل خاموشی اور اس خاموشی پر رقص کرتی ہُوئی نغمے کی بازگشت۔

"ارشد!" —— ایک آہ، زیرِ لب۔

"طاہرہ!" —— ایک سرگوشی، خواب آلود۔

آنکھیں ایک دوسرے کے قریب ہو گئیں۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں پھیلتی چلی گئیں۔ قریب اور قریب چاندنی شب کی مسحور کن موسیقی سے مسحور و بے خود ہو رہی تھی۔ نغموں کی گونج ابھی تک فضا میں تیر رہی تھی۔ آنکھیں ایک دوسری میں جذب ہو لیتیں۔ دو دل ایک دوسرے کے ساتھ لگے دھڑک رہے تھے۔ انجن نے وسل دی لیکن دُور بہت دُور سے پھر ایک شور، ایک گڑگڑاہٹ۔ لوہے کے پہیوں نے لوہے کی پٹڑی پر قیامت خیز واویلا بلند کیا جو طاہرہ اور ارشد کے سینوں میں اٹھتے طوفانوں میں تحلیل ہو گیا۔ انجن کے دھوئیں نے ان پر سایہ کر لیا۔ چاند بے آواز یا سفر طے کرتا گیا اور کیکر کی شاخوں میں اٹکنے لگا۔

"رات گذر رہی ہے"

"گذر گئی ہے"

"مُرغ اذانیں دے رہے ہیں"

"سحر طلوع ہو رہی ہے"

"چلیں"

"کوئی بات تو کی نہیں"

وہ اُٹھے۔ چلے۔ رکے۔ رک کر چلے۔ یوں جیسے چاند کی اونگھتی کرنوں کے سہارے چل رہے ہوں۔ بازو ایک دوسرے کی کمر کے گرد۔ فطرت انہیں چوم رہی تھی۔ بزبان خاموشی کہہ رہی تھی —— "یہ تمہارا انعام ہے۔ تم نے کعبے کو جبینوں سے لیپا یا۔ تم نے خدا کا نام سبز پرچم پر لکھ کر کافر کے سینے پر لہرایا ہے۔ تم تھکے ہوئے ہو۔ ستا لو۔ میرے بچو! کھیلو۔ اب کھیلو۔ خُدا کا ہاتھ تمہارے دل پر ہے"

جب وہ کمرے میں داخل ہوتے تو کمرے کا سارا ماحول سو رہا تھا۔ ارشد لیٹتے ہی سو گیا لیکن طاہرہ نہ سوسکی۔ چاند سا
بارک کے کونے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور اس کی تھکی ہوئی ایک کرن کھڑکی کی راہ عفت کے چہرے پر ستا رہی تھی۔ طاہرہ اس پرُشبا
حسین چہرے کو دیکھنے لگی — کتنا پاک چہرہ، کس قدر معصوم — طاہرہ نے ہاتھ بڑھایا کہ عفت کی پیشانی پر پڑے بال پیچھے کر دے
ہاتھ رک گیا، وہ جاگ نہ اُٹھے۔ جانے کیا خواب دیکھ رہی ہوگی۔ طاہرہ اسے دیکھتی رہی اور زیرلب کہا۔

"میری پیاری عفت! یہ سارا زیور تجھے دے دوں گی۔ مَیں نے تجھے سب کچھ دینے کا وعدہ کیا ہے جو مانگو گی دو
لیکن دیکھنا، میری بہن! کہیں ارشد ہی مجھ سے نہ مانگ لینا۔ یہ متاع عزیز نہ دے سکوں گی.... سنا میری اچھی عفت؟ اچھا!
طاہرہ کی سرگوشی خواب کی آواز بن گئی۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد ارشد حسب معمول اپنے خاندان کی تلاش میں نکل گیا۔ طاہرہ اور عفت ساتھ والی بارک
دوسرے پر چلی گئیں۔ طاہرہ نے آج پھر دو کنبے ڈھونڈ نکالے جنہیں مکان تو مل گیا تھا لیکن روزگار کی کوئی صورت نہیں
طاہرہ نے رات کو ان کے مردوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ ارشد سے پانچ پانچ سو روپیہ لے کر ان کے حوالے کر
ور انہیں کہا — "یہ روپیہ تمہارے پاس خدا کی امانت ہے اگر اس میں خیانت کرو گے تو خدا تم سے جواب طلبی کریگا"
"طاہرہ!" — عفت نے ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد طاہرہ سے کہا — "اتنا روپیہ تم یوں ختم کرتی جا رہی
اپنا بھی کچھ خیال کرو۔ ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں"

"ہمارا خیال خُدا کرے گا عفت" — طاہرہ نے کہا — "اتنا روپیہ ہم اپنے پاس کس طرح دبا تے رکھیں جب
پڑوس میں ہی لوگ پیسے پیسے کو ترس رہے ہیں۔ کیا یہ گناہ نہیں کہ محض پانچ سو روپوں کی خاطر ایک کنبے کی زندگی تباہ
ہو اور ہم پانچ ہزار روپیہ سینے سے لگائے بیٹھے رہیں؟"
"تم یہ مت بھولو، طاہرہ! کہ تم لڑکی ہو۔ خدا جانے کل کوئی سہارا بھی ملے یا نہیں"
"اسے میری کمزوری ہی کہہ لو عفت! کسی کو تکلیف میں دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ معلوم نہیں میں خدا کو خوش کر رہی
یا اپنے آپ کو لیکن کسی کا ہاتھ بٹا کر مجھے لذت محسوس ہوتی ہے"

طاہرہ کو معلوم نہ تھا کہ اس کے باپ نے صرف اس لیے اس کا گلا گھونٹنا چاہا تھا کہ وہ لڑکی تھی۔ خاتون یہ راز اپنے
ہی دبائے سرحد پار گمنام قبر میں سو گئی تھی کہ ساجدہ کو لڑکی پیدا کرنے کے جرم میں مار دیا گیا تھا۔ اب تو یہ راز جلال آباد کے
ئے مکانوں کی راکھ میں جل بھُن گیا تھا۔

ارشد طاہرہ کے اس ایثار کی راہ میں مزاحم نہ ہُوا۔ اس کے اپنے جذبات طاہرہ سے ملتے جلتے تھے۔
شام کو ارشد کمرے میں داخل ہُوا اور "مُبارک ہو، گھر مل گیا، مبارک ہو" کے نعروں سے کمرے میں شگفتگی بکھیر دی
واپس جا رہا ہوں....؟" اس نے کہا — "رات کو واپس نہیں آؤں گا۔ ابا جان کی کوٹھی کا پتہ مل گیا ہے۔ خواہ تمام
اش میں گزر جاتے ڈھونڈ کے ہی دم لوں گا.... کوٹھی کا نام ہے 'آشیانہ'۔ صبح سویرے تم تیار رہنا۔ میں ٹانگہ لے
چلو نُورے کھانا لے آتیں.... ارے ہاں طاہرہ! کیوں نہ میں نورے کو ساتھ لے جاؤں۔ یہاں تمہیں کوئی ڈر خطرہ

تو نہیں؟"

"ہاں!"—— طاہرہ نے کہا —"اسے ساتھ ہی لے جاؤ تو بہتر ہے۔ رات کا وقت ہے اور تمہارے
وہ چپ ہوگئی اور ارشد کو فکر مندی سے دیکھنے لگی۔ ارشد نے خاصی رقم اور زیورات کمر سے باندھ رکھے تھے۔

ارشد اور مزارعہ رات کو چلے گئے۔ طاہرہ اور عفت ایک نئی امید اور ایک نئے ولولے کی بنیاد دل پر
قلعے بنانے لگیں۔ انہوں نے دنیا بھر کے پروگرام بنا لیے۔ باہر کی دنیا اونگھ رہی تھی اور یہ دونوں لڑکیاں خوشی کے
اچھل کود رہی تھیں۔ آخر طاہرہ نے دیا بجھا دیا اور دونوں لیٹ گئیں۔ بظاہر دونوں سونے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن
خیالوں میں ہیجان اور اضطراب تھا۔ دونوں کے تصورات اپنی اپنی راہ بنا رہے تھے اور دونوں کے ذہن الگ الگ
لے خواب دیکھ رہے تھے۔ چاندنی کی کرنیں روزن میں سے کمرے میں آ رہی تھیں اور کمرہ پُر اسرار ضو سے منور ہو

"نیند آ رہی ہے؟"—— عفت نے طاہرہ سے پوچھا۔

"آتی تو نہیں!"—— طاہرہ نے شگفتہ سی بے چینی سے جواب دیا۔

"کوئی بات کرو، طاہری!"

"تم ہی کچھ کہو۔"

عفت سرک کر طاہرہ کے قریب آ گئی۔ طاہرہ پیٹھ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ عفت اس کے قریب پیٹ
لیٹ گئی اور ایک ہاتھ طاہرہ کے گال پر رکھ کر پیار سے کہا —"طاہری! ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو!"

"تم ارشد کو چاہتی ہو؟"

طاہری نے ہنس کر کروٹ بدل لی اور عفت نے اس کی کمر کے گرد بازو لپیٹ کر اسے اپنی طرف
ارشد انہیں ایسا مژدہ سنا گیا تھا جس سے ان دونوں لڑکیوں کے غم جیسے ڈھل ہی گئے تھے۔

"تم نہیں چاہتی اسے؟"—— طاہرہ نے پوچھا —"ہم موت کی وادیوں میں ہم سفر رہے ہیں پھر
ہوں کہ میں ارشد کو نہیں چاہتی؟"

"اتنی بھولی نہ بنو طاہرہ"—— عفت نے کہا —"تم جانتی ہو میں کیا پوچھ رہی ہوں۔"

"مجھے ارشد سے تھوڑی محبت ہے"—— طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔

"طاہری!"—— عفت کے چہرے کا تاثر اور لب و لہجہ یک لخت بدل گیا اور وہ سنجیدگی سے بولی —
مجھے معلوم نہیں۔ میں نے وہ رونق اور چمک بھی دیکھی ہے جو ارشد کو دیکھتے ہی تمہارے چہرے پر اور آنکھوں
میں نے تم دونوں کو آدھی رات کے وقت باہر جاتے دیکھا ہے۔"

"ارے میں تو سمجھتی تھی تم سو رہی ہو گی"—— طاہرہ نے ہنسی مذاق کے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ طاہری!" عفت نے دکھی ہوئی سنجیدگی سے کہا —"میں جاگ رہی ہوتی تھی۔ میں نے بھی

کہ ارشد کا ہاتھ پکڑ کر اسے دُور الگ تھلگ لے جاؤں لیکن ... لیکن ... طاہری! میری ہستی اور حیثیت ہی کیا ہے۔ تم اونچے
خاندان کی لڑکی ہو اور ارشد بھی۔ میرا تم دونوں کے ساتھ کیا جوڑ ہے۔"

"تم غلط کہتی ہو"—— طاہرہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی —"میں نے تمہارے دل سے یہی اونچے نیچے کا
احساس دور کرنے کی خاطر جانے کیا کیا جتن کیے ہیں لیکن تم ابھی تک اسی دلدل میں پھنسی ہوئی ہو۔"

"کچھ بھی ہو"—— عفت نے سر کو جھٹک کر کہا —"ارشد کے معاملے میں تم بہرصورت مجھ سے برتر ہو ... میری سن
لو، طاہری! تم میری بہن ہو۔ تم نے ہی مجھے بہن بنایا ہے۔ آج اپنی بہن کی باتیں سُن لو ... ایک رات جب تم دونوں باہر
نکل گئے تو میں بھی پیچھے پیچھے چل دی۔ تم کیمپ کی دیوار سے بہت آگے نکل گئے اور میں دیوار کی اوٹ میں کھڑی رہی۔
معلوم نہیں میں کتنی دیر کھڑی رہی۔ میں رو بھی رہی تھی۔ میں کون تھی تمہاری راہ میں حائل ہونے والی، طاہری؟ ... تمہیں کہاں ہوش
ہوگا۔ کل رات جب ایک دل جلا جانے کس کے تصور میں اور کس کی یاد میں کھویا ہوا گا رہا تھا —— کوئی گل وسو جیہڑی یاد رکھاں
جدوں باز تساں دل تنگ ہوسی —— اس وقت میرے بھی دل سے یہی فریاد نکلی تھی کہ طاہری! تمہارے یوں چلے جانے کے
بعد میرا دل روتا ہے۔ مجھے بھی کوئی بات کہہ جایا کرو کہ اس روتے دل کو بہلا لیا کروں۔"

طاہرہ کا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا اور عفت کے سینے کے کواڑ ٹوٹ گئے۔ اس کے آنسو بہے جا رہے تھے اور
الفاظ کانپتے ہونٹوں سے پھسلتے ہی آ رہے تھے۔ وہ کہتی گئی اور طاہرہ سنتی رہی۔

"طاہری! تم نے مجھے کال کوٹھری میں سے نکال کر محل میں لا بسایا تھا۔ تم نے مجھے غربت کی گرد سے اٹھا کر نواری پلنگوں
پر سلایا تھا۔ تم نے میری اجڑی ہوئی زندگی کو مسکراہٹوں اور مسرتوں سے سجایا تھا لیکن تم جان ہی نہ سکی کہ میرے دل کی تمنائیں
تم نے یہاں آ کر کس بے دردی سے کچلیں اور میری امنگیں تم نے رات کی خاموشی میں مجھ سے چھین لیں۔"

"تم نے مجھ سے کبھی ذکر بھی کیا تھا کہ تم ارشد کو اس قدر چاہتی ہو؟"—— طاہرہ نے پوچھا۔

"میں کیوں ذکر کرتی؟"—— عفت نے جواب دیا —"تم نے مجھے ریشم کے کپڑے تو پہنا دیتے لیکن میرا دل اسی
کمتری میں ملبوس رہا۔ جو خدا نے میری قسمت میں لکھ دی تھی۔ تمہیں اور ارشد کو یکجا دیکھتی ہوں تو اپنے آپ کو مخمل میں کمبل کا پیوند
سمجھنے لگتی ہوں۔ ایسے میں میں بھاگ کر اسی کال کوٹھڑی میں جا چھپنا چاہتی ہوں جہاں سے تم نے مجھے نکالا تھا۔ میری
دنیا وہی تھی، طاہری! میں اس اندھیرے سے کبھی نہ نکل سکوں گی —— تمہیں یاد ہے، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں
جو مانگوں گی تم دو گی۔ میں اس وعدے کو دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ تم نے یہ کچا وعدہ اس لیے کیا تھا شاید میں زیور یا کوئی اور چیز
مانگوں گی۔ تم ہزار ایثار اور قربانیاں کرو، طاہری! لیکن تم مجھے ارشد تو نہیں دے سکتی!"

طاہرہ کے آنسو نکل آئے۔

"یہ ہے وہ دوراہا جس کا میں نے اس روز ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ انسانوں کو بدلتے دیر نہیں لگتی"—— عفت نے کہا —
میں نے کہا تھا کہ ڈرتی ہوں ہماری راہ میں ایسا دوراہا نہ آ جائے کہ ہم جدا ہو جائیں ... آہ، طاہری!"—— عفت نے طاہرہ کا ہاتھ
دبایا اور سسکی لے کر کہا —"وہ دوراہا آ گیا ہے۔ اب میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گی۔ ایک قدم بھی نہ چل سکوں گی۔ میں نے

بہت کوشش کی ہے کہ ارشد کو دل سے نکال دوں۔ میں اس کے خیال کو آنسوؤں میں بہانے کی کوشش کرتی رہی ہوں، لیکن آنسو بہہ گئے اور خیال خیال ہی رہا۔ دماغ پر سوار۔ اعصاب پر سوار۔ اور میں"...... عفت کی آواز دب گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔ ذرا رک کر بولی ——"میں نے غربت دیکھی ہے۔ بے مائیگی اور فاقہ مستی بھی دیکھی ہے۔ جی لوں گی طاہری! اکیلی ہی جی لوں گی، اب میں تمہارے ساتھ نہ چل سکوں گی۔"

"اگر میں تمہیں ساتھ چلا لوں تو؟" —— طاہرہ یوں بولی جیسے گہرے غار میں سے بول رہی ہو۔

"ناممکن ہے طاہری!"

"اگر میں ارشد کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں تو؟"

"پگلی!" —— عفت نے غمزدہ مسکراہٹ سے کہا —— "ٹوٹے ہوئے ستارے کس کے ہاتھ آتے ہیں؟"

"عفت!" —— طاہرہ بولی ——"کسی کی خاطر قربان ہونے کا جذبہ میری رگ رگ میں بھرا ہوا ہے۔ جانے کس نے بھر دیا ہے۔ جلال آباد میں تم نے دیکھا تھا کہ میں نے کس طرح تھانے کے سامنے اور اس کے بعد ہر جگہ اپنے آپ کو سُولی پر لٹکا لیا ہے۔ سینے میں ایک آگ لگی ہوئی ہے جو مجھ سے یہ سب کچھ کروا رہی ہے۔ اس کا انعام مجھے یہی ملا ہے کہ میری جائیداد کا نیں، تین ملز وہ ساری جائداد اور میری عزیز امی مجھ سے چھین لی گئی ہیں لیکن میں خوش ہوں۔ یہ چیزیں میری نظر میں ٹکتی ہی نہیں۔ عفت! اگر تم نے تمہیں پستیوں سے نکال کر بلندی پر پہنچایا ہے تو اب تمہیں یہاں سے نیچے نہیں پھینکوں گی۔ تم میری بہن ہو۔ ارشد تمہارا ہے ...... طاہرہ نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کی آواز حلق میں اٹکی گئی اور آخر اٹک کے رہ گئی۔ وہ ذرا سا چپ ہو کے روندھی ہوئی آواز میں بولی —— "میں ارشد کو تمہارے حوالے کر کے دم لوں گی۔"

"نہیں!" —— عفت نے کہا ——"یوں نہیں ہوگا۔ میں تمہاری نیکیوں کا یہ صلہ نہیں دوں گی، طاہری! ارشد تمہارا ہے اور میں تمہاری راہ سے ہٹ رہی ہوں۔ اپنی خوشی سے۔ اگر میں تم دونوں کے ساتھ رہی تو میں تم دونوں کے اعصاب پر ناگوار بنی رہوں گی۔ مجھے تم سے گلہ تو نہیں۔ یہ تو میرے احساسات تھے جو میں نے اصلی رُوپ میں تمہارے سامنے اگل دیئے ہیں۔ میں اب تم دونوں کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔ ہو سکتا ہے ...... نہ بولو، طاہری! آج کی رات مجھے بولنے دو۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔ مجھے مت روکو۔ کہہ لینے دو۔ ہو سکتا ہے میں تم دونوں کے ساتھ رہ کر تم دونوں کے درمیان کوئی بے مزگی پیدا کر دوں۔ میرا یہ رشک اور میری یہ غلط تمنا حسد کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ میں عورت ہوں۔ تم نے امیرانہ اور برتر ماحول میں پرورش اور تربیت پائی ہے۔ میں محرومی اور پستی میں پل کر جوان ہوئی ہوں۔ مجھ میں بلند خیالی اور بلند اخلاقی آ ہی نہیں سکتی۔ تمہیں کیا پتہ، طاہری، کہ میں سینے میں کیسے کیسے طوفان دبائے رکھتی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ طوفان اس شدت سے اُٹھ آئیں کہ میں دبا نہ سکوں نہ یہ دب سکیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہاری محبت کی نقب زنی پر اُتر آؤں۔ میں پستیوں میں پلی ہوں اور پستی پر نہایت آسانی سے اتر سکتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری ہستی میں بیٹھی ہوئی وہ پست عورت بیدار ہو جائے اور طاہرہ کی اُمنگوں کا گلا گھونٹ دے ...... طاہری! میری بہن! مجھے اپنی راہ لگ جانے دو۔ مجھے تم سے پیار ہے اور مجھے ...... طاہری! مجھے ارشد سے پیار ہے۔"

"اور ہم دونوں کو تم سے پیار ہے، عفت!" طاہرہ نے اس کے گال تھام کر کہا۔

طاہری محسوس کر رہی تھی کہ عفت پر بے خودی یا دورے کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اس کا بھی دکھ تھا۔ طاہرہ کو ایک جذبہ مجبور کر رہا تھا —— "تمہیں یہ قربانی دینی ہی ہوگی" —— ایک غیبی آواز اس کے کانوں میں کہہ رہی تھی۔ "تم پیدا ہی اس لیے کی گئی ہو کہ روتے دلوں کو ہنساؤ۔ یہی تمہاری راہ ہے۔ قربانی پیسے کی نہیں ہوتی۔ ایثار زیور اور جان کا نہیں ہوتا۔ کسی کی خاطر اپنا آپ اور اپنی امنگیں تباہ کر دینے کو ایثار کہتے ہیں۔ تم نے اس لڑکی کو ایک غار سے نکالا تھا۔ اب اسے تنہا نہ چھوڑ دینا ورنہ وہ ایسے غار میں جا گرے گی جہاں لوگ اس کی بوٹیاں بھی نوچ لیں گے۔ ان حالات میں اسے تنہا نہ چھوڑ دینا" یہ اس کی اپنی ہی آوازیں تھیں جو اجنبی صدائیں بن کر اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اس کی ایک حس مکمل طور پر بیدار ہو گئی تھی۔

عفت کہتی رہی۔ جانے کیا کہتی رہی اور طاہرہ اپنی ہستی سے اٹھتی آوازوں کو سنتی رہی۔ کوئی اسے کہہ رہا تھا "کوئی بعید نہیں کہ یہ لڑکی رات کے اندھیرے میں بھاگ اُٹھے۔ ان حالات اور اس ماحول میں ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کا بے آسرا ہو جانا مناسب نہیں۔ اس میں بہت خطرے ہیں۔ طاہرہ! ایک ہی راستہ ہے۔ ایک ہی راستہ ہے ......"

طاہرہ اس سے آگے سننا نہ چاہتی تھی لیکن اس کی داخلی دنیا میں دو عورتیں ایک دوسرے کا مُنہ نوچ رہی تھیں۔ ایک تصادم۔ ایک ہنگامہ۔ عفت دیوانگی کے عالم میں کچھ نہ کچھ کہے جا رہی تھی کہ طاہرہ نے تصورات کے میدانِ جنگ میں دیکھا کہ ایک عورت لہولہان ہو کر بے حس ہو گئی ہے۔ طاہرہ کو تلخ سا سکون محسوس ہوا اور اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ عفت نے اپنے سینے پر دباتے ہوئے تھے۔

"عفت!" —— اس نے کہا اور وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ بولی —— "ارشد تمہارا ہے ...... سُنو! تمہیں سچی بات بتاؤں!" —— طاہرہ نے سکون آمیز آواز میں کہا —— "ارشد دراصل تمہیں چاہتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ بات کرنے سے جھجکتا تھا۔ ہم راتوں کو جو باہر جاتے تھے وہ اس لیے نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے پیار و محبت کرنے جاتے تھے۔ نہیں۔ ارشد میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ میں تمہیں اس کے ساتھ شادی پر رضامند کروں لیکن میں اس لیے خاموش تھی کہ کہیں ٹھکانہ بن جائے تو بات چھیڑوں گی۔ مجھے یقین تھا تم انکار نہیں کرو گی۔"

"جھوٹ!" —— عفت نے کہا —— اس کی آواز میں اب مسرت عود کر آئی تھی۔

"یقین کرو، عفت!" —— طاہرہ نے پر اطمینان انداز میں کہا —— "میں نے تو شادی کے متعلق ابھی سوچا بھی نہیں۔ میرے سامنے اور بہت سے پروگرام اور ارادے ہیں۔ میں بھی چاہتی تھی کہ تمہارا اور ارشد کا بیاہ کرا دوں اور تمہاری ذمہ داری سے فارغ ہو کر اپنے ارادوں کی تکمیل کروں ...... بولتے بولتے طاہرہ کو غوطہ سا آیا اور وہ تھوک نگل کر سنبھل گئی —— "کتنی خوشی کی بات ہے کہ تم نے خود ہی اس کا اظہار کر دیا ہے۔"

"لیکن میں اتنی دیر سے جھک جھک کر رہی ہوں" —— عفت نے یک لخت اپنے آپ میں آتے ہوئے کہا ——

"تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ روک لیا؟"

"اوہ! پہلے؟" — طاہرہ ذرا سی گھبرائی لیکن جلدی ہی سنبھل گئی — "میں ذرا تمہارا تماشہ دیکھنا چاہتی تھی۔ مزہ آ رہا تھا۔"

"ہٹ پرے" — عفت نے اسے دھکا دے کر کہا۔

"لیکن ابھی ارشد سے کوئی بات نہ کرنا" — طاہرہ نے کہا — "مکان میں منتقل ہو لیں تو یہ سلسلہ میں خود ... گی.... اچھا؟"

"بہت اچھا!"

عفت تو اطمینان کی نیند سو گئی اور طاہرہ نے بے بل لیٹ کر بارک کی مخروطی چھت کی سلیٹوں پر نظریں جما دیں ... کی جگہ ایک بے چینی نے لے لی۔ طاہرہ نے بار ہا سر جھٹکا لیکن یوں سر جھٹکنے سے یہ طوفان تھم نہ سکا۔ طاہرہ نے عفت کو زندگی کے اس دوراہے سے الگ نہ ہونے دیا لیکن اس کی اپنی شخصیت اندر ہی اندر دو حصوں میں بٹ کر ایک دوراہے پر آکھڑی ہوئی۔ اس نے کمرے کے اذیت رساں سکوت میں اپنے آپ کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ جذبہ ایثار متزلزل ہو رہا تھا۔ عفت کو کہی ہوئی اس کی اپنی باتیں اسے بے جان الفاظ محسوس ہو رہے تھے جیسے اس کا اپنا سایہ، اپنا عکس، پیکر کی صورت اس کے جسم اور چھت کے درمیان کھڑا تھا۔ عورت کی کمزوریاں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

"تم جاہل ہو، لڑکی" — اس کے عکس نے اسے کہا۔

"نہیں، میں عفت کو یوں مجروح نہ ہونے دوں گی" — طاہرہ بڑبڑائی۔

"ہونے دو تجھے کیا؟" — عکس نے سرگوشی کی — "کیا ساری عمر دوسروں کے لیے ہی روتی رہو گی؟"

"لذت اسی میں ہے" — طاہرہ نے جواب دیا۔

"بیہودہ خیال ہے۔ ارشد کا وہ نرم و گداز، سرخ و سپید سینہ یاد کرو۔ ریلوے لائن کے کنارے اس سینے کا لمس .... کیوں؟ تصور میں ذرا اس گداز کو پھر محسوس کرو۔"

"عفت کمزور ہے، بے بس ہے۔"

"کچل دو۔ تم عورت ہو۔ عورت اپنے محبوب کو یوں نہیں چھوڑ دیا کرتی۔"

"لیکن عفت میرے مقابلے میں آئی ہی کب ہے؟ اس نے مجھے للکارا تو نہیں۔ مدد کے لیے بلایا ہے۔"

"یہ تو اور اچھی بات ہے" — عکس نے کہا — "وہ خود ہی تمہاری راہ سے ہٹ رہی ہے۔ تمہاری کیا گئی"

"کچھ بھی نہیں" — طاہرہ نے زیر لب کہا — "لیکن گرے ہوؤں کو روندنا مجھے آتا نہیں۔"

"ارشد جیسا خوبرو مرد تمہیں ملنے کا نہیں، طاہرہ!" — عکس نے کہا — "عفت تم پر ہنسے گی۔ تمہارے ایثار کو وہ تمہاری شکست سمجھے گی۔ یہ میری شکست ہے۔ یہ میری توہین ہے۔"

"لیکن تم ہو کون؟" — طاہرہ نے بے چینی سے سر کو جھٹکتے ہوئے سرگوشی کی — "تم خود غرض ہو۔ مجھے خود غرضی

سے نفرت ہے۔"

"پھر یوں کرو کہ میرا گلا گھونٹ دو" — عکس نے مسکرا کر کہا — "لیکن یہ جرأت تم کر نہ سکو گی۔ تم میری غلام ہو۔ میری لونڈی ہو۔ اپنی خواہشات کی لونڈی! مجھے نہیں پہچانا؟ میں تم ہوں۔ تمہارا سایہ! مجھ سے نہیں تم اپنے آپ سے نفرت کر رہی ہو۔"

"غلط ہے! میں آزاد ہوں" — طاہرہ نے کہا۔

"تم ایک عورت سے آزاد نہیں ہو سکتی، پگلی...." سایہ نما عکس کا زیر لب قہقہہ چھت کی سلیٹوں پر سرسرایا — "تم اپنے آپ سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ میں ارشد کو ہاتھ سے جانے نہ دوں گی۔ میں تمہاری کمزوریوں کا مجسمہ ہوں۔ تمہاری خواہشات کا پیکر۔ تم اپنے پیکر سے آزاد نہ ہو سکو گی۔"

"میں تمہارے جسم کو کبھی کا دفن کر چکی ہوں.... تم میری کمزوریوں کا مجسمہ، مر چکی ہو۔ میری روح تیرے چنگل سے آزاد ہو چکی ہے۔"

"روح؟" سایہ سرسرایا — "میں تمہارے جسم کو ارشد کی گود میں ڈال دوں گی۔ تم عفت کو بھول جاؤ گی۔"

"میں تمہیں شکست دے چکی ہوں" — طاہرہ نے سرگوشی کی — "میں ارشد کو عفت کے حوالے کر چکی ہوں۔"

سایہ کمرے کے اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ طاہرہ کو اندھیرے میں سرگوشی سنائی دی "میں تیرے اعصاب پر قابض ہو رہی ہوں۔ تم مجھ سے آزاد نہیں ہو۔"

"نہیں! عفت! نہیں!" — طاہرہ کی اپنی ہستی سے فریادیں نکلنے لگیں — "یوں نہ ہو سکے گا۔ میرا تمام زیور لے لو۔ میں ارشد کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ارشد میری روح ہے۔ ارشد میری جان ہے۔ تم جاؤ، عفت! اپنی راہ لگ جاؤ۔ اُف خدا! مجھے راہ دکھا۔ میری ہستی کو نجات دلا اس اذیت سے۔ مجھے ارشد دے دے یا میری جان لے لے۔ نہیں، عفت! یوں نہ ہو گا.... میں اس قدر عظیم قربانی نہ دے سکوں گی۔ میں بہت کمزور ہوں۔ مجھ پر احسان کرو، عفت! میرے لیے تم ہی قربانی کرو۔"

طاہرہ بلبلا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس کی پیشانی پسینے سے شرابور تھی اور دل سینے سے باہر آیا چاہتا تھا۔ دیکھا کہ عفت گہری نیند سو رہی تھی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ طاہرہ جس نے ہزارہا مسلمانوں کو حوصلہ دے کر بندوقوں سے لڑا دیا تھا، سکھوں کی کرپانوں اور برچھیوں کا مقابلہ کیا، جلتے گھر میں بھی خوف زدہ نہ ہوئی تھی، چڑھتے ہوئے دریا میں بہتے تیر آئی تھی، آج کی رات ایک آرزو کے سامنے بے بس و مجبور ہو کر رو پڑی۔ وہ تنہا تھی۔ اس کے ہر طرف سیلاب کی مہیب موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ کاش! یہ لہریں پانی کی ہوتیں تو وہ ان میں کود جاتی۔ یہ خیالات و احساسات کی لہریں تھیں، وہ دل کو دبا کر جھک گئی۔

"آزاد ہو مجھ سے؟" — کمرے میں سرگوشی سنائی دی "کہو؟ بولو؟.... تم میرے ہاتھ میں مجبور محض ہو۔"

طاہرہ نے یکبارگی اپنے آپ کو ہلکا پھلکا پایا۔ سامنے اس کا اپنا عکس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"میں تمہیں پھر کہتی ہوں کہ میرا دل رکھ لو" — سایہ بڑبڑایا — "مجھے ارشد کی محبت کی ضرورت ہے۔ یہ میری غذا ہے ورنہ میں تیرا خون چوس لوں گی اور اپنے آپ کو زندہ رکھوں گی۔ میں عفت کو جان سے مار کر اپنے آپ کو زندہ رکھوں گی۔"

"مجھے بخش دو"۔۔۔ طاہرہ گڑگڑا اٹھی۔۔۔ "میری نیکیاں مجھ سے نہ چھینو۔"

"یہ میرے لیے گناہ ہے۔"

"وہ میرے لیے گناہ ہے۔"

"مجھے دوسروں کے لیے جینے دو۔"

"مجھے اپنے لیے جینے دو۔"

"عفت کو میں نے بہن بنایا تھا۔ میں ارشد کی خاطر اسے دل سے جدا نہیں کروں گی۔"

"عفت گھٹیا ۔ جس کی لڑکی ہے وہ گندے نالے کے کنارے پلی ہے۔ اس میں اتنی سوچ ہے ہی نہیں کہ میری ہی خاطر ذرا سی قربانی کر دے۔ وہ نیچ گھر میں پیدا ہوئی ہے اور نیچ ہی رہے گی۔"

"میں تو نیچ نہیں"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔۔۔ "میں عفت کو اپنی بلندی تک رکھوں گی۔"

"وہ اس قابل نہیں"۔۔۔ سایہ نما عکس نے سرگوشی کی۔۔۔ "وہ ارشد کے قابل نہیں۔ وہ تجھ سے مانگنے کی عادی ہے اس میں دینے کا سلیقہ نہیں۔"

"میں اسے دے کر دینا سکھاؤں گی۔"

"تم میری توہین کرو گی۔"

"مجھے اسی میں مسرت ملے گی۔ تم میری کمزوریوں کا پیکر ہو۔ تم دھواں ہو"۔۔۔ طاہرہ ایک بار پھر ڈٹ گئی۔۔۔ "میں تو بلاوجہ تمہارے ساتھ اُلجھ پڑی تھی۔ یہ میری بھول تھی۔ جاؤ۔ میں تمہارے منہ پر تھوکتی ہوں۔"

"یاد رکھو، پاگل لڑکی!"۔۔۔ عکس نے ذرا آگے ہو کر کہا۔۔۔ "میں تمہاری خامیوں کا پلندہ ہوں۔ میں وہ طوفان ہوں جو تمہیں بھی اپنے ساتھ اڑا لے جاؤں گی۔ یہ مت بھولو کہ تم اکیلی ہو۔ مجھے ارشد چاہیئے۔ مجھے ہر اس عورت سے نفرت ہے جو ارشد پر حق جتائے گی۔"

"مجھے عفت سے محبت ہے"۔۔۔ طاہرہ نے گردن اُونچی کر لی۔۔۔ "میں نے اسے سہارا دیا ہے۔ اب یہ سہارا چھینوں گی نہیں۔ جو تمہاری توہین ہے وہ میرا ایمان ہے۔"

"تم اپنے ایمان کی حفاظت نہ کر سکو گی۔"

"میرا خدا میرے ایمان کی حفاظت کرے گا"۔۔۔ طاہرہ نے سرگوشی کی۔۔۔ "میں اکیلی نہیں۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے"۔۔۔ وہ بلند آواز سے بولی۔۔۔ "مجھے میرا خدا قوت دے گا! میرے خدا! مجھے استقلال دے۔ مجھے حوصلہ دے۔ اپنی راہ پر مجھے ثابت قدم رکھ۔ میرا ایمان تیرا دین ہے، ذاتِ باری! مجھے اس غیر محسوس سائے سے نہ ڈرا۔ میرا امتحان لے، ذوالجلال! مجھے عفت سے پیار ہے۔ مجھے تیری راہ سے پیار ہے۔"

"طاہری! طاہری! طاہرہ!"۔۔۔ طاہرہ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ عفت اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔۔۔ "کیا ہوا طاہری؟ خواب میں ڈر گئی ہو؟ آیتہ الکرسی پڑھ کر کروٹ بدل لو۔ یہ دیکھو تو! تم پسینہ پسینہ ہو گئی ہو۔ لو، سو جاؤ! میری گود میں سر رکھ کر سو جاؤ۔

اوہ! تم تو رو رہی ہو۔ طاہری؟ خواب میں جلال آباد کے وہ خونی منظر دیکھے ہوں گے؟"

اور عفت طاہرہ کا سر اپنی آغوش میں رکھ کر سہلانے لگی۔ طاہرہ کا سانس اکھڑا ہوا تھا اور وہ ابھی تک اندھیرے خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے دونوں بازو اوپر کیے اور عفت کا چہرہ اپنے قریب کر لیا۔

"میری اچھی، عفت! ارشد تیرا ہے۔ میں اسے تیرے لیے ہی ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہوں۔ دل میں شکوک نہ رکھا کرو، میری اچھی بہن! وہ خواب آلود آواز میں بول رہی تھی، میں تیری ہوں، ارشد تیرا ہے۔"

کیمپ کی تھکی ماندی فضا میں صبح کی اذان بلند ہوئی اور طاہرہ اونگھتے اونگھتے گہری نیند سو گئی۔ عفت نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

ان کے گیارہ بج رہے تھے کہ ارشد اور مزارعہ باچھیں کھلاتے کمرے میں داخل ہوتے۔۔۔ "مل گئے مل گئے"۔۔۔ ارشد نے نعرے لگاتے۔ اسے دیکھتے ہی عفت پر حجاب سا طاری ہو گیا اور لبوں پر حیا آلود تبسم رینگنے لگا۔ طاہرہ نے بھی ارشد کا استقبال مسکرا کر کیا۔ وہ مسکراہٹ جو بن بلائے ان ہونٹوں پر آ جاتی تھی۔ آج اسے جسم اور روح کی ساری قوتیں یکجا کر کے ذرا سی دیر کے لیے ہونٹوں پر لانا پڑی۔

وہ اس جدوجہد میں اس قدر مصروف تھی کہ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ارشد کا چہرہ دُھلا ہوا ہے۔ کپڑے بدلے ہوئے ہیں۔ بال دھل کر نکھر آئے ہیں اور وہ کیمپ والا ارشد نہیں رہا، جلال آباد والا ارشد بن آیا ہے، طاہرہ تو جیسے اس کی صرف آواز سن رہی تھی۔ وہ ارشد کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خیالوں میں ارشد سے دور ہٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہم تو سویرے سویرے ہی آ جاتے"۔۔۔ ارشد نے پرجوش آواز میں کہا۔۔۔ "میں اور نورا نہانے دھونے لگ گئے تھے۔ جانے کتنے عرصے کی مٹی آج اتاری ہے۔"

"اوہ!"۔۔۔ طاہرہ کے منہ سے بے اختیار استعجاب کی آہ نکل گئی۔ وہ دو چار لمحے ارشد کو دیکھتی رہی۔ بولی۔۔۔ "میں نے تو دیکھا ہی نہیں کہ تم کیا سے کیا بن آتے ہو..... دیکھا عفت؟ پہچانا ارشد میاں کو؟"

"تم دونوں نے ناشتہ کیا ہے؟"۔۔۔ ارشد نے پوچھا۔

"کہاں کیا ہے ناشتہ!"۔۔۔ عفت نے قدرے شرما کر جواب دیا۔۔۔ "ابھی ابھی تو سو کے اُٹھی ہیں..... رات طاہرہ خواب میں ڈر گئی تھی۔"

"ارے!"۔۔۔ ارشد نے اپنی مخصوص بے تکلفی سے طاہرہ کے گال پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا۔۔۔ "اب ڈر بھی آنے لگا!"

طاہرہ نے ارشد کے ہاتھ کا گداز محسوس کیا تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے سوئیاں چبھو دی ہوں۔ اس نے چاہا کہ چیخیں مار کر رو پڑے اور ارشد کو کہہ دے۔۔۔ "ارشد! آؤ ہم ایک دوسرے پر قربان ہو جائیں۔ آؤ اسی دوراہے پر ہی جدا ہو جائیں۔"

جانے طاہرہ نے کیا کچھ سوچا لیکن اس سوچ کا تاثر چھپانے کے لیے اس نے ایک بار کوشش کر کے کہیں سے مسکراہٹ کو ہونٹوں پر گھسیٹ ہی لیا۔

"اور طاہرہ! ایک عجیب چیز" ——— ارشد نے جیب میں سے ایک کارڈ سائز فوٹو نکال کر طاہرہ کے ہاتھ میں دیا ——
"یہ فوٹو دیکھو کس کا ہے؟"

طاہرہ نے تصویر دیکھی تو اسے یوں لگا جیسے یہ تصویر اس کی اپنی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تصویر کے ناک کے قریب بائیں آنکھ سے ذرا نیچے ایک تل تھا جو طاہرہ کی ناک پر نہیں تھا۔

طاہرہ نے تصویر میں بیٹھی اس جوان لڑکی کو دیکھا اور بہت ہی غور سے دیکھا۔ چہرے کا ایک ایک نقش طاہرہ کا تھا اس نے تصویر کو ذرا دور سے پھر نزدیک سے دیکھا۔ عفت بھی سرک کر اس پر جھک گئی اور بولی۔

"طاہری! یہ تو تمہاری تصویر ہے۔"

"کہاں سے ملی ہے؟" ——— طاہرہ نے ارشد سے پوچھا۔

"تمہیں یاد ہے میں نے بھیگے ہوئے نوٹوں کو خشک کیا تھا" ——— ارشد نے کہا ——— "ان بنڈلوں میں سو سو کے نوٹوں والا بنڈل بھیگا نہیں تھا۔ صرف باہر کے دو نوٹ ذرا ذرا بھیگے تھے۔ اسے میں نے کھولا ہی نہیں تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ درمیان میں تھا اور سب پر موٹا کاغذ لپٹا ہوا تھا ورنہ یہ بھی بھیگ جاتا اور یہ تصویر بھی خراب ہو جاتی۔ میں نے رات کو تمام زیور اور نوٹ امی جان کو دیئے تو انہوں نے ایک ایک نوٹ گنا۔ جب یہ بنڈل کھولا تو اس میں سے یہ تصویر نکلی...... ذرا الٹاؤ تصویر کو۔ پڑھو کیا لکھا ہے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔"

طاہرہ نے تصویر کو الٹ کر دیکھا۔ اس پر یہ تحریر لکھی تھی۔

"ساجدہ بیگم تاریخ پیدائش ۱۸ دسمبر ۱۹۱۱ء۔ اپنی عزیز سہیلی مسرت جہاں کے اصرار پر
یہ تصویر اٹھارہ سال کی عمر میں شادی سے ایک ہفتہ پہلے ۱۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو اتروائی تھی۔"
ساجدہ بیگم

اس تحریر کے نیچے خاتون کے ہاتھ کی یہ تحریر تھی:

"تاریخ وفات ۱۲ فروری ۱۹۳۱ء۔ میری ساجدہ بیٹی اپنی نشانی، طاہرہ کو میری گود میں ڈال کر چل بسی۔
خاتون

طاہرہ نے یہ تحریر پڑھ تو لی لیکن اس کی نظریں ان الفاظ سے اٹھ نہ سکیں۔ اس نے سر اوپر اٹھایا اور ارشد کی طرف دیکھا وہ پہلے ہی اسے دیکھ رہا تھا۔ عفت اور مزارعہ بھی طاہرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں ایسا سکوت تھا جیسے باہر کا شور بھی ذرا سی دیر کے لیے تھم گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دو آنسو آ گئے اور ان آنسوؤں کے دھندلکے میں اسے بہت کچھ یاد آیا۔ کتنے ہی خیال آئے اور راستے بھر سوالیہ نشان ناچتے نظر آئے۔

"میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟" ——— اس نے دل ہی دل میں پوچھا ——— "خدا کی قدرت میرے ساتھ مذاق کر رہی ہے!

اسے یہ رنج بھی ہوا کہ اس نے اپنی اس قدر خوبصورت اور جواں سال ماں کو نہ دیکھا۔ اس نے اپنے باپ کو نہ دیکھا۔

امی خاتون نے یہ راز چھپاتے کیوں رکھا؟ شاید اس لیے کہ مجھے دکھ نہ ہو۔ آج امی خاتون بھی نہیں ہے۔ قدرت مجھ سے میری تمام تر متاع چھینتی جا رہی ہے۔ ارشد بھی مجھ سے چھین لیا گیا ہے...... میں کون ہوں؟...... میں کیا ہوں؟...... یہ سب کیا ہے؟...... میری راہ؟...... میں گم کردہ راہ ہوں کیا؟...... خدا! اوہ میرے خدا! راہ دکھا مجھے!

طاہرہ کے آنسو نکل آئے اور بہہ نکلے۔ پھر بہتے ہی چلے گئے۔

"پرانی بات ہو گئی ہے، طاہرہ!" ——— ارشد نے اس کے قریب سرکتے ہوئے ملول سے لہجے میں کہا ——— "بھول جاؤ اسے بھی"

طاہرہ نے اشکوں بھری آنکھوں سے ارشد کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "کیا کیا بھول سکوں گی؟"

لیکن اس نے پہنی ہوئی قمیض کے دامن سے آنسو پونچھ ڈالے اور کہا ——— "میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ امی خاتون اتنی بوڑھی ہو گئی ہیں۔ وہ میری ماں کیسے ہو سکتی ہیں۔ انہوں نے کبھی محسوس ہی نہ ہونے دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میرے ابا جان جنگ عظیم میں مارے گئے تھے۔"

"تمہارے والد صاحب یقیناً جنگ میں مارے گئے تھے" ——— ارشد نے کہا۔

"لیکن جنگ میری پیدائش سے نو سال بعد شروع ہوئی تھی" ——— طاہرہ نے کہا۔

"میں نے اس پر بھی غور کیا ہے" ——— ارشد نے کہا ——— "ہو سکتا ہے تمہارے والد صاحب تمہاری والدہ کی وفات کے بعد خاتون سے الگ تھلگ ہو گئے ہوں کسی ناچاقی کی وجہ سے یا اور کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ بہرحال اماں جی مرحومہ نے اچھا کیا کہ تم سے یہ راز چھپاتے رکھا۔ ورنہ ماں باپ کو نہ دیکھ سکنے کا افسوس تمہارے بچپن، لڑکپن اور جوانی کو دیمک کی طرح کھاتا رہتا۔ یہ ایک محرومی ہوتی ہے، طاہرہ! یہ افسوس اور محرومی تمہیں آج یہ طاہرہ نہ بننے دیتی۔ بلکہ تم بالکل عام سی قسم کی لڑکی ہوتی۔ اماں جی مرحومہ بہت ہی دور اندیش عورت تھیں۔ انہوں نے تمہارے کردار کو ایک آسیب سے بچاتے رکھا۔"

"ایک یادگار تصویر!" ——— طاہرہ نے لمبی آہ لے کر کہا اور تصویر چوم کر ارشد کو لوٹا دی ——— "اسے سنبھال کے رکھنا"

دن کے ڈیڑھ بجے لٹا ہوا یہ کارواں راوی روڈ پر ایک خوشنما بنگلے میں داخل ہوا۔ یہ ایک محل نما کوٹھی تھی۔ چاروں طرف سبزہ زار اور رنگا رنگ کے پھول تھے۔ کوٹھی کی پیشانی پر مرمر کی سل پر لکھا تھا ——— "آشیانہ" ——— ارشد کے ابا جان، امی، بڑا بھائی، بڑے بھائی کی بیوی اور اس کے بچے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ ارشد نے گھر والوں کو طاہرہ کے متعلق ساری تفصیلات رات کو ہی سنا دی تھیں۔ کسی مصلحت کے پیشِ نظر اس نے گھر والوں کو بتایا تھا کہ طاہرہ اور عفت چچا زاد بہنیں ہیں۔

ارشد کے گھر والوں نے بیش بہا زیورات اور ہزاروں روپوں سے طاہرہ اور عفت کے خاندانی پس منظر کا اندازہ کر لیا۔ ارشد کی امی اور بھابی نے دونوں لڑکیوں کو گرم پانی سے غسل کرایا۔ اپنے ریشمی کپڑے پہنائے۔ پھر کھانا کھلایا اور دن

کے پچھلے پہر اُنہوں نے یہ تقریب اس طرح منائی کہ لان میں گھر کے افراد کی چائے پارٹی کا انتظام کیا گیا۔ بھابی نے اپ
کچھ زیور نکال کر طاہرہ اور عفت کو پہنایا اور جب دونوں لڑکیاں اچھی خاصی دلہنیں بنی لان میں آئیں تو دیکھنے والے د
ہی رہے۔ چہروں کی معصومیت سے مصائب کی گہری پرچھائیاں، دُھول اور سیلابی مٹی کی تہیں اور کیمپ کی اذیت
زندگی کے آثار دھل گئے اور معصوم حسن نکھر آیا۔ کیچڑ اور پسینے سے جڑے ہُوئے بال ریشم کے تاروں کی طرح چمک اُ
تھے۔ اس پر شرم وحجاب نے وہ رنگ جمایا کہ لان کے پھُولوں نے بھی جیسے سر جھکا لیے ہوں۔ مرد تو آپس میں باتوں
مصروف ہو گئے لیکن ارشد کی امی اور بھابی کبھی طاہرہ اور عفت کو اور کبھی ارشد کو دیکھنے لگیں۔ جیسے ارشد کے لیے ان
کر کے جوڑ ملا رہی ہوں لیکن انتخاب مشکل ہو رہا تھا۔ ظاہری شکل وصورت میں دونوں کے صرف ناموں کا فرق تھا۔

اسی شام ارشد روپے جیب میں ڈال اور بھابی کو ساتھ لے کر بازار چلا گیا اور دونوں لڑکیوں کے لیے چار چار جو
سادے اور ریشمی کپڑے، دوپٹے، سینڈل اور ضرورت کی باقی اشیاء خرید لایا۔ کوٹھی چھوٹی نہیں تھی۔ اس میں اٹھارہ کمر
ایک کمرہ طاہرہ کے لیے اور دوسرا عفت کے لیے تیار کر لیا گیا تھا۔ مزارعہ کو نوکروں کے کوارٹروں میں ایک کوارٹر مل گیا
کے لیے ایک بھینس خریدنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ارشد کے ابا جان نے بتایا کہ وہ اسے دفتر میں چپڑاسی
لیں گے۔

جلال آباد سے نکلنے کے بعد یہ پہلی رات تھی کہ طاہرہ اور عفت رات کھانا کھاتے ہی ایسی سوئیں کہ دوسری صبح
بجے جاگیں۔ پھر دوپہر کا کھانا کھا کر سوئیں اور شام پانچ بجے اُٹھیں۔ پھر رات نو بجے سوئیں اور صبح سات بجے آنکھ کھل
ان کی تمام تر تھکان اور اعصاب کا بوجھ گرد وغبار کی طرح جھڑ گیا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے جو گرم پانی سے بھی اتر
تھے مکمل آرام سے دور ہو گئے اور حسن کا جلال کھلتا ہی گیا۔ ارشد کی بھابی ابھی جوانی کی عمر میں تھی۔ اُس نے شکر کیا کہ د
لڑکیاں مِل گئی ہیں۔

رات کا اندھیرا لاہور کے ہنگاموں کو خاموش لوریاں دے کر سلا رہا تھا۔ جنگِ پاکستان اور فسادات کا تھکا ہُوا
اونگھ رہا تھا۔ "آشا بھون" کے کمروں کی بتیاں بجھ چکی تھیں۔ صرف طاہرہ کی کھڑکی میں سے ہلکی سبز روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ
کی روشنی میں پلنگ پر لیٹی خیالوں کی بھول بھلیوں میں کھوتی ہوتی تھی۔ ارشد کا کمرہ ساتھ ہی تھا۔ طاہرہ کے کمرے کا د
کھلا۔ اس نے دیکھا۔ ارشد دروازے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ طاہرہ نے اس شگفتہ مُسکراہٹ کا جواب اداس مسکراہٹ
دیا۔ ارشد بے تکلفی سے اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ طاہرہ نے شدت سے چاہا کہ اسے پلنگ پر لٹا لے لیکن اسے یہ
موزوں نظر نہ آئی۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔

"سوتی نہیں؟"

"نیند نہیں آ رہی!"

ارشد نے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو طاہرہ کا جسم کسی ان جانے خطرے کے خیال سے سکڑ گیا۔ اُس نے
ہاتھ کھینچ لینا چاہا لیکن کھینچ نہ سکی۔

"ابا جان ایک پروگرام بنا رہے بیٹھے ہیں" ـــ ارشد نے مسکراتی ہُوئی سنجیدگی سے کہا ـــ "میں تمہارا مشورہ لینا
چاہتا ہوں"

"کیا؟"

"اُنہوں نے کچھ اس قسم کا فیصلہ کیا ہے کہ میں ان کے محکمے میں ایک خالی جگہ پُر کر دوں"

"کیسی جگہ ہے وہ؟" ـــ طاہرہ نے پوچھا۔

"اچھا خاصا عہدہ ہے۔ ساڑھے چار سو روپے سٹارٹ ہے" ـــ ارشد نے کہا ـــ "میں نے ابا جان سے کہا تھا کہ
پہلے بی اے کر لوں لیکن وہ کہتے ہیں۔ بی اے پرائیویٹ ہو سکتی ہے اور یہ جگہ پھر نہ مِل سکے گی۔ ابھی تک ان کے
ہاتھ میں ہے۔ ابا جان کو بھی ترقی مل رہی ہے۔ سارے دفاتر خالی پڑے ہیں۔ ہندو سکھ جا چکے ہیں۔ ہر طرف ان کی ہی
حکومت تھی"

"پھر کیا خیال ہے تمہارا؟"

"خیال یہی ہے کہ ابا جان کی بات مان لوں" ـــ ارشد نے کہا ـــ "نوکری کر لوں اور ساتھ ساتھ پڑھتا بھی رہوں۔ امید
ہے میں دونوں کام نبھا سکوں گا۔ عفت اور تمہارے متعلق بھی بات ہُوئی تھی۔ ابا جان کہتے ہیں کہ سارا نظام ہی درہم برہم ہو
گیا ہے، سکولوں کی حالت تسلی بخش نہیں رہی۔ ان کا ارادہ ہے کہ تم دونوں کے لیے گھر میں ہی پرائیویٹ ٹیوٹر کا بندوبست کر لیا
جائے گا۔ وہ تمہارے روپے میں سے تم دونوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کی دونوں تجویزیں قبول
کر لی ہیں"

"تو تم چند دنوں تک وہ عہدہ سنبھالو گے؟"

"ابا جان تو کل صبح ہی ساتھ لے جا رہے ہیں" ـــ ارشد نے بتایا ـــ "کہتے ہیں کہ ٹریننگ وہ خود دے لیں گے"

ارشد چپ ہو گیا۔ اس نے طاہرہ کی طرف دیکھا اور طاہرہ اُسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے دو پل
لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور ارشد نے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مسلتے ہوئے کہا ـــ "امی جان اور بھابی کا
ایک اور اصرار ہے۔ میں اسے بھی ٹالنا نہیں چاہتا۔ یہ تجویز سب سے پہلے قبول کرنے والی ہے"

طاہرہ نے کچھ کچھ سمجھتے ہُوئے سر جھکا لیا ارشد نے اس کا چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ چہرہ تو اوپر اُٹھ گیا لیکن آنکھیں جھکی رہیں۔
"وہ کہتی ہیں کہ طاہرہ اور عفت میں سے کسی کو پسند کر لو لیکن میں نے دانستہ انہیں اپنی پسند بتائی نہیں"

طاہرہ کا جسم لرز اُٹھا جیسے ایک بگولہ اس کے سینے سے اُٹھا ہو اور اس کے خیالات واحساسات اس کی لپیٹ
میں آ گئے ہوں۔ ارشد اس خاموشی کو حجاب سمجھ رہا تھا۔ وہ طاہرہ کی شرمیلی مسکراہٹ کا منتظر تھا لیکن اسے سسکتی ہُوئی
ایک آہ سنائی دی جو کمرے کے سکوت میں بھٹک بھٹک کر دم توڑ گئی۔

"طاہری!" ـــ ارشد نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا ـــ "اس قدر طویل خاموشی؟ ... بولو... میں اپنی
پسند انہیں بتا دوں؟"

"نہیں!" — طاہرہ کے سینے سے جیسے آہ نکل گئی ہو — "یہ پسند میں بتاؤں گی۔"

"کیا مطلب؟" — ارشد کچھ سمجھ نہ پایا۔

"تمہاری شادی عفت سے ہوگی، ارشد!"

ارشد کے ہاتھ سے طاہرہ کا ہاتھ چھوٹ کر اس کی گود میں گر گیا۔ طاہرہ کا سر جھک گیا لیکن اس نے فوراً ہی سر جیسے ایک خطرے کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئی ہو۔

"مذاق کر رہی ہو طاہرہ؟" — ارشد نے اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کی۔

"نہیں!" — طاہرہ کے لہجے میں خود اعتمادی عود کر آئی۔ بولی — "سنو، ارشد! میں تمہیں جذبات میں سے نکال کر حقیقت کی طرف لانا چاہتی ہوں۔ جذبات کو محبت سے اور احساسات کو ان دونوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا لیکن صورت ذرا مختلف ہو گئی ہے۔"

"نہیں! یہ غلط ہے" — ارشد تڑپ کر بولا — "میں جذبات سے نہیں نکل سکوں گا۔ جذبات نہیں تو محبت نہیں۔ تم سیدھی بات کرو کہ یہ کیا مصیبت ہے" — ارشد نے ذرا آگے جھک کر چھیڑنے کے انداز میں پوچھا — "شادی سے ڈر لگتا ہے کیا؟"

"ارے نہیں، بدھو!" — طاہرہ اس کی ذرا سی چھیڑ سے موڈ میں آ گئی اور ارشد کے بالوں میں انگلیاں الجھا کر پیار سے کہنے لگی — "ذرا میری بات سن لو۔ دل اور دماغ سے سارے خیالات نکال کر میری بات سنو۔ ذرا سی دیر مجھے اور میری محبت کو بھول جاؤ۔"

"ناممکن سا کام بتا رہی ہو۔"

"مجھے احساس ہے۔ میں خود ایک ناممکن کام سرانجام دینا چاہتی ہوں۔ یہ ایک اور مہم ہے، ارشد!" — طاہرہ کے سینے سے پھر ایک آہ نکلی لیکن وہ سنبھل چکی تھی۔ اس نے کہا — "ہم نے جانوں کو خطرے میں ڈال کر جھنڈے لہرائے، لاٹھیوں اور گولیوں کی بوچھاڑوں میں جلوس نکالے۔ ستر اسی میل کا سفر پیادہ طے کیا اور وہ بھی سکھوں کی برچھیوں اور کے سائے میں۔ ہم نے کس طرح سینہ تان کر ان کا مقابلہ کیا۔ پھر وہ دریا یاد کرو، ارشد! بخدا میں تو اسے خودکشی سمجھ کر کود پڑی تھی لیکن ہم تیر نکلے۔ وہ مصائب اور خطرات اور وہ ہم کہ ہم نے ان کا مقابلہ کیا۔ اس قیامت سے نکل کر میں نے اپنے آپ کو سب سے بڑا انعام یہ دیا تھا کہ چاندنی رات میں تمہیں اپنے دل میں بٹھا لیا تھا۔ ہمارے تھکے ہارے اور فاتح جسموں اور روحوں کو ایسے ہی انعام کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے خدا کا انعام سمجھا تھا۔"

طاہرہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ ارشد نے پلنگ کے تکیے کی ٹیک لے لی اور رات دبے پاؤں گزرتی گئی۔

طاہرہ کہہ رہی تھی — "ارشد، ذرا اپنے سینے میں وہ ولولہ تازہ کرو۔ وہی عزم اور استقلال جو کمال کی موت کے دن تمہارے چہرے کے ہر ایک نقش سے ٹپک رہا تھا" — طاہرہ نے ارشد کے چہرے کا جائزہ لیا اور بولی — "عفت کے متعلق تمہیں بہت کچھ معلوم ہے لیکن تم تفصیلات سے آگاہ نہیں۔ وہ بہت غریب تھی۔ جس لڑکی نے زندگی کے چودہ

دوسروں کے پرانے کپڑے پہنے ہوں اس میں بلند خیالی کیسے آ سکتی ہے؟ یہ میں نے امی مرحومہ کو مجبور کیا تھا کہ عفت کی ماں کو گھر لا کر اسے باعزت کام دے دیں، ورنہ آج عفت سکھوں کے ہاتھ میں ہوتی اور دونوں ماں بیٹی بخوشی اپنے آپ کو کافروں کے حوالے کر چکی ہوتیں۔ اس قسم کی پسماندہ اور مفلس عورتوں کو کیا چاہیئے؟ دو وقت کی روٹی اور کپڑا، مرد چاہے کیسا ہی مل جائے۔ میں نے بڑے جتن کر کے عفت کو ان پستیوں سے نکالا ہے۔ تمہیں تو اندازہ ہی نہیں وہ کس قدر پست خیال تھی۔ اس میں اس بے چاری کا قصور ہی کیا تھا۔ جن کے جینے کا مقصد صرف پیٹ ہو وہ بھلا عزت، آبرو اور خودداری کو کیا جانیں۔ ان کی روحوں پر سیاہ دھبے پڑ جاتے ہیں۔ ذرا دیکھو کس قدر حسین شکل و صورت کی لڑکی ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کوڑے کرکٹ میں پڑی رہے۔ اس کی ماں بظاہر دیانتدار تھی، کسی حد تک خوددار بھی لیکن یہ کمبخت مفلسی ایسا جرم ہے کہ اس میں سے سو جرم پھوٹتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ تم حیران ہو گے کہ اس تنگدستی اور اخلاقی مفلسی میں عفت آٹھویں جماعت تک پہنچ گئی تھی اور آگے پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ ایک دن عفت نے مجھے بتایا تھا کہ اسے ماں صرف اس لیے پڑھا رہی ہے کہ وہ اچھے داموں فروخت ہو سکے۔ شاید عفت کا اپنا مقصد بھی یہی تھا۔"

طاہرہ نے آہ لی اور کہنے لگی — "خیر، ارشد! یہ باتیں لمبی ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس لڑکی کی ذمہ داری سنبھالی اور قسم کھائی کہ اس کی روح کو خدا کی راہ پہ ڈال کے رہوں گی۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ میری اخلاقی بے بسی سمجھ لو۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا ہی اطمینان ہوا تھا کہ عفت میرا مدعا سمجھ گئی تھی اور اس نے تھوڑے ہی عرصے بعد میرے ساتھ تعاون شروع کر دیا تھا۔ اس کا یہ کمال ہے کہ اس نے جلسوں اور جلوسوں میں ہمارا پورا پورا ساتھ دیا۔ ذرا یاد کرو کہ جلال آباد سے لاہور تک اس نے تمام راستے کہیں بھی پیٹھ نہیں دکھائی۔"

"میں تمہیں وہ جھڑپ یاد کرانا چاہتی ہوں، ارشد!" — طاہرہ نے بیٹھے بیٹھے کروٹ بدلی اور ارشد کے اور قریب ہو گئی۔ ارشد انہماک سے سن رہا تھا۔ طاہرہ نے کہا — "کس کس بات کو دہراؤں۔ ایک سے ایک نرالی ہے لیکن یہ واقعہ تو تم کبھی فراموش نہیں کر سکو گے۔ تمہیں یاد ہے کہ ابھی دریا سے ہم بہت دور تھے کہ شام کے وقت تین سکھوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ دو کے پاس کرپانیں اور ایک کے پاس لمبی کلہاڑی تھی۔"

"ہاں! شام کے وقت" — ارشد نے کہا — "جس دن تم گر گئی تھی۔ ایک درخت کے پاس۔ سارا قافلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔"

"ہاں وہی" — طاہرہ نے کہا — "تمہیں تو صرف میرا خیال تھا کہ میں گر گئی تھی لیکن وہ عفت تھی کہ جسے تمہارا خیال تھا، ورنہ آج تم یہاں ہوتے نہ ہم دونوں ہوتیں۔ میں تو کلہاڑی کی زد سے بچتے بچتے گر پڑی تھی اور مزارعہ درمیان میں آ گیا تھا۔ تم دوسرے سکھ سے الجھے ہوئے تھے۔ میں اٹھ ہی رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ تیسرے سکھ نے تمہارے پیچھے آ کر کرپان اپنے سر سے اوپر اٹھالی تھی اور کرپان تمہاری گردن کی طرف چل پڑی تھی۔ کرپان اور تمہاری گردن میں دو ہی لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں تو گری ہوئی تھی اور تھی بھی دور۔ اس منظر کی تاب نہ لا کر میں نے کرچ پھینک کر دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے تھے۔ میں نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹاتے۔ دیکھا اور مجھے آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ تم بدستور لڑ رہے تھے۔ زخمی سکھ تمہارے

سامنے گر رہا تھا اور تم پر حملہ آور ہونے والے سکھ کی کرپان گر چکی تھی۔ عفت کی برچھی اس کے پہلو میں داخل ہو چکی تھی
اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت عفت تم سے دور تھی۔ معلوم نہیں کس پھرتی سے اُس نے اچھل کر یا اُڑ کر تمہاری جان
اور برچھی سکھ کے پہلو میں اس بری طرح داخل کی کہ اس سے اب باہر نہیں نکل رہی تھی۔"

ارشد نے طاہرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ طاہرہ نے محسوس کیا کہ ارشد کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ یہ لرزہ جہاں ایک خیالی خوف
تھا وہیں یہ عفت کی بہادری کی خاموش داد بھی تھی۔

"مجھے معلوم نہ تھا" ——— ارشد نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اب بھی ایک کرپان اس کے سر پر لٹک رہی ہو۔

"اب غور کرو، ارشد!" ——— طاہرہ نے کہا ——— "یہ دلیری اس لڑکی نے کی تھی۔ جس کا دھیان پیٹ سے آگے
نہ جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے جنگِ پاکستان میں محض میری اور تمہاری خوشنودی کے لیے ہی حصہ لیا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے
کہ اس نے حصہ لیا اور اپنا حق خوب ادا کیا۔ کسی موقعہ پر اس نے یہ نہیں کہا کہ میں تھک گئی ہوں۔ بھوکی ہوں یا پیاسی ہوں بلکہ
راستے قائم کر چکی ہوں کہ اس نے جو کچھ کیا ہے اصلی مقصد و مدعا کو سمجھ کے کیا ہے۔ ارشد! میں اس لڑکی کو بہت بڑا انعام دینا
چاہتی ہوں۔ میں اسے بہت زیادہ تعلیم دلانا چاہتی ہوں۔ زیورات میں سے جو کچھ اسے پسند ہوگا دے دوں گی۔ اس کے لیے
میرا ارادہ تھا کہ اس کی شادی اپنے ہاتھوں کراؤں گی لیکن عفت نے مجھ سے بہت بڑا انعام مانگا ہے۔"

"یعنی وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے" ——— ارشد نے ذرا اُکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں!" ——— طاہرہ بولی ——— "اس نے یہ خواہش ایسے رنگ میں ظاہر کی ہے کہ ارشد! میں انکار نہ کر سکی۔"

"کس رنگ میں؟"

"اس رنگ میں جو میں سمجھتی تھی کہ اس پر سے اتار چکی ہوں" ——— طاہرہ نے کہا ——— "اس نے اس یقین کے ساتھ بات
کی تھی کہ میں اور تم ایک دوسرے کو چھوڑ نہ سکیں گے اور وہ اپنے آپ کو ہم دونوں کے درمیان بن بلائی مہمان سمجھ رہی ہے۔
بخدا، ارشد! جب عفت نے باتیں شروع کیں تو میں تو ڈر گئی تھی کہ شاید اس پر کوئی دورہ پڑ گیا ہے۔ مجھے اس پر بہت رحم
آیا۔ جب ہم رات باہر جایا کرتے تھے تو وہ ہمیں دیکھتی رہتی تھی..... وہ بہت کچھ کہتی رہی اور روتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔ میں تمہارا
کا بدلہ اسی طرح دے سکتی ہوں کہ تمہاری راہ سے ہٹ جاؤں۔ ایسے میں، ارشد! مجھے بہت خیال آئے۔ میں سوچتی
کہیں ایسا نہ ہو یہ لڑکی ہاتھ سے ہی نکل جائے۔ آج کل کے حالات تم جانتے ہو اس قسم کی شکل دار اور نوجوان لڑکی کہاں
کہاں پہنچ سکتی ہے یا پہنچائی جا سکتی ہے۔"

"عجیب و غریب قربانی ہے طاہرہ!" ——— ارشد نے آہ لے کر کہا اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے بولا ——— "اپنے
قاتل کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔"

"یہی مشکل مجھے بھی درپیش ہے۔ ارشد! لیکن میں یہ قربانی دینا چاہتی ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ جب میں اپنے ہاتھ
تمہیں ایک اور لڑکی کے سپرد کر دوں گی تو میرا کیا حشر ہوگا۔ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا ہے اور اکثر اپنے
حوصلے دیتی رہتی ہوں لیکن میں نے جو پودا بویا تھا اسے اپنے خون سے سینچنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے تمہاری
بھی ضرورت ہے، ارشد! میری نیکیوں کا گلا نہ گھونٹ دینا۔ ایک طرف میرا دل ہے۔ دوسری طرف ایمان ہے اور
مجھے ایمان عزیز ہے۔"

"طاہرہ!" ——— ارشد کمرے کے وسط میں رک گیا اور بولا ——— "کیا کہہ رہی ہو! کہنے سے پہلے سوچو کہ میں یہ مہم سر بھی کر
سکوں گا؟" وہ آہستہ آہستہ پلنگ کے قریب آ گیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ طاہرہ نے آگے ہو کر اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا
لیا۔ ارشد نے طویل آہ لی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رو پڑے گا۔

"محبت بہت ساری قربانیاں مانگا کرتی ہے، ارشد!" ——— طاہرہ نے ایسے پیار سے کہا جو اکثر ماں یا بہن کے ہی
ہونٹوں سے سنائی دیتا ہے ——— "میری محبت کی خاطر یہ قربانی دو۔"

طاہرہ کا لہجہ فوراً بدل گیا۔ ارشد کے بالوں سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو نے طاہرہ کے لب و لہجے میں خمار بھر دیا۔ ایک
بے خودی سی طاری ہو گئی۔ اسے والٹن رلیفیوجی کیمپ کے باہر میدان میں پھیلی ہوئی چاندنی یاد آ گئی۔ وہ مخمور سے لہجے میں بولی ———
"اس محبت کی خاطر قربان ہو جاؤ جو ہمارے دلوں میں چنگاریوں کی طرح سلگ رہی تھی اور ریلوے لائن کے کنارے شعلہ بن کے
ظاہر ہوتی تھی۔"

"کاش! وہ چنگاریاں اس دریا کی سیلابی لہروں میں بجھ جاتیں جو ہم نے تیر کر پار کیا تھا" ——— ارشد نے جذبات سے مغلوب
ہو کر کہا۔

"وہیں سے تو یہ بھڑکی تھیں" ——— طاہرہ نے اس کے سر پر اپنا گال رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا سب کچھ جل جائے گا" ——— ارشد نے کہا۔

"اسی جلنے میں ہی قرار ہے" ——— طاہرہ نے کہا۔

"یہ ظلم ہے، طاہرہ! یہ فریب ہے" ——— ارشد نے اکتا کر کہا۔

رات آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ کائنات سکوت کی آغوش میں سو رہی تھی۔ نیند کے بوجھ نے اور جذبات کے ابال
نے دونوں کو بے خود اور مدہوش بنا دیا تھا لیکن دونوں کی مدہوشی میں ایک فرق تھا۔ طاہرہ پر جذبۂ ایثار غالب تھا اور ارشد پر صرف
بات۔ ایک کو اپنے اوپر قابو تھا دوسرا بے بس و مجبور ——— خاموشی، طویل خاموشی ——— طاہرہ کے دو آنسو ارشد کی پیشانی پر گرے
اور گر کر ارشد کے دو آنسوؤں میں جذب ہو گئے۔

"تم سنگدل ہو، طاہرہ! محبت کا خون نہ کرو۔"

"یہ محبت ہم دونوں کا خون مانگ رہی ہے ارشد! زندہ رہنے کے لیے۔"

"مرنے کے لیے طاہری!"

"محبت تو بہرحال زندہ رہتی ہے۔ بہن کے دل میں، ماں کے دل میں اور میرے دل میں بھی اسی طرح زندہ رہے گی۔"
اس نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اُوپر اٹھایا اور کہا ——— "مان جاؤ میرے عزیز! عفت کو قبول کر لو۔ اس
میں میری خوشی ہے، ورنہ میں سمجھوں گی میرے ارشد نے مجھے کانٹوں پر ڈال دیا ہے" ——— ارشد خاموشی سے اس کی آنکھوں

میں ٹکٹکی باندھے رہا۔ جیسے طاہرہ نے اسے ہپناٹائز کر لیا ہو۔ طاہرہ بولی ــ "عفت میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ شکل دیکھ لو۔ قد بُت دیکھ لو۔ میں نے اس کے ذہن سے وہ پست خیالات دھو ڈالے ہیں۔ دیکھ لینا تم اسے پا کر دنیا کو بھی
"تمہیں نہ بھول سکوں گا۔"

"میں ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گی، ارشد!" ــ طاہرہ نے اس کا گال تھپکاتے ہوئے کہا ــ "میں نے بھی تمہارے ساتھ رہا کروں گی۔ کھو گئے تو تمام عمر شادی نہیں کروں گی۔ آج رات کی طرح جب چاہو گے تمہارے قریب رہا کروں گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔"

ارشد آہستہ سے اُٹھا اور انگڑائی لے کر کمرے میں ٹہلنے لگ گیا۔

"میں تمہیں ایک بار پھر یاد دلانا چاہتی ہوں" ــ طاہرہ نے کہا "کہ عفت نے تمہاری جان بچائی تھی۔ آج عفت پھر الجھنوں میں الجھ کر صرف اس لیے اندھیرے میں واپس جانا چاہتی ہے کہ تمہاری زندگی میں بے مزگی پیدا نہ ہو..... تمہارا کتنا خیال ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہارا نعم البدل ثابت ہو گی؟" ــ ارشد نے صلح جُو لہجے میں پوچھا۔

"مکمل یقین" ــ طاہرہ نے خود اعتمادی سے کہا ــ "میں یہیں تو ہوں۔ کوئی خامی دیکھی تو درست کر دوں گی۔"

"تم مجھے بھول تو نہ جاؤ گی، طاہرہ؟"

"نہیں۔"

"دعا کرنا، طاہرہ! کہ خدا ہم دونوں کو ثابت قدم رکھے۔"

"آمین۔"

"تو میں جاتا ہوں" ــ ارشد دروازے کی طرف بڑھا۔

"ذرا ٹھہرو" ــ طاہرہ بولی ــ "یہاں آؤ" ــ وہ طاہرہ کے قریب گیا تو طاہرہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا ــ "یوں دل پر بوجھ لے کے نہیں۔ ہنسی خوشی۔ ورنہ ہماری محبت اداس ہو جائے گی۔ جاؤ! شب بخیر....."

ارشد جانے کس خیال میں مسکرا دیا۔ اس نے طاہرہ کا چہرہ تھام کر اُوپر اٹھایا اور کہا ــ "عجیب بے تکی لڑکی ہو۔" طاہرہ نے اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور لیمپ بجھا کر لیٹ گئی۔ اس نے سکون آمیز آہ لی اور سارے آنسو نکل آئے۔ اس نے آنسوؤں کو نکل ہی جانے دیا۔ وہ روئی خوب روئی اور روتے روتے سو گئی۔

ارشد اپنے کمرے میں جا کے لیٹ گیا لیکن اسے نیند نہ آئی۔ طاہرہ کا ایک ایک لفظ اسے از سرِ نو سنائی دینے لگا۔ اس نے اپنے سامنے طاہرہ کو کھڑے دیکھا۔ پھر اس نے اس تصور کو سامنے سے ہٹا کر اس کی جگہ عفت کو کھڑا کیا اور اس تصویر کے ہر پہلو کا جائزہ لینے لگا لیکن وہ آنکھ جھپکتا تو اس کے سامنے عفت کی جگہ طاہرہ آ کھڑی ہوتی۔ اس نے سوچ و فکر کی تمام قوتیں یکجا کر کے یکسوئی سے عفت کا خیال تصوروں میں جمایا لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال طاہرہ کے روپ میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا سر دُکھنے لگا اور اس نے کروٹ بدل لی۔

دوسری صبح ابا جان نے اسے گھسیٹ کر بستر سے نکالا اور تیار کر کے دفتر لے گئے۔ دوپہر کھانے کے بعد طاہرہ عفت کے کمرے میں گئی۔ عفت لیٹی ہوئی تھی۔

"بیگم صاحبہ! اب لیٹنا چھوڑ دو اور شادی کی تیاریاں کرو" ــ طاہرہ نے ایک دُکھ کو مسکراہٹ میں چھپا کر کہا ــ "ارشد میاں آج اپنے عہدے کا چارج لینے گئے ہیں اور ایک ہفتے کے اندر شادی بھی ہو جائے گی۔"

"سچ طاہری؟" ــ عفت باچھیں کھلا کر اچھل پڑی ــ "ارشد کے ساتھ تم نے بات کر لی ہے؟ بات طے ہو گئی ہے؟"

"اری! وہ تو پہلے ہی طے ہو گئی تھی" ــ طاہرہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا ــ "صرف رسمی باتوں کی ضرورت تھی، وہ بھی طے ہو گئی ہیں لیکن یاد رکھو، عفت!" ــ طاہرہ سنجیدگی سے بولی ــ "تمہیں ذرا سنبھل کے رہنا ہو گا۔ دیکھو کتنا بڑا گھر اور کتنا اونچا خاندان ہے۔ اپنے آپ کو اُونچا ہی رکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ میری ساری محنت برباد کر کے رکھ دو۔"

"طاہری" ــ عفت طاہرہ سے بغل گیر ہو گئی ــ "میری بہن تم دیکھنا اگر ذرہ بھر تمہاری بات پر آنچ آنے دی تو۔ مجھے تمہارے سارے سبق یاد ہیں۔"

شام گھر میں ایک نئی رونق تھی۔ ارشد ملازم ہو کر گھر آ گیا تھا۔ اس کی امی، بھابی اور طاہرہ نے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر لی تھی۔ دیر صرف کپڑے بنوانے کی تھی۔ زیور موجود تھا۔ امی اور بھابی کو عفت کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ طاہرہ کی چچا زاد بہن ہے اور ہندوستان میں دونوں گھروں کی وسیع زمینداری تھی۔ جلال آباد میں تو وہ طاہرہ اور عفت کو ارشد کی زبانی غائبانہ طور پر جانتی تھیں۔ خاتون کے ساتھ ان کی علیک سلیک ہوتی تھی لیکن تحریکِ پاکستان کے ہنگاموں کی وجہ سے علیک سلیک

بے تکلفی تک نہ پہنچ سکی تھی۔ دونوں کے گھر دور دور تھے، پھر فسادات ہوتے اور بات ہی ختم ہو گئی تھی۔

عفت اب زیادہ دیر کمرے میں چھپی رہتی تھی اور ارشد کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ صرف طاہرہ تھی جو اس کی اندر

کیفیت کو سمجھتی تھی۔ دو تین مرتبہ اس نے اسے تنہائی میں بلا کر حوصلہ دیا۔ عفت کی تعریفیں کیں اور اس رات کی ملاقات کی

ایسی ایسی باتیں کیں کہ ارشد کا رجحان بدل دیا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ارشد کو بھی اندازہ نہ تھا، عفت کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ

کے دل پر کیا گزر رہی ہے اور اس نے وہ قربانی دی ہے جو عورت نہیں دے سکتی۔ اس گھر میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ طا

روح اور جذبات کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر اس شادی کو ایک کامیاب شادی اور ایک مثالی ازدواجی زندگی بنانے !

مصروف ہے۔

اُس نے ارشد سے ساجدہ کی تصویر لے کر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لی تھی۔ بعض اوقات وہ اس تصویر کے مسکرا

خدوخال میں کھو جاتی جیسے اپنی تھکی ہوئی روح کو سہلا رہی ہو اور تر و تازہ کر رہی ہو۔

شادی میں ایک دن باقی تھا۔ گھر کا بچہ بچہ کسی نہ کسی کام میں مصروف تھا۔ عورتیں کپڑوں کا آخری معائنہ کر کے درز

جان کھا رہی تھیں۔ طاہرہ کمرۂ عروسی کی سجاوٹ میں ہلکان ہو رہی تھی۔ بچوں کا یہ حال کہ جھنڈیاں بنا بنا کر ہی پاگل ہوئے

رہے تھے۔ عفت کا یہ حال کہ کسی نے بازو پکڑا اور گھسیٹ کر ایک طرف لے گئی تو دوسری نے پیچھے سے قمیض پکڑ

طرف کھینچ لیا۔

دن کے پچھلے پہر طاہرہ عفت کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ پھر ارشد کی امی اور بھابی کو بلا لائی۔ میز پر خاتون کا بنا

سارا زیور پڑا تھا۔ طاہرہ نے دونوں عورتوں کی موجودگی میں یہ زیورات عفت کو دکھاتے اور کہا ــــ "جو چیزیں تمہیں پسند ہیں

"صرف کل کے لیے؟" ــــ عفت نے بغیر سوچے سمجھے پوچھا اور طاہرہ کو دھچکا سا لگا۔

"نہیں، عفت آ" ــــ طاہرہ نے بڑی بہنوں کی طرح کہا ــــ "ہمیشہ کے لیے۔ تم تو یوں پوچھتی ہو جیسے میں

کی مالک ہوں" ــــ اور طاہرہ نے آنکھ بچا کر عفت کا ہاتھ دبایا۔

عفت نے جب اپنے سامنے بکھرے ہوئے طرح طرح کے زیورات دیکھے اور یہ سنا کہ "جو چاہے لے

اس کے چہرے کی رنگت ہی بدلنے لگی جیسے اسے غشی آ جائے گی۔ وہ سب سے پہلے اس ہار پر لپکی جو خاتون نے

کو دکھائے بغیر بنوا کر اس کی شادی کے لیے چھپا رکھا تھا۔ پھر عفت نے وزنی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ایک طرف کرنا

کر دیا۔ ارشد کی بھابی نے اس کے انتخاب پر ذرا سا ناک سکیڑا۔ یہ چیزیں خاتون کے زمانے میں بنی تھیں۔ جب ان

ان کے ڈیزائن میں نہیں وزن پر ہوتی تھی۔ موٹے موٹے نقلی پتھر جڑے ہوتے اور ہر چیز موٹی۔ عفت نے انہ

کو پسند کیا۔ کانٹے وہ اٹھائے جو کانوں کو ہی دہرا کر کے کندھوں تک لے آئیں اور بناوٹ ایسی جیسے لوہار نے بنا

ان زیورات میں صرف یہ خوبی تھی کہ سونا اصلی تھا اور وزن زیادہ۔

طاہرہ کا ارادہ تھا کہ اس دقیانوسی زیور کو فروخت کر دے گی لیکن عفت کی پسند صدیوں پرانی ثابت ہوئی

زمانے کی بنی ہوئی ایک بھی چیز سوائے ہار کے اس نے پسند نہ کی۔ طاہرہ مصلحتاً مزاحم نہ ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ عفت

یں نہ پڑ جاتے۔ اس طرح عفت نے وزن کے حساب سے نصف سے کہیں زیادہ سونے پر قبضہ کر لیا۔ طاہرہ نے

عفت کو گہری نگاہوں سے دیکھا اور وہ اس کے چہرے کا تاثر دیکھ کر چونک اٹھی لیکن خاموش رہی۔

ارشد کی بھابی سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہہ ہی دیا ــــ "یہ زیور آج کل کون پہنتا ہے؟ یہ ٹاپس کیوں نہیں پہنتیں؟

دیکھو کس قدر ہلکے پھلکے اور کتنے بھلے لگتے ہیں۔"

"نہیں" ــــ عفت نے منہ بنا کر کہا ــــ "وہ بہت ہلکے ہیں" ــــ اور وہ پسند کیے ہوئے زیورات کو جلدی جلدی

سے اٹھا سمیٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

بھابی نے طاہرہ کی طرف دیکھا۔ ان نظروں میں ایک سوال تھا لیکن طاہرہ نے صورتِ حال پر قابو پاتے ہوئے

ــــ "شادی کا چاؤ بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ کل ہی ساری چیزیں پھینک کر یہ نئی چیزیں لے جائے گی۔ میں اس

عادت جانتی ہوں۔ گھر میں بھی اس کی حرکتیں کچھ اسی قسم کی ہوا کرتی تھیں۔"

"چلو شادی کا موقعہ ہے" ــــ ارشد کی امی نے کہا ــــ "بچی ہی تو ہے جو جی چاہے پہنے۔"

اور بات آئی گئی ہو گئی۔

شادی کا دن آیا۔ گھر میں ایسی چہل پہل کہ جسے کوئی کام نہیں وہ بھی مصروف نظر آ رہا تھا۔ مہمانوں کی فہرست نہ ہونے کے

ابر تھی۔ رشتے برادری والے جانے کہاں کہاں بکھر گئے تھے۔ اس کے علاوہ ارشد کے ابا جان کا خیال تھا کہ ملک کے موجودہ حالات

ں زیادہ شور شرابا نہ کیا جائے۔ انہوں نے کہا ــــ "گھر کے افراد جمع ہو کر جی بھر کر ناچ لو۔"

اور یوں ہی کیا گیا۔

دوپہر کو واجبی ہنسی خوشی اور خاموشی سے نکاح پڑھوا دیا گیا اور یہ تقریب بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ طاہرہ نے دونوں کے لیے

پھولوں کے دو سہرے بنائے تھے جو اس نے اس وقت چھپائے رکھے۔ گھر کے ہی تو لوگ تھے سارے۔ کوئی رسم اور

تکلف تھا نہیں۔

عفت بیر بہوٹی بنی ہوئی تھی۔ وہ ذرا کی ذرا کمرے میں روایتی دلہنوں کی طرح لیٹی بیٹھی رہی۔ پھر وہ بھی اٹھ کر عورتوں اور بچوں

کے ہنگامے میں شامل ہو گئی۔ ارشد کچھ الگ الگ رہا جسے گھر والوں نے شرم و حجاب سمجھا لیکن طاہرہ کو معلوم تھا کہ کیا

بات ہے؟

طاہرہ گیلری میں سے گزر رہی تھی کہ ارشد سے ٹکر ہو گئی۔ وہ سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ طاہرہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور

اس کے منہ پر ہلکا سا تھپڑ مار کر مسرت بھرے لہجے میں ارشد کے ہی مخصوص انداز میں کہا ــــ "سن پٹھے! اگر ماتھے پر ذرا سا

بھی بل آیا تو یاد رکھ دانت توڑ دوں گی۔"

ارشد نے خالی سی نگاہوں سے طاہرہ کو دیکھا تو طاہرہ نے کہا ــــ "ایسے نہیں! باچھیں پھیلا کے رکھو۔ فسٹ کلاس

لڑکی دی ہے تمہیں۔"

ارشد شاید جذبات میں الجھنے والا تھا کہ طاہرہ کے ہنستے ہوئے بشاش چہرے اور مذاق نے اسے کچھ کہنے

نہ دیا بلکہ اس کا مُوڈ ہی بدلنے لگا۔

شام کو ارشاد اور عفت اکٹھے لان میں گھوم رہے تھے۔ بچوں نے دیکھا تو تالیاں بجائیں۔ امّی اور بھابی نکل آئیں اور جی بھر کے دونوں کی بلائیں لیں۔ طاہرہ موقعہ دیکھ کر دونوں سہرے نکال لائی اور سب کے سامنے لان میں جا کر ایک ارشاد کو اور دوسرا عفت کو پہنا دیا۔ اس نے دونوں کے ہاتھ پکڑے۔ کچھ کہنے لگی لیکن ہونٹ کانپ اٹھے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ارشد کی بھی مگر دونوں نے ایک دوسرے کو ڈوبنے سے بچا لیا اور طاہرہ صرف اتنا ہی کہہ سکی — "مبارک ہو۔"

دوسرے دن شادی کا ہنگامہ تو ختم ہو چکا تھا لیکن اس تقریب کا سرور "آشا بھون" پر چھایا ہوا صاف محسوس ہوتا تھا۔ تمام چہرے بشاش تھے، رجو رات سو نہ سکے تھے وہ بھی مسرت سے ترو تازہ تھے۔ شب بیداری نے آنکھوں کے گرد جو نشان چھوڑے تھے ان سے بھی رومان ٹپکتے تھے اور لان کے جو پھول اس تقریب کی زد سے بچ گئے تھے وہ بھی مسکرا رہے تھے۔ طاہرہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی، ذہن خالی تھا۔ شاید سوچ سوچ کر تھک گیا تھا ارشد اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اُٹھ بیٹھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ کوئی بات کرتا (اسے توقع تھی کہ وہ کیا بات کرے گا) طاہرہ نے ا... لیکچر شروع کر دیا۔

"میں جانتی ہوں تُم کیا سوچ رہے ہو" — طاہرہ نے کہا — "اب یوں کرو کہ کم از کم ایک ہفتہ مجھ سے دُور رہو اور زیادہ سے زیادہ وقت عفت کے ساتھ گزارو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو دل سے دُور کر دیں۔ میں ایک حل سوچ رہی ہوں۔ سات آٹھ روز بعد تم دیکھو گے کہ تمہارے دل کا بوجھ کس قدر ہلکا ہو گیا ہے۔ میرے پاس بیٹھو گے تو تمہارے دل میں پھر وہی کشمکش پیدا ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے میں بھی بھٹک جاؤں۔ تم اپنے آپ کو عفت میں جذب کر لو۔ ہمارا مقام بلند ہے۔ فلمی قسم کی محبت ہمیں زیب نہیں دیتی۔ ہمیں اپنی سطح سے نیچے نہیں آنا چاہیئے۔"

"تو گویا ہماری محبت محض مذاق تھا؟" — ارشد نے کہا — "ہنگامی سا جذبہ تھا وہ؟"

"نہیں!" — طاہرہ نے جواب دیا — "محبت برقرار ہے اور رہے گی لیکن ہم چھپ چھپ کر اس محبت کا اظہار کیوں کریں؟ میں کیوں چوری چھپے تمہارے کمرے میں آؤں؟ تم چوروں کی طرح کیوں مجھے تنہائی میں ملنے کی کوشش کرو؟ یہ چوری کیوں؟ تم میرے دل کو بہت اچھے لگتے ہو۔ میں یہ حقیقت لوگوں سے کیوں چھپاؤں؟ ہمارے گھر والے بھی محبت پر قائم ہے۔"

طاہرہ باتیں کرتے کرتے ارشد کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور دونوں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اس کے ساتھ لگ گئی۔ کہنے لگی — "عفت تمہیں دیوانہ وار چاہتی ہے۔ تم اس کی محبت کو عروج تک پہنچا سکتے ہو، اور میری محبت کا تقاضا اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ میں نے اپنی محبت اور ایمان کو بھی برقرار رکھا ہے اور عفت کو بھی اس کے مقام تک پہنچایا ہے۔" طاہرہ ہاتھ سرکا کر ارشد کے سینے تک لے گئی اور گال اس کے سر پر رکھ دیا۔ "اس میں چوری کی کیا بات ہے؟ کھول دو اور میرے قریب ہو کر بیٹھو۔ کوئی پوچھے گا تو میں کہوں گی کہ کیا ہوا اگر ارشد دوسری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ ایک پیٹ کی پیداوار دو بہن بھائی ایک دوسرے کے قریب بیٹھ سکتے ہیں تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں کہ مجھے کسی دوسرے

نے جنم دیا ہے.... نہیں سمجھے، ارشد؟"

"خدا جانے تمہیں فلاسفر کس نے بنا دیا ہے" — ارشد نے مسکرا کر کہا۔

"تمہاری محبت نے" — طاہرہ نے اس کے جسم کو اپنے بازوؤں میں دباتے ہوئے کہا — "عفت میں گھل مل جاؤ اور میرے پاس کم آیا کرو۔ اپنا آپ اس میں جذب کر لو۔ اس طرح تمہارے دل میں عفت میری جگہ لے لے گی اور یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہو گی۔ جب تمہارا پہلا بچہ پیدا ہو گا تو صُورتِ حال بالکل ہی بدل جائے گی.... کیوں؟" — طاہرہ نے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا — "بچہ پیدا ہو گا نا؟ اگلے ستمبر تک ہو جانا چاہیئے۔ ایسے کاموں میں دیر اچھی نہیں ہوتی۔"

"بالونی کہیں کی!" — ارشد نے اسے ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے کہا۔

وہ جانے کیا کیا دکھ لے کر آیا تھا۔ طاہرہ نے اسے اظہار کا موقعہ ہی نہ دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا لڑکی ہے اور کیا اس کا دماغ ہے۔ ابھی جذبات میں بہ رہی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے بچہ بن جاتی ہے۔ ارشد کو اس کی یہ خوبی بھلی لگتی تھی۔ اسی خوبی کا اثر تھا کہ ارشد جو بوجھ دل پر لے کر آیا تھا وہ بغیر کچھ کہے ہلکا ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا پایا۔ مگر اسے یہ خیال بھی آیا کہ طاہرہ کا دماغ ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو نارمل نہیں۔ یہ لڑکی دیوانگی کے قریب ہے۔

شام کو عفت طاہرہ کے کمرے میں آئی۔ طاہرہ نے اس کا استقبال اس سے بغل گیر ہو کر کیا۔ رات کی بات پوچھی۔ بات کی تفصیلات پوچھیں۔ چھیڑ خانی کی۔ جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی اور عفت کو خوب پریشان کیا۔ اس چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق میں طاہرہ نے اپنے اچھلتے دل کو سنبھال لیا تھا۔ ایک دکھ دبا لیا تھا اور اس رویے نے اس پر یہ کرم کیا کہ وہ بھول ہی گئی کہ ارشد کے ساتھ کبھی اس کا تعلق تھا۔ یہ رویہ پیدا کرنے کے لیے طاہرہ کو بڑے بڑے جتن کرنے پڑتے تھے اور اب اسے اپنے اُوپر فتح کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔

"دیکھو عفت!" — اس نے سنجیدہ ہو کر کہا — "ارشد تو مرتا ہے تم پر۔ میں تو تمہاری محبت پر حیران ہوتی رہتی ہوں۔ آج میرے پاس آیا تھا، جتنی دیر بیٹھا رہا تمہاری ہی باتیں کرتا رہا۔"

"سچ، طاہری!" — عفت نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں!" — طاہرہ نے کہا — "لیکن عفت! یہ خیال رکھنا کہ وہ بعض اوقات چپ چاپ سا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی عادت ہے۔ اس کی ایسی خاموشی کو غلط نہ سمجھنا اور دیکھو، اسے اپنے ساتھ پُوری طرح بے تکلف کر لو۔ اجڈ لڑکیوں کی طرح بلا وجہ شرم اور جھجک میں نہ رہنا۔ خاوند سے کیا شرم؟ جب وہ دفتر سے آئے اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے جایا کرو۔ چائے خود لا کر اسے پلایا کرو۔ اسے پاس بٹھاؤ۔ اس کے پاس بیٹھو اور اس کی تھکان دور کر کے دم لو۔ سُنا؟"

"یہ باتیں تمہیں کس نے بتائی تھیں طاہرہ؟" — عفت نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"تیری ماں نے" — طاہرہ نے پیار بھرے غصے سے کہا — "بھلا یہ باتیں بھی کسی کے سکھانے کی ہوتی ہیں؟ تم خود نہیں سوچ سکتیں کہ تم ایک مرد کے جسم اور روح کی مالک ہو اور مرد بھی وہ جسے تم دل و جان سے چاہتی ہو اور وہ تم پر جان نثار کرتا ہے۔ کیا تم اسے خوش کرنے کے لیے اس کے بُوٹوں کے تسمے بھی نہ کھولو گی؟"

"ہاں! یہ تو ٹھیک ہے۔"

"کل شام ارشد کو مجبور کر کے پکچر پر لے جانا" — طاہرہ نے کہا — "شاید وہ انکار کرے لیکن تم لے ہی جانا۔"

"انکار کیوں کریں گے وہ!"

"مردوں کا مزاج ہی ایسا ہوتا ہے" — طاہرہ نے کہا — "ہو سکتا ہے وہ تمہیں کمرے میں اپنے پاس بٹھلانا چاہے۔ تم ضد کر کے اسے پکچر پر لے جانا۔"

ایک دن باتوں باتوں میں طاہرہ نے عفت سے کہا — "عفت ایک بات مانو۔ یہ زیور آج کل اچھا نہیں لگتا۔ بہت پرانے نمونے کی ساخت ہے۔ تم باہر جاتی ہو تو لوگ دیکھ کر کہتے ہوں گے کوئی دیہاتی لڑکی ہے۔"

"نہ بھئی!" — عفت بچوں کی طرح بولی — "اب میں واپس نہیں کروں گی۔"

"میں واپس نہیں مانگ رہی پگلی!" — طاہرہ نے ترش روئی سے کہا — "اسے تبدیل کر لو اور دوسری چیزوں میں نئے نمونے کی چیزیں لے لو۔ آج کل چھوٹے چھوٹے ٹاپس پہننے کا رواج ہے۔ یہ اتنا دزنی زیور تم کیوں لٹکاتے پھرتی ہو۔ خواہ مخواہ اپنا مذاق بنا رہی ہو؟"

عفت کے دماغ نے اس بات کو قبول نہ کیا۔

طاہرہ اپنی اس مصروفیت میں سب کچھ فراموش کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ارشد خلاؤں میں معلق رہا۔ شروع شروع میں اس کے پاس عفت کو ناپسند کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی سوائے اس کے کہ اس کے تصورات اور اعصاب پر طاہرہ چھائی ہوئی تھی۔ اس نے بارہا کوشش کی کہ طاہرہ کو دل سے اُگل دے لیکن وہ تنہا ہوتا تو طاہرہ کا تصور چوری چھپے اس کے ذہن میں گھس آتا۔ اب تو کوئی راہِ فرار نہیں تھی۔

کئی بار یوں بھی ہوا کہ وہ عفت کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ عفت نے اس بلا وجہ خاموشی کو محسوس بھی کیا لیکن اسے فوراً طاہرہ کے الفاظ یاد آ گئے کہ ارشد بعض اوقات چپ سا ہو جاتا ہے، یہ اس کی عادت ہے۔ عفت کسی غلط فہمی میں نہ اُلجھی لیکن دو تین موقعے ایسے آئے کہ عفت نے رومان انگیز جذبات سے سرشار ہو کر ارشد سے کوئی بات شروع کی اور ایسی حرکات کیں جیسے ارشد کو سینے کی تہوں میں بٹھا لینا چاہتی ہو لیکن ارشد کو جیسے ہوش ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ہم کلام ہے۔ ایسے میں عفت نے محسوس کیا جیسے وہ برف کے تودے کے ساتھ کھیل رہی ہو۔ اس کے دل میں درد سا اُٹھتا جسے وہ طاہرہ کے ان الفاظ سے دبا لیتی تھی کہ مردوں کا مزاج ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔

ایک دن عفت نے ارشد کے اس رویّے کی طاہرہ سے شکایت کر ہی دی۔ طاہرہ نے ہنس کر وہی فقرہ دہرایا — "میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ یہ اس کی عادت ہے؟"

اسی رات اس نے ارشد کو بھی کھینچا لیکن ارشد مجبور سا ہوتا جا رہا تھا۔ طاہرہ نے اسے بہت کچھ کہا لیکن ارشد کے پاس دکھے ہوئے احساسات کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا — "عفت میں اچھے خاندان والی بلند خیالی نہیں" — لیکن طاہرہ نے یہ دلیل قبول نہ کی۔

"میں نے بہت جتن کیے ہیں طاہرہ!" — ایک دو روز بعد ارشد نے تنگ آ کر طاہرہ کو بتایا — "لیکن اس میں وہ بات پیدا ہی نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں تم نے یہ رائے کس طرح قائم کر لی تھی کہ اس کی پسماندہ خیالی ختم ہو گئی ہے۔ بخدا میں تو اس چیز کو مانتا ہی نہیں کہ جس ماحول میں وہ جنی پلی اور جس تاریکی میں اس نے چودہ برس گزارے ہوں اس کے اثرات تم نے دو تین سال میں دھو ڈالے ہیں۔"

یہ باتیں سن کر طاہرہ کو افسوس ہو رہا تھا۔ ایک اس لیے کہ عفت اپنی اور ارشد کی زندگی اجیرن بنا رہی تھی دُوسرا اس لیے کہ اُس نے، طاہرہ نے خود، ارشد کو دیدہ دانستہ اس اذیت میں پھینک دیا تھا اور اپنی محبت کو بھی قربان کر دیا تھا لیکن طاہرہ اتنی جلدی ہار ماننا نہ چاہتی تھی۔ شکست خوردگی اس کا شیوہ نہ تھا۔ اس نے ارشد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"خدا کے لیے اس فریب سے نکلو طاہرہ جو تم نے اپنے اُوپر ایثار کے نام سے اوڑھ رکھا ہے" — ارشد نے تپ کر کہا — "میں نے اسے ہزار بار کہا ہے کہ یہ دنیا بھر کا جو زیور لٹکاتے پھرتی ہو، اتار دو۔ اب ہمارے گھر میں اچھے اچھے گھرانوں کی عورتیں اور مرد آنے لگے ہیں۔ کل تم نے نوٹ نہیں کیا کہ وہ لڑکی جو بھابی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، عفت کے زیورات کو دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ لڑکی دیہاتی معلوم ہوتی ہے۔ پھر تم نے ضد کر کے اس کا برقعہ بھی اتروا دیا ہے۔ اگر برقعہ پہنے تو اس سے اس زیور کے بھونڈے پن کو تو چھپایا جا سکتا ہے۔ اس پر تمہاری یہ ضد کہ ہم دونوں باہر بھی جایا کریں۔ اللہ جانتا ہے کہ راستے میں لوگ بھی دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ آج کل بھلا کون اتنا اور اس قسم کا زیور پہنتا ہے؟ سینما ہال میں بیٹھے زور زور سے مجھ سے پکچر کے متعلق پوچھتی رہتی ہے۔ اُدھر پکچر چل رہی ہے اِدھر بیگم صاحبہ اُونچی آواز میں سوالوں پہ سوال کیے جا رہی ہیں۔ کئی بار اگلی سیٹوں والوں نے پیچھے گھوم کر بھی دیکھا ہے۔"

"سوال کیا پوچھتی ہے؟" — طاہرہ نے پُوچھا۔

"خاک پوچھتی ہے۔ حالانکہ اردو اچھی طرح سمجھتی ہے" — ارشد نے کہا — "جب ایک سین ختم ہوتا ہے تو پوچھتی ہے اب کیا ہوگا! ایک دن میں نے اسے غصے میں آ کر کہا کہ یہی جاننے کے لیے تو میں نے دو ٹکٹ خریدے ہیں کہ اب کیا ہوگا۔ اگر پہلے پتہ ہوتا تو پیسے کیوں خرچ کرتے! لیکن وہ سمجھنے والی کہاں۔ پہلے دن جو پکچر دیکھ کر نکلے تو ٹانگے میں بیٹھے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بیکار اور بیہودہ سوال۔ مجھے بڑی شرم آئی۔ ٹانگے والا بار بار پیچھے دیکھتا تھا۔ میں نے بات کا رخ بدلنے کے لیے کئی باتیں کیں لیکن وہ اپنی باتوں سے نہ ہٹی۔"

"ارشد! یہ کوئی مشکل نہیں" — طاہرہ نے کہا — "میں جانتی تھی تمہیں یہ دقت ہوگی۔ ہمت کیے جاؤ اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ سنبھل جائے گی۔ ابھی تو شادی کو کل ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے۔"

"غلط ہے۔ طاہرہ! بالکل غلط ہے" — ارشد نے اکتا کر کہا — "وہ دن بدن پیچھے جا رہی ہے۔ محبت کے سرور اور نشے میں وہ بہت دور پیچھے چلی گئی ہے۔ ذہنی نشوونما کی خاطر اس کی جدوجہد ختم ہو گئی ہے اور اب ذہنی اور روحانی تنزل شروع ہو گیا ہے۔"

ین محبت تو ہے نا!

"خاک محبت ہے!" ــــ ارشد نے کہا ــــ "طاہرہ! بات کرتے شرم آتی ہے لیکن میں اب تم سے شرماؤں گا نہیں۔ یہ باتیں مجھے پریشان کرنے لگی ہیں۔ خدارا میری ساری باتیں سن لو۔ اسے بکواس سمجھ کر ہی سن لو.... جانتی ہو، طاہرہ! عفت محبت کیا ہے؟ صرف جسمانی۔ یہ اس کی محبت کا عروج ہے۔ معلوم ہوتا ہے اتنی عمر تک اس کے دل و دماغ میں صرف جنسی رجحان پرورش پاتا رہا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ روح اور روحانی لذت بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ یہ بیہودہ بے تکا معاف رکھنا، طاہرہ! میں اب کھل گیا ہوں تو مجھے کھل کر بکواس کرنے دو۔ عفت کی محبت حیوانوں سے ذرہ بھر کم نہ اسی کو وہ زندگی کی مسرت سمجھتی ہے اور یہی میرے لیے موت ہے۔"

"نہیں! ذرا صبر کرو" ــــ طاہرہ نے اداس سے لہجے میں کہا ــــ "چند ماہ تک تمہارا ایک بچہ پیدا ہو جائے گا۔ پھر"

"ایک نہیں!" ــــ ارشد نے کھل کر کہا ــــ "یہ حال رہا تو چند ماہ تک دو بچے پیدا ہوں گے۔"

طاہرہ خوب ہنسی اور ہنستے ہنستے کہا ــــ "تم تو بالکل ہی بکواسی ہو گئے ہو۔"

"بکواسی کہتی ہو تم؟ بخدا مجھے تو اس بیوی نے فحش اور جنگلی بنا دیا ہے اور ٹریجیڈی یہ ہے طاہرہ کہ میری روح ہی ہے۔ خدا کی قسم نہ جینے میں کوئی سرور رہا ہے نہ لذت۔ ایسی لیتی کہ اب حیوانیت ہی شیوہ بنتی جا رہی ہے اور اس کا جسم ہنگامی بے خودی کا عادی ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ محض گوشت پوست کا پیکر ہوتی ہے ــــ سرد اور سرد ــــ اس کا جسم روح سے بیزار ہو چکا ہے۔"

"اچھا ہوا جو تم نے مجھے بے تکلفی سے بتا دیا ہے" ــــ طاہرہ نے گہری سوچ سے جاگتے ہوئے کہا ــــ "میں اس رجحان تبدیل کروں گی۔"

"خیال ہے، طاہرہ!" ــــ ارشد نے کہا ــــ "ایک بیکار خیال۔ میں تو اب تمہاری غلطی کی سزا بھگت رہا ہوں۔ بے آدمی گرتا ہے تو کئی بار گرتا ہے لیکن ہاتھوں کے بل۔ عقل مند آدمی گرتا ہے تو ایک ہی بار لیکن سر کے بل۔ پھر اٹھ سکتا۔ کچھ ایسی ہی غلطی تم نے کی ہے۔"

"میں تو اسے اب بھی غلطی نہیں کہوں گی۔"

"تم خفت مٹا رہی ہو، طاہرہ! اپنے آپ کو فریب دے رہی ہو۔ میں امی اور بھابی کے سامنے مجبور بول کر عفت کے اجڈ پن کو چھپا رہا ہوں لیکن وہ بھی اس کا دیہاتی پن محسوس کرنے لگی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ..."

خاموش ہو گیا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ؟" ــــ طاہرہ سراپا سوال بن گئی۔

"کچھ نہیں، طاہرہ!" ــــ ارشد نے آہ لے کر کہا ــــ "یہ گاڑی چل نہ سکے گی۔"

"یوں نہ کہو، ارشد!" ــــ طاہرہ نے اٹھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے ــــ "اس گاڑی کو چلانا ہے۔ میری خاطر۔ دو۔ اسے اپنی باتوں اور اپنے خیالوں میں الجھا لو۔"

"تمہیں اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ میں کس قدر تھک گیا ہوں" ــــ ارشد نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ ذرا توقف سے اداس لہجے میں بولا ــــ "ڈرتا ہوں کہیں جینے سے ہی بیزار نہ ہو جاؤں۔ اب تو میں اس کے ساتھ بات ہی بہت کم کرتا ہوں۔ ہزار کوشش کے باوجود طبیعت مائل نہیں ہوتی کہ اسے کچھ بھی کہوں۔ ڈیڑھ مہینہ کم عرصہ نہیں ہوتا۔"

دونوں اس موضوع میں ایسے الجھے کہ انہیں خیال ہی نہ رہا کہ رات کے دس بج رہے ہیں۔ عفت کمرے میں ارشد کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی کرسی پر بیٹھتی، کبھی پلنگ پر لیٹ جاتی۔ اسے ارشد کے بغیر چین نہیں آ رہا تھا۔ چند دنوں سے وہ ارشد کی خاموشی اور بے رخی کو محسوس کرنے لگی تھی۔ ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں اسے شک ہونے لگا تھا کہ یہ خاموشی ارشد کی عادت نہیں۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ اس کی محدود نگاہی اس سے آگے دیکھنے سے قاصر تھی۔ چند دنوں سے ارشد نے اس کے ساتھ بات چیت بہت کم کر دی تھی اور رات اس کے کمرے میں، جو اب ان دونوں کا کمرہ تھا، ارشد نے بہت دیر سے آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ رات گئے تک اپنے پڑھنے کے کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ گذشتہ رات عفت اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لائی تھی۔

عفت کو ایک اور خیال آسیب کی طرح پریشان کرنے لگا تھا۔ وہ یہ کہ رفیوجی کیمپ میں طاہرہ اور ارشد جو راتوں کو باہر نکل جاتے تھے اس میں کوئی راز تھا۔ طاہرہ نے اسے بتایا تھا کہ ــــ "ارشد تجھے ہی چاہتا ہے اور میں اسے تمہارے ساتھ شادی کے لیے تیار کر رہی ہوں بلکہ ارشد نے یہ خواہش ظاہر کر بھی دی ہے۔" لیکن دو ایک روز سے طاہرہ کی ان باتوں سے اسے شک کی بو آنے لگی تھی۔

آج رات ارشد پھر عفت کے پاس نہ آیا تو عفت نے سوچ سوچ کر دانت پیس لیے۔ وہ ہر اس انسان کو کچا چبا جانا چاہتی تھی جو اس کے اور ارشد کے درمیان آنے کی کوشش کرے۔ اس نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر ارشد کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کے کمرے کے سامنے برآمدے میں اندھیرا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ارشد یا تو کمرے میں ہے ہی نہیں یا وہیں سو گیا ہے۔ اس کمرے کی بغل میں طاہرہ کے کمرے کی کھڑکی میں سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں سے نکل کر ارشد کے کمرے کی طرف چلی۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ اگر وہ سو بھی گیا ہے تو اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے آئے گی۔ جب وہ طاہرہ کی کھڑکی کے سامنے سے گزر رہی تھی تو اس کے کانوں میں ارشد کے یہ الفاظ پڑے۔

"ہزار کوشش کے باوجود طبیعت مائل ہی نہیں ہوتی کہ اسے کچھ بھی کہوں۔"

عفت وہیں رک گئی اور کان کھڑے کر لیے۔ ارشد کی آواز طاہرہ کے کمرے میں سے آ رہی تھی۔

"ارشد! میں نے تمہیں چاہا ہے" ــــ یہ طاہرہ کے لرزتے ہوئے جذباتی الفاظ تھے ــــ "میں نے تم سے محبت کی ہے۔ خدارا میری محبت کو نہ کچلنا۔ اس محبت کی خاطر سب کچھ برداشت کرو۔"

"طاہری!" ــــ ارشد اس سے زیادہ جذباتی لہجے میں کہ رہا تھا ــــ "میرے لیے اب کوئی راہ نہیں۔ میں تمہاری محبت بھی مجروح نہیں کرنا چاہتا۔ میں دو پتھروں کے درمیان پس رہا ہوں۔"

"دیکھو ارشد! وہ جنگلی سہی۔ اجڈ سہی...." طاہرہ کا فقرہ پورا نہ ہو سکا۔

"کاش ہم دونوں کو پہلے سے علم ہو جاتا" ــــ ارشد نے طاہرہ کی بات کاٹ کر کہا ــــ "ان چاندنی راتوں کی بے لوث

محبت بے بس ہوگئی ہے۔"

عفت نے یہ الفاظ سُنے تو دبے پاؤں وہاں سے ہٹی اور دھڑام سے اپنے پلنگ پر آگری۔ اس نے دانتوں کو پیس کر اپنے آپ سے کہا۔ "میری آنکھوں کے سامنے میری محبت کا خون... طاہرہ آستین کا سانپ ہے۔"

"خدا کے لیے، ارشد!" طاہرہ ارشد سے کہہ رہی تھی۔ "ان چاندنی راتوں کو بھول جاؤ۔ جذبات میں الجھ کر اپنی اور عفت کی زندگی تباہ نہ کرو۔ وہ وقت گزر گیا ہے۔ اب اس وقت کو حسین بناؤ۔ میری خاطر، میری محبت کی خاطر عفت کو دل و جان سے قبول کر لو۔ یہ میرا ایمان ہے۔ اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ یہ ایک عظیم نیکی ہے۔ خدارا، ارشد اس نیکی کو برباد نہ کرو۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

عفت غصے میں بپھری ہوئی، پاگلوں کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتی کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ ارشد طاہرہ کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور رات وہیں گزاری۔

دوسری صبح عفت طاہرہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر شب بیداری کے اثرات نمایاں تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں اس نشئی کی آنکھوں کی مانند تھیں جو رات بھر نشے سے ٹوٹتا رہا اور اس وجہ سے بے حال رہا ہو۔ عفت کے اس حلیے کو دیکھ کر طاہرہ کو اطمینان ہوا۔ اس نے سمجھا کہ ارشد اور وہ تمام رات جاگتے رہے ہیں اور وہ یقیناً مطلب کی باتیں کرتے رہے ہوں گے یا کم از کم اکٹھے رہے ہوں گے۔

"آؤ عفت!" طاہرہ نے ہر روز کے عام لہجے میں کہا۔ "صبح صبح اُٹھ کے نہا دھو لیا کرو۔ تمہیں شاید یہ حلیہ اچھا لگتا ہے" طاہرہ نے شرارت کے لہجے میں کہا۔ "اس حلیے میں ارشد کے پیار کے نقوش ملتے ہیں نا! اس لیے تم اس کو پسند کرتی ہو۔ ہے نا یہی بات؟"

عفت خاموش کھڑی رہی جیسے اس نے طاہرہ کی بات سُنی ہی نہیں تھی۔ طاہرہ نے اس کی اندرونی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو! میں آج تمہارے ساتھ ایک اور بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"...یہ کہ تم ارشد کو چاہتی ہو اور تمہیں دکھ ہو رہا ہے کہ ارشد نے میرے ساتھ شادی کر لی ہے۔" عفت نے لہجے میں ایک طوفان چھپا کر بظاہر تحمل سے کہا۔ لیکن اس میں طنز کے جو نشتر تھے وہ پوشیدہ نہیں تھے اور طاہرہ نے ان کی چبھن دل ہی دل میں محسوس کی۔

"کیا بکتی ہو عفت؟" طاہرہ نے مخصوص بے تکلفی سے کہا۔

"جیسے تمہیں پتہ ہی نہیں" عفت نے اپنا لب و لہجہ نہ بدلا اور کہا۔ "سنو طاہرہ! میں نے تمہیں کیمپ پر کہا تھا کہ میں تم دونوں کے درمیان نہ رہوں تو بہتر ہے، ورنہ میں تم دونوں پر ناگوار بوجھ بنی رہوں گی لیکن تم نے جانے کیا سوچ کر مجھے اپنے ساتھ چپکائے رکھا۔ آج ارشد پر میرا قبضہ ہو گیا ہے تو تمہیں دُکھ ہونے لگا ہے اور اب مجھ سے میرا خاوند چھین رہی ہو۔"

"اوہ؟" طاہرہ کے مُنہ سے جیسے استعجاب کی آہ نکلی ہو۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"پہلے مجھے شک تھا۔ اب یقین ہو گیا ہے کہ تم اپنی محبت کی خاطر ارشد کو مجھ سے دُور لے جا رہی ہو۔" عفت نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر ایسی بات تھی تو مجھے اس کے حوالے کیوں کیا تھا؟"

"تم بھول گئی ہو کہ میں نے خود تمہاری شادی کا بندوبست کیا تھا۔" طاہرہ نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یاد نہیں رہا کہ میں نے ہی تمہیں بتایا تھا کہ ارشد تمہیں چاہتا ہے اور وہ تمہارا ہے۔ یہ بھی سوچا تم نے کہ میں نے ایسے کیوں کیا تھا؟ ایسے کیوں کہا تھا؟ میں پاگل تھی کیا؟ اگر مجھے اس سے محبت ہوتی تو میں اسے تمہارے حوالے کیوں کرتی؟ آخر کیا وجہ تھی کہ میں نے تمہیں اس رات یقین دلایا تھا کہ وہ تم کو چاہتا ہے؟ ذرا سوچو عفت!"

"وجہ یہ تھی کہ میں نے تم دونوں کو اکیلے باہر جاتے اور رات رات باہر گزارتے پکڑ لیا تھا" عفت نے خود اعتمادی سے کہا۔ "وجہ یہ تھی کہ تم اُس وقت مُجرم تھیں اور تم بوکھلا گئی تھیں۔ تم جرم کر چکی تھیں۔ طاہرہ! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ عورت مرد سے کیا چاہتی ہے۔ عورت اور مرد کا ملاپ کیا ہوتا ہے۔ مُجھے معلوم ہے۔"

"تم جنگلی کی جنگلی رہیں" طاہرہ نے کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھی تھی میں نے تمہیں اندھیرے میں سے نکال لیا ہے لیکن تم اس سے بھی زیادہ گہرے اندھیرے میں جا گری ہو۔ جس نے تمہیں راہ دکھائی اور جس نے تمہاری ہر تمنا پوری کی تم اس پر یہ بہتان لگا رہی ہو کہ وہ مجرم ہے۔ میں تمہارے ساتھ یہی بات کرنا چاہتی تھی کہ اپنا یہ خیال بدل دو کہ عورت اور مرد کا ملاپ جسمانی ہوتا ہے۔ تمہارے اسی رجحان اور رویے نے ارشد کو مایوس کر دیا ہے۔ میں تمہیں ایک بلندی پر لے گئی تھی اور تم نے ایک ہی جست میں اپنے آپ کو گہری کھائیوں میں گرا لیا ہے۔ میں نے تمہاری اجاڑ بیابان ہستی میں جس روح کو بیدار کیا تھا اسے تمہارے جسم نے نگل لیا ہے۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں ایسی باتیں کر رہی ہوں لیکن میرا مطلب احسان گنوانا نہیں۔"

"تمہارا مطلب صرف احسان جتانے سے ہے" عفت نے اسی طرح کھڑے کھڑے کہا۔ "تمہیں تو اس زیور کا بھی افسوس ہو رہا ہے جو تم نے مجھے دیا ہے۔ اسی لیے تم میرے پیچھے پڑ گئی تھیں کہ وہ زیور واپس کر دو تمہیں اچھا نہیں لگتا۔"

طاہرہ کو غصے نے آگ بگولا کر دیا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ موقعے کا تقاضا کچھ اور ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جسے اس نے سنبھال کر کہا۔ "یہ بھول گئی ہو کہ میں نے اس کے بدلے تمہیں نئی اور اچھی چیزیں پیش کی تھیں؟"

"وہ اس لیے کہ وہ ہلکی ہیں اور خالص سونے کی نہیں... طاہرہ!" عفت نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں کئی روز سے دیکھ رہی ہوں کہ ارشد مجھ سے دور ہٹتا جا رہا ہے۔ میں اس کی یہ بے رُخی اور سرد مہری سمجھ نہ سکی لیکن رات یہ بھید کھل گیا ہے۔ میں نے تم دونوں کی باتیں سُن لی ہیں۔"

"کیا سنا ہے تم نے؟"

"یہ کہ ارشد! میں نے تمہیں چاہا ہے۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ خدارا میری محبت کو کچل نہ دینا۔ میری محبت کی خاطر سب کچھ برداشت کر لو۔ یہ تم نے کہا تھا اور ارشد نے کہا تھا کہ میرے لیے اب کوئی راہ نہیں۔ میں تمہاری محبت کو مجروح نہیں کرنا چاہتا پھر تم نے کہا تھا کہ عفت جنگلی اور اجڈ ہے اور ارشد نے کہا تھا کہ ان چاندنی راتوں کی محبت بے بس ہوگئی ہے۔"

"اور کچھ؟"

"ایک عورت میں اس سے زیادہ سننے کی تاب ہی کہاں ہوتی ہے۔"

"بس تم نے اسی قدر سنا تھا؟"

عفت خاموش رہی۔

"کیا تم نے ان فقروں سے پہلے اور بعد بھی کچھ سُنا تھا؟"

"سننے کی ہمت ہی کہاں تھی۔"

"کاش! تم اس سے پہلے اور بعد کی باتیں بھی سُن لیتیں!" طاہرہ نے تحمل سے کہا — "اوہ! عفت! اِ
آپ کو دیکھے اور سمجھے بغیر میری تمام امنگوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں اب یہی کہتی ہوں....؟ طاہرہ کی آواز بلند اور درا
اور اس میں ایک جلال جھلک اٹھا — "میں اب بھی کہتی ہوں کہ ارشد نے نہیں، تم دونوں نے مل کر میری امنگوں اور
کو کچل ڈالا ہے۔ میں وہی الفاظ تمہیں کہتی ہوں جو رات ارشد کو کہے تھے اور تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ میری
خاطر سب کچھ برداشت کرو۔ سنو، عفت! میں نہ چاہتی تھی کہ ایک راز تم پر فاش کروں لیکن حالات نے مجبور کر دیا ہے"۔
نے تلخ سا گھونٹ اطمینان سے نگل کر کہا — "ارشد اور میں ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے تھے۔ ہم نے کتنی ہی را
سے دور بیٹھ کر گزاری ہیں۔ جب ہماری محبت عروج پر تھی تو اس حسین منظر میں تم داخل ہو گئیں اور تم نے اپنے جذبات
مخصوص رنگ میں میرے سامنے پھیلا دیئے۔ اب ایک طرف میرے جذبات اور احساسات تھے اور دوسری طرف
اخلاق اور کردار.... جانتی ہو کردار کسے کہتے ہیں؟ بھول گئی ہو میرے تمام سبق؟"

عفت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے بے بسی کے عالم میں اپنے جسم کو کرسی پر پھینک دیا۔ اس کی تمام شخ
طاہرہ کے باوقار کردار کے سامنے ریت کے گھروندے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ طاہرہ کا اخلاق اور شخصیت اس
کی طرح غالب تھی۔ عفت سمجھی شاید سایہ ہٹ گیا ہے۔ دوسری طرف عفت کی شخصیت کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ طا
اس کے نیچے بنیادیں رکھی تھیں لیکن ان بنیادوں کے نیچے ریت اور پانی تھا۔ صرف ایک جھٹکے کی ضرورت تھی۔ عفت
کچھ سوچ کر آئی تھی لیکن طاہرہ نے بات کی تو عفت نے محسوس کیا جیسے طاہرہ کا سینہ ایک طلسمی دیوار کی طرح کھل گ
جانے کس قوت کے تحت عفت اس میں سماتی جا رہی ہے۔ دیوار کا شگاف بند ہو گیا اور عفت اسی میں گم ہو گئی۔

"میرا ایمان میرا کردار ہے اور تمہارا ایمان ارشد کے جسم تک محدود ہے" — طاہرہ نے طلسماتی سے انداز میں کہا
کے سامنے وہ طاہرہ آ گئی جس نے جلال آباد کے تھانے کے سامنے ہزاروں پسپا ہوتے مردوں کو سالار کے گھوڑے پر
ہو کر للکارا تھا اور اس طوفان کا رخ بندوقوں کی طرف کر کے بندوقوں کے دہانوں سے نکلتے ہوئے آگ کے شعلے بجھا د
عفت اپنے اندر ہی اندر تڑپ اٹھی۔ اس کا جسم ساکت تھا۔

"تم ایک پودا ہو جسے میں نے اپنی محبت کے خون سے سینچا ہے" — طاہرہ کہہ رہی تھی — "میں نے ارشد
پڑ کر اسے تمہارے حوالے کیا تھا۔ تم نے تو صرف ایک رات کی دو باتیں سنی ہیں۔ میں نے ساری ساری رات کتنی را
اپنے قریب تڑپا کر اسے تم میں اور تمہیں اس میں جذب کر لینے اور جذب ہو جانے کے سبق پڑھائے ہیں۔ میں نے

بات میں اپنی محبت کا واسطہ دیا ہے لیکن تم اس چٹان کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہلیں جو چڑھتے سمندر کے نیچے ڈوب جاتی ہے ہلتی
نہیں، اس میں ہلنے اور ابھرنے کی سکت ہی نہیں ہوتی۔"

عفت نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس نے اپنے آپ کو دریا کی مہیب لہروں میں بہتے پایا۔ وہ لہریں جنہیں وہ ہجرت
کے دوران مزارعہ کے سہارے بغیر عبور نہ کر سکی تھی۔ اس نے ایک بار پھر سہارے کی ضرورت محسوس کی۔ اس پر ڈوبنے کی
کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ سینہ اٹھ اٹھ کر بیٹھنے لگا۔

".....تم ارشد سے صرف جسمانی آسودگی چاہتی ہو" — طاہرہ نے اسی لہجے میں کہا — "یہ تمہارا مقام ہے۔ تم نہیں
جانتیں کہ ارشد اس مقام سے بہت آگے ہے۔ بہت بلند ہے۔ وہ ارشد جس نے تعلیم چھوڑ کر صرف سبز جھنڈے کی خاطر
اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ وہ ارشد جس نے جلوسوں کی قیادت کی ہے اور عورتوں کو منظم کیا ہے۔ وہ ارشد جس کے ارد گرد
کالج کی نوجوان لڑکیاں مکھیوں کی طرح بھنبھناتی رہتی تھیں اور اس کی نظر سبز جھنڈے سے اٹھتی نہ تھی۔ جس مرد کے سینے میں
یہ ولولے پرورش پا رہے ہوں وہ جسمانی آسودگی کے قائل نہیں ہوا کرتے۔ اس کے بال و پر لپیٹے ہوئے نہیں رہتے۔ تم عفت!
ارشد کے پر نوچ رہی ہو جس نے پاکستان کی خاطر اور قومی پرچم کی خاطر"....

"طاہرہ!" — عفت چیخ مار کر اٹھی۔ ایک دل خراش چیخ۔ اور طاہرہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس کے سامنے دو زانو ہو گئی۔
ایک طوفان جو اس کے سینے سے اٹھ رہا تھا سینکڑوں بگولوں کی صورت اختیار کر گیا اور عفت بے بس اور بے سہارا ہو کر طاہرہ کے
سامنے گر گئی۔ اس نے بچوں کی طرح روتے ہوئے کہا "لے جاؤ اپنا پاکستان.... لے جاؤ یہ سبز جھنڈے۔ مجھے میرا ارشد دے دو
... مجھے میرا ارشد لوٹا دو.... طاہرہ! اور اس کے باقی الفاظ سسکیوں اور ہچکیوں میں کھو گئے۔

"پاگل نہ بنو عفت!" — طاہرہ نے دبے ہوئے غصے سے کہا — "ہوش میں آؤ۔"

"تم نے میرے ہوش اڑا دیئے ہیں، طاہرہ!" — عفت نے طاہرہ کے سہارے اٹھتے ہوئے کہا — "میری ایک بات
مان جاؤ۔ بس آخری بات۔ پھر تم سے کچھ نہ مانگوں گی۔"

طاہرہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"تم یہاں سے چلی جاؤ" — عفت نے اسی طرح روتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا — "اپنا سارا زیور لے جاؤ۔ جب تک
تم ارشد کے سامنے ہو وہ مجھ سے دور رہے گا۔ میں جان گئی ہوں وہ تمہیں چاہتا ہے اور تم اسے چاہتی ہو۔ تم ہمارے درمیان
سے ہٹ جاؤ۔ یہاں سے چلی جاؤ۔"

"کہاں؟"

"جہاں تمہارا جی چاہے۔ یہاں سے نکل جاؤ" — عفت کے لہجے میں التجا تھی۔

"دربدر ٹھوکریں کھانے کے لیے؟" — طاہرہ نے اطمینان سے پوچھا — "میں اکیلی کہاں رہوں گی؟ عفت! بات
کرتے کچھ تو سوچا کرو۔ کہو تو واپس رفیوجی کیمپ میں چلی جاؤں۔ وہی ایک ٹھکانہ ہے۔"

طاہرہ کی باتوں میں نرمی تھی جسے عفت نے اس کی بے بسی سمجھا۔ ایسے میں عفت کو جیسے کسی نے کان میں کہہ دیا ہو —

"ارشد تمہارا خاوند ہے اور اس کوٹھی کی مالک تم ہو۔ طاہرہ کا یہاں کیا کام؟" ——— عفت کی ہستی کی وہ عورت جسے طاہرہ نے
"طاہرہ آ ——— عفت نے لب و لہجے میں فوراً ایک تبدیلی پیدا کر کے بنگلوں والی بیگموں کے انداز سے کہا۔"
جاؤ اور کہیں ٹھکانہ کر لینا۔ میں اپنے گھر میں کسی بے مزگی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ نوری مزارعہ کو ساتھ لے جانا تمہیں اں
طاہرہ خاموشی سے عفت کو دیکھتی رہی۔ عفت نے اس کی طرف دیکھا تو طاہرہ نے آنکھیں اس کی آنکھوں م
چہرے پر اطمینان، سکون، خود اعتمادی، وقار اور جلال کے تاثرات لیے کمرے کے وسط میں کھڑی عفت کو دیکھتی ر
ہونٹوں پر ایک لطیف تبسم تھا، کنواری مسکراہٹ جس طرح انتیس کا چاند ٹیڑھی دلکش لکیر کی طرح افق سے ابھرا
ایک ایک نقش کا حسن اس طرح نکھر آیا تھا جیسے قدرت نے اپنی تمام تر رعنائیاں اور معصومیت ان خدوخال میں
نے نگاہیں نیچے کر لیں لیکن اس کی آنکھیں فوراً ہی اس طرح اوپر اٹھ گئیں جیسے غیبی قوت نے اٹھا دی ہوں۔ عفت
بار پھر طاہرہ کی طرف دیکھا اور اسے ایک بار پھر یوں لگا جیسے طاہرہ کی ہستی طلسمی دیوار کی طرح کھل گئی ہو اور عفت دھک
ہوئی اس میں داخل ہو رہی ہو۔

عفت نے اپنے اندر ہی اندر اپنے آپ کو پیچھے کھینچ لینے کی جدوجہد کی لیکن وہ نڈھال ہو گئی۔ اس نے آ
کی اور تیزی سے گھوم کر کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑی۔ طاہرہ اسے اسی طرح دیکھتی رہی۔ عفت نے دروازہ کھو
جیسے ایک جادو نے اس کے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست کر دیئے ہوں۔ وہ ذرا سی رکی۔ طاہرہ کی طرف پیٹھ کیے ہ
کواڑ کو تھام کر جھک گئی جیسے اس پر غشی طاری ہو رہی ہو۔ طاہرہ اسے اسی طرح دیکھتی رہی۔ عفت نے جھکے جھکے طا
دیکھا اور ایک بازو آنکھوں کے گرد لپیٹ کر دوسرا بازو طاہرہ کی طرف پھیلا دیا۔ پھر اس کے سینے سے ایک دلدوز چیخ نکا
"طاہرہ آ ——— عفت نے چیخ کر کہا اور طاہرہ کی طرف گئی۔ ایک بازو آنکھوں پر لپیٹ لیا جیسے اس کی آنکھوں م
دھواں پڑ گیا ہو اور دوسرا بازو ہوا میں معلق۔ طاہرہ کی طرف بڑھا ہوا جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو ——— "طاہرہ خدا کے لیے
میرے قریب آ جاؤ۔ میری طاہری! میں ڈوب رہی ہوں"

طاہرہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھی۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتی ہوئی ابھی وہ چار قدم ہی چلی ہو گی ک
بجلی کی سرعت سے طاہرہ کے قریب آ گئی اور اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ پھر اس کے سامنے گھٹنوں کے بل گر تے
اس کے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑ کر اور اس کے دامن میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

طاہرہ کے لیے یہ صورت حال تکلیف دہ تھی لیکن سکون آمیز بھی۔ وہ عفت کی ذہنی کیفیت سمجھ گئی تھی۔ طاہرہ پر رقت
گئی۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ آواز حلق میں اٹک گئی۔ اس نے عفت کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ سینے سے لگایا اور
اپنے پاس بٹھا کر اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔

"طاہرہ آ ——— عفت کی سسکیوں نے رک رک کر کہا ——— "میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے کچھ کہا تھا؟" ——— وہ اٹھ بیٹھی ا
کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے گہری نیند سے چونک اٹھی ہو۔ طاہرہ کے آنسو جاری تھے۔ عفت اکھڑی ہوئی آواز م
"تمہیں یاد ہے۔ میں نے کیا کہا تھا؟ تم چلی تو نہ جاؤ گی طاہری؟ ... تم نے کہا نہیں تھا کہ میں چلی جاؤں گی ...... نہ جانا، طاہری

لیے کہیں چلی نہ جانا"... وہ طاہرہ کے ساتھ لپٹ گئی اور روتے روتے بولی ——— "مجھے تنہا چھوڑ کے نہ جانا۔ میں بھٹک جاؤں گی
ں اندھیرے میں۔ مجھے اکیلے نہ چھوڑ جانا"

خاموشی، سکوت جیسے دونوں لڑکیوں کے آنسو تعرض نہ کر سکے۔ دو منٹ بعد عفت نے سکوت توڑا ——— "طاہری!
مر چھٹ رہا ہے"

طاہرہ نے اسے پلنگ پر لٹا دیا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کا ماتھا سہلانے لگی۔ عفت نے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر
نے پر دبا لیا۔ عفت کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور بند ہو گئیں۔ طاہرہ اس پر جھکی اور اس کی پیشانی چوم کر زیر لب کہا ——— "ارشد تمہارا ہے"
عفت گہری نیند سو گئی تھی۔

اسی دن کھانے سے ذرا پہلے ارشد کی بھابی طاہرہ کو سویٹروں کے لیے اُون خریدنے کے لیے انارکلی لے گئی۔ عفت ابھی تک سو رہی تھی۔ راستے میں بھابی نے طاہرہ سے کہا — "ارشد الگ کھویا کھویا رہتا ہے۔ عفت بھی کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی ہے۔ کچھ گڑبڑ تو نہیں؟"

"نہ بھابی!" — طاہرہ نے جواب دیا — "گڑبڑ کیا ہو گی۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ دو چار دن تک آپس میں گھل مل جائیں گے۔"

"مجھے شک ہے" — بھابی نے کہا — "کہاں وہ صبح و شام کی سیریں اور کہاں یہ حال کہ ارشد شام دیر سے گھر آتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے وہ اب کئی راتوں سے سوتا بھی اپنے کمرے میں ہے۔ دیکھا نہیں تم نے ارشد کس قدر ہنس مکھ اور کھلنڈرا تھا۔ اب بالکل ہی بجھ کے رہ گیا ہے۔ میں نے تو پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"ابھی نہ ہی پوچھیں" — طاہرہ نے مشورہ دیا — "کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو عفت مجھے ضرور بتائے گی۔"

طاہرہ فکر مند ہو گئی کہ دونوں کی ناچاکی دوسروں کو بھی نظر آنے لگی ہے۔ اگر حالات زیادہ خراب ہو گئے، طاہرہ نے سوچا، تو وہ کس طرح سنبھالے گی۔ وہ اسی فکر میں گم ہو گئی کہ دونوں میں کوئی بے مزگی پیدا نہ ہو جائے۔

دونوں انارکلی کی ایک دوکان میں اُون دیکھ رہی تھیں کہ طاہرہ نے اپنے کندھے پر ہلکا پھلکا سا ہاتھ محسوس کیا تو دو بازوؤں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ طاہرہ اس اچانک لپیٹ میں آنے سے پہلے یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ یہ کون ہے۔ جب گرفت ڈھیلی ہوئی تو دیکھا — وہ نجمہ تھی — اب طاہرہ کی باری تھی۔ وہ نجمہ کے ساتھ لپٹ گئی۔ پھر بھابی سے تعارف کرایا۔ طاہرہ کو اون کی پسند و ناپسند کا تو ہوش ہی نہ رہا۔ نجمہ کے ساتھ باتوں میں ایسی الجھی کہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ دونوں طرف سے سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور دونوں بیک وقت جواب دے رہی تھیں۔ جلال آباد کی آخری ملاقات سے لے کر اس ملاقات تک کی بیشتر باتیں پوچھی گئیں اور سنائی گئیں۔

نجمہ نے اسے بتایا کہ وہ ان دنوں راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ اس نے شادی کر لی ہے اور راولپنڈی ایک سکول میں ٹیچر ہے۔ وہ اپنی نئی زندگی پر مطمئن تھی۔ اس نے طاہرہ کو بتایا کہ وہ ایک ہفتہ لاہور ٹھہرے گی، کسی رشتہ دار کی شادی پر آئی ہے۔ طاہرہ نے اسے بتایا کہ عفت کی شادی ارشد کے ساتھ ہو گئی ہے تو نجمہ کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا اور وہ حیران

ہوئی۔ نجمہ کے لیے یہ عجوبہ تھا کہ طاہرہ کی جگہ عفت نے کس طرح لے لی۔ وہ عفت کی پچھلی زندگی سے پوری طرح آگاہ تھی۔

طاہرہ نے نجمہ کو اپنی کوٹھی کا نمبر اور پتہ بتایا اور اس کے رشتہ داروں کے مکان کا پتہ لے کر اسے دوسرے دن دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ نجمہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

واپس آتے ہوئے تانگے میں طاہرہ نے نجمہ کے متعلق بہت سی باتیں سنائیں۔ اسے سنایا کہ نجمہ کا ایک جوان بھائی تحریک پاکستان میں شہید ہو گیا ہے اور مرحوم ارشد کے ساتھ اس قدر مشابہ تھا کہ ایک دن نجمہ ارشد سے بغل گیر ہو کر بہت روئی اور اس نے ارشد کو بھائی بنا لیا ہے۔

"وہ عفت کی شادی کا سن کر حیران سی ہو گئی تھی؟" — بھابی نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"نہیں! وہ حیران نہیں ہوئی تھی" — طاہرہ نے بات پر پردہ ڈالتے ہوئے جواب دیا — "ارشد کا نام سن کر اُسے اپنا مرحوم بھائی یاد آ گیا ہوگا — اچھا ہوا کہ نجمہ نے شادی کر لی ہے ورنہ تنہائی اور فراغت میں بھائی کے لیے ہی روتی رہتی۔"

دوسرے دن نجمہ آئی۔ گھر میں خوب رونق رہی۔ جلال آباد سے نکلنے کے قصے تفصیلاً سُنے سنائے گئے انہیں بھی یاد کیا گیا جو مر گئے تھے اور انہیں بھی جو زندہ تھے لیکن کہاں؟ کسی کو کسی کا علم نہیں تھا۔ دن کے پچھلے پہر نجمہ اور طاہرہ اکیلی کمرے میں بیٹھ گئیں پھر دل کی باتیں شروع ہوئیں۔

"عفت کو کیا ہو گیا ہے؟" — نجمہ نے پوچھا۔

"شادی ہو گئی ہے" — طاہرہ نے شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ یہ شادی ہوئی کیسے؟" — نجمہ نے پوچھا — "میرا تو خیال تھا کہ ...."

"آپ کا خیال درست تھا" — طاہرہ نے نجمہ کی بات پوری نہ ہونے دی اور اسے سارا واقعہ سنا ڈالا کہ کس طرح اس نے عفت کی ایک تمنا، اپنی اور ارشد کی تمناؤں کا خون کر کے پوری کی ہے۔ لیکن اس نے نجمہ کو یہ نہ بتایا کہ اب ارشد اور عفت کی کس طرح گزر رہی ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ وہ آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ طاہرہ اپنے مخصوص رنگ میں باتیں سناتی جا رہی تھی اور نجمہ چپ چاپ اُس کی باتیں سنتی جا رہی تھی اور طاہرہ کے حسین خدو خال میں اس عورت کو ڈھونڈ رہی تھی جو اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے لیکن دل کی امنگ کسی کو نہیں دیتی۔ نجمہ کو طاہرہ کے خدو خال میں وہ عورت نظر نہ آئی۔ نجمہ کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔

وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ ارشد آ گیا۔ نجمہ اس سے بغل گیر ہو گئی اور بہن بھائی نے دل کھول کر باتیں کیں۔

ارشد کے جانے کے بعد نجمہ نے طاہرہ سے کہا — "عفت میں مَیں ایک تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔ وہ کچھ گُم سُم سی ہے جیسے اپنے آپ میں نہیں۔ اس میں جلال آباد والی شوخی رہی ہی نہیں۔ میں نے اسے علیحدگی میں شادی کی مبارکباد دی اور ذرا سا مذاق کیا تو وہ آہ بھر کے بولی کیا شادی ہوتی ہے۔ جانے خدا کو کیا منظور ہے۔ مَیں نے بہت کریدا لیکن وہ اُکھڑی اُکھڑی اور اُدھوری اُدھوری باتیں کرتی رہی۔"

"میاں بیوی کے درمیان ہی کچھ ہوگا" — طاہرہ نے ٹالتے ہوئے کہا — "میں نے تو پوچھا نہیں سنبھل جائیں گے۔"

"خیر! یہ تو ہُوا سو ہُوا" — نجمہ نے اس موضوع کو ختم کرتے ہُوئے پُوچھا — "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میری! راولپنڈی میرے پاس آجاؤ۔ چھوڑو آگے پڑھنے کو۔ میں اپنے سکول میں تمہیں استانی لگوا دوں گی اور شادی کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"شاید کسی وقت آ ہی جاؤں" — طاہرہ نے جواب دیا — "لیکن ابھی نہیں۔ کم از کم میٹرک تو کر لوں۔ ماسٹر ہر روز آتا ہے۔ اس سال کر لوں گی۔"

"بہر حال دیکھ لو" — نجمہ نے اس کے ساتھ بات طے کرنے کے لہجے میں کہا — "میں تمہیں اپنا ایڈریس دیتی ہُوں۔ جب بھی آنا چاہو۔ مجھے اطلاع دے دینا اور بلا جھجک چلی آنا۔ بڑا اچھا مکان مل گیا ہے۔ 'وہ' تو بہت ہی آدمی ہیں۔ ان کی ملازمت بھی اچھی ہے۔ سچ کہتی ہُوں۔ طاہرہ! تمہیں اسی قسم کا فسٹ کلاس علیحدہ کمرہ دوں گی۔ جیسے جی رہنا۔ یہاں اب تمہارا ہے ہی کیا۔ لے دے کے ایک ارشد تھا۔ اسے تم نے عفت کے حوالے کر دیا ہے۔"

"شاید آجاؤں" — طاہرہ نے اداس سی مسکراہٹ سے کہا — "شاید آ ہی جاؤں۔"

شام کو نجمہ واپس چلی گئی اور اپنے رشتہ داروں کے مکان کا اتا پتا پھر بتا گئی۔

ارشد مسلسل چھ راتیں عفت کے کمرے میں نہ گیا اور نہ ہی طاہرہ کو اس طرح بلا جس طرح اس کے پاس پہرا رہتا تھا۔ طاہرہ عفت کے کمرے میں کئی بار گئی اور جب بھی گئی اسے پریشانی کے عالم میں دیکھا یا خلاؤں میں گھورتے پا۔ اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن عفت نے نہ اس کی باتوں کا جواب دیا نہ اس کا سامنا کیا۔

ایک دن صبح صبح طاہرہ عفت کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ کمرے میں کسی چیز کے ٹوٹنے کا چھناکا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندر کا منظر قدرے حیران کن تھا۔ عفت کے سنگار میز کا شیشہ ٹوٹا ہُوا تھا اور عفت کے دائیں ہاتھ سے خُون بہ رہا تھا۔ طاہرہ نے بھاگ کر عفت کا خُون آلود ہاتھ پکڑ لیا اور پُوچھا — "یہ کیا کر لیا عفت؟"

"کچھ نہیں!" — عفت نے غصّے بھرے لہجے میں کہا — "نظر نہیں آ رہا تمہیں شیشہ ٹوٹ گیا ہے؟"

"کس طرح؟"

"مجھ سے پوچھتی ہو کس طرح؟" — عفت کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔ بولی — "اس شیشے میں پہلے چڑیل نظر آیا کرتی تھی۔ اب دو ہوگئی ہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو عفت؟" — طاہرہ عفت کی یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ اس پر بلاشک و شبہہ کسی دورے کا یہ صورتِ حال اس کے بس سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ طاہرہ کو پہلی بار اپنی کم عُمری اور ناتجربہ کاری کا احساس ہُوا اور ساتھ یہ احساس کہ شاید وہ مجرم ہے۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" — عفت نے طاہرہ کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہُوئے کہا — "اس شیشے میں مجھے طاہرہ نظر آتی تھی اب نجمہ بھی شامل ہوگئی ہے۔" — طاہرہ نے اس کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔ عفت نے کہا "شرم نہ آئی اسے، شادی شدہ مرد سے یوں بے حیائی سے بغل گیر ہوگئی تھی۔ تم سمجھتی ہو میں نے دیکھا نہیں تھا؟"

طاہرہ خاموشی سے کمرے سے نکل آئی۔ ایک کپڑا بھگویا۔ ڈیٹول کی شیشی اٹھائی اور عفت کے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ دیکھا عفت پلنگ پر بیٹھے کے بل لیٹی چھت پر ٹکٹکی باندھے ہُوئے تھی۔ اس کے ہاتھ کو بھیگے کپڑے سے صاف لیا اور ڈیٹول لگا کر ایک خشک کپڑا باندھ دیا۔ عفت یوں بے خودی میں پڑی رہی جیسے اسے کچھ علم ہی نہ ہو کہ طاہرہ کیا کر رہی ہے۔ جب ڈیٹول نے زخم پر اثر دکھایا تو عفت نے چونک کر ہاتھ کھینچ لیا۔ دیکھا کہ اس پر پٹی بندھی ہُوئی تھی۔

اس نے پہلے پٹی کو دیکھا پھر طاہرہ کو۔ چند ثانیے دیکھتی رہی۔ عفت نے بائیں ہاتھ سے طاہرہ کی ران کو پکڑا اور ران کو زور سے دبا کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سر سرہانے پر اِدھر اُدھر مارنے لگی۔ طاہرہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر تھام کر اس کی کنپٹیاں ملنے لگی — عفت چپ چاپ روتی رہی اور روتے روتے سو گئی۔

ارشد کی بھابی نے چند روز بعد طاہرہ کو قدرے فکر مند لہجے میں کہا — "طاہرہ! ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا ارشد اور عفت کھچے کھچے کیوں رہتے ہیں! میں نے عفت کو روتے بھی دیکھا ہے۔ پوچھا بھی ہے لیکن وہ کچھ بتاتی نہیں۔ ارشد بھی کھویا کھویا رہتا ہے۔ تم ہی سراغ لگاؤ!" — بھابی نے ذرا آگے جھک کر کہا — "عفت امید سے ہے۔"

طاہرہ کو کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اسے خیال آیا کہ صحیح صورتِ حال واضح کر دے لیکن خاموش رہی۔

"تم تو کہتی تھی کہ ان دونوں میں بے پناہ پیار ہے" — بھابی نے کہا — "یہ عجیب پیار ہے۔"

"بھابی!" — طاہرہ یوں بولی جیسے بکھرے ہوئے خیالات اور الفاظ چُن رہی ہو — "میں نے بھی دونوں کی یہ کیفیت دیکھی ہے۔ دونوں کو الگ الگ سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن معلوم نہیں ہو سکا کہ دونوں کے درمیان کیا حائل ہوگیا ہے۔ اصل، بھابی! دونوں کی عادتوں میں فرق ہے۔ امید ہے یہ فرق وقت کیساتھ ساتھ دور ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے یہ کوئی سنگین مسئلہ نہیں۔"

"خُدا کرے دُور ہو جائے" — بھابی نے آہ لے کر کہا۔ ذرا وقفے کے بعد بولی — "چلو آج نجمہ کے ہاں چلیں۔ گھر تلاش کرنے میں تو کوئی دقّت نہیں ہوگی۔"

"ہاں ضرور چلیں" — طاہرہ نے کہا — "عفت کو بھی لے چلتے ہیں۔"

نجمہ تینوں کو دیکھ کر خوشی سے اچھلتی کودتی پھرتی تھی۔ عفت کی تو اس نے رہ رہ کے بلائیں لیں — "میری بھابی! میری بھابی! امیر سے سگے بھائی کی بیوی" — نجمہ پر رقت طاری ہوگئی اور اس کے آنسو بہ نکلے۔ نجمہ کی رشتہ دار لڑکیاں بھی جمع ہوگئیں۔ بیٹھے بیٹھے پروگرام بن گیا کہ دوپہر کا کھانا پکا کر ساتھ باندھ لیا جائے اور دن جہانگیر کے مقبرے پہ گزارا جائے۔ قیمہ بگھار، پراٹھے، حلوا بنا اور چھ لڑکیوں کا قافلہ ایک ہی تانگے میں شاہدرہ کی طرف روانہ ہُوا۔

تانگہ راوی روڈ پر چلا جا رہا تھا۔ لڑکیاں باتیں کرتی اور ہنستی جا رہی تھیں۔ عفت اپنے خیالوں کی بھُول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی اور طاہرہ راوی روڈ کے دونوں طرف انسانوں کے اس جمگھٹے کو دیکھ رہی تھی جو مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ فٹ پاتھ پر دونوں طرف اور جہاں ذرا ذرا سی بھی جگہ خالی تھی، چار چار، پانچ پانچ، سات سات افراد کے کُنبے

چار پائیوں کے نیچے بانس رکھ کر چھت بناتے ہوئے تھے اور زمین پر کمبل اور بوریاں بچھا کر سڑک پر جاتی موٹروں، تانگوں اور لوگوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر کی کل جائداد یہی کمبل اور بوریاں، ایک حقہ، ایک گھڑا اور کسی کسی کے پاس ایک ہنڈیا بھی تھی۔ بچے چہروں پر سردی، کسمپرسی، بھوک اور بے سروسامانی کے گہرے تاثرات لیے یوں گم سم گٹھڑیاں سی بن کے بیٹھے تھے جیسے یہ بچے ہیں ہی نہیں اور ان کی ننھی ننھی زندگیوں سے کھیل شوخیاں نوچ لی گئی ہیں۔ وہ خلاؤں میں ان گھروں اور گلیوں کو دیکھ رہے تھے جو ان کے قہقہوں سے گونجتی رہتی تھیں دیکھ رہے تھے اور دیکھ ہی رہے تھے — ہر آنے والے کو اور ہر جانے والے کو۔ ہر کسی کے ہاتھوں کو — انہوں اب ماؤں سے روٹی مانگنی بھی چھوڑ دی تھی۔ ان کی معصومیت جان چکی تھی کہ ان کے ماں باپ خود بھوکے ہیں۔

تانگہ راوی روڈ پر جا رہا تھا۔ آگے طاہرہ، عفت اور نجمہ بیٹھی تھیں۔ نجمہ طاہرہ کو جانے کہاں کہاں کے قصے سنا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف اُجڑی ہوئی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ نجمہ نے باتیں کرتے کرتے محسوس کیا کہ طاہرہ کہیں گم ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا — "بیچارے مہاجر ہیں۔"

"کیا یہ اتنے عرصے سے یہیں پڑے ہیں؟" — طاہرہ نے پوچھا۔

"کچھ تو اتنے عرصے سے پڑے ہیں" — نجمہ نے جواب دیا — "اور زیادہ تر چند دن ہوتے آتے ہیں۔ ہجرت کا سلسلہ ابھی تھما نہیں۔ قافلوں کے قافلے چلے آ رہے ہیں۔"

"یہ کیمپ میں کیوں نہیں جاتے؟" — عفت نے پوچھا۔

"وہاں جگہ ہی کہاں ہے؟" — نجمہ نے جواب دیا — "وہ وقت اور تھا جب تم وہاں پہنچی تھی۔ اب جا کے کیمپ کی بارکوں، برآمدوں، میدانوں میں اور سڑکوں پر انسان ہی انسان نظر آتے ہیں۔ اس سردی کی راتوں میں وہ سو طرح ہیں؟ یہی لوگ جانتے ہیں یا اللہ جانتا ہے۔ دن کو دھوپ میں سو لیتے ہیں اور رات بھر جاگتے رہتے ہیں حکومت نے کمبل تقسیم کیے تھے لیکن پانچ سات انسانوں میں ایک کمبل کیا کرے گا۔"

"ہندو سکھ جو مکان چھوڑ گئے ہیں وہ انہیں کیوں نہیں دے دیے جاتے؟" — طاہرہ نے پوچھا۔

"یہاں اب لاٹھی اور بھینس کا معاملہ ہے" — نجمہ نے جواب دیا — "جس میں ہمت تھی وہ ٹھکانے لگ گئے۔ ان دنوں ہمت اسی میں ہے جس کے پاس پیسہ ہے یا سفارش۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے دو دو تین تین مکانوں پر قبضہ جما لیا اور ایک یہ ہیں کہ آسمان کے نیچے دو گز جگہ کے لیے بھی سر پٹخ رہے ہیں۔ کل ہی پولیس انہیں یہاں سے اُٹھا دے گی۔"

نجمہ بولتی رہی۔ تانگہ چلتا رہا اور اس سے زیادہ تیز رفتار سے طاہرہ کے خیالات کا سلسلہ چل پڑا۔ اس نے سوچا یہ ہجوم ہے جس کے سکوت میں ہنگامے اور نعرے سو رہے ہیں۔ ان کی بے بسی میں چٹانوں کا جگر چاک کرنے کی قوت سو رہی ہے۔ یہ وہ انسان ہیں جنہوں نے انگریز کی گولیوں کے سامنے سینے کھول دیتے تھے۔ ٹھٹھری ہوئی سردی میں لپٹی گٹھڑیاں وہ بچے ہیں جنہوں نے جلال آباد کے ریلوے سٹیشن پر گاڑی روک کر انگریز کمشنر کا سر جھکا دیا تھا۔ یہ وہ لڑکیاں ہیں جنہوں نے تھانے کی پتھریلی دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہی تھے وہ مسلمان جنہوں نے انگریز کے آہنی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ انہوں نے سبز پرچم کو خون سے سینچا تھا اور وادیوں میں لرزہ طاری کر دینے والے نعروں سے ہوا دی تھی۔ کہاں گئے وہ نعرے؟ ہندوستان کے کونے کونے سے اٹھتی ہوئی وہ گرجدار گونجیں کہاں گئیں؟ کعبے کو جبینوں سے بسانے والے آج سردی سے اکڑ گئے ہیں۔ ان کے جسم خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بازو مفلوج ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ قوت سلب ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ انسان مرتے جا رہے ہیں۔ ان کی رُوحیں بجھتی نظر آتی ہیں ٹمٹما رہی ہیں۔

طاہرہ نے ذہن میں ایک شور سُنا۔ یہ شور بلند ہونے لگا۔ سینے میں بچھو رینگنے لگے اور وہ بے چین ہو گئی۔ نجمہ نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن طاہرہ اپنی دنیا کے اٹھتے شور سے بیرونی دنیا کے خاموش ہنگاموں کو جگا رہی تھی۔

"نہیں! نہیں!" — طاہرہ جیسے دِل ہی دِل میں چیخ اٹھی ہو — "یہ رُوحیں بجھیں گی نہیں۔ یہ انسان مفلوج نہیں ہو گے۔ انہوں نے پاکستان بنایا ہے۔ اُنہوں نے اس چمن کی خاطر اپنے آشیانے پھونک ڈالے ہیں۔ ہندوستان کی گلیاں ہمارے لیے اجنبی تھیں۔ وہ گھر ہمارا نہیں تھا۔ ہمارا گھر یہ ہے۔ یہ — پاکستان — پاکستان — ہمیں ان گھروں کا غم نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں اس ماضی کو ذہن سے اگل دینا چاہیئے۔ ہمارے ماضی پر انگریز اور ہندو کا آسیب سوار ہے۔ ہم اس آسیب کو جھٹک آتے ہیں.... لیکن.... لیکن.... یہ مخلوق جو فٹ پاتھوں پر پڑی ٹھٹھر رہی ہے؟"

طاہرہ کے جذبات حقیقت کے سامنے ماند پڑنے لگے۔ دوسروں کی روحوں کو جگاتے جگاتے اس کی اپنی روح اُونگھنے لگی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی کہ چشم زدن میں اس کا ذہن خالی ہو گیا، ہُو حق سے ویران گھر کی طرح۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ زور سے جھٹکا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اندھیرا چھٹنے لگا — دھندلاہٹ۔ پھر اُجالا — اور اُس نے دیکھا کہ تانگہ دریائے راوی کے پل پر جا رہا تھا۔ نیچے دریا بہ رہا تھا۔

دریا خاموشی سے بہ رہا تھا۔ پانی کی ٹیڑھی سی لکیر، سرگوشیاں کرتی، بل کھاتی، کشتیوں کو دھیمے سروں میں لوریاں سناتی اور ہلا رہے دیتی۔ آہستہ آہستہ، نہایت آہستہ بہی جا رہی تھی۔ دریا کے دونوں کناروں پر سیلاب کے بعد کے نشان اس طرح نظر آ رہے تھے جس طرح بھیڑیئے کے ہونٹوں سے شکار کھانے کے بعد رال ٹپک رہی ہوتی ہے۔ راوی بھی فٹ پاتھ پر جامد ہجوم کی طرح بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ مرا ہُوا سا لیکن طاہرہ کو معلوم تھا کہ چند ہی مہینے پہلے یہ دریا یوں مرا ہُوا اور بے بس نہیں تھا۔ اس نے ہزاروں انسانوں کو لہروں پر اُٹھا اُٹھا کر پٹخ دیا تھا اور جانے کہاں سے کہاں بہا لے گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں گاؤں کے گاؤں گم ہو گئے تھے۔ اگلے سال یہ دریا پھر انگڑائی لے گا۔ ایک بار پھر جاگے گا اور چٹانوں کے دل چیر کے رکھ دے گا۔ آبادبستیوں کو سمندر میں جا پھینکے گا۔ یہ ٹھٹھرا ہُوا دریا — فٹ پاتھ پر ٹھٹھرا ہُوا یہ ہجوم — دونوں جاگیں گے۔ ان کے ہنگامے ایک ہیں۔ ان کی قوت ایک ہے۔ دریا بھی ستا رہا ہے۔ انسان بھی ستا رہا ہے۔ انسان بھی دریا ہے.... دریا؟.... اوہ.... انسان دریا ہے!

طاہرہ کے دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔ اسی قسم کی بجلی اس کے لبوں پر چمکی — "میرے پاس اتنے ہزار روپیہ ہے۔ ہزاروں کا زیور ہے۔ یہ زیور، یہ روپیہ!" اس نے ذرا سی دیر سوچا اور جھٹکے سے سر گھما کر نجمہ کے کندھے پر فاتحانہ انداز سے تھپکی دی۔

"نجمہ آپا!"— طاہرہ نے غیر معمولی مسرت سے کہا — "کل دن کے پچھلے پہر ہمارے ہاں آنا۔ اس طرف پھر آئیں گے"

"دریا پر؟"— نجمہ نے پوچھا اور کہا — "مجھے بھی کشتی کی سیر کا بہت شوق ہے۔"

"ہاں دریا پر!"— طاہرہ نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر انوکھے سے اطمینان سے کہا — "اس خاموش دریا کو دیکھ آئیں گے" — اور زیرِ لب اپنے آپ سے کہا — "اس دریا کو میں ذراسی زندگی تو دے ہی سکوں گی!"— اس نے ... کے ساتھ لگا لیا اور سکون آمیز آہ لی۔

"کیوں؟"— نجمہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا — "سیر کا لطف آرہا ہے؟"

"پاکستان انہی بے لبسوں کی ہڈیوں پر زندہ رہے گا، آپا! اسی انسان کے خون سے جو فٹ پاتھ پر ٹھٹھر رہا ہے"۔

... نے ذرا دقفے سے کہا — "ہاں، آپا! سیر کا خوب لطف آرہا ہے۔"

تانگہ جہانگیر کے مقبرے کے باہر رکا اور چند لمحوں بعد چھ لڑکیاں مقبرے کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ دوپہر تک وہ پھرتی رہیں۔ پھر کھانے کے لیے ایک گھنے درخت کے نیچے جا بیٹھیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ دو دو کی ٹولیوں میں ادھر اُدھر نکل گئیں۔ عفت کی طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔ نجمہ نے اس کا ساتھ دینا پسند کیا اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ طاہرہ کی ایک رشتہ دار لڑکی کے ساتھ اور بھابی دوسری لڑکی کے ساتھ سیر کو نکل گئیں۔ نجمہ نے عفت کو باتوں میں لگانا چاہا لیکن ... نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ عفت کا دماغ حاضر نہیں۔

"اری! دل کیوں چھوڑتی ہو۔ ذرا اُٹھ کے بیٹھو تم تو لیٹ ہی گئی ہو"— نجمہ نے شگفتہ لہجے میں کہا اور عفت کو جھنجھوڑا۔ "آغاز میں یوں ہی تکلیف ہوا کرتی ہے۔ لیٹنے سے طبیعت اور زیادہ خراب ہوگی۔ ذرا چلو پھرو۔ دل ٹھکانے آجائے گا۔"

"میری طبیعت اب مشکل سے ہی سنبھلے گی"— عفت نے آہ لے کر ویران سے لہجے میں کہا۔

"کیوں نہ سنبھلے گی؟"— نجمہ نے عفت کے دل کی کیفیت محسوس کیے بغیر کہا — "تم تو حوصلہ ہی ہار بیٹھی ہو۔ تمہیں ... سے اچھلنا کودنا چاہیے۔ تم پیٹ میں اس مرد کے بچے کو زندگی دے رہی ہو جسے تم دل و جان سے چاہتی ہو اور جو تم پر نثار کرتا ہے۔ تم تو اپنے جسم میں اپنی محبت کو پال رہی ہو عفت!"

عفت نے گھاس پر لیٹے لیٹے نجمہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں طنز اور شکوہ تھا۔ ویرانی اور بے سر و سا...

نجمہ نے عفت کی جذباتی کیفیت کو محسوس نہ کیا اور بولی — "یہی تو شادی کا رومانی پہلو ہے۔ ان جوان بیویوں کا ... کرو جو زبردستی ایسے مردوں کے ساتھ زندگی بھر کے لیے باندھ دی جاتی ہیں جنہیں وہ ایک بھٹکی ہوئی نگاہ سے بھی نہیں د... وہ بھی تو عورتیں ہی ہیں نا جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ پیٹ میں کس مرد کا بوجھ اٹھاتے پھر رہی ہیں۔ ادھر تم ہو کہ محبت کی یادگار کو طبیعت پر بوجھ سمجھ رہی ہو۔ ازدواجی زندگی جو عشق و محبت کی بنیادوں پر کھڑی ہو اس میں یہ بچے سنگِ میل ہوتے ... تم جیسی خوش نصیب کون ہوگی جس کے پیٹ میں ارشد کا بچہ پل رہا ہے۔"

"نجمہ آپا!"— عفت بولی لیکن اس کے الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے۔ اس نے ایسی آہ لی جیسے اداسیوں کی آگ کو پھونک مار کر بجھانے کی کوشش کی ہو۔ وہ خاموش ہوگئی اور اُٹھ بیٹھی۔ نجمہ نے دیکھا کہ عفت کی آنکھوں میں دو آنسو تیر ر...

وہ ٹھٹھکی۔ عفت نے نجمہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ادھر اُدھر دیکھا اور کہا — "آپ نے جو کچھ کہا ہے اسے میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ کون سے جوان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا لیکن میں پیٹ میں نہیں دل پر ایک بوجھ اٹھاتے پھر رہی ہوں۔ میرے سینے میں آگ سلگ رہی ہے۔ کس سے کہوں؟ کون سنے گا؟"— اس نے آنچل سے آنسو پونچھے۔

"طاہرہ تمہاری ہمراز ہے"— نجمہ نے سنجیدگی سے کہا — "تم ایسی باتیں طاہرہ سے کیا کرو۔"

"اری آپا!"— عفت نے دُکھ زدہ مسکراہٹ سے کہا — "اگر میرے دل کا بوجھ طاہرہ کا وجود ہی ہو تو کس سے کہوں؟ طاہرہ ہی تو وہ پتھر ہے جس نے میری اور ارشد کی محبت کو چکنا چور کر کے رکھ دیا ہے۔"

"طاہرہ؟"— نجمہ نے یقین نہ کرتے ہوئے پوچھا — "طاہرہ؟ میں تو سمجھتی تھی کہ طاہرہ نے ہی تمہیں بسایا ہے۔"

"بسا کے اُجاڑا ہے آپا!"— عفت بولی — "طاہرہ نے میرا نصیب بنا کے بگاڑ دیا ہے.... نجمہ آپا!"— عفت کے آنسو بہے جا رہے تھے۔ اس نے ایک ہچکی بھی لی۔

نجمہ نے اس کا ہاتھ دبایا اور پوری بات سننے کو بیتاب ہوگئی۔ کسی اور لڑکی کا ذکر ہوتا تو بات قابلِ فہم تھی لیکن ارشد اور عفت کے ازدواجی رشتے کا طاہرہ کے ہاتھوں برباد ہو جانا اس کے لیے معمّہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس پودے کو طاہرہ نے ہی بویا ہے اس نے اسے اپنی اُمنگوں سے سینچا ہے لیکن یہاں تو قصہ ہی مختلف نظر آرہا تھا۔

"نجمہ آپا!"— عفت نے بظاہر اپنے آپ کو سنبھال لیا لیکن وہ بے بس ہوگئی اور اس نے نجمہ کا روحانی سہارا لینا چاہا۔ ... "خدا کے لیے مجھے راہ دکھاؤ۔ میں بہت دکھی ہوں"— عفت نے التجا کے انداز میں کہا — "طاہرہ پر آپ کا بہت ... ہے۔"

"ساری بات سناؤ تو کچھ پلے پڑے۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"— نجمہ نے اس کے قریب سرک کر پوچھا۔

"قصہ یہ ہے، آپا، کہ ارشد مجھے چاہتا تھا"— عفت گویا ہوئی — "اور میں ارشد کو آنکھوں کا نور سمجھتی ہوں۔ شادی کی پہلی چند ایک راتیں تھیں جن میں میری ساری عمر کی مسرتیں سمٹ گئی ہیں اور اب انہی چند راتوں کی یاد میں تنہائی کی راتیں گزار رہی ہوں ... راتوں کی یادگار کو پیٹ میں زندگی دے رہی ہوں....؟" عفت کے لہجے میں روانی آگئی اور نجمہ ہمہ تن گوش ہوگئی — "ارشد میرے ... ب ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور چلا گیا ہے۔ طاہرہ نے مجھ سے میرا ارشد چھین لیا ہے۔"

"آخر کیسے؟"

"وہ ایسے کہ میں نے شادی سے پہلے طاہرہ کو بتایا تھا کہ مجھے ارشد سے بے پناہ پیار ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ طاہرہ ارشد سے محبت ہے۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میں طاہرہ اور ارشد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ آپ تو جانتی ہیں، آپا میں کیا میری حقیقت اور وقعت کیا ہے۔ میں نے دل کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ میں نے کوشش کی کہ دل کو سینے ... زبان کو دانتوں تلے دبائے رکھوں لیکن نادان دل ایسا مچلا کہ طاہرہ کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں ارشد کو دیوانہ وار چاہتی ... اور اب یہ بھید میرے سینے میں رہ نہیں سکتا۔ آپا! میں نے طاہرہ کو یہ تو نہیں کہا تھا کہ ارشد مجھے دے دو۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے ... سے دور کر دو، اتنی دور جہاں سے میں تم دونوں کو آپس میں ہنستا کھیلتا دیکھ نہ سکوں۔ تم ارشد کے لیے اور وہ تمہارے ...

لیے پیدا ہُوا ہے۔ تم دونوں خوبصورت ہو اور دونوں جوان ہو اور امیر ہو۔ میرا کیا ہے، میں نے دل کی خوبصورتی اور جوانی کا گلا میں ہی گھونٹ دیا تھا۔ پرائے گھروں کے جھوٹے برتن دھونے والی کو اونچے مکانوں میں رہنے بسنے سے کیا واسطہ ہے۔ مجھے آپا؟"

نجمہ عفت کی باتوں میں محو ہونے کے ساتھ عفت کے خدوخال کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہزار مرتبہ پہلے دیکھ کے باوجود آج گہری نظر سے ان خدوخال کو دیکھا اور اسے ازسرِنو یقین ہو گیا کہ عفت حسین ہے اور اس کی آنکھوں میں دلکشی۔ نجمہ نے دل ہی دل میں کہا ــــ "کاش! اس لڑکی کی رُوح سے کمتری کے گھناؤنے سائے اُتر جاتے اور اس کی روح بھی حسین ہوتی۔"

"نجما میں نے طاہرہ سے ارشد مانگا نہیں تھا ــــ" عفت نے کہا ــــ "میں نے اس سے الگ ہونے کی اجازت میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ میں ارشد کی محبت کو دل سے اتار نہیں سکوں گی، اور یہ بھی کہ دیا تھا کہ میں پستیوں میں جنی پلی ہوں نہ ہو کہ میرے سینے میں وہ پست خیال اور مفلسی کی ماری ہوئی عورت جاگ اُٹھے اور میرے ہاتھ سے تم دونوں کی بربادی کر دے۔ طاہرہ نے جانے کیوں ارشد کو میری گود میں ڈال دیا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ عفت! اچھی بات ہے ارشد چاہتا ~~ہے میں نے تو پہلے آپ کو اس میں پایا تھا لیکن میری اچھی آپا! وہ پیار بھی روز بعد ہی اس فردوس سے نکال دی گئی~~ پر آ رہی ہے۔"

"لیکن یہ ہُوا کیسے؟"

"ہُوا اس طرح کہ جب طاہرہ نے مجھے اور ارشد کو الگ کمرے میں رات رات جاگتے دیکھا جب اس نے ہم اکٹھے بچپن بیتا نے اور سیر و تفریح کے لیے نکلتے دیکھا تو طاہرہ ۔۔۔ طاہرہ ہی نہ رہی جس نے مجھے کلیوں کے کوڑے سے اُٹھا رضائیوں میں لپیٹا تھا۔ نجمہ آپا! طاہرہ کچھ بھی سہی۔ وہ بلند اخلاق اور پاکیزہ خیال ہی سہی لیکن وہ آخر عورت ہے، جوان اور میں اس کے بعد بات خوب سمجھتی ہوں لیکن مجھے رنج اس بات کا ہے کہ میں نے طاہرہ کو پہلے کہ دیا تھا کہ میں تمہارا گھر چھوڑ جاتی ہوں مگر اس نے یوں نہ ہونے دیا۔ نہ اس وقت کچھ سوچا نہ اب سوچ رہی ہے۔ شادی کے دو چار دن نے شرم و حیا کا لبادہ اتار پھینکا اور ارشد کو شیشے میں اتارنے کی کوشش شروع کر دی۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ طاہرہ نے ایسی حرکت کی ہو گی" ــــ نجمہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا ــــ "ہو سکتا ہے نہیں۔ آخر اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ایثار کا جذبہ تو اس میں ہے لیکن عقل کی کچی اور ناتجربہ کار ہے۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا ــــ" عفت نے کہا ــــ "لیکن حالات نے یقین دلا دیا ہے۔ صرف ایک بات کرو آپا! طاہرہ نے خود ہی مجھے زیور دیا تھا اور چند دنوں بعد پیچھے پڑ گئی کہ زیور واپس کر دو۔ صاف الفاظ میں واپس نہیں کہا کہنے لگی۔ یہ وزنی زیورات تجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان کی جگہ ہلکی چیزیں لے لو۔"

نجمہ نے بھی دیکھا کہ عفت نے جو زیورات پہنے ہوئے تھے وہ صدیوں پرانے فیشن کے تھے۔ ان کو زیادہ بھلی لگتیں لیکن نجمہ کے سامنے زیورات کے بھلے لگنے نہ لگنے کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ [illegible]

تھی جو عفت کی باتوں سے اُلجھتی ہی جا رہی تھی۔

عفت کہ رہی تھی ۔۔۔ "چند روز بعد ارشد مجھ سے کھچا کھچا سا رہنے لگا۔ رات آتے۔ ذرا سا بیٹھے یا لیٹے اور سر درد یا کام کا بہانہ کر کے چل دیتے۔ بعض اوقات تو وہ اس طرح آتا اور آ کر چلا جاتا جیسے کوئی زندگی کے کوٹھے کا چکر پورا کرنے آتا ہو۔ حد یہ کہ وہ دو دو تین تین راتیں بالکل ہی نہ آتا اور اپنے کمرے میں سو جاتا۔ آخر ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں رات ساڑھے دس گیارہ بجے کے قریب ارشد کو اپنے کمرے میں لانے کے لیے نکلی۔ میں طاہرہ کی کھڑکی کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ اس کے کمرے سے مجھے ارشد کی آواز سنائی دی۔ میں وہیں رک گئی ۔۔۔ نجمہ آپا! وہ باتیں سننے کے بعد تو کسی شک اور شبہے کی گنجائش نہ رہی۔ طاہرہ کہ رہی تھی ــــ خدارا میری محبت کو یوں نہ کچلو ــــ اور ارشد نے کہا ــــ ہماری چاندنی راتوں کی محبت بے بس ہو گئی ہے۔ پیار محبت کی دوسری باتوں کے علاوہ طاہرہ نے ارشد کو یہاں تک کہا ۔۔۔ عفت اجڈ اور جنگلی ہے ۔۔۔ اور کیا بتاؤں آپا! تیرا رونا روتے کہتی ہوں۔ طاہرہ نے اس رات ارشد کے ساتھ وہ باتیں کیں جو ایک کنواری لڑکی ایک شادی شدہ مرد کے ساتھ کبھی نہ کرے لیکن طاہرہ سب کچھ کر رہی تھی اور اگر میں یہ کہوں کہ اس رات طاہرہ نے ارشد کو اپنے کمرے میں سُلایا تھا تو جھوٹ نہ ہو گا۔ مجھ میں تو تاب ہی نہیں رہی تھی کہ اس سے آگے دو کلمے اور بھی سنتی۔ خدا جانے میں اپنے کمرے تک کس طرح پہنچی تھی بیہوش تھی یا ہوش میں۔"

عفت کہے جا رہی تھی اور نجمہ کا سینہ اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔ اس نے جسم پر رعشہ کی کیفیت محسوس کی۔ ٹیڑھا سا سوال اسے پریشان کرنے لگا ــــ عفت کی باتوں کا یقین کرے یا طاہرہ کی پاکدامنی کو پیشِ نظر رکھے؟ جب اسے عفت کی اوائل کی زندگی یاد آئی تو اسے اس کی باتوں میں شک کی بُو آنے لگی۔

"طاہرہ یوں نہیں کر سکتی" ــــ نجمہ نے اپنے آپ سے کہا اور آہ لے کر عفت کی باتیں سننے لگی۔ عفت اس دوران بہت کچھ کہ گئی تھی کہ کس طرح وہ دوسری صبح طاہرہ کو رات کی بات یاد دلانے گئی تھی۔ زیور بھی لوٹانے کی کوشش کی تھی اور اُس نے طاہرہ کو ہر ایک بات صاف صاف کہ ڈالی تھی۔

"نجمہ آپا! ــــ" عفت خاموش ہو گئی اور انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ پھر قدرے بے بسی کے لہجے میں گویا ہوئی ــــ "طاہرہ کی آنکھوں میں ایک جادو ہے جس کا میں سامنا نہیں کر سکتی۔ میں جب بھی اس کے سامنے جاتی ہوں۔ دل کے شکوے سینے میں ہی گُم ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھ پر طاہرہ کا سایہ آسیب کی طرح غالب ہے اور میں بے بس ہو کر اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتی ہوں۔ میں نے طاہرہ کو یہاں تک کہ دیا تھا کہ یہاں سے چلی جاؤ اور مجھے میرا ارشد لوٹا دو۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ جب تک تم یہاں موجود ہو، ارشد مجھ سے دور رہے گا ۔۔۔ آپا! میں کیا ہوں؟ آپ جانتی ہیں۔ اب تو ایک ہی صورت ہے کہ ارشد مجھے طلاق دے دے اور طاہرہ کے ساتھ شادی کر لے اور میں ۔۔۔ اور میں ۔۔۔" عفت پر رقت طاری ہو گئی اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

نجمہ نے اسے اپنے قریب کر کے ماں کی طرح دلاسا دیا۔ شادی کے بعد نجمہ پہلی عورت تھی جسے عفت نے حالِ دل سنایا تھا۔ یہ غبار اسے بے حال کیے ہوئے تھا۔ اب نجمہ نے سر پر ہاتھ جو رکھا تو عفت کے سینے کا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا اور وہ غم سے بھرپور لہجے میں بولی ــــ "آپا! مجھے راہ دکھاؤ۔ میں اندھیرے میں ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ آج کئی روز سے میں نے روٹی نہیں کھائی

بانے کتنی راتیں جاگتے گزر گئی ہیں۔ اس روز میں نے ارشد کے پاؤں پڑ کر التجا کی تھی کہ مجھے یوں نہ ٹھکراؤ۔ مجھے پاؤں کی
کر ذرا سی توجہ دے دیا کرو لیکن اس پتھر دل نے جواب تک نہ دیا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ یہ طاہرہ کا جادو ہے یہی
جس کے سامنے میں بھی گنگ ہو جاتی ہوں۔ طاہرہ چڑیل ہے آپا! وہ شرم و حیا ختم کر چکی ہے۔ ارشد اب میرا نہیں طاہرہ کا
گیا ہے۔ وہ آدھی رات کے وقت طاہرہ کے کمرے میں جاتا ہے۔"

عفت کے لہجے میں غم کی جگہ عتاب آ گیا۔ اس کی روتی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس کے دانت آپس میں ٹکرا
اور نجمہ دیکھ کر ٹھٹھک گئی کہ عفت کی مٹھیاں بند تھیں اور کانپ رہی تھیں۔ یہ کیفیت بلاشک و شبہ دورے کی کیفیت
یا غصے کا عروج۔ وہ دانت پیس کر بولی — "طاہرہ سے کہو یہاں سے چلی جائے۔ چلی جائے ورنہ میں اس کا یا اپنا خون
آپا! میں نے یہ بھید ابھی بھابی اور امی سے چھپا رکھا ہے۔ اس آگ کو کب تک چھپائے رکھوں گی۔ میری نظر کے سامنے یہ
خون ہو رہا ہے۔ اب نہیں آپا! اب برداشت نہیں ہوتا۔"

عفت یک لخت چپ ہو گئی اور خلاؤں میں گھورنے لگی۔ اس کے لرزتے ہونٹوں کے کونوں سے ہلکی ہلکی جھاگ
نجمہ نے دیکھا کہ عفت کی انگلیاں اس کی ہتھیلی میں دھنستی جا رہی تھیں اور ہاتھ مڑتے جا رہے تھے۔ نجمہ اس کی یہ حالت
وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے تسلی دے یا کیا کرے کہ عفت نے دونوں بند مٹھیاں اس زور سے اپنے منہ پر ماریں کہ اس
مال چہرے پر گلابی رنگ کی لکیریں ابھر آئیں۔ نجمہ نے لپک کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ عفت کے نرم و نازک سے بازوؤں کا
کی طرح اکڑ گیا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ نیلا ہوتا جا رہا تھا۔

نجمہ کا تو سرد ہوا میں بھی پسینہ نکل آیا۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی بھی لڑکی آس پاس نہیں تھی۔ عفت
کانپ رہا تھا اور وہ زمین پر پیٹھ کے بل لیٹ گئی تھی۔ نجمہ نے اس کی کلائیاں چھوڑیں تو عفت نے دونوں ہاتھوں سے
دبوچ لیا اور پیٹ کے بل کروٹ لے کر بلک بلک کر رونے لگی۔ نجمہ نے اس کا سر دبانا شروع کر دیا۔ پھر اسے سیدھا
کی پیشانی سہلائی۔ چند منٹ بعد، جو نجمہ کے لیے چند گھنٹے تھے۔ عفت کا جسم معمول پر آنے لگا اور دورے کی کیفیت
ہوتے ختم ہو گئی۔

عفت نے اپنے اُوپر جھکی ہوئی نجمہ کو اس طرح دیکھا جیسے وہ اچانک اس کے پاس آ بیٹھی ہو۔ اس کی آنکھیں
پر کھلی ہوئی تھیں۔ وہ چند لمحے نجمہ کو دیکھتی رہی اور زیر لب کہا — "اوہ میرے خدا! اوہ خدا! مجھے بخش دے... نجمہ
کر دنیا میں بہت دکھی ہوں۔ اکیلے میں اپنے آپ سے یوں ہی باتیں کرتی رہتی ہوں۔"

"یوں حوصلہ نہیں ہارا کرتے عفت!" — نجمہ نے ایسی آواز میں کہا جس میں گھبراہٹ اور حیرت کا تاثر غالب
نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا — "میں طاہرہ کے ساتھ بات کروں گی اور اسے اچھی طرح کان کھینچ کے سمجھا
تو ارشد کو بھی سمجھا دوں؟"

"پانی سر سے گزر چکا ہے، آپا!" — عفت نے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "اگر طاہرہ بیچ میں نہ

میرے پاس لوٹ آتے۔"

"دیکھو بھی آ رہی ہیں" — نجمہ نے کہا — "دل کو قابو میں کر لو اور سب کے ساتھ ہنس کر بولنا۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلے کہ تم روتی
رہی ہو اور کسی کو علم نہ ہونے دوں گی کہ تم نے میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات کی ہے۔ میں انشاء اللہ حالات کو سدھار
لوں گی۔"

دن کا پچھلا پہر گزر رہا تھا۔ سبھی سیر سے تھک چکی تھیں۔ نجمہ اور عفت نے شگفتگی کا مظاہرہ کر کے چند منٹ پیشتر کی اذیت
ناک فضا پر پردہ ڈال لیا۔ ذرا سی دیر بعد تانگہ ایک بار پھر اس سڑک پر جا رہا تھا جس کے دونوں طرف مفلوک الحال خانماں برباد خانہ بدوش
لے اپنے خالی پیٹ اور خالی کاسوں سمیت آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ طاہرہ نے مٹی کے ان متحرک ڈھیروں کو ایک بار
پھر دیکھا لیکن اب وہ رنجیدہ نہ ہوئی۔ اُس کے دماغ میں ایک منصوبہ طے ہو چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس منصوبے کو دہرا رہی تھی
جیسے پڑھا ہوا سبق یاد کر رہی ہو۔

"تم نے کہا تھا کل پھر ادھر آئیں گے؟" — نجمہ نے طاہرہ کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

"ہاں آپا!" — طاہرہ نے قدرے چونک کر جواب دیا — "کل دوپہر کے کھانے کے بعد ہمارے ہاں آ جانا۔ ارشد کو بھی کہوں
گی، لے کر ساتھ آ جائے۔"

نجمہ نے کنکھیوں عفت کی طرف دیکھا۔ عفت اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سیٹ پر بے چینی سے کروٹ بدلی۔
وہ اس کی اندرونی خلفشار کو سمجھ گئی اور کہا — "عفت بھی آئے گی۔"

"ہاں! کیوں نہیں" — طاہرہ نے معمول کے لہجے میں کہا — "عفت کو تو بہر صورت ساتھ لائیں گے۔ کیوں عفت؟"
لیکن عفت گھوڑے کی اچھلتی ہوئی پیٹھ پر نظریں گاڑھے رہی۔ اس کا دل بھی اسی طرح اچھل رہا تھا۔

کہاں وہ ارشد جو شام ساڑھے چار بجے ابا جان کے ساتھ گھر پہنچ جایا کرتا تھا اب کئی روز سے شام کے کھانے کے وقت
آنے لگا۔ وہ بھی خاموش اور چپ چاپ۔ گھر والے اس کی اس تبدیلی کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دو چار مرتبہ بھابی نے
پوچھا بھی آخر قصہ کیا ہے؟ لیکن ارشد نے اداسیوں اور نامرادی کو ایک جواں مسکراہٹ میں چھپا کر بھابی کو ٹال دیا۔
ارشد کا بڑا بھائی بھلے مانس سی قسم کا آدمی تھا۔ نمازی اور پرہیزگار۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کے سوا کسی کے معاملات
میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ اسے محبت تھی اور اس محبت کا ہی اثر تھا کہ اس نے پرہیزگار ہوتے ہوئے بھی
بیوی کے بناؤ سنگار اور آزادانہ سیر و تفریح سے کبھی نہ روکا تھا۔ بیوی نے اسے بھی کہا تھا کہ نہ جانے ارشد شادی کے فوراً بعد اس قدر
چپ کیوں گیا ہے۔

"نئی نئی شادی ہوئی ہے" — وہ بولا — "دودھ شکر ذرا وقت بعد گھلتے ملتے ہیں۔ ایسی تلخیوں میں بھی پیار ہوتا ہے۔ تم
کو یاد ہو گا شروع شروع میں تم نہیں روٹھ جایا کرتی تھیں؟"
ارشد کی بھابی نے جانے کیا سوچ کر بات شروع کی تھی کہ اس کے خاوند نے اسے اس تلخ سوچ سے نکال کر رومانوں میں

گھسیٹ لیا اور بات رات کے اندھیرے سکوت میں آ گئی ہو گئی۔

ارشد کی امّی چند دنوں سے خاص طور پر پریشان تھی۔ اُس نے ارشد سے تو بات نہ کی۔ ایک دن عفت سے پوچھا لیکن عفت نے بھی بھید پر پردہ ڈال لیا۔ یوں تو اس بھید کو صرف تین انسان جانتے تھے۔ ارشد، طاہرہ اور عفت اور تینوں نے اپنے اپنے خیال اور سمجھ کے مطابق اس پر پردہ ڈال رکھا تھا لیکن وہ ایسے بھید کی رکھوالی کر رہے تھے جو چھپائے چھپ نہیں سکتا۔ ارشد کی خاموشی اور عفت کے کمرے اور اس کے چہرے کا اجاڑ پن تمام پردے چاک کر رہا تھا۔

ارشد کے دیر سے گھر آنے کے اب بہانے بھی ختم ہو چکے تھے۔ ہر روز دوست پکچر پر یا کیفے میں نہیں لے جایا کرتے۔ ہر روز بچھڑے ہوئے دوست سر راہ نہیں مل جایا کرتے۔ پھر چار بجے پکچر کا تو وقت نہیں ہوتا لیکن ارشد نے اب یہ بتانا چھوڑ دیا تھا کہ وہ آج دیر سے کیوں آیا ہے۔ عفت کے کمرے میں جانا اور سونا تو پرانا قصہ ہو گیا تھا۔ اُس نے ہفتہ بھر سے اس کے ساتھ بات بھی نہیں کی تھی۔

طاہرہ نے بھی اب ارشد کے کمرے میں جانا یا اسے اپنے کمرے میں بلانا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ارشد کے دل میں عفت بیٹھ نہیں سکی اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ ارشد کے دل سے طاہرہ کا نام دُھلنا ناممکن ہو گیا ہے۔ طاہرہ کو اپنے دل کا علم تھا۔ ایک بار نہیں متعدد بار ایسا ہُوا کہ طاہرہ نے ارشد کے ساتھ باتیں کرنے کے دوران شدت سے چاہا کہ وہ ایک بار پھر اس کے جسم کے ساتھ اسی طرح لگ کر بیٹھے جس طرح وہ کیمپ کے باہر چاندنی راتوں میں بیٹھا کرتی تھی۔

ایک رات تو طاہرہ اپنی اسی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو محسوس کر کے چونک اُٹھی۔ وہ یوں کہ ارشد کی شادی کے چند رات بعد طاہرہ کو اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے ارشد کا خیال آ گیا تھا۔ چاندنی چٹکی ہُوئی تھی اور موسم سرما کے پھولوں کی مہک رومان بکھیر رہی تھی۔ طاہرہ کے ذہن میں ریلوے لائن کی چمکتی لکیریں آ گئی تھیں۔ دو لکیریں جن کا کوئی سرا نہ تھا۔ طاہرہ کے تصورات اور تخیلات کی ان دو لکیروں پر رینگتے رینگتے بہت دور رومانوں کی وادی میں پہنچ گئی جہاں ارشد کی مُسکراہٹیں اس کی منتظر تھیں۔ طاہرہ کو اونگھ آ گئی۔ بے چین پلکیں نیند کے بوجھ سے بند ہو گئیں اور وہ سپنوں کے دیس میں جا پہنچی جہاں ارشد کا محسوس ہیکل اس کے قریب تر بیٹھا تھا۔ اس کی عطر بیز سانسیں طاہرہ کے سینے میں سماتی جا رہی تھیں۔ طاہرہ کا ایک بازو بے اختیار ارشد کی گردن کے گرد لپٹ گیا اور لمحے اس کے تپتے رخسار ارشد کے گالوں کا گداز محسوس کر رہے تھے۔ ارشد نے گردن گھمائی تو طاہرہ کی گردن خود ہی اس کی طرف گھوم گئی۔ ہونٹوں نے ایک دوسرے کو محسوس کیا ہی تھا کہ ایک دھند لکا دونوں کے درمیان آ گیا۔ اور آہستہ آہستہ، نہایت آہستہ طاہرہ کی آنکھ کھل گئی۔

وہ پیٹھ کے بل لیٹی ہُوئی تھی اور ساٹن کی رضائی کے ایک کونے نے اس کے چہرے کو ڈھانپا ہُوا تھا۔ طاہرہ نے اندھیرے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُکھڑی ہُوئی سانسوں سے اُچھلتے ہُوئے دل سے۔ اس کی گرم سانسیں رضائی کے ساتھ ٹکرا کر اس کے ہونٹوں کو لگ رہی تھیں۔ طاہرہ کو یوں لگا جیسے اس کے کمرے سے ابھی ابھی کوئی بھاگ کے نکلا ہو لیکن یہ واہمہ دو ثانیے سے زیادہ نہ رہا۔ طاہرہ نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ہاتھوں کو خنک پسینہ محسوس ہُوا اور ایک آہ کمرے کے سکوت کو مرتعش کر گئی۔

طاہرہ کے سینے میں تلاطم اُٹھ رہے تھے۔ وہ تو سو گئی تھی لیکن اس کی ذات میں ایک عورت جاگ اُٹھی تھی۔ طاہرہ نے اس عورت کا گلا کئی بار دبو چا تھا۔ اس کی آخری ہچکیاں بھی سُنی تھیں اور طاہرہ خوش تھی کہ وہ مر گئی ہے لیکن خواب میں وہ پھر جاگ اُٹھی تھی۔

طاہرہ کی آنکھ کھلی تو اُس نے ہوش میں آ کر بے اختیار چاہا کہ ارشد کو بلا لے یا اس کے کمرے میں چلی جائے۔ اس نے تپتے ہُوئے گالوں پر نمی سی محسوس کی۔ ہاتھ لگایا تو یہ آنسوؤں کے دو قطرے تھے۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ جذبِ ایثار بے تکا سا خیال بن چلا تھا۔ اخلاق کی بلندی گہری کھائی کے منہ پر کھڑی قدم آگے رکھنے کو تھی۔ صرف ایک قدم، آخری۔ صرف ایک لمحہ۔ ارشد کے کمرے میں پہنچنے کو صرف ایک لمحہ درکار تھا۔ طاہرہ اور ارشد کے درمیان صرف ایک لغزش کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

اس نے رضائی ہٹائی اور رک گئی۔ کمرے کی گہری خاموشی میں اسے اپنے دل کی دھڑکن بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اندھیرے خلاؤں میں گھُورا اور گھبرا گئی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر دبا لیا۔ رضائی لپیٹ لی اور تیرہ و تار کمرے میں ایک ملتجی سرگوشی گونجی — "میرے خدا مجھے معاف کر دیجو۔ میں نے گناہ کیا ہے میری لغزش بھُول جائیو۔ ذوالجلال! میں کمزور انسان ہُوں۔ مجھے راہ دکھائیو۔ ثابت قدمی عطا فرمائیو۔ میرے اللہ! میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرتی ہوں۔ یا خُدا! یا خدا!..." سرگوشیاں کمرے کے سکوت کو درہم برہم کرنے لگیں۔

طاہرہ کو محسوس ہی نہ ہُوا کہ وہ اونچی آواز میں دعا کر رہی ہے اور اس کی آواز کمرے کے باہر تک جا رہی ہے لیکن آشا بھون کا ماحول گہری نیند سو رہا تھا۔ طاہرہ لیٹے لیٹے "یا خدا! یا اللہ" کہتی رہی۔ اسے ایسا سکون محسوس ہُوا جو اس نے زندگی میں پہلی بار پایا تھا۔ وہ یہ عزم لے کر سو گئی کہ وہ آئندہ تنہائی میں ارشد سے ہم کلام نہیں ہو گی۔

"ارشد عفت کا ہے۔ خُدا عفت کو ارشد کے قابل بنائے۔ آمین۔ خدا دونوں کی زندگی کو پیار و محبت سے سرشار کرے۔ آمین۔" اونگھ آنے سے پہلے یہ دعا اس کے ہونٹوں سے پھسلی تھی۔

اس رات کے بعد طاہرہ نے محسوس کیا تھا کہ یہ آگ اتنی آسانی سے بجھائی نہیں جا سکتی جتنی آسان وہ سمجھتی تھی۔

اس رات اسے اندازہ ہُوا کہ اس نے ارشد کو کس قدر کٹھن راہ پہ ڈال دیا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ارشد کئی شامیں باغِ جناح کی پہاڑی پر پھولوں کو گھورتے اور پھولوں سے پیار کرتے گزارا کرتا ہے یا راوی کے کنارے جا بیٹھتا ہے اور اداسیوں کو پانی کی جل ترنگ میں بہانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ تلخ سے حقائق اب ارشد کے دل کی زندگی کو بجھاتے جا رہے تھے۔ طاہرہ نے اس سے عفت میں گھل مل جانے کی جو قسمیں لی تھیں۔ وہ دل کی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک ایک کر کے بیوہ کی چوڑیوں کی طرح ٹوٹتی جا رہی تھیں۔

عفت اب ایسی ذہنی حالت کو پہنچ گئی تھی کہ رات اسے نیند نہیں آتی تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے تھک جاتی تھی تو دانت پیس کر اُٹھ بیٹھتی تھی اور مٹھیاں بھینچ لیتی تھی۔ ایک بار نصف شب کے قریب اس نے جسم میں اکڑن سی اور اعصاب میں تناؤ سا محسوس کیا۔ اس نے لیٹے لیٹے سر کو زور سے جھٹکے دیئے لیکن جسم کی حالت بدلتی ہی گئی اور اس نے سر میں درد کی ٹیس محسوس کی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور ننگے پاؤں ارشد کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ یہ وہ رات اور رات کا وہ وقت تھا جب طاہرہ

خواب میں ارشد کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ عفت ارشد کے کمرے کے دروازے پر پہنچی تو دروازہ باہر سے بند تھا۔ کھول کر اندر گئی بتی جلائی اور ارشد کو غائب پایا۔ بتی بجھا کر وہ واپس لوٹ رہی تھی تو اسے طاہرہ کے کمرے میں سرگوشیاں سنائی دیں — "پرور خدا! مجھے معاف کر دیجو۔ میں نے گناہ کیا ہے۔ میری لغزش بھول جائیو، ذوالجلال"....

پیشتر اس کے کہ وہ طاہرہ کا یہ فقرہ بھی سنتی — "ارشد عفت کا ہے۔ خدا عفت کو ارشد کے قابل بناتے۔ آمین۔" وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح وہاں سے چل پڑی اور اپنے کمرے کے وسط میں آ کھڑی ہوئی۔ چاندنی کی پرچھائیاں کمرے میں پھیلی تھیں اور کمرے کی ہر چیز سائے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

وہ کمرے میں کھڑی تھی اور ارشد اس رات میں راوی کے جل ترنگ کی روانی میں کھویا ہوا تھا۔ چاندنی بھی کھلی ہوئی تھی۔ فضا بھی کانپ رہی تھی لیکن ارشد کے سینے میں ایک تپش تھی۔ اس نے کوٹ اتار کر کندھے پر ڈال لیا تھا اور دریا کے کنارے کنارے ٹہل رہا تھا۔

عفت کی سانسیں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ تیزی سے گھومی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ آج طاہرہ کا دروازہ توڑ کر ارشد کا بازو سے پکڑ کر باہر لے آئے گی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ بھابی کو جگا لاتے اور امی کو بھی جگاتے۔ سب کے سامنے ارشد کو طاہرہ کے کمرے سے نکالے اور سب کو دکھائے کہ.... اس نے بہت کچھ سوچا۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے تک گئی بھی لیکن یک لخت اس طرح رک گئی جیسے کوئی اس کے سامنے آ گیا ہو۔ اسے طاہرہ کا واہمہ محسوس پیکر کی صورت میں نظر آنے لگا اور یہ واہمہ اس کے خیالوں اور پُراحتجاج ارادوں پر آسیب کی طرح چھا گیا۔ پھر اندھیرا، ہر سُو اندھیرا۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی۔ رات کی واردات اسے یاد آئی لیکن خواب کی طرح کہیں کہیں سے۔ اس کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ سر پھٹا جا رہا تھا اور متلی کی کیفیت نے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ کروٹ بدل کر پیٹھ کے بل ہو گئی۔ طاہرہ ہنستی مسکراتی کمرے میں آئی اور عفت کے بستر پر آ بیٹھی اور اسے زبردستی بستر سے نکالنے لگی تو عفت کو رات کی ساری بات یاد آ گئی۔ اس کے چہرے کی رنگت پھر بدلنے لگی۔ اس کے دل میں آئی کہ طاہرہ کو صاف صاف کہہ دے کہ رات ارشد اس کے کمرے میں تھا اور اس کے بعد تم یا تمہارے بھوت نے مجھے نگل لیا تھا۔ لیکن عفت پر طاہرہ کا سایہ آسیب کی طرح غالب تھا۔ رات کی ہی طرح عفت پھر دبک گئی اور آگ کے شعلے جو اس کے سینے سے نکلنا چاہتے تھے اس نے سینے میں ہی قید کر لیے اور وہ بے بس ہو کر بولی — "طاہرہ سر پھٹ رہا ہے۔"

طاہرہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور اس کا سر دبانے لگ گئی۔

یہ اعصاب زدگی کا پہلا دورہ تھا اور اس کے بعد دوسرا دورہ اُسے آج جہانگیر کے مقبرے کے باغ میں نجمہ کے ساتھ باہر کرتے پڑا تھا۔ عفت اس کیفیت کو غم و غصے کا عروج سمجھ رہی تھی لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اعصاب زدگی کی شکار ہو گئی ہے۔ گھر والوں کو ابھی اس کی اس حالت کا علم نہ تھا۔ عفت نے نجمہ کو آج بہت کچھ سنایا لیکن اس رات کا یہ واقعہ نہ سنایا۔ طاہرہ اور ارشد کو بھی علم نہ تھا کہ عفت نہایت سرعت سے ہسٹریا کے منہ میں جا رہی ہے جب کہ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔

"آشنا بھون" کی فضا میں چوری چھپے ایک تلخی پرورش پا رہی تھی جو گھٹا کی طرح افق سے اُٹھ کر اس خاندان کی مسرتوں

دونوں تانگے جہانگیر کے مقبرے سے لوٹے تو "آشنا بھون" کے سامنے آ رکے۔ نجمہ اور اس کی رشتہ دار لڑکیوں نے اجازت چاہی اور چلی گئیں۔ ارشد خلاف معمول گھر میں تھا۔ بھابی اور طاہرہ نے اسے گرمجوشی سے سلام کیا۔ ذرا سا مذاق کیا لیکن عفت بیگانوں کی طرح سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے ارشد کی طرف دیکھا نہ ارشد نے اسے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے اداسیوں میں سے اُبھر کر ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پیدا کر لی جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی۔

نہاتے دھوتے اور کپڑے بدلتے شام کے کھانے کا وقت ہو گیا اور ارشد اتنی دیر باغیچے میں ہی ٹہلتا رہا۔ عفت نے بے دلی سے ذرا سا کھانا کھایا اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ کھانے کے بعد تھوڑی سی دیر گپ شپ ہوئی۔ سیر کی تفصیلات سنی سنائی گئیں اور سڑک کے کنارے "آباد" پناہ گزینوں کی حالت کے تذکرے ہوتے۔

کچھ دیر بعد طاہرہ ارشد کے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے ارشد کے کمرے میں نہ جانے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا لیکن آج کا جانا روزمرہ کا جانا یا رسمی ملاقات نہیں تھی۔ آج طاہرہ ارشد کے ساتھ ایک پروگرام بنانا چاہتی تھی۔ ارشد ٹیبل لیمپ کے سامنے جھکا میز پر کہنیاں ٹکائے جانے کیا سوچ رہا تھا کہ طاہرہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آؤ۔ طاہرہ!" — ایک آہ تھی جو ارشد کے ہونٹوں سے تڑپ کر نکل گئی — "کہو طبیعت کیسی ہے؟"

"میری یا عفت کی؟" — طاہرہ نے پوچھا۔

"اُونہہ!" — ارشد نے طنز آمیز مسکراہٹ سے کہا — "اپنی کہو، اس کی طبیعت تو میں جانتا ہوں کیسی ہے۔"

"ارے ہٹاؤ اس موضوع کو" — طاہرہ نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا — "بینک میں میرے کتنے روپے ہوں گے؟"

"کیوں؟"

"پوچھ رہی ہوں، بھئی!" — طاہرہ نے مسکراتے ہوتے پوچھا — "ایک ضروری کام کے لیے آئی ہوں۔ تمہارے ساتھ اور ابا جان کے ساتھ مشورہ کر کے کچھ روپے نکلوا کر خدا کی راہ میں خرچ کرنے ہیں۔"

"غالباً ساڑھے سات ہزار ہوں گے۔" — ارشد نے میز کی دراز سے اکاؤنٹ بک نکال کر دیکھی اور کہا — "ہاں! سات ہزار ساڑھے چھ سو روپے.... کہاں خرچ کرنے ہیں؟"

طاہرہ نے ان بے گھر اور بے آسرا پناہ گزینوں کا آنکھوں دیکھا حال سنایا جنہیں وہ سڑک کے کنارے سردی اور بھوک سے مرتے دیکھ آئی تھی۔ "مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ یہ لوگ رفیوجی کیمپ میں کیوں نہیں چلے جاتے" — طاہرہ نے کہا — "کم از کم کھانے پینے اور رہائش کا تو انتظام ہے وہاں۔"

"کہاں کی باتیں کرتی ہو، طاہرہ!" ارشد اداسیوں کی دنیا سے ایک ہی جست میں نکل آیا۔ اس کا خیال تھا کہ طاہرہ آج پھر عفت کی وکالت کرنے آئی ہے۔ اس موضوع کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھا لیکن طاہرہ نے بات شروع کی تو یہ بات عفت کی دنیا سے بہت بلند تھی۔ ارشد نے جب پناہ گزینوں کا نام سنا تو اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو جلال آباد کی سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کو جلوس کے لیے جمع کرتے پایا۔ اس کی روح یک بارگی تازہ ہوگئی۔ اس کے گرد سبز جھنڈے [illegible] تو یہ تھی کہ اس موضوع میں عفت کا ذکر نہیں تھا۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ پاکستان اور پاکستان بنانے والوں کی بہبود کا مسئلہ

ارشد نے عفت کے نام کو نگلی ہوئی مکھی کی طرح اگل دیا اور اس نے تشکر آمیز نظروں سے طاہرہ کی طرف دیکھا۔ یہ نظر بزبانِ خاموشی کہہ رہی تھیں — "تو نے کتنا کرم کیا ہے کہ مجھے میرا مقام یاد دلا دیا ہے۔ میں تو بھول ہی چلا تھا۔ تیرا شکریہ کہ تو نے مجھے میری راہ دکھا دی ہے۔"

ارشد نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی روح کو مصروفیت مل گئی ہے اور اب وہ عفت کے خیال کو اس مصروفیت میں ڈبو سکے گا۔ بھول ہی جائے گا ان تلخیوں کو۔ حالانکہ اس نے بھی راوی کی طرف جاتے ان پناہ گزینوں کو د[یکھا] تھا لیکن وہ اپنے آپ میں اس قدر گم تھا کہ اسے ان بلبلاتے اور ٹھٹھرتے بچوں کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ طاہرہ نے اسے اس کی راہ دکھائی تو وہ اندر ہی اندر مسکرا اٹھا۔

مسرت کی ایک لہر اس کے پاس آلود چہرے پر رونق لے آئی اور وہ بولا — "کہاں کی باتیں کرتی ہو، طاہرہ! اب ذ[را] جا کے رفیوجی کیمپ کی حالت دیکھو۔ ہر طرف گندگی اور کوڑے کرکٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ انسان ان انباروں کے سائے میں آباد ہیں۔ بارکوں اور برآمدوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ کیمپ سے ریلوے لائن تک پھیلا ہوا میدان ان خانہ بد[وشوں] سے اٹا پڑا ہے۔ بعض نے بھیک مانگنی شروع کر دی ہے۔ جن کے پاس وسیلہ اور پیسہ تھا وہ ہماری طرح چھوٹے بڑے مکانو[ں] پر قابض ہو گئے ہیں۔ بے آسرا انسانوں کے یہ انبار اب لاہور کی سڑکوں پر پھیل گئے ہیں۔ کسی کھلی سڑک پہ جا کے دیکھ لو، جن کے ساتھ بچے اور جوان لڑکیاں ہیں، ان کا تو جینا محال ہو رہا ہے۔ لاہور کی منجھی ہوئی طوائفیں شریف عورتوں کے بھیس میں ان کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں اور نہ جانے کتنی لاوارث لڑکیاں اس دام میں الجھ بھی چکی ہیں۔"

طاہرہ کے جسم نے جھرجھری لی۔ اس کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔ آخری فقرے پر اس کی آنکھیں بھی ٹھہر گئیں اور ہونٹ ذرا سے کھل گئے۔ وہ حیرت و استعجاب کے لہجے میں بولی — "حکومت کیا کر رہی ہے؟"

"حکومت خود پناہ گزین ہے" — ارشد نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں جلال آباد والا تقریر کا رنگ آگیا۔ کہنے — "یہ کام اتنا سہل نہیں جسے ایک نوزائیدہ حکومت فوراً سرانجام دے لے۔ لوگوں کے تعاون کے بغیر یہ مسئلہ حل

ناممکن ہے۔ میں تو اس کا یہی حل سوچ سکتا ہوں کہ روپے پیسے والے لوگ لاوارث بچوں اور خصوصاً لڑکیوں کو سنبھال لیں۔ رسوخ والے لوگ ان غریب خاندانوں کے لیے مکان الاٹ کرائیں اور انہیں پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے مالی امداد دیں۔ حکومت صرف اسی قدر کرے کہ اپنے کارندوں اور اہل کاروں کو رشوت اور دھاندلی سے باز رکھے۔ یہ بھی بڑا کرم ہوگا، ورنہ سارا کام رکا رہے گا اور یہ مفلوک الحال انسان جن کے خون سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے کیڑوں مکوڑوں کی طرح روندے جائیں گے اور یہ ملتِ پاکستان کا ایسا جرم ہوگا جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستان کے پرچم کی ہریالی میں قوم کی بیٹیوں کی عصمت کا خون شامل ہے۔"

طاہرہ بھی قوم کی ہی بیٹی تھی۔ جذبات کی شدت سے اس کی آنکھیں لال سرخ ہوگئیں۔ ان آنکھوں سے اس نے ارشد کی طرف دیکھا۔ یہ ارشد عفت کا خاوند نہیں تھا۔ یہ ارشد چار دیواری کی دنیا کا قیدی نہیں تھا۔ یہ ارشد عشق و محبت کے کسی افسانے کا ہیرو نہیں تھا۔ یہ ارشد جنگِ آزادی کا مجاہد تھا۔ اس ارشد کے پاس تنہائی میں بیٹھنا اسے معیوب نہ لگا۔

"میں یہی تجویز لے کر تمہارے پاس آئی ہوں" — طاہرہ نے جلال آباد والے لہجے میں کہا — "ساڑھے سات ہزار خاصی رقم ہے اور دس پندرہ ہزار کے تو زیورات ہیں۔ یہ بھی فروخت کر دیں گے۔ تم ابّا جان سے بات کرو اور انہیں کہو کہ اپنے رسوخ سے کم از کم پانچ کنبوں کے لیے پانچ مکانوں کا بندوبست کر دیں اور مالی امداد میں کروں گی۔ میں نے نجمہ کو کل یہاں بلایا ہے۔ اسے ساتھ لے کر راوی روڈ پر جاؤں گی اور ان پناہ گزین کنبوں میں سے جن کے ہاں بچے یا لڑکیاں ہیں پانچ کنبوں کا انتخاب کر لوں گی۔"

"ابّا جان کو اشارے کی دیر ہے" — ارشد نے کہا — "ہم بھی تو مہاجر ہیں۔ ابّا جان اکثر ان پناہ گزینوں کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ بھائی جان بھی دردمند انسان ہیں۔ وہ بھی ساتھ دیں گے۔ کہو تو آج رات ہی بات کر لوں!"

"ہاں! آج ہی ہو جائے تو اچھا ہے" — طاہرہ نے پرجوش لہجے میں کہا — "اور سنو ارشد! اگر کسی طرح عفت سے یہ وزنی زیورات لے سکو تو پہلے ان کو فروخت کر دیں۔ ایک تو اسے اچھے نہیں لگتے۔ خواہ مخواہ دیہاتیوں کی طرح لٹکائے پھرتی ہے۔ دوسرے وہ سونا خالص بھی ہے اور زیادہ بھی، اچھے پیسے مل جائیں گے۔ باقی زیور ہلکا اور ملاوٹ والا ہے۔"

"توبہ کرو" — ارشد نے کہا — "اس کے ساتھ بات کی تو وہ جان کو آجائے گی۔ میں نے ایک بار کہہ کے دیکھا ہے۔ وہ ہے ہی دیہاتی۔ اچھا تو میں ابا جان کے پاس جاتا ہوں۔ وہ سو نہ جائیں۔ میں تمہیں تمہارے کمرے میں ملوں گا۔"

ارشد ابا جان کے پاس گیا تو اس کا بڑا بھائی بھی وہیں بیٹھا تھا۔ اس نے ان کے ساتھ طاہرہ کی سکیم کا تفصیلاً ذکر کیا اور اس موضوع پر کھل کر تبادلۂ خیالات ہوا۔ ارشد نے طاہرہ کے جوشِ جہاد کے قصّے تو گھر والوں کو پہلے ہی سنا رکھے تھے لیکن اس کے ابّا جان اور بھائی نے آج پہلی بار محسوس کیا کہ طاہرہ کا جذبۂ ایثار بہت ہی بلند اور بے لوث ہے۔

ان کے پاس اللہ کا دیا بہت تھا۔ فسادات شروع ہونے سے پہلے ہی انہوں نے بینک اور ڈاک خانے سے تمام روپیہ نکلوا لیا تھا اور پاکستان لے آئے تھے۔ خیر خیرات میں وہ کشادہ ظرف تھے۔ بے گھر پناہ گزینوں کی مدد امداد کے لیے وہ اکثر سوچتے رہتے تھے اور راہ چلتے آٹھ آنے، بارہ آنے فی سبیل اللہ دے ہی دیتے تھے لیکن یہ تو غریب کو

مفلوج کرنے والی بات تھی۔

"چھ سات مکان تو میں الاٹ کرا سکتا ہوں" ـــ ارشد کے بھائی نے کہا ـــ "لیکن سوچنا یہ ہے کہ ان ہزاروں میں سب سے زیادہ حق دار کون ہے ؟"

"یہ ہم تلاش کر لیں گے" ـــ ارشد نے کہا ـــ "طاہرہ اور اُس کی ایک اُستانی، سنجنہ کل راوی روڈ کی طرف جا رہی ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ جن گھرانوں میں نوجوان لڑکیاں ہیں، پہلے انہیں ٹھکانے لگایا جاتے۔"

"عجیب مہم ہے" ـــ ارشد کے ابّا جان نے کہا ـــ "ہمت کرو بچو! اور زیادہ سے زیادہ خاندانوں کو آباد کراؤ دیکھو یوسف میاں!" ـــ ابا جان نے ارشد کے بھائی سے کہا ـــ "کل ہی شاہ صاحب سے ملنا اور انہیں میری طرف سے کہنا کہ ہمارے چھ اور رشتہ دار آئے ہیں اور چھ سات مکان الاٹ کرا دیں۔"

"کروا کیا دیں" ـــ ارشد کے بھائی نے کہا ـــ "انہی کے ہاتھ میں ہے جتنے چاہیں الاٹ کر سکتے ہیں۔"

"اور تم ارشد میاں!" ـــ ابا جان بولے ـــ "دیکھ لینا کہ طاہرہ کا کتنا روپیہ جمع ہے ..... اور سنو؟" ـــ اُنہوں نے قدرے فکر مند لہجے میں پوچھا "طاہرہ اپنی مرضی سے یہ روپیہ صرف کر رہی ہے نا؟ بھئی آخر نو عمر بچی ہے۔ کہیں تم نے تو اسے نہیں اکسایا؟"

"نہیں ابا جان!" ـــ ارشد نے خود اعتمادی سے کہا ـــ "چاہیں تو اسے بلا لیں۔ وہ نو عمر تو ہے لیکن اس کا دماغ پختہ ہے۔"

"خیر! دیکھ لو" ـــ ابا جان نے کہا ـــ "میں سوچ رہا تھا سات آٹھ ہزار روپیہ معمولی رقم نہیں۔ مکان الاٹ ہوتے رقم تقسیم کر دینا کہیں چور اچکوں کے ہی حوالے نہ کر دینا۔"

"نہیں، ابا جان!" ـــ بڑا بھائی بولا ـــ "میں ساتھ رہوں گا۔ اچھی طرح دیکھ بھال لیں گے۔"

ڈیڑھ دو گھنٹے بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ تجویزیں پیش ہوتی رہیں منصوبے بنتے رہے۔ ٹوٹتے رہے۔ ترمیمیں ہوتی رہیں اور آخر تینوں نے مل کر ایک سکیم بنا لی۔

"خدا کرے چند ایک اور دولتمندوں کو بھی اسی قسم کی عقل آ جائے" ـــ ابا جان بولے ـــ "ہمارے بیشتر مسائل اپنی مدد آپ۔ کے اصول پر حل ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے طاہرہ کو اس قدر روپے کی ذاتی طور پر ضرورت بھی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ تو اب ہماری ہی بیٹی ہے اور اب ہم ہی اس کے نیک و بد کے ذمہ دار ہیں۔ اس کی شادی پر انشاءاللہ جی کھول کر خرچ کریں گے..... ماسٹر باقاعدہ پڑھانے آتا ہے ؟"

"جی ہاں!" ـــ ارشد کے بھائی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد طاہرہ کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر آج ایک عرصے بعد اطمینان اور مسرت کی جھلک آئی تھی۔ وہ کتنے ہی دنوں بعد اپنے مخصوص لب و لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ آج وہ باتوں باتوں میں کھل کر ہنس بھی رہا تھا جیسے وہ عفت کو بھول ہی گیا ہو۔ وہ اس قدر بلند آواز سے بولنے لگا کہ آوازیں عفت کے کمرے تک پہنچنے لگیں۔ عفت

اندر ہی تڑپنے لگی جیسے ارشد کی آواز تیروں کی بوچھاڑوں کی طرح اس کے وجود میں اتر رہی ہو۔ اس کے اعصاب تو پہلے ہی مجروح تھے۔ دن بھر کی سیر کی تھکان بھی تھی۔ سنجنہ کے ساتھ باتیں کرتے وقت جو اسے اعصاب زدگی کا دورہ پڑا تھا اُس کا اثر بھی باقی تھا گرم پانی کے غسل سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا تھا۔ اسے نیند تو آ رہی تھی لیکن اس کا ذہن سونا نہیں چاہتا تھا۔

وہ لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی مگر ارشد کی جو باتیں اسے طاہرہ کے کمرے سے سنائی دے رہی تھیں اور ان باتوں کے ساتھ ارشد کا جو قہقہہ بھی سنائی دیتا تھا اس سے اس کا سکون آندھی میں تنکوں کی طرح اُڑ رہا تھا۔ اس نے یہ تو کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ ارشد کے جیتے جی اس کے بیوہ ہو جانے کی اور بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ صرف طاہرہ کو اپنی دشمن اور اپنے راستے کی ایک چٹان سمجھ رہی تھی۔ اب تو اس کے دماغ میں ایک خبط سماتا جا رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح طاہرہ راستے سے ہٹایا جاتے۔ یہ خبط ایک جنون، ایک مالیخولیا بنتا جا رہا تھا جس سے اس کے اعصاب تباہ ہو رہے تھے۔

آج رات اس نے ارادہ کیا تھا کہ کچھ نہیں سوچے گی لیکن دل و دماغ کا طوفان بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ لیٹی ہی تھی کہ ارشد کی پُرمسرت آوازوں نے اسے سیلاب کے پانی کی طرح بھنور میں لے لیا۔ ارشد کی آوازوں کے ساتھ اس کی اپنی دنیا کی آوازیں شامل ہو گئیں۔ دو دنیاؤں کی آوازیں غلط ملط ہونے لگیں۔ پھر یہ باتیں لہروں کی صورت اختیار کر گئیں۔ کچھ لہریں ساحل سے ٹکرا کر سمندر کو لوٹ رہی تھیں اور کچھ سمندر سے ساحل کی طرف لپک رہی تھیں۔ ایک مہیب تصادم۔ ایک بھیانک شور۔

عفت کو کمرے کی ہر چیز گھومتی محسوس ہوئی۔ چت لیٹے ہوتے اس نے چھت کو دیکھا۔ چھت بھی جیسے پہیے کی طرح گھومنے لگی تھی۔ آوازوں کے بگولے اُٹھ اُٹھ کر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ لہریں ایک دوسری کو مخالف سمتوں سے دھکیل رہی تھیں اور عفت کا سر پھٹنے لگا۔ وہ کچھ سوچ نہ پائی کہ کیا کرے۔ کہاں جاتے۔ طاہرہ کے کمرے کا دروازہ توڑ دے یا اپنا سر پھوڑ لے۔ وہ بے بس اور شکست خوردہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی سوچنے کی قوتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ اپنے آپ جو سوچیں آتی تھیں وہ تخریبی اور زہریلی تھیں۔

اس نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سرما کی رات کی یخ ہوا نے اسے ذرہ بھر سکون نہ دیا۔ دروازہ کھلنے سے ارشد کی آوازیں اور بلند ہو گئیں اور اس کے ساتھ طاہرہ کی مترنم ہنسی ..... عفت غیر ارادی طور پر برآمدے میں نکل آئی۔ اس کی داخلی اور بیرونی دنیا کا شور گرجتی سیاہ گھٹائیں بن گیا اور جب یہ گھٹائیں آپس میں ٹکرائیں تو عفت کے سینے میں بجلیاں کوند گئیں ہیبت ناک کڑک اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی اور اس کا سینہ جل اُٹھا۔ وہ برآمدے میں قدم اٹھاتی گئی چلتی گئی۔ غیر ارادی سے قدم اُٹھتے گئے۔ لاشعور اس کی راہنمائی کرتا رہا اور اس نے کمرے کے دروازے کو زور سے کھولا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کمرے کے وسط میں جا کھڑی ہوئی۔

"ارے عفت! کیا ہوا؟ یہاں بیٹھ جاؤ۔"

عفت اس آواز سے چونک اُٹھی۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ بھابی کے کمرے میں کھڑی تھی۔ دو پلنگ سامنے بچھے ہوئے تھے اور بھابی پلنگ پر بیٹھی پناہ گزینوں کے لیے سویٹر بُن رہی تھی۔ ارشد کا بڑا بھائی ابھی ابا جان کے پاس بیٹھا تھا۔ اس وقت تک تو وہ اپنے کمرے میں آ کر سو چکا ہوتا تھا لیکن ارشد آج ان کے سامنے ایسا موضوع رکھ

آیا تھا جس میں کئی قسم کی ذمہ داریاں تھیں۔ سات آٹھ ہزار روپیہ یک مُشت خیرات کر دینا نوالہ نہ تھا کہ منہ میں ڈالا اور نگل لیا۔ ترین صورت یہ تھی کہ یہ روپیہ ایک لاوارث لڑکی کا تھا جو ابھی غیر شادی شدہ تھی اور ان کے خیال کے مطابق عمر کی پختگی کو بھی نہ پہنچی تھی۔ گو دونوں بزرگ طاہرہ کی سکیم کو منظور کر چکے تھے اور لائحہ عمل بھی تیار ہو چکا تھا پھر بھی وہ دونوں ابھی تک اسے ہر پہلو سے دیکھ رہے تھے۔

عفت نے بھابی کی آواز سن کر بھی کمرے کو نہ پہچانا۔ جب اچھی طرح جائزہ لے چکی تو اسے خواب میں چلنے پھرنے کا دھوکہ ہُوا۔ اسے وقت کا بھی کچھ اندازہ نہ تھا۔ اچھی طرح کمرے کو پہچان چکنے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گئی کہ وہ اس کمرے تک پہنچ کس طرح گئی۔ وہ جھجکی، شرمندہ ہونے یا کسی اور دھچکے یا صدمے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی قوتِ برداشت ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔

"بھابی"!—— یہ حیرت زدہ سرگوشی نہیں تھی۔ دبی ہُوئی ایک دردآلود چیخ تھی جو عفت کے سینے سے نکلی اور دوسرے لمحے عفت بھابی کے سامنے، آدھی پلنگ پر اور آدھی فرش پر گری ہُوئی تھی۔ بھابی نے سلائیاں اور اون پرے پھینک کر عفت کو پلنگ پر لٹایا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ عفت کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ نبض پر ہاتھ رکھا تو اکڑا ہُوا تھا۔ بھابی کا دل دہل گیا۔ دیکھا کہ عفت کے ہاتھ پاؤں مڑتے جا رہے ہیں۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو وہاں ٹھنڈا پسینہ، ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھیں بے چینی سے اِدھر اُدھر تک رہی تھیں جیسے اجنبی جگہ کو پہچان رہی ہوں۔ بھابی سمجھی شاید حمل کے آغاز کا فتور ہے۔

اس نے امّی کو بلانا چاہا لیکن خیال آیا کہ وہ تو کبھی کی سو چکی ہوں گی۔ تکلیف چونکہ زنانہ قسم کی تھی اس لیے اس نے خاوند یا ابا جان کو بلانا مناسب نہ سمجھا۔ سوچا ذرا پیٹ مَل دوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ عفت کے پاس بیٹھ گئی اور پیٹ مَلنا شروع کر دیا۔

"عفّت! عفّت"! اس نے مادرانہ پیار سے عفت کو جھنجوڑا۔ عفت نے کھوئی کھوئی رحم طلب نگاہوں سے بھابی کو دیکھا تو بھابی نے اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہُوئے پیار سے پُوچھا "کیا ہُوا میری چھوٹی سی بہن کو؟ یہاں تکلیف ہو رہی ہے"؟—— اس نے عفت کے پیٹ پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہُوئے پوچھا—— "لاؤ مَل دوں گی۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا"۔

"وہاں نہیں"!—— عفت نے زیرِ لب کہا—— اس کی سرگوشی دکھ اور درد سے لرز رہی تھی۔ اس نے بھابی کی آہستگی سے کانپتے اور مڑتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑا اور اس کا ہاتھ اپنے دِل پر رکھ کر کہا—— "یہاں میری اچھی" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بھابی نے اس کے دل پر قمیض کے نیچے سے ہاتھ جو پھیرا تو عفت نے اس نسوانی لمس میں ماں کا پیار محسوس

"دِل ڈوب رہا ہے"؟—— بھابی نے پوچھا۔

"ڈوب چکا ہے"—— عفت نے روندھی ہُوئی آواز میں کہا—— "بھابی!.... اس سے آگے عفت کچھ نہ کہ سکی

میں بھری ہوئی باتوں نے آنسوؤں کا لامتناہی سلسلہ رواں کر دیا۔ بھابی کچھ نہ سمجھ پائی۔ حمل کے علاوہ اسے یہ خیال بھی آیا کہ ارشد عفت سے سرد مہری برت رہا تھا۔

"لیکن اتنی سی بات پہ یہ حالت"؟ بھابی نے سوچا اور یہ بھی محسوس کیا کہ عفت کے دِل پر یقیناً کوئی بوجھ ہے جسے آنسو ہلکا کر دیں گے۔ عفت رو رہی تھی اور بھابی محبت اور شفقت سے اس کی پیشانی سہلا رہی تھی۔ عفت کی ہچکی بندھ گئی۔ پھر ہچکیاں تھمیں۔ سسکیاں ختم ہونے لگیں اور چند ہی منٹ بعد عفت کی حالت معمول پر آنے لگی۔ آنسوؤں نے بہت کام کیا۔ بھابی کے ہاتھوں نے عفت کے جسم کو پسینے میں شرابُور پایا۔

"کچھ کہو بھی عفت"!—— بھابی نے ایک ہمراز اور دردمند ماں کے انداز سے پوچھا—— "آخر بات کیا ہے؟ یہ تکلیف یقیناً پیٹ میں بچے کی وجہ سے نہیں۔ بات کچھ اور ہے.... ارشد ناراض ہو گیا ہے؟ کہو تو اس کے کان کھینچوں؟ ابا جان سے کہوں وہ سیدھا کر دیں گے"۔

"بیکار ہے بھابی"!—— عفت نے بیٹھتے ہُوئے کہا۔ اس نے پلنگ کے تکیے کے ساتھ ٹیک لگائی اور بولی "جس مرد کے کان طاہرہ نے کھینچ لیے ہوں اور اس کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی ہو اسے کیا سنائی دے گا اور کیا نظر آئے گا"۔

"کیا کہا؟ طاہرہ نے"؟—— بھابی کو دھچکا لگا۔

عفت نے طویل آہ لی جو نہ جانے کب سے اس کے سینے میں آزاد ہونے کو تڑپ رہی تھی۔ بولی—— "بھابی! ڈرتی ہوں بات کر کے مجھے پچھتانا نہ پڑے۔ ہو سکتا ہے۔ آپ ارشد کے خلاف کوئی بات سننا نہ چاہیں۔ وہ آپ کا قریبی عزیز ہے اور میں اجنبی ہوں۔ ایک مُسافر۔ یوں ہی گزر جاؤں گی۔ کچھ نہ کہوں تو سینہ جلتا ہے"۔

"بات تو کرو نا، عفت"! بھابی نے اس کے قریب سرک کر رضائی اپنے اور عفت کے اُوپر اوڑھ کر گہری ہمراز سہیلی کی سی بے تکلفی سے کہا—— "خدا گواہ ہے میں ارشد کے خلاف ایک ایک بات سُنوں گی۔ مجھے تمہارے ساتھ بھی وہی دلچسپی ہے جو ارشد کے ساتھ ہے۔ میرا کون ہے۔ ماں نہ باپ نہ بھائی۔ دو بہنیں تھیں، دونوں اپنے اپنے گھر والی بن کر اپنی راہ لگ گئی ہیں۔ اب میرے خون کے رشتے دار تم لوگ ہی ہو۔ میرے لیے جیسا ارشد ویسا اس کا بڑا بھائی۔ تم اور طاہرہ بھی ویسی ہی ہو۔ میں تو چاہتی ہی یہی ہُوں کہ میرے ساتھ کوئی دکھ سُکھ بانٹے۔ بخدا جب سے اس گھر میں تمہارا اور طاہرہ کا اضافہ ہُوا ہے میری خوشیوں کی تو حد ہی نہیں رہی۔ تم اپنے دل کی مجھے نہ سناؤ گی تو میرے دل کو بھی رنج ہو گا کہ تم نے مجھے بیگانہ سمجھا"۔

"بھائی جان تو نہیں آجائیں گے"؟—— عفت نے پوچھا۔

"آ گئے تو دوسرے کمرے میں بھیج دوں گی"—— بھابی نے جواب دیا—— "تم کھُل کر باتیں کرو نگی! یہ حالت تو خُدا دشمن کی نہ کرے جو ابھی تمہاری ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے تم اندر ہی اندر کُڑھتی رہتی ہو"۔

"کُڑھوں نہ، بھابی تو کیا کروں! دِل کا رونا کس کے آگے روؤں؟"

"طاہرہ جو ہے"۔

"اگر میرا سہاگ اجاڑنے والی طاہرہ ہی ہو تو سر پھوڑنے اور دورے پڑنے کے سوا رہ ہی کیا جاتا ہے"؟

"خدا کے لیے مجھے پوری پوری بات سناؤ"——بھابی نے جھنجھلا کر کہا——"معلوم ہوتا ہے یہاں اچھا
رہا ہے۔ مجھے بتاؤ کیا گورکھ دھندا ہے، پھر دیکھنا میں کس طرح سارے مسئلے حل کرتی ہوں۔"

"بھابی! قصہ یہ ہے کہ ارشد مجھے دیوانہ وار چاہتا تھا۔۔۔" اور اس تمہید سے اس نے بھابی کو وہ قصہ سنا ڈالا
روز جہانگیر کے مقبرے کے سائے میں نجمہ کو سنا آئی تھی۔

لیکن بھابی کو اس نے یہ نہ بتایا کہ وہ یتیم اور غریب لڑکی تھی اور طاہرہ نے اسے گھر میں لا کر اپنے کنبے
بنا لیا تھا۔ یہ نہ بتانے کی غالباً وجہ یہ تھی کہ اس بات سے طاہرہ کے کردار کے قابلِ تحسین پہلو نکلتے تھے اور اس کے
احساسِ کمتری کا ثبوت ملتا تھا۔

اِس قصے میں اُس نے یہ اضافہ کیا——"بھابی، یقین نہ آتے تو چل کے دیکھ لو، اس وقت ارشد صاحب کہاں؟
بھی اتنے عرصے سے دیکھ رہی ہیں وہ کس طرح بجھے بجھے سے رہتے ہیں، جیسے وہ اس گھر میں موجود ہی نہیں۔ کہاں گئے
کہاں گئے ان کے ہر کسی کے ساتھ ٹھٹھے مذاق؟ نہ وہ مسکراہٹ رہی نہ وہ لطیفے رہے۔ میرے کمرے میں پہلے سو
پھر آنا بھی چھوڑ دیا اور اب گھر آنا بھی چھوڑ رہے ہیں۔ کیا میں اتنی بری ہو گئی ہوں؟۔۔۔ میں بری نہیں ہو گئی طاہرہ زیادہ ا
ہے۔۔۔ ہاں تو، بھابی! چل کے برآمدے میں سُنیئے کہ وہ بجھے مرے ہُوئے ارشد صاحب طاہرہ کے پاس بیٹھے کہ
رہے ہیں۔ میرے لیے تو اب پھیکی سی مسکراہٹ بھی نہیں رہی ان کے ہونٹوں پر اور اس کمرے میں ان کے قہقہے سا
رہا ہے۔"

عفت بولتی جا رہی تھی۔ اس کے آنسو سینے کی جلن نے خشک کر ڈالے تھے۔ بھابی حیرت و استعجاب کا پیکر
تھی۔ طاہرہ کے متعلق یہ انکشاف پہلی بار ہوا تھا جس پر وہ یقین کرنا نہ چاہتی تھی لیکن احوال و کوائف، ارشد کا مرجھا جانا
یہ حالت اور قرائن پکار پکار کر کہ رہے تھے کہ ارشد اور عفت کی محبت آسیب زدہ ہے۔ اس گاڑی کے آگے
گیا ہے——"اور یہ پتھر طاہرہ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟"——بھابی نے اپنے آپ سے کہا۔

"کیا وہ لڑکی جس نے مردوں کے دوش بدوش مردوں کی طرح جہاد کیا ہو اس قدر آوارہ بھی ہو سکتی ہے؟"——
اتنی آہستہ سے کہا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔

"طاہرہ نے مردوں کی طرح جہاد تو کیا تھا وہ مرد تو نہیں بن گئی"——عفت نے کہا——"ہے تو عورت ہی
بھی تو عورت ہیں۔ دل پر ہاتھ رکھ کر محسوس کریں اور ذرا تصور میں اپنے آپ کو میری جگہ لائیں۔ میں نے بھی جہاد کیا تھا۔ لا
طرح ہم پہنچے ہیں وہ آپ سن چکی ہیں لیکن جب میں نے اپنی محبت کو مجروح ہوتے دیکھا ہے تو خدا کی قسم تمام جہاد بھُو
اب تو میرے سامنے صرف ایک ہی جہاد ہے کہ اپنی ازدواجی زندگی کی راہ میں آنے والے ہر انسان کی بوٹیاں

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟"——بھابی نے عفت کو جذبات میں سے نکال کر عمل
لانے کی کوشش کی۔

"ایک ہی طریقہ ہے"——عفت نے کہا——"طاہرہ کو کہیں بیاہ دو۔ وہ جب تک اس گھر میں موجود ہے
دور رہے گا۔"

"ارے! تم صرف اپنی اور ارشد کی بات کر رہی ہو"——بھابی نے فکرمند سنجیدگی سے کہا——"اور میں سوچ رہی ہوں کہ جس
تم کہتی ہو کہ ارشد اور طاہرہ کے تعلقات بھی ایسے ویسے ہو گئے ہیں تو یہ طاہرہ کوئی اور گل نہ کھلا بیٹھے۔ خدانخواستہ اس
لت تمہارے والی ہو گئی تو اچھے بھلے شریف خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ طاہرہ کو بیاہ دینے میں ہی بھلا
لیکن عفت!۔۔۔" بھابی کو اپنے ہی الفاظ اس قدر چبھے کہ اس نے اپنے آپ کو ایک بار پھر فریب سا دینا چاہا اور کہا۔
نا ہے تمہارا یہ شک محض وہم ہو۔ ارشد اس کے کمرے میں جاتا ضرور ہو گا لیکن۔۔۔"

"بھابی! اٹھو خدا!"——عفت یہ مخالفانہ چوٹ برداشت نہ کر سکی اور لبستر سے اُٹھ بیٹھی۔ اس نے بھابی کو بھی بازو سے
گھسیٹ لیا اور اسی طرح کھینچتی ہوئی اسے کمرے میں سے نکال کر لے گئی۔

ارشد اور طاہرہ دنیا بھر کی باتیں کر رہے تھے۔ جب باتیں ختم ہو چکیں تو طاہرہ نے کہا——"اٹھو جناب! میں آج تمام دن
کی ہوئی ہوں۔ جاؤ اپنی عفت کے پاس۔" طاہرہ نے کیا تو مذاق تھا لیکن وہ سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی——"ارشد معلوم ہوتا ہے تم
ساتھ مجھے بھی رسوا کراؤ گے۔ تمہیں کہہ کہہ کر اور سمجھا سمجھا کر میں تو عاجز آ گئی ہوں"——ان اڑھائی تین گھنٹوں کی باتوں میں یہ پہلی
ت کا ذکر آیا۔

عفت اور بھابی دبے پاؤں طاہرہ کی کھڑکی کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہو چکی تھیں۔ کھڑکی کے پردے گرے ہُوئے
در طاہرہ کی آواز آ رہی تھی——"تم نے اپنی حالت ایسی بنا لی ہے کہ ہر کسی کو شک ہوتا ہے۔ ہم جو راز سینے میں دبائے ہوئے
آخر ظاہر ہو کر ہی رہے گا۔ مجھے ڈر لگتا ہے گھر کے لوگ شک میں نہ آ جائیں۔ تم سے بدتر حالت عفت کی ہے۔ کہیں میں
ہو جاؤں۔"

"دیکھو تو آج کتنے دنوں بعد تمہارے کمرے میں آیا ہوں"——ارشد نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا——"خدا کی قسم، طاہرہ
محبت کو میں اب دفن نہیں کر سکتا۔ بہت کوشش کی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا ہے لیکن عفت تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔
لے سکے گی۔"

"مجھ میں اب زیادہ باتوں کی تاب نہیں رہی، ارشد!"——طاہرہ نے جمائی لے کر کہا——"تمہیں میری محبت کے ساتھ میری
کا پاس بھی ہونا چاہیئے۔ یہ راز فاش نہ ہونے پاتے۔ تمہاری اور عفت کی ناچاقی کا نزلہ آخر مجھ پر ہی گرے گا۔"

"دیکھا جائے گا"——ارشد نے کہا۔

ارشد جانے کے لیے اُٹھا تو کرسی کی آواز آئی۔ عفت اور بھابی خاموشی سے وہاں سے ہٹ آئیں۔ برآمدے میں بھابی
نے کو بوجھل دل سے کہا——"اب جا کے سو جاؤ۔ مجھے تمہاری باتوں کا یقین ہو گیا ہے۔ کل بندوبست کر دوں گی کہ کسی اور سے
ارشد کو تمہارے قدموں میں نہ ڈال دوں تو۔۔۔"

اُدھر نجمہ الجھن میں پڑی ہُوئی تھی۔ عفت کی داستان رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اسے طاہرہ پر غصہ بھی آ رہا تھا۔
اس کی سوچ اور فکر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ طاہرہ کی وکالت میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا——"یہ جھوٹ ہے۔ طاہرہ

ایسی آوارہ لڑکی نہیں" ــــ اور دوسرا حصّہ کہہ رہا تھا ــــ "وہ آخر عورت ہے۔ نوجوان۔ جوانی اندھی ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی تو حقیقت
کہ طاہرہ اور ارشد ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے ہیں" ــــ نجمہ یہ آوازیں سننا نہ چاہتی تھی لیکن عفت کی حالت اس کے سا
آتی تو پھر سوچ میں پڑجاتی "یہ دَورہ بلا وجہ بھی نہیں ہوسکتا"۔

نجمہ نے ایک بار نہیں کئی بار طاہرہ اور عفت کے بچپن، لڑکپن اور متضاد تربیت و ماحول کا تجزیہ کیا۔ مقابلہ کیا
آخر میں آکر وہ پھر اُلجھ گئی۔ رات سونے سے پہلے وہ ویران بھُول بھلیوں میں بھٹکتی رہی اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس عقدے
ہی وا کر سکتی ہے۔ کل اسی کو ساری بات سُنا کر پوچھوں گی۔ تصویر کا دوسرا رُخ بھی تو دیکھنا چاہیئے۔ دوسرے رُخ سے اسے
واقفیت تھی کہ طاہرہ نے اپنی محبت ارشد اور عفت پر قربان کر دی ہے۔

ادھر بھابی آنکھیں کھولے اندھیرے میں ایک ڈرامہ دیکھ رہی تھی جس کے قالب اور کردار ایسے بھونڈے طریقے
مِلط ہو رہے تھے کہ نہ کہانی کا کچھ سراغ اور سرا ملتا تھا اور نہ کرداروں کی اداکاری قابلِ فہم تھی۔ نجمہ کے لیے یہ مسئلہ مشکل ضرور تھا
نہیں تھا اور وہ طاہرہ اور عفت کو اچھی طرح جانتی تھی۔ بھابی کے لیے ایک مشکل یہ تھی کہ اس نے طاہرہ کے کردار کی بلندی
کے صرف قصے سُنے تھے۔ اس کے علاوہ وہ عفت کے اوائل اور اس کی اصلیت کے متعلق کچھ بھی نہ جانتی تھی کہ دونوں
بہنیں ہیں اور اب اسے عفت کی زبانی یہ معلوم ہُوا کہ ارشد ان کے درمیان وجہِ پیکار ہے۔ وہ اپنے کانوں طاہرہ کی وہ
آتی تھی جو وہ ارشد کے ساتھ کر رہی تھی۔

بھابی جوں جوں اس قضیے کی گہرائی میں جاتی رہی وہ بے چین سے بے چین تر ہوتی گئی۔ اس کا خاوند آکر سو گیا تھا
نیند کی ہلکی سی جھائی بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ عفت کی باتوں کو سچ مانتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس سلسلے میں کیا اقدام کارگر
سکتا ہے۔ طاہرہ کے ساتھ براہِ راست بات کر لی جائے؟ .... وہ بگڑ نہ بیٹھے! .... اُس نے چاہا کہ خاوند کو جگا کر سارا ماجرا
لیکن وہ اس جلد بازی سے بھی باز رہی۔ اسی اُلجھن میں رات جانے کتنی گزر گئی تھی۔ سر بوجھل ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ ا
بات سنا ڈالوں گی۔ معاملہ عورتوں میں ہی طے ہو جاتے تو اچھا ہے۔

صُبح معمول کی طرح طلوع ہُوئی۔ کمروں برآمدوں اور باورچی خانے میں روز مرّہ والی چہل پہل تھی۔ بچے ہر روز کی طرح
جاگے۔ نور دین نے حسبِ معمول بھینس کا دودھ دوہا۔ نماز اور تلاوت ہر روز کی طرح۔ باغیچے میں پھولوں کی خوشبو بھی وہی تھی
روز کی طرح بھی ہُوئی اور آنکھوں میں شب بیداری اور بے چینیوں کو تھامے ہُوئے تھی، لیکن ارشد کا رنگ نکھرا ہُوا اور اس
کا رنگ اڑا ہُوا تھا۔ طاہرہ نے بھابی کو روز مرّہ کی طرح سلام علیکم کہی اور بھابی نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا لیکن طاہرہ محس
سکی۔ مرد حسبِ معمول دفتر کے لیے تیار ہُوئے اور نکل گئے۔
ارشد نے جاتے جاتے طاہرہ سے کہا ــــ "میں دوپہر کے کھانے تک آجاؤں گا۔ نجمہ بھی آچکی ہو گی"۔
بھی نکل گیا۔
مردوں کے دفتر اور بچوں کے سکول جانے کے بعد بھابی ارشد کی امّی کو الگ لے گئی اور اسے وہ ساری با

جو عفت نے رات اسے سنائی تھیں۔ اس نے عفت کی اس وقت کی حالت کا تفصیلاً نقشہ کھینچا۔ جوں جوں کہانی عروج کو پہنچ
رہی تھی امّی کے چہرے کی جھریاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے فرش و عرش ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ اتنی عمر میں اس
نے عشق و محبت اور گناہ و بدکاری کے سینکڑوں قصے سنے تھے۔ وہ دوسروں کے قصے ہونے کی وجہ سے دل چسپ ہُوا کرتے
تھے لیکن جو کہانی اسے بھابی سنا رہی تھی وہ اس کے اپنے گھر میں اپنی نظر کے سامنے بیت رہی تھی اس لیے اسے یقین نہیں آ
رہا تھا۔ وہ یقین کرنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ یہ اس کے اپنے گھر کی چار دیواری کا ڈرامہ تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی ــــ "کون؟ طاہرہ؟
اری زینت! کس کی بات کرتی ہو؟ میرے ارشد کی؟" ــــ یہ سوال اس نے کئی بار پوچھا اور بھابی نے وضاحت سے جواب
دیا۔ جواب بے شک صاف اور قابلِ فہم تھے لیکن ارشد کی ماں کو تو توقع تھی کہ بھابی ابھی کہے گی کہ یہ بات ارشد اور طاہرہ کی نہیں
[illegible] تی تی۔

"میرا خیال ہے ارشد کے بھائی جان کو بتا دوں اور وہ ارشد کو سمجھائیں" ــــ بھابی نے کہا۔
بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ گم سم جانے کہاں نظریں جمائے ہُوئے تھی۔
"یہ ڈرامہ یہیں ختم ہو جائے تو بھلا امّی! ورنہ یہ راز کہاں چھپائے پھریں گے" ــــ بھابی نے رازداری سے کہا ــــ "ایک
ہم اس طاہرہ کا اتنے ہزار روپیہ اور زیور گھر میں رکھے بیٹھے ہیں۔ پھر اس کی یہ جوانی۔ یہ کیا کم ذمّہ داری ہے۔ امّی؟ میں تو اب
ں کے ساتھ بات کرتے بھی ڈرتی ہُوں۔ چالاک لڑکی ہے ــــ کہیں ہم پر ہی تہمت نہ لگا دے کہ میری دولت ہضم کرنے کو
مجھے بدنام کر کے گھر سے نکالنا چاہتے ہیں"۔
"لڑکی تو بڑی چالاک ہے" ــــ ارشد کی امّی نے آہ لے کر کہا ــــ "دیکھا نہیں کس طرح آنکھوں سے باتیں کرتی ہے،
نوں کے ہونٹ مسکراتے ہیں، اس کی آنکھیں مسکراتی ہیں کمبخت جادوگرنی ہے۔ ارشد تو پھر جوان ہے، ارشد کا ابا بھی اس
کی تعریفیں کرتا نہیں تھکتا"۔

"ارشد کے بھائی جان کا بھی یہی حال ہے" ــــ بھابی نے لقمہ دیا۔
"بس جی بس" ــــ بوڑھی امّی یک لخت غصّے میں آگئی اور بازو لہراتے ہوئے فیصلہ دیا "اسے صاف کہہ دو کہ یہ لو
مال و پیسہ اور زیور اور اپنا ٹھکانا کرو۔ یہ کوئی یتیم خانہ تھوڑے ہی ہے کہ ہم لاوارث لڑکیوں کے ناز اور چونچلے اٹھاتے پھریں؟
کنجر خانہ یہاں نہیں چلے گا ....." بڑھیا بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ ذرا توقف کے بعد رازدارانہ لہجے میں بولی ــــ "اری زینت تو
نے اپنے کانوں سے طاہرہ کو یہ باتیں ارشد سے کہتے سنا ہے؟ میں تو کہتی ہوں یہ قصہ غلط ہو گا۔ سچی بات ہے کہ عفت کی
نسبت مجھے طاہرہ زیادہ سُلجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے"۔ امّی گہری سوچ میں پڑ گئی۔
"اللہ کی اللہ جانے، امّی!" ــــ بھابی نے جھنجھلا کر کہا ــــ "مَیں نے عفت کی حالت دیکھی، اس کی باتیں سُنیں اور ارشد کو
طاہرہ کے کمرے میں پایا۔ وہاں دونوں کی باتیں سنیں۔ جانے وہ کب سے وہاں بیٹھے تھے اور کب ارشد وہاں سے نکلا"۔
امّی اور بھابی چند منٹ خاموش اور اپنے اپنے خیالوں میں کھوئی رہیں۔ یہ کوٹھی وسیع و عریض تھی۔ گھر کے افراد پڑھے
لکھے تھے، کشادہ ظرف تھے مگر یہ کوٹھی اور اس کوٹھی میں رہنے والے انسان چار دیواری کی دنیا کے گھناؤنے آسیب اور رسم و رواج

کی زنجیروں سے آزاد نہیں تھے۔

"یوں کرو آپا" ــــ امّی نے سر ہلا کر کہا۔ "ابھی طاہرہ اور ارشد سے کچھ نہ کہو۔ تم یوسف سے ذکر کرو اور یوسف کے ابا کو سارا حال میں سناتی ہوں۔ وہ دونوں ارشد کو گھیر لیں گے۔ شاید یہ بات غلط ہو۔ تمہاری یہ بات درست ہے کہ لڑکی ہوشیار ہے اور اس کا اتنا سارا زیور اور روپیہ ہمارے ہاں پڑا ہے۔ کہیں تمہارا خدشہ ٹھیک ہی نہ ہو جائے کہ لڑکی الٹا ہمیں ہی رسوا کر دے"

"تو ابھی طاہرہ پر بھی ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ ہمیں اس کی کرتوت کا علم ہو گیا ہے" ــــ بھابی نے کہا۔ "پہلے مردوں سے بات کر لی جائے۔"

یہ دن ہر روز کی طرح گزرتا جا رہا تھا۔ کسی کے چہرے پر غیر معمولی تاثرات نہیں تھے۔ سوائے عفت کے جو ایک الگ کر پہلے سے زیادہ بے چین ہو گئی تھی۔ دوپہر کا کھانا سب نے مل کر اکٹھے بیٹھ کر کھا لیا۔ عورتوں نے آپس میں روزمرہ کی طرح باتیں نہ کیں۔ زیادہ دیر خاموشی طاری رہی۔ طاہرہ اس خاموشی اور کھچاؤ کو محسوس نہ کر سکی کیونکہ اس کا ذہن پناہ گزینوں کی خانہ بربادی اور نو آبادکاری میں اُلجھا ہوا تھا۔ اسے نجمہ کا انتظار تھا۔ نجمہ نے آنے کا اور راوی روڈ چلنے کا وعدہ کیا تھا۔

دو بجے کے قریب نجمہ پہنچ گئی۔ پہلے تمام عورتیں اکٹھی بیٹھی گپیں ہانکتی رہیں۔ آدھ گھنٹہ بعد نجمہ اور طاہرہ الگ ہو گئیں۔ نجمہ کو اپنے کمرے میں لا کر طاہرہ نے اسے اپنے پروگرام کی تفصیلات سنائیں اور اسے بتایا کہ ارشد، ارشد کا بڑا بھائی اور ابا جان اس پروگرام کو منظور کر چکے ہیں اور اب ارشد کو ساتھ لے کر راوی روڈ کی فٹ پاتھ سے پانچ ایسے گھرانوں کو تلاش کرنا ہے جن میں نوجوان لڑکیاں ہوں۔

نجمہ طاہرہ کے ساتھ ارشد اور اس کے تعلقات کے متعلق تمام باتیں سننا سنانا چاہتی تھی۔ عفت نے اسے جو کچھ بتایا تھا وہ اس کی تحقیقات کرنا چاہتی تھی۔ وہ دل میں جانے کتنی باتیں، شکوے اور غصہ بھر کے لائی تھی لیکن طاہرہ نے جہاں کی بات شروع کر دی۔ نجمہ کو جرأت تک نہ ہوئی کہ اس کے ساتھ اس قدر گھٹیا اور گرے ہوئے موضوع پر بات کرتی۔ طاہرہ تو اپنا مستقبل بھی ان کراہتے ہوئے انسانوں پر قربان کر رہی تھی۔ نجمہ طاہرہ کے اس روپ کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ جو شکوک عفت نے اس کے دل میں بھر دیئے تھے وہ از خود نکل گئے۔ نجمہ نے عیاں طور پر محسوس کیا کہ طاہرہ کی مسکراہٹ ایک عام انسان کی مسکراہٹ نہیں۔ اس میں فرشتوں کا نور اور روح کا جلال رچا ہوا ہے۔

"خدا میری یہ مراد پوری کر دے کہ میں اپنے ہاتھوں زیادہ سے زیادہ پناہ گزینوں کو آباد کر دوں" ــــ طاہرہ نے کہا۔ "پھر ایک مراد اور رہ جاتی ہے جو بظاہر پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ میں اس کے لیے رات رات بھر خدا کے حضور دعائیں کیا کروں گی۔ کاش! یہ مراد بھی روپے پیسے سے پوری ہو سکے۔"

"ایسی کون سی مراد ہے؟" ــــ نجمہ نے جیسے بے خیالی میں پوچھا ہو۔

"عفت اور ارشد کو ایک دوسرے میں شیر و شکر کر کے ایک جان کر سکوں...." طاہرہ نے بدستور مسکراتے ہوئے

"یہ پودا میں نے اپنے ہاتھوں لگایا ہے۔ آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ میں نے اسے اپنی تمناؤں اور جگر کے خون سے سینچنے کی کوشش کی ہے لیکن دیکھ رہی ہوں کہ پودا مرجھا رہا ہے اور میرے جگر کا خون ضائع ہو رہا ہے۔"

"وجہ؟" ــــ نجمہ اپنے موضوع کی طرف آنے لگی۔

"عفت اور عفت کی عادتیں".... طاہرہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس کی عادتوں کے علاوہ تمہاری اور ارشد کی محبت بھی تو ایک وجہ ہے" ــــ نجمہ نے بلا تکلف کہا۔ "عفت تمہاری محبت کو اچھی طرح جانتی ہے۔"

"ہاں آپا یہ بھی ایک وجہ ہے" ــــ طاہرہ نے جواب دیا۔ "لیکن اس کی عادتیں ذرا سی بہتر ہوتیں اور مغز میں ذرا سی بھی جان ہوتی تو وہ ارشد کا دل موہ سکتی تھی۔ میں نے ارشد کو قائل کر لیا تھا کہ وہ میری محبت کی خاطر عفت کو قبول کر لے اور اس نے قبول بھی کر لیا تھا لیکن عفت نے کیا کیا؟ یہ بھی آج سُن لو، آپا!...." اور طاہرہ نے نجمہ کو وہ تمام باتیں سنائی جو ارشد نے طاہرہ کو عفت کے متعلق سنائی تھیں اور بتایا کہ وہ کسی سے ملتی ملاتی نہیں۔ کمرے میں دن بھر گھُٹی رہتی ہے۔ ارشد نے ایک رُوحانی محبت کو غلیظ محبت پر قربان کر دیا ہے۔ "آپا! ارشد کو جسمانی آسودگی سے اتنا لگاؤ نہیں جتنا روح و قلب کی مسرت سے ہے۔"

نجمہ نے آج پہلی مرتبہ اپنے آپ کو طاہرہ سے کمتر پایا۔ اس نے محسوس کیا جیسے طاہرہ اُستانی ہو اور وہ شاگرد۔ طاہرہ کہہ رہی تھی ــــ "وہ ایک پیاس ہے جسے عفت اس وقت محسوس کرتی ہے جب ارشد کئی کئی راتیں اس کے کمرے میں نہیں جاتا، اور ایک وہ پیاس ہے جسے ارشد اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ عفت کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ دونوں پیاسے اپنی اپنی جگہ حق بجانب ہیں اور اپنی اپنی جگہ مجبور۔ نجمہ آپا! ارشد اپنی روحانی تشنگی بجھانے میرے کمرے میں آ جاتا تھا اور میں اسے کتنی کتنی دیر ہنسی مذاق سے، سنجیدگی سے اور بعض اوقات پیار و محبت سے سمجھاتی رہتی تھی کہ عفت کو اپنا بنا لو اور اپنی تمام تر محبت اور توجہ اسے دے کر اس کے دل و دماغ کو اپنے قبضے میں لے لو۔ وہ ابھی کچا پودا ہے، اُکھاڑ کے جہاں چاہو گے ہرا ہو جائے گا لیکن نہ ارشد کا دل جما نہ عفت نے اس کا دل جمانے میں تعاون کیا۔"

"ایک رات تو ارشد نے صاف جواب دے دیا کہ وہ عفت کو ان عادتوں اور اس ذہن کے ساتھ قبول نہیں کر سکتا" ــــ طاہرہ نے انکشاف کیا۔ "اور اس رات میں بھی جذباتی ہو گئی ــــ اپنے لیے نہیں، عفت کے لیے ــــ میں نے ارشد کو یہاں تک کہا کہ تم نے میری محبت کو کچل ڈالا ہے اور وہ کہنے لگا کہ تم نے ہی مجھے اس دوزخ میں دھکیلا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ عفت جنگلی اور اجڈ ہے، خدارا میری محبت کی خاطر ہی سہی.... ابھی کل رات کا ذکر ہے کہ ارشد میرے کمرے میں آیا۔ میں نے اسے خود ہی بلایا تھا۔ یہی پناہ گزینوں کے لیے روپیہ نکلوانے کی بات کرنی تھی۔ یہ بات تو آپ کو سنا ہی چکی ہوں۔ میں نے تو کوئی ایک ماہ سے ارشد کے قریب بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ آپا! سچی بات ہے وہ بجائے میری سننے کے اپنی لے بیٹھتا تھا اور مجھے وہ پیار و محبت کے گزرے ہوئے دن یاد دلانے شروع کر دیتا تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ میرا اعلیٰ مقصد فوت ہو رہا ہے اور ساتھ یہ بھی ڈر کہ میں بھی ایسے ہی جذبات اور ایسی ہی باتوں میں نہ اُلجھ جاؤں تو میں دونوں کو اللہ کے حوالے کر کے الگ ہو بیٹھی...."

"ہاں! تو رات کا ذکر ہے کہ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے ارشد اپنی باتوں پر آ گیا۔ میں نے [illegible] سے کہا ــــ معلوم ہوتا ہے تم [illegible] ساتھ مجھے بھی رسوا کراؤ گے۔ آپا! عفت الگ بے حال ہے۔ ارشد الگ پریشان ہے۔ میں ڈرتی ہوں نہ گھر والے کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں [illegible] میں ان دونوں کے درمیان آ گئی ہوں۔ میں نے ارشد کو ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ جو جی میں آئے کر دو لیکن میرا راز فاش نہ کر دینا، لیکن وہ

کہنے لگا — طاہرہ! میں نے بہت کوشش کی ہے لیکن تمہاری محبت کو دفن نہیں کر سکتا۔ عفت تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔ لے بھی سکے گی؟ آخر میں نے اسے اتنا ہی کہ کر ٹال دیا ”تمہیں میری محبت اور عزت کا پاس ہونا چاہیئے اور میرا راز فاش نہ ہونے پائے“ آپا مجھے تو دو بھیدوں پر پردہ ڈالنا پڑ رہا ہے۔ ایک ارشد کی محبت اور دوسرے عفت کی خاندانی اصلیت۔ بخدا میں نے بڑی مشکل سے اس راز کو چھپا رکھا ہے۔ ورنہ عفت تو اپنا آپ کبھی کا ظاہر کر چکی ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ وہ انسان بن گئی ہے لیکن وہ تو دن بدن حیوان بنی جا رہی ہے۔“

طاہرہ روانی سے بولے جا رہی تھی اور نجمہ کا دل مسرت و شادمانی سے سرشار ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مبارکباد دی کہ اس موضوع پر بولنے میں اس نے پہل نہیں کی ورنہ بات کا رنگ ہی بدل جاتا۔ اب اصلی بات کھل کر خود ہی سامنے آگئی تھی۔

نجمہ دل و دماغ پر عفت کی رام کہانی کے جو اثرات لے کر آئی تھی وہ دُھل گئے اور اسے بات کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ اس نے سکون آمیز آہ لی اور گہری فکر میں کھو گئی۔ طاہرہ بولے ہی جا رہی تھی۔ نجمہ اس کی سن بھی رہی تھی اور سوچ بھی رہی تھی کہ اگر یہی باتیں ارشد کی بھابی یا امی کو سُنا ڈالیں تو طاہرہ کے لیے بڑی پریشانی پیدا ہو جائے گی۔ اس نے ارادہ کیا کہ عفت سے جا کر پوچھ لے کہ اس نے کسی اور کے ساتھ ذکر تو نہیں کیا اور اس کی غلط فہمیاں دُور کر دی جائیں۔

نجمہ نے بہانے بہانے سے طاہرہ کو ٹالنا شروع کر دیا لیکن طاہرہ کو ایک ہمراز سہیلی مل گئی تھی جس کے سامنے وہ اپنے دل کا بوجھ اور غبار نکال دینا چاہتی تھی۔ نجمہ نے عفت سے علیحدگی میں ملنا نہایت ضروری سمجھا۔ طاہرہ کو ٹلتا نہ دیکھ کر اس نے کہا — ”یہ باتیں تو کبھی ختم نہ ہوں گی۔ میں ذرا عفت کے پاس بھی پانچ سات منٹ بیٹھ آؤں۔ اگر وہ موڈ میں ہوئی تو اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کروں گی۔“

”اللہ آپ کو سچ دے آپا!“ — طاہرہ نے مسکرا کر کہا — ”اسے سمجھائیں۔ شاید آپ کا ہی جادو کام کر جائے۔“

”تم ذرا کی ذرا لیٹ جاؤ“ — نجمہ نے اُٹھتے ہوئے کہا — ”ارشد بھی آنے والا ہوگا۔ میں عفت کو بھی تیار کرلوں گی۔“

نجمہ طاہرہ کا دروازہ بند کر کے عفت کے کمرے کی طرف دو ہی قدم چلی تھی کہ اُدھر سے بھابی نے آکر اس کی کلائی پکڑ لی اور کمرے میں لے گئی۔ نجمہ نے کہا بھی کہ ذرا عفت کو دیکھ آؤں لیکن بھابی اسے لے ہی گئی اور کہا — ”ایک نہایت ضروری بات کرنی ہے۔“

نجمہ جب ”آشا بھون“ میں داخل ہوئی تھی تو ارشد کی امی اور بھابی نے کانا پھوسی میں طے کر لیا تھا کہ مردوں سے بات سے پہلے نجمہ سے ذکر کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ نجمہ طاہرہ اور عفت کو جلال آباد سے جانتی ہے اور ارشد کے ساتھ بھی بنی ہے۔ شاید اسے کوئی پتے کی بات معلوم ہو۔

بھابی نجمہ کو بڑے کمرے میں لے گئی۔ امی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک دو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں تو بھابی نے رازداری کا سلسلہ شروع کیا۔ جوں ہی بھابی نے بات شروع کی نجمہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بھابی نے وہ تمام باتیں نجمہ کو [illegible] نے اسے سنائی تھیں۔ ارشد کی امی ساتھ ساتھ لقمے دیتی جا رہی تھی اور راستے بھی، یہ لقمے اور راستے ہر پہلو سے [illegible]

بات تھے اور اس کی مٹی پلید کرنے کو کافی۔ نجمہ نے چاہا کہ سر پیٹ لے لیکن وہ سنتی رہی اور سوچتی رہی کہ اب وہ کس طرح اس صورتحال کو سنبھال سکتی ہے۔ اگر دونوں عورتیں شک و شبہے کے لہجے میں باتیں کرتیں تو طاہرہ کی وکالت کی گنجائش نکل آتی لیکن وہاں تو ایک ایک لفظ پورے یقین اور بلا خوفِ تردید لہجے میں کہا جا رہا تھا۔

بھابی بار بار طاہرہ اور ارشد کے ان دو فقروں کو دہرا رہی تھی جو اس نے عفت کے ساتھ طاہرہ کے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر سُنے تھے۔ یہ بھی اچھا ہُوا کہ طاہرہ یہ فقرے نجمہ کو پہلے ہی سنا چکی تھی۔ نجمہ نے دونوں عورتوں کی باتوں سے یہ بھی اندازہ کیا کہ انہیں ابھی تک طاہرہ کے اس ایثار کا علم نہیں ہُوا جو وہ پناہ گزینوں کے لیے کر رہی ہے۔ انہیں واقعی اس کا علم نہیں تھا۔ مردوں نے ابھی طاہرہ کے پروگرام کا عورتوں کے ساتھ ذکر نہیں کیا تھا۔

نجمہ بیٹی! — ارشد کی ماں نے طنز آمیز التجا کی — ”سُنا ہے تم راولپنڈی میں رہتی ہو۔ ہم پر کرم کرو اور طاہرہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کا ایک ایک پیسہ اور زیور گِن کر اس کے ہاتھ میں دے دیں گے۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔ میرے بچے کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔“

”سچی بات ہے، نجمہ بہن!“ — بھابی نے تائیداً کہا — ”اب تو ایک ہی علاج ہے کہ طاہرہ یہاں سے چلی جائے۔ ہمیں پہلے علم ہوتا تو ارشد کا بیاہ طاہرہ سے ہی کر دیتے۔“

”طاہرہ کے ساتھ کیوں کر دیتے؟“ — امی نے ناک چڑھا کر کہا — ”خدا جانے کہاں کی آوارہ ہمارے پلے پڑ گئی ہے۔ میرا ارشد کوئی ایسا ویسا ہے کہ ایسی لوفر لڑکی سے بیاہ دیتی؟“

نجمہ تو تڑپ اُٹھی۔ اس کے سینے میں جیسے زہر آلود تیر آکے پیوست ہو گیا ہو۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نکل گیا۔ بولی — ”آپ تو اس قدر جلی بیٹھی ہیں کہ بات کرنے کی کوئی گنجائش ہی نظر نہیں آرہی۔“

”نجمہ بیٹی!“ — امی نے بے رُخی سے کہا — ”گنجائش آتے بھی کہاں سے۔ میں تو اب کسی کی ایک نہیں سنوں گی۔ تمہیں اس لیے سنائی ہے کہ طاہرہ تمہاری سہیلی ہے۔ اگر اس کا بھلا چاہتی ہو تو اسے ساتھ لے جاؤ۔ ورنہ ہم آج شام مردوں سے مشورہ کر کے کل خود ہی اسے جواب دے رہے ہیں۔ یہ شریفوں کا گھر ہے۔“

”طاہرہ میری صرف سہیلی نہیں“ — نجمہ پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے رندھی ہوئی آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا — ”وہ میری منہ بولی بہن ہے۔ آپ نے تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھا ہے۔ آپ نہ طاہرہ کو سمجھ سکتی ہیں نہ عفت کو اور نہ ہی اپنے بیٹے کو۔ آپ نے جو کچھ مجھے سنایا ہے وہ میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ یہ سب بکواس ہے۔ جھوٹ ہے اور بہتان ہے۔“

”لو اور سُنو“ — ارشد کی امی نے مُنہ دوسری طرف کر کے اس انداز سے کہا جیسے طاہرہ کے حق میں بات کرنی ہی گناہ ہو۔ کہنے لگی — ”یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے“ — بڑھیا کے چہرے پر غصے کی جھلکیاں نمودار ہونے لگیں۔

نجمہ بھی آخر عورت تھی۔ اسے بھابی اور امی پر نہیں عفت پر غصہ آرہا تھا اور طاہرہ پر ترس۔ وہ غصے کے جواب میں غصے میں ہی بولی — ”یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوتے بلکہ بند چار دیواری میں پردے کے پیچھے بیٹھے بیٹھے سفید ہوتے ہیں۔ امی جان! آپ نے باہر نکل کر دنیا دیکھی ہوتی تو بات کرنے یا سُنی سنائی پر یقین کرنے سے پہلے [illegible]

سونپ لیتیں۔ کل تک تو آپ اسی طاہرہ کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ آج اس میں کیڑے پڑ گئے۔ عفت تو اس کے پاؤں کی خاک کے برابر نہیں۔"

"تُو تو لڑنے پر اُتر آئی ہے" ۔۔۔ امّی نے لڑنے کے انداز میں کہا ۔۔۔ "میں تو اس کا کلیجہ بھی کھا جاؤں جو میرے بچے کی راہ میں کانٹے بوتے۔ خدا نے اچھی بھلی بہو دی تھی اور تیری طاہرہ نے اس کا سُہاگ اجاڑ دیا ہے۔ میرے بیٹے کو اندھا کر دیا ہے" ۔۔۔ غصہ بڑھنے لگا ۔۔۔ "دیکھ لینا کل یہ چڑیل کہاں ہو گی۔"

"ہو گی کہاں!" ۔۔۔ نجمہ نے جوابی حملہ کیا ۔۔۔ "خدا کے بندوں کے لیے خدا کی زمین تنگ تو نہیں۔"

"تم تو لڑنے بیٹھ گئی ہو" ۔۔۔ بھابی نے دخل اندازی کی ۔۔۔ "میں نے بات اس لیے کی تھی کہ اس مسئلے کا کوئی حل سوچا جائے۔"

"اللہ تمہیں عقل دے، بھابی" ۔۔۔ نجمہ نے کہا ۔۔۔ "کیا یہ طریقہ ہے حل سوچنے کا؟ کیا آپ ابھی تک طاہرہ کو نہیں سمجھ سکیں؟ اگر اس کے متعلق کوئی ٹیڑھا مسئلہ درپیش آیا تھا تو اسی کے ساتھ براہِ راست کیوں نہ بات کر لی؟ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اسی سے بات کرو اور اس کی بھی سن لو۔"

"اس کے ساتھ بات کرتی ہے میری جُوتی" ۔۔۔ بُوڑھی امّی کی عقل کی حدود ختم ہو چکی تھیں اور وہ منڈیر پر بیٹھ کر لڑنے والی عورتوں کی طرح اصل موضوع سے ہٹ کر اوچھی باتوں پر اُتر آئی۔

"نہ امّی! یوں نہیں" ۔۔۔ بھابی نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا ۔۔۔ "آپ تو بات کو بگاڑ رہی ہیں۔"

"بہر حال، امّی جان!" ۔۔۔ نجمہ نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں آپ کے گھر بیٹھی ہوں۔ شریفوں کے گھر دار میں جو آتا ہے اس کی یہ خاطر نہیں ہوا کرتی۔"

"ایک بار نہیں! سو بار آؤ" ۔۔۔ امّی نے کہا ۔۔۔ "میں نے تو سیدھی سادی بات کی تھی کہ...."

"لاٹھی تو میں نے بھی نہیں ماری تھی" ۔۔۔ نجمہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں نے بھی سیدھی سادی بات کا سیدھا سا جواب دیا تھا لیکن آپ نے تو اچھل کر میری زبان ہی پکڑ لی۔"

"اچھا، نجمہ بہن! تم اپنی سناؤ" ۔۔۔ بھابی نے کہا ۔۔۔ "امّی جان ان کی بھی تو سن لیں۔"

"سُن کیا لیں!" ۔۔۔ امّی نے اسی مزاجی کیفیت میں کہا ۔۔۔ "یہی نا کہ طاہرہ بڑی شریف لڑکی ہے۔"

نجمہ نے جب دیکھا کہ صُورتِ حال بہت بگڑ گئی ہے اور بڑھیا کا رویّہ کسی پہلو امید افزا اور صُلح جو نہیں تو اس نے مزید جھک جھک سے گریز ہی بہتر سمجھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ طاہرہ کو اس گھر سے نکال لے جائے گی، ورنہ یہ بڑھیا اور بڑھیا کا رویّہ جانے کیا گُل کھلائے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جو عورت عفت جیسی لڑکی کی باتوں کی قائل ہو گئی ہے وہ عفت سے بڑھ کر عقلمند نہیں ہو سکتی۔ اتنا عرصہ گزر گیا ہے اور وہ ابھی تک طاہرہ اور عفت کے درمیان ایک عیاں فرق کو نہیں سمجھ سکی۔ نیک اور بد کی تو جیسے وہاں تمیز ہی کوئی نہ تھی۔

نجمہ نے طاہرہ کو اپنے ساتھ لے جانے اور اپنے پاس رکھنے کے امکانات پر بھی غور کیا اور نشیب و فراز کا جائزہ لے رہی تھی۔ بھابی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ارشد کمرے میں داخل ہوا اور نجمہ کو دیکھتے ہی کھل اُٹھا۔ نجمہ نے حالِ دل چھپا کر ہنس کر ارشد کا استقبال کیا۔ امّی اور بھابی کے چہروں کے رنگ بدلے ہوئے تھے لیکن ارشد نے اُدھر توجہ ہی نہ دی۔ ماحول میں جو تکدر آ چکا تھا وہ عورتوں کے

بس سے باہر تھا۔ نجمہ نے اطمینان کا سانس لیا کہ ارشد آ گیا اور موضوعِ سخن بند ہوا۔ ارشد دو تین منٹ وہاں رکا اور کپڑے بدلنے کے لیے باہر نکلنے لگا۔ نجمہ عورتوں سے معذرت کیے بغیر اس کے پیچھے پیچھے نکل آئی۔

"چائے پی کے چلتے ہیں آپا!" ۔۔۔ ارشد نے برآمدے میں آ کر نجمہ سے کہا ۔۔۔ "آپ کی طاہرہ بھی حد لڑکی ہے۔ اس نے ابھی سے اپنا گھر جنت میں بنا لیا ہے۔"

"خدا سب پیسے والوں کو ایسا ہی حوصلہ دے" ۔۔۔ نجمہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا ۔۔۔ "اتنی بڑی قربانی دل والے ہی کر سکتے ہیں۔"

ارشد اپنے کمرے میں چلا گیا اور نجمہ نے عفت کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ عفت لیٹی ہوئی تھی۔ نجمہ کو دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی اور بجھی ہوئی گرمجوشی سے نجمہ کا استقبال کیا۔ بولی ۔۔۔ "میں تو بڑی دیر سے راہ دیکھ رہی تھی کہ میرے پاس آ بیٹھیں گی لیکن آپ تو...."

"عفت! میں تمہیں صرف یہ کہنے آئی ہوں" ۔۔۔ نجمہ نے اس کے پلنگ کے کونے پر بیٹھتے ہوئے قدرے غصے سے کہا ۔۔۔ "...کہ تم نے جو کچھ کیا ہے بہت برا کیا ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ کسی سے بات نہ کرنا، میں سب سنبھال لوں گی لیکن اب میں سمجھ نہیں سکتی کہ تمہاری اور ارشد کی بنے گی کس طرح...."

"میں نے کیا کیا ہے آپا؟" ۔۔۔ عفت نے غم ناک لہجے میں کہا ۔۔۔ "میں اس قدر مجبور ہو گئی ہوں کہ...."

"تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ جس طاہرہ نے تمہیں بہن بنا کر اپنے گھر میں بسایا تھا، آج اس طاہرہ کو تم گھر سے بے گھر کر رہی ہو۔"

"نہیں!" ۔۔۔ عفت نے بے چین ہو کر کہا ۔۔۔ "میرا مطلب یہ نہ تھا۔ میں اسے ارشد سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ آپا! کل رات وہ پھر ایک ہی کمرے میں تھے۔ بھابی نے بھی ان کی باتیں سُنی ہیں۔"

"تم نے سنوائی ہیں" ۔۔۔ نجمہ نے کہا ۔۔۔ "جیسی تم ویسی تمہاری بھابی۔ اگر چوری چھپے باتیں سننے کا شوق ہے تو ساری باتیں سنا کرو۔ تمہیں معلوم نہیں طاہرہ تمہیں اور ارشد کو یکجا کرنے کو تڑپ رہی ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ طاہرہ نے تمہیں زندہ رکھنے کے لیے اپنی محبت تمہارے لیے قربان کی ہے۔"

"لیکن اب اسے افسوس ہو رہا ہے" ۔۔۔ عفت بولی ۔۔۔ "اب وہ پچھتا رہی ہے اور حسد سے جل رہی ہے۔"

"عفت!" ۔۔۔ نجمہ کا غصہ بے قابو ہوا جا رہا تھا ۔۔۔ "میں زیادہ بک بک نہیں کرنا چاہتی۔ طاہرہ اب یہاں نہیں رہے گی۔ یہ گھر تمہارا ہے اور ارشد بھی تمہارا ہے لیکن میں تمہیں یہ بتا دیتی ہوں کہ طاہرہ کے راستے میں یوں کانٹے بو کر تم زندگی کا ایک لمحہ بھی چین سے نہ گزار سکو گی۔ طاہرہ میں قربانی کا جذبہ ہے اور تم میں اوچھاپن ہے۔"

"آپا!" ۔۔۔ عفت نے تقریباً چیخ کر کہا اور لپک کر نجمہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ لیے ۔۔۔ "یُوں نہ کہیں۔ میں نے آپ کا سہارا تلاش کیا تھا۔ آپ بھی مجھے نہ ٹھکرائیں۔ خدا کے لیے مجھے راہ دکھائیں۔"

"تم اندھی نہیں ہو" ۔۔۔ نجمہ نے کہا ۔۔۔ "کم عقل ہو۔ تم حیوان ہو اور ارشد انسان ہے۔ وہ روحانی آسودگی کا قائل ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ وہ اڑنے والا پنچھی ہے اور تم اسے اس کمرے میں قید کرنا چاہتی ہو۔ تم نے اپنے آپ کو نہ بدلا، وہ اپنے آپ کو

نہیں بدلے گا۔ میں تمہیں ٹھکرا نہیں رہی ہاں اگر میرے سہارے کی تلاش میں ہو تو میں تمہیں مایوس نہیں کرتی۔ ارشد کے جسم کو کھلونا نہ سمجھو اس کے ساتھ باہر نکل کر جیسے وہ چاہتا ہے دوسروں میں اُٹھو بیٹھو۔ اسے جس محبت کی ضرورت ہے وہ محبت دو۔ وہ محبت کہ جس کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔ اگر طاہرہ کے حق میں تمہاری نیت صاف ہے تو اسی سے سبق لو۔"

"مجھے ارشد کے ساتھ دیوانہ وار محبت ہے"۔۔۔ عفت نے تڑپ کر کہا۔۔۔ "میں اس کے لیے جسم و جان قربان کر دوں گی۔"

"لیکن تمہاری محبت کا عروج روح کے لیے موت ہے"۔۔۔ نجمہ بولی۔۔۔ "جسے تم عروج کہتی ہو وہ محبت کی پستی ہے۔ پیار کے لیے زہر ہے۔"

"خدا کے لیے مجھے کچھ سمجھاؤ۔ آپا!"۔۔۔ عفت نے التجا کی۔۔۔ "میں گمراہ ہوں، بھٹک گئی ہوں۔"

"تمہیں اب خدا سمجھائے گا"۔۔۔ نجمہ نے جواب دیا۔۔۔ "اب یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ تم نے طاہرہ کو بدنام کر دیا ہے۔ اس کی تمام تر نیکیاں ایک بیہودہ محبت کی آگ میں جلا ڈالی ہیں۔ طاہرہ تو تمہارا یہ گناہ بخش دے گی۔ خدا نہیں بخشے گا۔" نجمہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

"آپا نہ جاؤ"۔۔۔ عفت نے نجمہ کا بازو پکڑ لیا اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔

نجمہ کا دل ایسا پتھر تو نہ تھا لیکن طاہرہ کی رسوائی اور ارشد کی امّی کے توہین آمیز سلوک نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ عفت سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ نجمہ یہ بھی برداشت نہ کر سکی۔

"میں تمہارے ساتھ صرف اتنی نیکی کر سکتی ہُوں کہ تمہیں سمجھا دوں کہ ارشد زندہ دل اور شگفتہ مزاج ہے۔ تم بھی اسی طرح بن جاؤ"۔۔۔ نجمہ نے عفت سے کہا۔۔۔ "اسے اندر ہی اندر کڑھنے والوں سے نفرت ہے۔ دل و دماغ اور نظر میں وسعت پیدا کرو۔۔۔ ارشد کھلونا نہیں جسے ہر وقت دبوچے رکھو گی اور اس پر جیسے کسی دوسرے کا حق ہی نہیں۔ اپنے آپ سے باہر آ جاؤ تمہیں ارشد مل جائے گا۔ طاہرہ اب تمہارے ساتھ نہیں رہے گی۔ اس گھر کی دنیا اس کے لیے تنگ ہو گئی ہے۔ تم نے اسے گھر سے نکلوا دیا ہے۔ اب ذہن سے طاہرہ کا سایہ اتارنے کی کوشش کرو۔ تم نے خود کہا تھا کہ طاہرہ کا تم پر جادو سوار ہے۔ کوشش کرو کہ یہ جادو اُتر جائے۔"

نجمہ کہہ رہی تھی اور عفت نجمہ کا بازو چھوڑ کر آہستہ آہستہ پیچھے سرک گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھل کر ساکن ہو گئی تھیں اور نجمہ کہے جا رہی تھی۔۔۔ "تم طاہرہ کے بغیر جی نہ سکو گی۔ اس کی یاد آسیب کی طرح تمہارے گرد منڈلاتی رہے گی۔"

نجمہ کے آنسو پھوٹ آئے۔ صورتِ حال اسے کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ عفت کو یوں کوسنے میں بھی دل اس کا نہیں دے رہا تھا لیکن آہستگی سے گزرتے ہُوئے وقت کا ایک ایک لمحہ اس کی ذہنی افراتفری اور بے قراری میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اسی لہجے میں کہہ رہی تھی۔۔۔ "پھر تم ہو گی اور ارشد ہو گا۔ ارشد خواب کے سائے کی طرح تمہیں دکھائی دیتا رہے گا، تم اسے پا نہ سکو گی۔ طاہرہ کی مدد کے بغیر تم ارشد کو اپنا نہ بنا سکو گی۔ طاہرہ تمہاری لاٹھی تھی، تمہارا چراغ تھا۔ تم نے لاٹھی توڑ دی ہے، چراغ بجھا دیا ہے۔ اب جیو اور اندھیرے میں جیو۔"

نجمہ نے کہتے کہتے محسوس کیا کہ اس کے دماغ اور زبان میں رابطہ قائم نہیں رہا۔ خیالوں میں انتشار پیدا ہوتا جا رہا تھا اور ایک دو لمحے ایسے بھی آتے کہ اسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، وہ کچھ نہ کچھ کہتی ہی رہی۔ اسے چکر سا محسوس ہُوا اور وہ نہایت آہستگی سے حیران و ششدر عفت کو آخری نظر دیکھے بغیر کمرے سے نکل آئی۔

جب اس کے پیچھے دروازے کا کواڑ تڑاخ سے بند ہُوا تو اسے محسوس ہُوا کہ دروازہ اس نے خود بند کیا ہے۔ اس ہلکے سے دھماکے سے وہ جاگ اُٹھی۔ اسے پہلے خیال یہ آیا کہ اس نے عفت کو چند ایک ناگوار باتیں کہہ دی ہیں۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ عفت اعصاب زدگی کی مریضہ ہے اور اس کا یہ مرض خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے دل میں عفت کی ہمدردی بھی تھی لیکن حالات نے ایسا رنگ اختیار کر لیا تھا کہ اس کا مزاج ہنگامی طور پر اُکھڑ گیا تھا۔

نجمہ نے چاہا کہ وہ طاہرہ کو اسی وقت اس گھر سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ یہی کچھ سوچتی، سر جھکائے طاہرہ کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ طاہرہ کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ طاہرہ دروازے کی طرف پیٹھ ترچھی کر کے کنگھی کر رہی تھی۔ نجمہ کو طاہرہ کے چہرے کا دایاں حصّہ تھوڑا نظر آ رہا تھا۔ بکھرے ہوئے ریشمی بال جن میں بھُورے پن کی ہلکی سی جھلک تھی، طاہرہ کے حسن کو چار چاند لگا رہے تھے۔ کندھوں کی سیدھائی، کمر اور لچک اور بازوؤں کی سپید گولائی میں ایک طلسماتی سا تاثر تھا۔

طاہرہ خوبصورت تو تھی ہی لیکن آج نجمہ کو وہ بہت ہی حسین دکھائی دی۔ شاید اس لیے کہ اس نے اسے کھلے بالوں میں کبھی نہ دیکھا تھا یا شاید اس لیے کہ سیاہی مائل بھُورے بالوں کے درمیان اس کی گردن اور زیادہ خم دار اور سفید دکھائی دیتی تھی یا اس لیے کہ کنگھی کی حرکت کے ساتھ اس کی گردن کا خم، کمر کی لچک اور مرمریں بازو کا ہلارا عمر خیام کی رباعیوں کو شرماتا تھا یا شاید اس لیے کہ نجمہ کے قلب و جگر میں طاہرہ نے آج ایک اور انگڑائی لی تھی۔ شاید اس لیے کہ نجمہ کا یقین آج پختہ ہُوا تھا کہ طاہرہ کا حُسن ظاہری نہیں، اس کے خدوخال میں روح کا پَرتو چمکتا ہے۔

طاہرہ کو علم نہ ہُوا کہ نجمہ اسے نیم وا کواڑ میں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ کنگھی میں مصروف رہی۔ اس کے بال خاموش ندی کی طرح ہلکی ہلکی، چھوٹی چھوٹی لہریں بناتے رہے۔ نجمہ کے خیالوں میں بھی ننھی ننھی لہروں کا زیر و بم پیدا ہونے لگا۔

"بے چاری!"۔۔۔ نجمہ کے ہونٹوں سے جیسے آہ نکل گئی ہو۔۔۔ "کوڑے کرکٹ میں پھینکا ہُوا ایک ہیرا۔ دوسروں کے لیے جان و مال قربان کرنے والی۔ آج دوسرے اس ننھی سی جان کو مسل ڈالنے پر تلے ہُوئے ہیں"۔۔۔ نجمہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔۔۔ "میری پیاری طاہرہ! کاش! تو میری بہن ہوتی، میری بیٹی ہوتی۔ کاش! آج تیرا باپ زندہ ہوتا۔ تیری ماں زندہ ہوتی اور تُو۔۔۔" نجمہ کے آنسو پھُوٹ آئے۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ کچھ آنکھوں میں ہی جذب کر لیے۔ اس نے دُکھوں سے لبریز آہ لی اور اپنے آپ سے کہا۔۔۔ "تُو نے اپنے اوپر اور ارشد پر وہ ظلم کیا ہے کہ فرشتے بھی لرز اٹھے ہوں گے۔۔۔ بے چارہ ارشد!"

نجمہ نے فرطِ غم سے سر دیوار کے ساتھ لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جانے وہ پلکوں کے اندھیرے میں کیا دیکھ رہی تھی کہ اس کی آہیں تھمتی ہی نہ تھیں۔ اسے یہ بھی ہوش نہ رہا تھا کہ وہ ایسی جگہ کھڑی ہے جہاں سے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد کسی وقت گزر سکتا ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے کواڑ کھولا۔ اپنے آپ کو سنبھالا اور ذرا سا رک کر کمرے میں چلی گئی۔ طاہرہ تقریباً تیار ہو چکی تھی۔ نجمہ کا دل بجھا ہُوا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی کہ طاہرہ نے پُوچھا۔۔۔ "معلوم ہوتا ہے عفت جانے کو تیار نہیں ہُوئی"۔۔۔ نجمہ کو خاموش دیکھ کر طاہرہ بولی

"کیوں؟ معلوم ہوتا ہے عفت پر آپ کا نہیں بلکہ آپ پر عفت کا اثر ہو گیا ہے۔ آپ تو یوں یوں گم سم بیٹھی ہیں جیسے لڑ کر آئی ہوں۔ کہتی ہے عفت؟ طبیعت خراب ہے؟"

"دفع کر کمبخت کو" ——— نجمہ نے دبی زبان میں کہا ——— "وہ کیا سمجھے گی! وہ تو الٹا سمجھانے بیٹھ جاتی ہے۔ میں تو آئندہ بھولے بھی اسے منہ نہ لگاؤں گی۔"

"نہ آپا!" ——— طاہرہ نے شگفتہ سی سنجیدگی سے کہا ——— "یوں نہیں۔ میں چاہتی تھی کہ آپ میرا ہاتھ بٹائیں گی۔ میں ارشد کو سمجھاؤں گی اور آپ عفت کو راہِ راست پر لائیں گی۔ آپ نے تو صاف جواب دے دیا ہے۔"

"یہ باتیں بعد میں کریں گے" ——— نجمہ نے کہا ——— "جس کام کے لیے بلایا ہے پہلے وہ کر آئیں۔"

"چائے [illegible] میں نے نوکر کو کہا تھا یہیں لے آئے۔"

"امی اور بھابی؟"

"میں نے کہلوا دیا تھا کہ میں اور آپ کمرے میں چائے پئیں گی۔"

نوکر چائے لے آیا جو صرف نجمہ اور طاہرہ کے لیے تھی لیکن ارشد بھی وہیں آ گیا اور نوکر کو تیسری پیالی لانے کو کہا۔ طاہرہ نے تو کچھ نہ کہا لیکن نجمہ کو گھر کی فضا کے تکدر کا علم تھا۔ اس نے بظاہر مذاق سے مگر سنجیدہ لہجے میں کہا ——— "جاؤ میرے بھائی! تم امی جان، بھابی اور عفت کے ساتھ چائے پیو" ——— لیکن ارشد نہ مانا اور مذاق مذاق میں ٹال گیا۔

"عجیب بے تکے انسان ہو۔ عورتوں میں بیٹھتے شرم نہیں آتی" ——— نجمہ نے بڑی بہنوں کے پیار سے کہا ——— "جاؤ اپنی بیگم کے پاس ...."

"تم بھی طعنہ دے لو آپا!" ——— ارشد نے نوکر کے ہاتھ سے پیالی لیتے ہوئے کہا ——— "کچھ اس طاہرہ نے بیوقوف بنایا ہے کچھ قدرت نے اور باقی جو کسر رہ گئی ہے وہ تم پوری کر لو اور چلو راوی روڈ چلیں۔"

ارشد، نجمہ اور طاہرہ تانگے پر سوار ہو کر "آشا بھون" سے نکلے تو ارشد کی امی اور بھابی نے ناک بھوں چڑھاتی پھر سر ہلاتے جیسے سنی سنائی بات سچ ثابت ہو گئی ہو۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے تھے۔ عفت نے لیٹے لیٹے کہنیوں کے سہارے اُٹھ کر تینوں کو جاتے دیکھا اور اسے یوں لگا جیسے اس کی پیٹھ میں ایک تیر پیوست ہو گیا ہو۔ وہ چند لمحے انہیں نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھتی رہی پھر دھڑام سے بستر پر گر گئی۔

"پکچر دیکھنے جا رہے ہیں" ——— بھابی نے کہا۔

"بس اب حد ہو چکی" ——— امی نے غصے میں کہا ——— "یہ نجمہ بھی مجھے ایسی ویسی نظر آتی ہے۔ کیا بے حیاؤں کی طرح بالوں کے لٹ بنا رکھے ہیں۔ آنکھوں سے باتیں کرتی ہے کمبخت، دیکھو زینت!" ——— امی نے تحکمانہ لہجے میں کہا ——— "آج مردوں کو بٹھا کر ساری واردات سنائیں گے۔ یہ آزادی اور بے شرمی اس گھر میں نہیں چلے گی۔ یہ اتنا زیور اور روپیہ حلال کے معلوم نہیں ہوتے۔ ہاں تو اچھی بھلی تھی۔ جلال آباد میں کبھی کبھار آیا کرتی تھی۔"

"اس طاہرہ نے تو شکر کیا ہو گا کہ وہ مر گئی ہے" ——— بھابی بولی۔

"میں تو اس گھڑی کو کوس رہی ہوں جب ارشد کو پیچھے رہنے کی اجازت دے دی اور ہم ادھر آ گئے تھے" ——— امی نے جلال آباد کے آخری دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا ——— "ہم نے سوچا تھا کوئی بھلے مانس لڑکیاں ہوں گی جن کے لیے رک رہا ہے۔ ہمیں کیا معلوم تھا۔ نہ ارشد پیچھے رہتا نہ ان کٹنیوں سے اس کے تعلقات ہوتے۔"

امی اور بھابی نے فیصلہ کن حملے کی تیاریاں مکمل کر لیں اور اپنے طور پر طاہرہ کے لیے جلاوطنی کی سزا کا فیصلہ کر لیا۔ عین اس وقت تانگہ راوی روڈ کے اس مقام پر جا رکا جہاں سے سڑک کے دونوں طرف کھلے آسمان تلے بے گھر پناہ گزینوں کی ویران آبادی شروع ہوتی تھی۔ وہ تینوں تانگے سے اُترے اور ایک ایک کنبے کو بغور دیکھتے ہوئے چلتے گئے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے پاکستان کے نام پر قربان ہونے والوں کو سخت رات کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتے دیکھتے جا رہے تھے۔

دن ڈھلتا جا رہا تھا اور فٹ پاتھ پر بکھرے ہوئے بچے آگ کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ نوجوان لڑکیاں جو جانے کتنے گہرے پردوں میں چھپی رہتی تھیں، ململ کے دو گز دوپٹے سے بھی محروم تھیں۔ جن کے پاس اکی دکی چارپائی تھی اسے وہ چھت کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ شہر کے گھر گھر سے چولہوں کے اور اس اجڑے ہوتے ہجوم کے سینوں سے آہوں کے دھوئیں

اُٹھ رہے تھے۔ ایک آگ تھی جسے وہ آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے تین تانگے "آشا بھون" کے سامنے رُکے۔ ان میں سے چھ آدمی اترے میں سے ارشد، نجمہ اور طاہرہ اُترے اور ان چھ آدمیوں کو ساتھ لیے کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ارشد انہیں ابا جان کے گول کمرے میں لے گیا۔ اس کا بڑا بھائی بھی وہیں تھا۔ ان چھ آدمیوں کا حال حلیہ ایسی زندہ لاشوں سے ملتا جلتا تھا جنہیں کسی ہوتے مکان کے ملبے سے نکالا گیا ہو۔ بھوک، افلاس، شب بیداری، سردی، ہجرت کی دہشت کے گہرے اثرات چہروں کو بھیانک بناتے ہوئے تھے۔ صرف دو تھے جن کے پاؤں میں جوتیاں تھیں۔ وہ بھی انہوں نے ٹھٹھرے ہوئے پاؤں کو فریب دینے کے لیے پہن رکھی تھیں ورنہ ان کا نہ پہننا زیادہ آرام دہ ہوتا۔ ان سب کو صوفوں اور کرسیوں پر بٹھایا گیا۔ چائے پلائی گئی۔ ارشد کے ابا جان اور بھائی نے ان سے بیسیوں سوال پوچھے۔ ان سب کی تان تقریباً ایک ہی جیسے فقروں پر ٹوٹی

"دو نوجوان لڑکیاں اور تین بچے ساتھ ہیں حضور! صرف ان کا ٹھکانہ بن جاتے۔ ہم تو باہر درختوں کے نیچے سو جائیں گے"

"میں لکڑی کا کام کرتا تھا۔ فرنیچر وغیرہ کا...." ایک نے کہا۔

"میری تین کھڈیاں تھیں" —— دوسرے نے کہا۔

"کپڑے کی دوکان تھی میری تو حضور!" —— تیسرے نے کہا —— "اگر ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ ہاتھ آجاتے تو میں کسی بھی دوکان کر سکتا ہوں۔"

"میں نے پاکستان بننے سے تھوڑا عرصہ پہلے دو سو مرغیوں کا مرغی خانہ بنایا تھا۔ خاصی آمدنی تھی" —— چوتھے نے "میں نے اس کاروبار پر بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ یہاں بھی یہی کام مل جاتے تو تینوں غیر شادی شدہ بہنوں کی زندگی محفوظ کر

"میری تو چھوٹی سی پان سگریٹ کی دکان تھی" —— پانچویں نے کہا —— "کنبہ بہت بڑا ہے، مرا کوئی بھی نہیں" —— جلے کٹے لہجے میں کہا —— "دو لڑکیاں اور تین چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں۔"

"میں امرتسر میں ایک سکھ آڑھتی کے پاس منشی تھا" —— چھٹے نے کہا —— "اگر تھوڑا سا سرمایہ مل جاتے تو کوئی دُ لوں۔ دکان چلا سکتا ہوں۔"

رات کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا جب ارشد کے ابا جان نے انہیں اپنے دفتر کا پتہ اور وہاں پہنچنے کا وقت بتایا۔ گ نصف بوری آٹا، کچھ چینی، نمک، مرچ، پیاز وغیرہ منگوا کر سب میں تقسیم کیا اور سب رخصت ہو گئے۔

نجمہ جانے پر مصر تھی لیکن طاہرہ نے اسے کھانے کے لیے روک رکھا تھا۔

"طاہرہ ایک بات مانو گی؟" —— نجمہ نے کہا —— "اللہ کی قسم بڑی امنگ سے کہہ رہی ہوں۔"

"کیا؟" —— طاہرہ نے پوچھا۔

"میرے ساتھ پنڈی چلی چلو اور باقی عمر میرے ساتھ گزارو" —— نجمہ نے کہا —— "یہاں اب تمہارے لیے ہے۔ ارشد اور عفت کا بیاہ ہو گیا ہے۔ تمہارا روپیہ بھی نیک کام میں صرف ہو جاتے گا۔ چلو پنڈی اور میں تمہیں اپنے اسنانی لگوا دوں گی۔ دونوں بہنیں اکٹھی رہیں گی۔ بڑی مزے سے کٹے گی۔ تیری قسم فسٹ کلاس شادی کراؤں گی۔ بالکل

ے ملتا جلتا بلکہ اس سے بھی اچھا آدمی ہو گا۔"

"چلی تو چلوں" —— طاہرہ نے سنجیدہ ہو کر کہا —— "لیکن اس گھر کو اب اپنا بنا چکی ہوں۔ عفت ہے۔ ارشد ہے۔ باقی بزرگ بھی، اللہ انہیں جزا دے، بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔ امی اور بھابی سگی ماں اور بہن کا سا سلوک کرتی ہیں۔ میں میٹرک پاس کر لوں تو ارشد لنا تھا کالج میں داخل کرائیں گے۔ سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ میں ارشد اور عفت کو ایک جان کرنا چاہتی ہوں۔ بظاہر امید کوئی نہیں لیکن میں مایوس بھی نہیں۔"

نجمہ اپنی دلیلیں دیتی رہی اور طاہرہ انکار کرتی رہی۔ نجمہ نے یہ چال بیکار جاتی دیکھی تو وہ اصلی بات پر آگئی —— کہنے لگی۔ برا نیال تھا میں وہ باتیں نہ ہی کروں جنہیں نہ تم برداشت کر سکو گی نہ میں کر سکتی ہوں۔ طاہرہ تم آج نہیں تو دو چار روز بعد اس گھر ے بھاگ نکلنے پر مجبور ہو جاؤ گی جس عفت کی زندگی کو تم خوشیوں سے مالا مال کرنا چاہتی ہو وہ تمہاری راہ میں اس قدر کانٹے بو چکی ہے بیں اب ہم میں سے کوئی بھی ہٹا نہیں سکتا۔"

طاہرہ کو دھچکا لگا۔ حیرت و استعجاب سے اس کا منہ کھل گیا۔ آنکھیں ٹھہر گئیں۔ نجمہ نے کل کی بات سے قصہ جو شروع کیا ہ دوپہر پر ختم کیا۔ عفت کی اوچھی باتیں اور الزام تراشی۔ ارشد کی امی اور بھابی کے شکوک جو یقین کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ ںکے فیصلے اور رائے۔ نجمہ نے ہر بات پوری تفصیل سے سُنائی۔

طاہرہ کو چکر آنے لگے۔ اس کا اخلاق پاک و برتر سہی لیکن عمر اور تجربے کے لحاظ سے وہ کمسن تھی۔ حالات کی یہ پُر خطر ذلیل کن کروٹ دیکھی تو اس پر سکتہ طاری ہونے لگا۔ اس کی نیکیاں، ایک ایک کر کے، بدنامیوں کی لستیوں میں گرنے لگیں اُس ، چند موتی چُننے تھے وہ ساحل کی ریت پر بکھر گئے۔ سمندر کی ایک ہی موج آئی اور انہیں سمندر میں بہا لے گئی۔ اس کی زبان گنگ ی۔ وہ ہر کسی کو اپنے جیسا نیک طینت سمجھتی تھی۔ ہر کوئی نیک طینت نہ سہی، اسے اتنا یقین ضرور تھا کہ جس کے ساتھ نیکی کر وہ ب میں برائی نہیں کرتا، لیکن عفت نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا وہ اس کی مختصر سی عمر کی پہلی ٹھوکر تھی۔ اس نے سکھوں کی برچھیوں مقابلہ تو کر لیا تھا لیکن عفت، امی اور بھابی کا یہ وار برداشت نہ کر سکی۔ وہ نہتی تھی اور نہ ہی اسے معلوم تھا کہ وہ جوابی حملے کے لیے پنے تحفظ کے لیے کون سا ہتھیار استعمال کرے، کون سا پینترا بدلے، کیا کرے، کیا نہ کرے۔

نجمہ اسے باتیں بھی سناتی رہی۔ اپنی رائے بھی دیتی رہی اور وہ طاہرہ کے اس اضطراب کا اندازہ بھی کرتی رہی جو اس کے معصوم چہرے پر کربناک تاثر پیدا کرتا جا رہا تھا۔ طاہرہ کو اطمینان تھا کہ اس قبیح سلسلے میں نجمہ کی رائے اس کے حق میں ہے۔ اُس نے اندھیرے میں اس کرن کو دیکھا اور اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ —— "نجمہ تو سب کچھ جانتی ہے اور یہی میرا سہارا بنے گی۔"

نوکر نے کھانے کی اطلاع دی تو طاہرہ نے اپنے اور نجمہ کے لیے کمرے میں ہی کھانا لانے کو کہہ دیا۔

"میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں ان کانٹوں پر گھسیٹوں" —— نجمہ نے اداس لہجے میں کہا لیکن لہجے کی اداسی میں خود اعتمادی ہمدردی اور ایک پختہ ارادہ تھا۔ وہ بولی —— "میرا خیال تھا تم میری پیشکش قبول کر لو گی اور اس طوفان کی لپیٹ میں آنے سے پہلے میرے ساتھ چل پڑو گی۔"

"آپ کب جا رہی ہیں؟" — طاہرہ نے خلاؤں میں تکتے ہوئے پوچھا۔

"پرسوں!"

"پرسوں"! — طاہرہ نے جیسے اپنے آپ سے کہا ہو۔

ذرا سی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ طاہرہ نے دکھ اور رنج سے بوجھل آواز میں کہا — "آپ پرسوں اکیلی جا... ان چھ پناہ گزین کنبوں کی جو ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے اپنے ہاتھوں پورا کر لوں۔ میں گھر والوں کی روش دیکھتی... حالات بدتر ہو گئے تو میں آپ کو پہلے اطلاع دے دوں گی اور پنڈی پہنچ جاؤں گی" — اس کے آنسو نکل آ... ایک بار پھر بولنے کی کوشش کی لیکن سینے سے غبار نے اُٹھ کر حلق دبوچ لیا۔

نجمہ نے ٹھنڈی آہ لی اور کہا — "یہ گھر چھوڑتے تمہیں اس قدر دکھ نہیں ہونا چاہیے، طاہرہ! تمہارا گھر تو اب... گھر ان شاء اللہ میں اپنے ہاتھوں آباد کروں گی۔"

"یہ بات نہیں، آپا!" — طاہرہ نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا — "مجھے تو جلال آباد چھوڑنے کا... دل پر ایک بوجھ ضرور تھا جو لاہور پہنچتے ہی جھٹک پھینکا تھا۔ مجھے دکھ اپنے کیے کا ہے۔ میری نیکیاں ایک ایک... ہیں۔" طاہرہ نے جو باتیں شروع کیں تو اس کا سینہ صاف ہونے لگا۔ "آہ عفت! مجھے اپنی قربانی کے برباد ہونے... افسوس ہے تو تیری بربادی کا۔ کاش! تو ارشد کو اپنا بنا سکتی" — طاہرہ ایسے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز... ایک موتی مٹی میں ملا دیا ہے .... ایک موتی ...!" اور اس کے آنسو پھر بہ نکلے۔

"اس موتی کو اب خدا کے سپرد کرو طاہرہ!" — نجمہ بولی — "ارشد اور عفت کو تنہا چھوڑ دو" — اُس نے سوچ کر دبی دبی آواز میں کہا — "یہ گھر چھوڑتے تمہیں ارشد کی جدائی کا بھی غم ہو گا!"

طاہرہ کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئیں۔ وہ خلاؤں میں تکنے لگی۔ ہونٹ لرزنے لگے۔ اس کی مٹھیا... نے اس کی یہ تبدیلی اچھی طرح محسوس کی۔ کمرے میں سکوت چھا گیا۔ طاہرہ نے بجلی کی سرعت سے سر کو زور... دیکھا۔ وہیں سے جھک کر سر نجمہ کی گود میں گرا دیا اور بچوں کی طرح رونے لگی۔ پھر فرش پر نجمہ کے سامنے دو زانو بیٹھ گئ... پہلوؤں کو ہاتھوں میں دبوچ کر دبی ہوئی چیخ کے انداز میں کہا — "آپا! مجھے ارشد سے بے پناہ محبت ہے۔ میر... نہیں ہونے دوں گی۔ آپا! میری آپا! میں اور ارشد ایک دوسرے سے الگ رہنے کے لیے پیدا نہیں ہو... اس نے سر پھر نجمہ کی گود میں پھینک دیا۔

"اب پچھتانا بیکار ہے" — نجمہ نے پیار سے کہا — "تم نے ارشد کو خود ہی قربان کیا ہے۔ اپنے آ...

"صرف عفت کی خاطر!" — طاہرہ نے سر اُٹھا کر جواب دیا — "صرف عفت کی خاطر۔ اگر وہ ارشد کو میر... سکتی تو سجدہ میں فخر کرتی مگر میری محبت کوڑے کرکٹ میں کھو گئی ہے۔ عفت نے میری قربانی نگل کر اُگل دی... سے نڈھال ہو گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اوپر دیکھا اور بولی — "تو ہی خیال رکھیو میرے خدا! تو نے ہر جگہ میری مد... ارشد کی محبت کو بچائیو۔ یہ محبت عفت اور ارشد کے دل میں منتقل کر دیجو میرے خدا!"

اور نوکر کھانا لے کر آ گیا۔

کھانے کے بعد نجمہ نے رخصت چاہی اور طاہرہ کے ساتھ طے کر لیا کہ طاہرہ ہفتے عشرے کے بعد راولپنڈی پہنچ جائے... لیکن وہ گھر والوں کو اپنی منزل نہیں بتائے گی۔ یہ بھی طے ہوا کہ "آشا بھون" کے حالات سُدھر گئے اور غلط فہمیاں کسی بے مزگی کے بغیر دور ہو گئیں تو طاہرہ پنڈی نہیں جائے گی۔

ارشد، اس کے ابا اور بڑا بھائی آج رات پھر ان چھ خاندانوں کی آبادکاری کا پروگرام دہرانے لگے۔ ان کے پیشوں کے مطابق ...نا کے لیے رقوم مختص ہوئیں اور اس پہلو پر بھی نظر رکھنے کا انتظام کیا گیا کہ یہ لوگ اتنے پیسے لے کر کوئی کام دھندا کیے بغیر ہی چٹ ...کر جائیں۔ یہ ڈیوٹی ارشد نے اپنے ذمے لے لی۔

نجمہ جا چکی تھی اور طاہرہ کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اس نے سوچا عفت کے ساتھ صاف الفاظ میں بات کر جائے پھر خیال آیا — "بے کار ہے" — جو اوچھے الفاظ وہ زبان سے نکال چکی تھی وہ تو اب واپس ہونے سے رہے — "امّی بھابی کے ساتھ ذکر کیا جاتے؟ — لیکن بات کہاں سے شروع کروں گی؟ بات کروں گی کیسے؟" — اس نے دماغ پر زور دیا ...نا دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ارشد کی محبت اس کے دل میں چور کی صورت اختیار کر گئی اور اس نے اپنے آپ کو مجرم سمجھنا ...روع کر دیا۔ کسی کے ساتھ کھل کر بات کرنے کا حوصلہ ختم ہوتا محسوس ہوا، اور یہ بھی کہ شاید اس میں اخلاقی جرأت بھی ختم ہو گئی ہے۔ ایسی ...محبت ایسا گھناؤنا جرم بن گیا کہ وہ گھر کی عورتوں کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگی۔

وہ نڈھال سی ہو گئی۔ اسے جلال آباد والا حوصلہ اور استقلال یاد آیا تو اسے یہ خیال بھی آیا کہ اُن حالات کے لیے وہ اب ...حوصلہ مند ہے۔ پاکستان پر کوئی افتاد پڑی تو اب بھی وہ مردوں کا مقابلہ کرے گی، جان اور مال قربان کر دے گی مگر چار دیواری ...کے اس ایک ہی وار نے اسے نہتہ اور بے بس کر دیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ عورتوں کی زبانوں کے وار نہیں سہہ سکے گی۔ ...ہو کر اس طرح چارپائی پر گر پڑی جیسے کوئی تیرتے تیرتے ہار کر اپنے جسم کو موجوں کے سپرد کر دیتا ہے۔

ارشد کی امی اور بھابی عفت کے کمرے میں سر جوڑے بیٹھی تھیں اور عفت بہت خوش تھی۔ تینوں کمرے کے بند دروازے ...طاہرہ کے کمرے کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔

طاہرہ بستر پر لیٹی ہی تھی کہ نوکر نے آ کر کہا — "بڑے بابوجی بلاتے ہیں" — طاہرہ کو یوں لگا جیسے پھانسی کے قیدی ...بلانے آیا ہو۔

اُس نے ایک دو لمحے توقف کیا جیسے اس انتظار میں ہو کہ ابا جان کا بلاوا منسوخ ہو جائے گا لیکن نوکر سامنے کھڑا تھا اور ...لرزتے جسم کو سنبھالتی گول کمرے میں چلی گئی۔

"آؤ طاہرہ بیٹی!" — ابا جان نے اسے مسکرا کر اپنے قریب بلایا۔ طاہرہ مجرموں کی طرح آگے بڑھی تو ابا جان نے اس ...ر ہاتھ پھیرا اور اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا — "مجھے یقین نہیں آتا کہ تمہاری عمر کی لڑکی اس قدر ایثار کے جذبے کی مالک ...ہے" — ابا جان نے بزرگانہ مسکراہٹ سے کہا — "ارشد تمہارے متعلق بہت کچھ بتا رہا ہے، لیکن تمہارے ا...

تازہ جہاد نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔ کیا تم واقعی اپنا تمام روپیہ پناہ گزینوں کے لیے صرف کرنا چاہتی ہو؟"
"کیوں نہیں؟" ــــ طاہرہ کا حوصلہ عود کر آیا۔
"شاباش بیٹی!" ــــ ابا جان نے طاہرہ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ــــ "اگلے جہان تو خدا تمہیں اجر دے گا
یقین ہے خدا تمہیں اس قربانی کا صلہ اس دنیا میں بھی دے گا۔ تمہارے ایثار کو دیکھ کر ہم نے دو ہزار روپیہ تمہارے
میں شامل کر دیا ہے۔ اس سے دو تین کنبے اور ٹھکانے لگ جائیں گے۔"
طاہرہ خوشی کے دھچکے سے ہل سی گئی۔
ڈیڑھ دو گھنٹے انہوں نے طاہرہ کو اپنے پاس بٹھائے رکھا اور مختلف موضوعوں پر باتیں ہوتی رہیں۔ طاہرہ
لے کے گئی تھی، اپنے کمرے میں لوٹی تو دل مسرت و شادمانی سے اچھل رہا تھا مگر تلخ سا ایک خیال بگولے کی طرح
سارا سکون اڑا لے گیا۔ اس نے سوچا یہ تو مردوں کے ساتھ بات ہوئی ہے۔ ان کے کانوں تک ابھی عفت کی باتیں نہ
گی۔ عورتوں کا سامنا وہ کیونکر کرے گی؟ ــــ کاش! عورتیں ان باتوں کو جھوٹ سمجھ کر نگل جائیں.... لیکن.... وہ تو عورتیں
کا تبنگڑ بنائیں گی۔
بجمہ اسے یہ بتا گئی تھی کہ عورتیں کیا سوچے بیٹھی ہیں۔ بجمہ کے خیال کے ساتھ ہی اسے راولپنڈی کا خیال آیا۔ ا
اسے "آشا بھون" اور اس کے مکینوں کو چھوڑنے کا خیال آیا اور ان خیالوں نے مل کر طاہرہ کا یہ حال کر دیا جیسے وہ بجھ
ہوا اور نیچے ہی نیچے جا رہی ہو۔
"نہیں! یہ غلط ہے" ــــ اس نے اپنے آپ کو فریب دیا ــــ "امی اور بھابی اتنی اوچھی نہیں جو بلا سوچے
دھتکار دیں گی۔ آخر عفت کو بھی وہ جانتی ہیں۔"
مرد آج رات بھر گول کمرے سے اس وقت اُٹھے جب عورتیں سو چکی تھیں جو معاملہ انہوں نے ہاتھ میں
کے ہر پہلو پر بہت سی سوچ اور فکر کی ضرورت تھی کہ وہ کوئی قدم جلد بازی میں نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ ارشد طاہرہ
سامنے سے گزرا تو طاہرہ کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ وہ ذرا سا رکا پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات گزر گئی۔ یہ صبح ہر صبح کی طرح روح افزا نہیں تھی۔ طاہرہ کی آنکھ معمول سے پہلے کھل گئی۔ پو پھٹ رہی
دنیا میں وہ جانے کہاں کہاں گھومتی پھرتی رہی لیکن آنکھ کھلتے ہی یہ تلخ خیال کہ "آشا بھون" کے پیارے پیارے
نے کیا بھدا اور پھیکا رنگ بھر دیا ہے، اس کے ذہن میں اس طرح داخل ہوا جس طرح خالی بوتل کا کارک کھلتے ہی
بوتل میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے جسم و جان جو کل تک نیند سے تر و تازہ ہو کر بیدار ہوتے تھے آج بیدار ہوتے
رات کے ساتھ ہی گم ہو گئی۔
اس نے اپنے وجود کے اندر سر سے پاؤں تک درد کی ٹیس محسوس کی۔ یہ درد جسمانی نہیں تھا، روح لہولہان
تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں مار کر جذبات سے نکل آئی اور اس نے سوچا کہ فرار ممکن نہیں۔ آخر کب تک۔ تمام تر جسمانی اور

کر کے اس نے اپنے آپ کو قائل کر لیا کہ اسے سب کا سامنا کرنا چاہیئے، اور اگر اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہو
تو دوسروں کی باتیں سن کر کچھ سوچا اور کہہ پڑتے ــــ اس نے لمبا سانس لیا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔
باورچی خانے میں گ... سے پر پتہ چلتا؟ ــــ کی تیاری میں مصروف تھیں۔ بھابی امی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ انداز سے
صاف پتہ چلتا تھا کہ کوئی کھر... ہو رہی ہے۔ طاہرہ نے السلام علیکم کہی تو بھابی چونک کر خاموش ہو گئی اور اس طرح
چولہے میں پھونکیں مارنے لگی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ اس نے روکھے پن سے سلام کا جواب دیا اور امی جو کل تک "آؤ بیٹی!
وعلیکم السلام" کہا کرتی تھی، آج صبح صرف خاموش ہی نہ رہی بلکہ اس کے جھریوں سے بھرے ہوئے ماتھے پر دو جھریوں کا اضافہ
ہو گیا۔ طاہرہ کو اسی سلوک کی توقع تھی۔ وہ وہاں سے نکل آئی۔
وہ عفت کے کمرے میں گئی۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ طاہرہ نے ایسی مسکراہٹ سے جو زبردستی ہونٹوں پر لائی گئی تھی عفت کو سلام
کیا لیکن عفت نے سلام کا جواب دینے کی بجائے کروٹ بدل لی اور اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ طاہرہ نے عفت کے چہرے پر
ایک نمایاں تبدیلی دیکھی جس میں کسی حد تک غرور اور فتح کی جھلک تھی۔ طاہرہ وہاں سے بھی نکل آئی اور غسلخانے میں چلی گئی۔ وضو، نماز
وغیرہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا اور آج بھی وہ اس معمول کے مطابق سارا کام کر رہی تھی لیکن مشین کی طرح۔ اس کے جسم اور دماغ کا
رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔
صبح کا اجالا نکھرنے لگا۔ بچے باری باری جاگے اور گھر میں روزمرہ کی گہما گہمی شروع ہو گئی لیکن آج طاہرہ کا وجود اس گہما گہمی سے
الگ تھلگ تھا جیسے کسی تندرست اور جیتے جاگتے جسم کا ایک عضو کاٹ کر الگ رکھ دیا جاتے۔ حسبِ معمول گھر کے تمام افراد
اکٹھے ناشتے پر بیٹھے۔ اس خاندان کا پرانا دستور تھا کہ کھانا اور ناشتہ اکٹھے بیٹھ کر کھایا جاتا تھا۔ یہ دستور اب روایتی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔
ارشد کے ابا جان نے گھر میں مرکزیت اور نظم و نسق برقرار رکھا ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ ارشد کا بڑا بھائی بال بچوں والا ہوتے ہوئے
بھی ماں باپ سے الگ نہیں ہوا تھا۔ کھانے کے وقت زیادہ تر ہلکی پھلکی اور پر مزاح باتیں ہوا کرتی تھیں۔
آج ناشتے پہ بیٹھے ہوئے زیادہ تر افراد خاموشی سے ناشتہ کر رہے تھے۔ عورتوں کی شکلیں بدلی بدلی سی تھیں۔ مردوں نے
جو بات شروع کی تو وہ مردوں میں ہی ختم ہو گئی۔ ابا جان نے عورتوں کی اس لاتعلقی کو محسوس کیا لیکن ارشد کے بھائی نے کوئی قصہ شروع
کر دیا تھا جس سے ان کی توجہ ادھر سے ہٹ گئی۔ یوں تو عفت ہر روز کبھی کبھی رہتی تھی لیکن اس کی "طبیعت کی خرابی" ایسی وجہ تھی کہ
سبھی اسے معذور سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ امی اور بھابی بھی عفت کا روپ دھار کے بیٹھی تھیں اور صرف کھا پی رہی تھیں۔
ناشتہ ختم ہوا تو یہ محفل جو عموماً ہنستے کھیلتے منتشر ہوتی تھی یوں بکھر گئی جیسے چند ایک اجنبی ہوٹل میں سے نکل رہے ہوں۔
ارشد کے ابا جان کو کسی بے مزگی کی بو آئی انہوں نے ارشد کی امی کو کمرے میں لے جا کر پوچھا ــــ "گھر میں کوئی خاص بات ہوئی ہے
کہ آج ناشتے کے وقت ماتم کا منظر بنا ہوا تھا؟"
"جس گھر پر شیطان کا سایہ پڑ جاتے وہاں اس سے بھی بدتر حال ہوا کرتا ہے" ــــ ماں نے کھرا سا جواب دیا ــــ "آپ تو
آنکھوں پر پٹی باندھے پھرتے ہیں۔ اجڑے ہوؤں کو بسانے کی ایسی فکر لگی ہے کہ اپنے گھر کے اجڑنے کا کچھ خیال ہی نہیں۔"
ــــ ابا جان آنکھیں اور منہ حیرت سے کھلا ہوا آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھ گئے اور کہا ــــ "بات صاف صاف کرو بیگم

تو کچھ سمجھوں۔"

"آپ کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے کہ کسی اور بات کی طرف بھی توجہ دے سکیں" — امّی نے خفگی کے انداز سے کہا۔

"خدا کے لیے مطلب کی بات کرو" — ابا جان نے غصّے سے کہا۔ "اسے کہتے ہیں، تمہارے دل کی سنے بنا حال جان جاؤں گا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی تو تم تو اندھی نہیں تھیں۔ آ گئے ہو ایثار کو دیکھ کر ہم پر۔ کہو ہوا کیا ہے؟ کس نے ہمارا گھر اجاڑا ہے؟ ... بات شروع کرنے سے پہلے یہ خیال رکھنا کہ اگر کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑے کا معاملہ ہے تو میں کہانی نہیں سنوں گا مجھے جو قصہ سنانا ہے اس کے دونوں پہلو سنانا۔"

"گھر اُجڑ رہا ہے میرے بچے کا .... ارشد کا" — امی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کون اجاڑ رہا ہے؟"

"آپ کی چہیتی طاہرہ جس کی تعریفیں کرتے آپ تھکتے نہیں۔ دونوں پہلو سننے میں تو دونوں سناؤں گی۔"

امی نے اس تمہید کے ساتھ کہانی کا آغاز کیا تو ابا جان کے دل کو صدمہ ہوا۔ اس لیے نہیں کہ طاہرہ کو مجرم بنایا جا رہا تھا بلکہ اس لیے کہ انہیں گھر کے افراد کے درمیان کسی بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہو جانے کا شک ہوا۔ یہ صورت ان کے لیے بڑی ناگوار تھی کیونکہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس سلجھے ہوئے گھر میں جس کے نظام میں کبھی جھول نہیں آئی تھی کوئی قباحت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ارشد کی امی کی بات انہماک سے سننے لگے لیکن ایک منصف بزرگ کے انداز سے۔ اُن کا مزاج نہ بگڑا اور نہ ہی انہوں نے بڑھیا کی بات پر اپنے آپ کو قائل ہونے دیا۔

امی نے وہ باتیں سنائیں جو عفت نے بھابی کو سنائی تھیں اور بھابی نے اُسے سنائی تھیں۔ نجمہ کے ساتھ مختصر سی جو بات ہوئی تھی اس کا بھی تفصیلاً ذکر کیا اور ایک آدھ جرم اس کے سر بھی تھوپ دیا۔ پھر وہ باتیں بھی سنائیں جو عفت سے اس نے سنی تھیں۔ ارشد اور طاہرہ کے درپردہ تعلقات کو اس طرح بیان کیا جیسے وہ عینی شاہد ہوا در یہ تعلقات کسی پہلو جائز نہ ہوں۔ اس نے ان سب سنی سنائی باتوں میں زیبِ داستاں پر خصوصی محنت کی۔ پھر عفت، طاہرہ اور نجمہ کے متعلق اپنی رائے دی جسے وہ حرف بحرف اور حرفِ آخر سمجھتی تھی۔

آخر میں اس نے کہا ..." آج شام کا واقعہ ہی لے لیجئے۔ اُدھر سے نجمہ آئی، اِدھر طاہرہ تیار بیٹھی تھی۔ ارشد بھی وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ پھر نہ کسی سے پوچھا نہ بتایا اور نہ ہی عفت کی بات پوچھی اور دونوں لڑکیاں ارشد کو اپنے ساتھ پکچر پر لے گئیں۔ اِدھر عفت بیچاری کو دَوروں پر دَورے پڑتے رہے۔ جب تینوں واپس لوٹے تو ارشد کو آپ نے بھی دیکھا ہو گا کس طرح کھِلا ہوا تھا اور کس طرح چہک رہا تھا۔ زمین پر پاؤں نہیں دھرتا تھا۔ آپ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی خاطر کچھ سامان ساتھ لے آیا کہ یہ بے چارے بے گھر ہیں، ان کی مدد کرنی چاہیئے۔"

ابا جان کے اعصاب جو قدرے کھنچ گئے تھے فوراً ہی اپنی جگہ پر آ گئے۔ انہیں تو اچھی طرح علم تھا کہ ارشد، نجمہ پکچر پر نہیں گئی تھیں اور بڑھیا نے بلا پوچھے بھالے فتویٰ دے دیا۔ انہیں شک ہوا کہ اسی طرح اس کی باقی باتیں بھی ... سکتی ہیں۔

"تمہیں کس نے بتایا تھا کہ وہ پکچر پر گئے تھے؟" — ابا جان نے تحمّل سے پوچھا۔

"یہ بھی بھلا کسی کے بتانے پر پتہ چلتا ہے؟" — بڑھیا نے تجربہ کارانہ لہجے میں جواب دیا — "ان کے چوچلے اور ناز و انداز ہی بتا رہے تھے کہ ..."

"بہرحال تم نے پوچھا نہیں تھا کسی سے؟" — ابا جان نے وکیلوں کی طرح جرح کے انداز سے پوچھا — "یعنی ان تینوں میں سے کسی سے پوچھا نہیں تھا؟"

"میری بلا سے! میں کیوں پُوچھوں؟" — امی نے گردن پھیر کر یوں جواب دیا جیسے یہ سوال تو محض بیکار تھا — "مجھے تو اپنے بیٹے کا فکر کھاتے جا رہا ہے، اس کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔"

"سُنو، ارشد کی ماں!" ابا جان نے بُردباری اور دُور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا — "ارشد، نجمہ اور طاہرہ ہماری بنائی ہوئی سکیم کے تحت گئے ہی ان چھ سات مُسٹنڈوں کی تلاش میں تھے جو واپسی کے وقت ان کے ساتھ تھے۔ ہماری سکیم یہ ہے ..." اُنہوں نے طاہرہ کی تجویز اور مالی قربانی سے بات جو شروع کی تو بوڑھی امّی کے ہر بہتان کا جواب دیتے چلے گئے جس میں نجمہ اور طاہرہ کے کردار کا ذکر غالب تھا۔ اُنہوں نے عفت کے متعلق بھی اپنی رائے دی اور کہا — "عفت کے شکوک اور الزام تراشی اس کی محدود ذہنیت کے پیشِ نظر بجا ہیں لیکن ہیں سراسر غلط۔ بہرحال میں ارشد سے اچھی طرح پوچھوں گا۔ مجھے یہ سارا قصہ محض غلط فہمی۔ بہتان اور بات کا بتنگڑ معلوم ہوتا ہے۔"

ابا جان کہے جا رہے تھے اور بڑھیا بے چین ہوتی جا رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ ارشد کے ابا جان بات سنتے ہی بھڑک اٹھیں گے لیکن ان کی فطرت میں بھک سے اُڑ جانے والا بارُود بالکل ہی نہیں تھا۔ ان کی عمر زیادہ اور تجربہ عمر کے لحاظ سے زیادہ تھا۔

اُنہوں نے بڑھیا سے کہا — "تم صرف اتنا کرم کرنا کہ ابھی طاہرہ کو کچھ نہ کہنا۔ میں یوسف کے ساتھ بھی بات کر لیتا ہوں۔ یہ معاملہ اب مردوں کے ہاتھ میں رہنے دو۔ اگر میں نے گھر میں کسی عورت کی زبان سے ذرا سا بھی ناگوار کلمہ سُن لیا تو آفت لے آؤں گا۔ ارشد کا دکھ جس طرح تمہیں ہے اسی طرح مجھے ہے لیکن یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے دکھی دل و دماغ سے حل کیا جاتے۔ باقی رہے عفت کے دَورے تو آئندہ جب اسے دَورہ پڑے تو مجھے اطلاع کرنا میں دیکھ کر ڈاکٹر سے مشورہ کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی مرض میں مبتلا ہو گئی ہو۔ بعض عورتوں میں پیار و محبت کا جذبہ اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ وہ خاوند کو اپنی ملکیت سمجھ کر اسے بچوں کی طرح سینے سے لگائے رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ برداشت نہیں کر سکتیں کہ خاوند کسی سے یا کوئی دوسری عورت، خواہ وہ خاوند کی سگی بہن ہی کیوں نہ ہو، اس کے خاوند سے ہم کلام ہو۔ اس کے علاوہ پیٹ میں پلتا ہوا بچہ اسے اپنی جگہ پریشان کر رہا ہو گا۔ اس کا اثر بھی دماغ اور اعصاب پر پڑتا ہے۔ تم نے اس بات کو سطحی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن یہ مسئلہ خاصا ٹیڑھا ہے۔ اب خُدا کے لیے دل کو ابھل نہ ہونے دو اور میری کارروائی کو برباد نہ کر دینا۔ جاؤ ذرا یوسف کو میرے پاس بھیج دو۔"

بڑھیا نے اُکھڑی ہوئی آہ لی اور بادلِ نخواستہ اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ اس قدر بھڑکی ہوئی تھی کہ اس نے طاہرہ کے سات آٹھ ہزار روپے خیرات کر دینے کے ارادے کو نظر انداز ہی کر دیا۔ جلتی پر تیل تو اس چیز نے ڈالا کہ ارشد کے ابا جان

نے معاملے کی شدت کو ہی نہ سمجھا تھا۔

وہ بھابی کے کمرے میں داخل ہوئی تو یوسف کو بھابی کے سامنے گم سم بیٹھے پایا اور بھابی آگے جھکی ہوئی انہیں قصہ سنا رہی تھی۔ اس کمرے میں بھی وہی کچھ لگی ہوئی تھی جو ابا جان کے کمرے میں دکھائی جا چکی تھی۔

"یوسف! تجھے ابا جان بلاتے ہیں" ——— امی نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا ——— "اور سنو! اپنے ابا کو بھی ذرا سمجھ گھر میں کیا گل کھلاتے جا رہے ہیں۔ بڈھے کا مغز جواب دیتا جا رہا ہے۔"

یوسف خاموشی سے کمرے میں سے نکل گیا۔ بھابی نے اس کے احساسات کو جھنجھوڑنے کی پوری کوشش کی تھی طور پر تو نہیں، بہت حد تک کامیاب تھی۔

نصف گھنٹے بعد جب یوسف ابا جان کے کمرے میں سے نکلا تو اس کے چہرے پر بیوی کے پیدا کردہ تاثرات اور ذہنی کہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ کے بیٹھا اور بیوی کو بلا کر پہلے تو سکون کی گہری اور طویل سانس لی، پھر اسے خاموش رہنے کی اسی قسم کی ہدایت دی جو ابا جان نے اس کی ماں کو دی تھی۔ بھابی مان گئی۔ یوسف نے ابا جان کی یہ ہدایت بھی بیوی کو دی ——— "تھے کہ امی کا خیال رکھنا۔ اس کی زبان اس کے قابو میں نہیں رہتی۔"

ابا جان نے گھڑی دیکھی۔ انہوں نے پھر یوسف کو بلا کر کہا ——— "دفتر جانے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔ ارشد سے بات کر لو، امید ہے وہ تم سے کچھ چھپائے گا نہیں۔"

یوسف ارشد کے کمرے میں چلا گیا۔

طاہرہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی گزری ہوئی زندگی کے شب و روز میں الجھی ہوئی تھی۔ ذہن بھاگ کر ماضی میں پہنچ گیا۔ بہت دور پیچھے، بچپن سے جوانی تک کا ایک ایک لمحہ اس کے سامنے آ رہا تھا اور نہایت آہستگی سے گزرتا جا رہا تھا۔ اسے رہا تھا جیسے ماضی کی تمام رنگینیاں یہیں سڑک کے پچھلے موڑ پر کھڑی ہوں۔ امی خاتون کے سانسوں کی بو ابھی تک اس کے تھی اور آج اس اذیت ناک تنہائی میں اسے یہ بو روحانی لذت دے رہی تھی۔ تلخیوں سے بھاگا ہوا ذہن ایسی ہی خوشگوار یادوں ڈھونڈا کرتا ہے۔ طاہرہ کو مرحوم باپ یاد آیا تو اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو بے آسرا اور لاوارث محسوس کیا۔ ایسی بے نے ہندوستان سے ہجرت کے بھیانک سفر میں دریا کی لہروں میں بھی محسوس نہیں کی تھی مگر آج کے وقت نے اس پر ایسا اوچھا کہ اس کے گھٹنے ٹک گئے۔

وہ غیر ارادی طور پر اٹھی اور سوٹ کیس کھول کر امی ساجدہ کی تصویر نکال لی۔ اس کی دوسری طرف لکھی ہوئی تحریر پڑھ میں مرحوم باپ کے نقش و نگار آراستہ کرنے لگی۔ اس نے ایک خوبرو مرد کا تصور بنا لیا اور کچھ دیر اس تصور سے ہمکلام رہی۔ امی ساجدہ اور مرحوم باپ کو پہلو بہ پہلو کھڑے دیکھا، مسکراتے بھی دیکھا اور طاہرہ نے آنکھیں بند کر لیں، پھر اس نے ذہن کو بھی مضبوطی سے جکڑ لیا۔ مبادا یہ حسین تصور نکل بھاگے لیکن تصور دھواں بن کر ذہن میں ہی الٹے سیدھے خیالوں اور تصورات میں تحلیل ہو گیا۔

اس نے امی ساجدہ کی تصویر کو ایک بار پھر دیکھا اور سنگار میز کے سامنے جا کر اپنی صورت دیکھی۔ پھر تصویر دیکھی اور اپنے دل ہی دل میں کہا ——— "یہ تو میری ہی تصویر ہے۔ وہی ناک نقشہ، بالوں کی بناوٹ وہی، مسکراہٹ وہی، ایک ایک نقش کس قدر ملتا ہے.... میری اچھی امی!" اس نے تصویر کو چوم کر دل کے ساتھ لگا لیا۔ پھر آئینے میں دیکھا۔ اس کے عکس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے ——— "مجھے اپنے پاس بلا لے امی!" ——— یہ ایک فریاد تھی جو آہ کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے پھسل گئی۔

آنسوؤں کے دھندلکے میں اسے نجمہ کا نکھرا ہوا چہرہ اور اس کی مسکراہٹ دکھائی دی جس طرح اندھیرے کھنڈرات کے ٹوٹے ہوئے روزن میں سے طلوع ہوتے سورج کی کرن آ رہی ہو ——— "نجمہ آپا! میں تیرے پاس آ رہی ہوں" ——— وہ چونک اٹھی۔ کمرے میں اسے آواز سنائی دی لیکن دوسرے ہی ثانیے اس نے اپنی آواز کی گونج پہچان لی، اور اس کے تصورات بکھر گئے۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے کمرے میں ہر سو دیکھا لیکن اس کمرے میں اب اسے چین اور سکون نظر نہیں آ رہا تھا۔

برآمدے میں اسے مردانہ قدموں کی آواز سنائی دی اور اس کے دروازے کے سامنے ارشد کے بڑے بھائی کی آواز آئی ——— "سب جہالت اور لیچڑپن کا مظاہرہ ہے۔ کسی فکر یا کسی قسم کی جلد بازی کی ضرورت نہیں۔"

طاہرہ سہم گئی۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلا، بند ہوا اور اس کے سامنے ارشد کھڑا تھا۔ وہ دو تین سیکنڈ دیکھتا رہا طاہرہ کو دیکھتا رہا۔ ایک نظر میں ہی اس نے پہچان لیا کہ طاہرہ روتی رہی ہے۔

طاہرہ اسے دیکھتی رہی۔ اس نے ارشد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تو فوراً جان گئی کہ یہ مسکراہٹ مستعار لی ہوئی ہے، ارشد کی روح کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ طاہرہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ چیخ مار کر رو پڑے گی اور ارشد کے ساتھ لپٹ جائے گی۔ اس نے شل دماغ اور نڈھال جسم کی تھکی ماندی قوت کو بروئے کار لا کر اپنے اوپر قابو پائے رکھا۔ ارشد کی مسکراہٹ اور نمایاں ہو گئی۔

"تیری پلکوں میں چمکتے ہوئے آنسو اے دوست!" ——— ارشد نے مسکراہٹ میں زندگی کی رمق ڈالتے ہوئے شاعرانہ لہجے میں کہا ——— "کسی آزردہ محبت کے سہارے تو نہیں؟"

ارشد کو یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ جو فتور عفت کی وجہ سے گھر میں پیدا ہو گیا ہے اس کا اثر ابا جان اور بھائی یوسف نے قبول نہیں کیا۔ اس پر وہ خوش تھا۔

"اداس ہو، طاہرہ؟" ——— ارشد نے اس کے قریب جا کر آہستہ سے پوچھا ——— "کوئی خاص بات؟"

طاہرہ کے آنسو بے قابو ہو کر نکل آئے اور اس نے دبی سی چیخ کے لہجے میں کہا ——— "چلے جاؤ، ارشد! یہاں سے خدا کے لیے چلے جاؤ۔"

لیکن ارشد نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنے قریب کر لیا۔

"تم پہلے سے ہی اداس ہو" ——— ارشد نے کہا ——— "اور میں تمہیں ایسی بات سنانے آیا ہوں جو تمہیں اور اداس کر دے گی لیکن اس میں امید کی گنجائش بھی ہے۔"

امید کا نام ہی سن کر طاہرہ کا سراجی تناؤ کم ہونے لگا۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ارشد کو دیکھا۔ ارشد نے اسے کندھوں سے پکڑ کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ سانسوں کے تسلسل کو ایک لمبی سانس لے کر سنبھالتے ہوئے ارشد نے بات شروع

کی تو طاہرہ نے کہا۔ "سمجھ۔ مجھے سب کچھ سنا گئی ہے۔ تم مجھے صرف وہ باتیں سناؤ جو تم کہتے ہو کہ امی جان نے، ابا جان نے
کی ہیں اور بھابی نے بھائی جان کو سنائی ہیں۔ عفت نے جو کچھ کہا ہے وہ تو میں سن چکی ہوں۔"

ارشد نے وہ ساری باتیں اسے سنائیں۔ پھر ابا جان اور بھائی کا ٹھنڈا اور امید افزا ردعمل بھی سنایا جسے سن کر
کی ڈھارس بندھی۔

"یہ ہے تمہاری عفت!" — ارشد نے ایسے لہجے میں کہا جس میں غصہ کم اور احتجاج زیادہ تھا۔ "جس کے متعلق
خوش فہمی تھی کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان بنتی جائے گی۔ اس اکیلی نے گھر بھر میں وہ تکدر پھیلا دیا ہے جسے دور کرنے
کتنا عرصہ لگے گا۔ اس میں صلاحیت ہے ہی نہیں۔ مجھے یہ تو گمان بھی نہ تھا کہ اس کا رجحان اس قدر خطرناک اور ذلت آمیز

"یہ تو عفت کا معاملہ ہے جو حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے" — طاہرہ نے شکست خوردگی کے لہجے میں کہا۔ "مجھے
کیا کروں۔ امی جان اور بھابی نے میرے ساتھ ایسی بے رخی شروع کر دی ہے کہ صبح انہوں نے میرے سلام کا جواب
دیا۔ کیا میں اس حال میں زندہ رہ سکوں گی؟"

"ضرور رہ سکو گی!" — ارشد نے اس کو اخلاقی سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "عورتوں کو ہم سنبھال لیں گے۔ میں نے
کو اس بہتان تراشی کا سارا پس منظر بتا دیا ہے جسے وہ سمجھ گئے ہیں۔ آج شام میں ابا جان کو بھی تفصیلات سے
گا اور بھابی کو بھی۔"

"عفت کے متعلق تم نے ساری باتیں تو نہیں بتا دیں؟" — طاہرہ نے پوچھا۔ "کہیں یہ تو نہیں بتا دیا کہ وہ
اور کیا کہتی تھی؟"

"طاہرہ!" — ارشد نے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے قائل کیا تھا کہ مجھے
سے سارا پردہ نہیں اٹھانا چاہیے ورنہ میں اس کی اصلیت بتانے ہی لگا تھا اور میں نے تمہاری اور اپنی محبت کو بھی
رکھا ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا" — طاہرہ اطمینان کا سانس لے کر بولی۔ "ہماری محبت چھپے نہ چھپے۔ یہ خیال بہرصورت
کہ عفت کو ہم چھپائے رکھیں۔ ہمیں اپنا اصول اور ایمان برقرار رکھنا چاہیے۔ وہ عفت کی سطح ہے اور یہ ہماری سطح ہے
اب بھی چاہتی ہوں کہ عفت کی برتری میں فرق نہ آنے دوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا ذہن کمتری کی دلدل میں پھنسا

ارشد کی باتوں سے طاہرہ کے دل کو سہارا ملا اور اس نے جلتے ہوئے سینے میں سکون اور اطمینان کی ٹھنڈک
کی۔ اس نے راولپنڈی جانے کے خیال کو گول کر دیا۔

"امی اور بھابی تمہارے ساتھ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گی۔۔۔" ارشد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر
یا تفصیل تم سے پوچھ بھی بیٹھیں، تو انہیں سب کچھ بتا دینا۔ میں نے بھائی جان کو بتایا ہے۔ انہیں یہ بھی بتانا کہ ہماری جو باتیں
باہر کھڑے ہو کر سنی گئی ہیں وہ کس سلسلے میں ہو رہی تھیں۔ میری اور اپنی وابستگی کا ذکر بے شک کر دینا، محبت کا نام نہ لینا اور
کہ تم مجھے عفت کے قریب لانا چاہتی تھیں اور میں اس سے دور ہٹتا جا رہا تھا۔ میں نے بھائی جان سے کہہ دیا ہے کہ میں

کے ساتھ نباہ نہیں کر سکوں گا" — ارشد کمرے سے نکلتے نکلتے رک گیا اور بولا۔ "آج وہ چھ مہاجر دفتر میں آ رہے ہیں۔ امید ہے
آج ہی ان کے لیے مکانوں کا انتظام ہو جائے گا اور میں آج ہی بینک سے سارا روپیہ نکلوا رہا ہوں۔ تم ذرا چیک پر دستخط کر دینا"
— اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

ارشد کے ابا جان اور بھائی جان باغیچے میں ٹہل رہے تھے۔ ارشد ان کے قریب پہنچا تو اس کا بھائی بات ختم
کرنے والا تھا۔

"کیوں ارشد میاں!" — ابا جان نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ یوسف کی سنائی ہوئی باتوں پر یقین رکھتے ہوں۔ "یہ کیا
ماشہ بن رہا ہے گھر میں؟ تمہاری بیگم صاحبہ کسی وہم یا ذہنی مرض میں مبتلا معلوم ہوتی ہیں اور مجھے یہ بھی شک ہے کہ تم اس مرض
میں اضافہ کر رہے ہو۔ یوسف نے مجھے ساری واردات سنا تو دی ہے لیکن میں تمہاری زبانی بھی سننا چاہتا ہوں۔"

"بہت اچھا، ابا جان!" — ارشد نے فدویانہ لہجے میں کہا۔ "میں خود بھی چاہتا ہوں کہ آپ کو صورت حال سے آگاہ کر دوں
امی جان اور بھابی نے بلا سوچے سمجھے عجیب تکلیف دہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔"

"ان کی پروا نہ کرو" — ابا جان نے کہا۔ "وہ آخر عورتیں ہیں اور ان کی نظر محدود ہے۔ میں نے انہیں سخت تنبیہہ
کر دی ہے۔"

"میں نے تمہاری بھابی کو بہت کھینچا ہے ارشد!" — بھائی نے کہا ہی تھا کہ انہیں دفتر لے جانے کے لیے تانگہ آ گیا۔

دن اپنی رفتار سے گزرتا جا رہا تھا۔ طاہرہ کے لیے یہ رفتار بہت سست تھی۔ ارشد نے اسے اطمینان تو بہت دے
دیا تھا مگر جو زہر آلود تیر کمان سے نکل چکے تھے، وہ اس کے سینے میں پیوست ہو کر سارے جسم میں زہر پھیلا رہے تھے۔ طاہرہ اس
زہر کی تلخی کو تو برداشت کر لیتی لیکن یہ تیر اب کمان میں واپس نہیں جا سکتے تھے۔ امی اور بھابی کو ہدایات تو ہزار دی گئی تھیں لیکن
جو شک ان کے دلوں میں بیٹھ چکا تھا وہ کیونکر نکلتا؟ طاہرہ کو یہ حقائق پریشان کر رہے تھے۔ البتہ اس کی پریشانی میں اب
تلخی ذرا کم تھی۔

امی اور بھابی نے عفت کو بے بہا تسلیاں دے کر کہہ دیا تھا کہ وہ طاہرہ کو اس گھر سے نکلوا کر ہی دم لیں گی۔ یہ دونوں
عورتیں بہت دیر تک عفت کے پاس بیٹھی رہی تھیں اور عفت نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے دونوں کا شکریہ ادا کیا تھا۔

مرد دفتر چلے گئے۔ عورتیں ادھر ادھر مصروف ہو گئیں۔ طاہرہ نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔ عفت ٹہلنے کی
خاطر برآمدے میں نکلی۔ اس نے دیکھا کہ طاہرہ کے کمرے کا دروازہ بند اور کھڑکیاں بھی بند ہیں۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے سارے گھر میں گھومی
لیکن اسے طاہرہ کہیں نظر نہ آئی۔ وہ طاہرہ کے پاس بیٹھنے کے لیے یا گپ شپ کے لیے اسے تلاش نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ
طاہرہ کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ ہر طرف گھوم پھر کر وہ گول کمرے میں جا پہنچی جہاں امی اور بھابی بیٹھی سویٹر بن رہی تھیں۔ عفت کی
طبیعت ہلکی پھلکی تھی وہ ان کے پاس جا بیٹھی اور ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا جس میں ہمراز ہونے کا عنصر غالب تھا۔

امی اور بھابی جو مردوں کے ساتھ بات کرنے تک بھڑکی ہوئی تھیں اور مارے غصے کے ان کی زبانیں کانپ رہی

تھیں۔ اب مردوں کے ساتھ بات چیت کر کے اور ان کی ہدایات اور نصیحت اور تنبیہہ سُن کر ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ اُنہوں نے یک طرفہ کہانی سُنی تھی اور اسی بنا پر یہ طوفان اُٹھا تھا۔ جب دوسری طرف سے مردوں نے باتیں کیں تو وہ بجھ کے رہ گئیں۔ دونوں عورتوں کو گوارا نہ تھا کہ وہ عفت کی کہانی کو سچا مان لیں۔ اس گھر میں وہ گناہ آلود حرکات کا نام بھی سننا نہ چاہتی تھیں لیکن انہوں نے ان سے منوا لیا تھا اور وہ عفت کے دوش بدوش طاہرہ کے خلاف محاذ قائم کر چکی تھیں، اس لیے انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ لیا جائیں۔ ایک خفت بھی کہ ٹلتی نظر نہ آتی تھی۔ اب انہیں دونوں لڑکیوں پر غصہ آ رہا تھا۔ طاہرہ پر بھی عفت پر بھی۔ طاہرہ پر اس لیے اس پر عائد کردہ الزام سچے ہوتے تو۔" اور عفت پر اس لیے کہ "اگر یہ سچے نہ ہوتے تو۔" مردوں نے ان کے سامنے دونوں رکھ دیتے تھے۔ تحکمانہ انداز میں بھی اور ناصحانہ انداز میں بھی۔

اب عورتیں خاموشی سے مردوں کے آخری فیصلے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے رویّے میں ایک تبدیلی یہ بھی آ گئی تھی کہ انہوں نے عفت کو بھی مجرم قرار دے دیا اور طاہرہ کو بخشنا التوا میں ڈال دیا تھا لیکن ان کے دلوں پر پسپائی کا جو احساس بیٹھ گیا تھا وہ انہیں کر رہا تھا۔ عجیب شرمندگی کا عالم تھا۔

عفت کو معلوم نہ تھا کہ ناشتے کے بعد گھر میں کیا تبدیلی آ گئی ہے۔ اسے گمان تک نہ تھا کہ اس کے محاذ میں شگاف پڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ جارحانہ حملے کے بعد اب دفاع کی بھی ضرورت پڑے گی۔ اُس نے امی اور بھابی کے ساتھ بے تکلفی کا جو کیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے کی بجائے ہلکی سی بے رخی کا اظہار کیا۔ عفت نہ سمجھ سکی۔ اسے یقین تھا کہ طاہرہ اب اس گھر کی رگ بن گئی ہے۔ اس نے اس رگ کو چھیڑنے کے لیے پوچھا ۔۔۔ "آج وہ کہاں ہے؟"

"کون؟" ۔۔۔ بھابی نے ماتھے پر شکن ڈال کر لاپرواہی سے پوچھا۔

"طاہرہ!"

دونوں عورتیں خاموش رہیں۔ عفت کو شک سا ہونے لگا۔ شک تو اس کی فطرت کا لازمی جزو تھا۔ اس نے کوئی جواب خود ہی اپنے آپ کو جواب دیا ۔۔۔ "شاید اپنے کمرے میں ہو گی" ۔۔۔ دونوں عورتیں اپنے اپنے کام میں لگی رہیں۔ عفت کو خفت ہونے لگی۔ اس نے آگ کو بھڑکانے کے لیے کہا ۔۔۔ "اسے ہماری پرواہ تھوڑے ہی ہے کہ ہم میں آ بیٹھے۔ وہ آئیں گے تو سے نکل کر باغ میں کھڑی ہو جائے گی۔"

جس آگ کو اس نے پھونک ماری تھی وہ بھڑک تو اٹھی لیکن اس کے شعلے اسی کی طرف لپکنے لگے لیکن خاموشی سے اور پاؤں۔ عفت کو کسی نے کچھ نہ کہا نہ کسی بات کا جواب دیا۔ وہ کوئی نہ کوئی بات، ادھوری سی، ٹوٹی پھوٹی، بلا موضوع و مطلب کرتی رہی جس کا جواب اسے سوائے دبی ہوئی "ہوں۔ ہاں" کے کچھ نہ ملا۔ دونوں عورتیں گفتگو میں اس کا ساتھ دے ہی نہیں رہی تھیں۔ اس نے خود ہی بات کی اور جیسے خود ہی سن لی ہو۔

اس سے رہا نہ گیا اور پوچھ ہی لیا ۔۔۔ "آپ چُپ چُپ کیوں ہیں؟"

"چپ کہاں ہیں!" ۔۔۔ بھابی نے سویٹر سے نظریں اٹھائے بغیر کہا ۔۔۔ "تمہاری باتیں جو سن رہی ہیں۔"

بھابی کے لہجے میں بیگانگی کا رنگ نکھرا ہوا تھا۔ عفت تڑپ اٹھی۔ وہ ذرا سی دیر خاموش بیٹھی رہی اور اسی طرح خاموشی

ذا کمرے سے نکل گئی۔ جب وہ نکل گئی تو دونوں عورتوں نے دروازے کی طرف دیکھا اور امی نے غصے سے دبی ہوئی زبان میں ا ۔۔۔ "خدا جانے یہ چڑیلیں ہماری انتظار میں کہاں بیٹھی تھیں" ۔۔۔ اور بھابی نے اضافہ کیا ۔۔۔ "اچھے بھلے گھر میں رونا ڈال دیا۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ جلال آباد میں بھی یہ اسی قسم کے لچھن کرتی رہی ہیں۔"

"تو اور کیا! ان کی شکلیں بتا رہی ہیں۔"

"سمجھ نہیں آتی زینت! یہ طاہرہ اس قدر روپیہ مہاجروں پر کس طرح خرچ کر رہی ہے۔"

"معلوم نہیں، امی!" ۔۔۔ بھابی نے بیٹھے بیٹھے کروٹ بدلتے ہوئے کہا ۔۔۔ "مجھے تو اس لڑکی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایک طرف فرشتہ سیرت معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف، خدا خبر یہ باتیں سچ ہیں کہ نہیں، یہ بالکل ہی آوارہ نظر آتی ہے۔"

"اگر مرد بھی بیوقوف نہ بن گئے تو صحیح بات کا سراغ نکل آئے گا" ۔۔۔ امی نے کہا ۔۔۔ "یہ ضرور ہے کہ عفت میں اچھے خاندانوں بات میں نے تو آج تک دیکھی نہیں۔ عقل کی کوری معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری سلجھی ہوئی اور کھاتے پیتے رانے کی معلوم ہوتی ہے۔"

"یہ بات تو ہے" ۔۔۔ بھابی نے یوں کہا جیسے اقبال جرم کیا ہو۔

عفت اپنے کمرے میں گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ جس کمرے میں چند منٹ پہلے امیدیں اور سکون بھرا ہوا تھا، اسے ایک بھر ہوحق سا ویران پایا۔ وہ امی اور بھابی کے پاس گئی تھی کہ ان دونوں نے اسے پناہ میں لے لیا تھا مگر ان کے آج کے برتاؤ نے سے صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ یہ چھاؤں محض فریب ہے اور اس کے نیچے دھوپ سے زیادہ تپش ہے۔ عفت کا فریب خوردہ دار پہلے سے بھٹکا ہوا اور سہاروں کی تلاش میں تھا۔ جانے کتنے ہی خیال اس کے ذہن میں گھس آتے اور وہ اس آندھی کے سامنے بے حال ہو گئی۔ اسے زندگی کے شب و روز عجیب بھونڈے طریقے سے آپس میں اُلجھے ہوئے دکھائی دیتے۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ایک زنا ٹے میں ماضی کی آغوش میں جا گری۔ اس کے سامنے اس کا بچپن آیا۔ ایک کٹیا دکھائی دی۔ اس ٹیا میں بیٹھی ہوئی، محنت اور مشقت کی ماری ہوئی، ایک ماں۔ عفت نے اس ماں کے ساتھ اپنے آپ کو دیکھا ۔۔۔ ناکافی خوراک نزوریں، بے آرامی اور بے اطمینانیوں سے کچلی ہوئی ایک معصوم لڑکی، آنکھیں دھوئیں سے بھری ہوئیں، گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی، عیدوں پر نئے جوڑے کے لیے ابا جان کا انتظار، ماں کے فریب کہ "ابا جان ل آئیں گے" ۔۔۔ محرومی ہر طرف محرومی۔ مسرت و اطمینان کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا اور اس خشک اور بے آب و گیاہ زندگی یں یہ لڑکی جیتی رہی، جوان ہوتی رہی۔ ایک سپاٹ زندگی۔

عفت کو سب کچھ یاد آیا لیکن اس نے ماضی کی تلخیوں میں بھی سکون ڈھونڈ لیا ۔۔۔ اپنی ماں کے رُوپ میں ۔۔۔ "کچھ بھی تھا۔" اس نے سوچا ۔۔۔ "ماں کا پیار تو تھا۔ ایک مونس و غمخوار تو تھی۔ دکھ سکھ کی ساتھی۔ ہر درد کی دوا ٹھنڈی چھاؤں۔" عفت آج کی اذیت میں ماں کی یاد کے سہارے تصوروں میں دور پیچھے گزرے ہوئے ایام میں کھو گئی۔

عفت کا ذہن حقائق سے بھاگا تو ایسے تصوروں میں جا اُلجھا جو ان حقائق سے زیادہ اذیت ناک تھے۔ دل و دماغ ایک اندھیرے سے نکل کر دوسرے اندھیرے میں جا بھٹکے۔ اُجالے کی ہلکی سی کرن صرف ماں تھی لیکن اس کی یاد کے ساتھ تلخیاں

دالبتہ تھیں۔ تھک ہار کر اسے طاہرہ یاد آئی۔

طاہرہ جو یاد آئی تو اسے یوں لگا جیسے ایک قندیل اس کی طرف بڑھتی آرہی ہو۔ یہ تھا وہ موڑ جس پر اس کی زندگی از
قندیل کی ضو میں ایسے راستے پر چل پڑی تھی جو سر سبز و شاداب وادی میں جا ختم ہوتا ہے۔ ماضی کا یہی عرصہ تھا جسے یاد کر
کے اس کی تھکی ہاری شکست خوردہ شخصیت گھڑی دو گھڑی تصوروں سے دل بہلا سکتی تھی۔ عفت کو طاہرہ کے گھر میں
ماں کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا۔ اسے امی خاتون یاد آئی۔ طاہرہ کا دیا ہوا کپڑوں کا پہلا جوڑا یاد آیا اور کیا کچھ
نہ آیا۔ وہ بچپن کی شوخیاں، وہ بچپن جو چودہ برس کی عمر میں طاہرہ کے گھر سے شروع ہوا تھا۔

عفت کے تنے ہوئے اعصاب نے ان حسین یادوں سے لطیف سا قرار پایا اور وہ اپنے آپ سے بے
ان یادوں میں یوں کھو گئی جیسے سفید سفید بادلوں کی گود میں فضا کی وسعتوں میں اڑ رہی ہو۔ پھر اسے وہ لمحہ یاد آیا جب ارشد پہلی بار ایک
اجنبی کی طرح اس کے سامنے آیا تھا۔

"اوہ، ارشد!" — جوں ہی عفت کو ارشد کی وہ پہلی جھلک یاد آئی تو وہ یوں چونک اٹھی جیسے سوتے میں کسی نے سوئی چبھو دی
یا جیسے وہ سہانا خواب دیکھتے دیکھتے کسی دھماکے سے جاگ اٹھی ہو۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں جیسے تصوروں کو پلکوں میں گرفتار کرلیا
ہو لیکن بیداری کے خواب ہوا میں تحلیل ہو چکے تھے۔ اس نے ذہن کا گوشہ گوشہ چھان مارا مگر ذہن آسیب زدہ مکان کی طرح خالی پڑا

"ارشد اس روز بھی اجنبی تھا" — اس نے اپنے آپ سے کہا — "وہ آج بھی اجنبی ہے۔"

اس روز اور آج کے روز کے درمیان جو اپنی لغزشیں حائل ہو گئی تھیں وہ اسے نظر نہ آئیں۔ کل اور آج کے درمیان اسے
طاہرہ کھڑی نظر آئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے طاہرہ نے تلوار کی طرح اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیتے ہوں۔

اس کا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا۔ اعصاب تو پہلے ہی ریزہ ریزہ تھے۔ اس نے نڈھال ہو کر سر کرسی کی پیٹھ پر پھینک
اس نے سوچنے سے گریز کرنا چاہا مگر ذہن ایک بار پھر جلال آباد جا پہنچا اور اسے ایک بار پھر جلال آباد والی طاہرہ یاد آئی۔ اعصاب
کا یہ عالم کہ اس کی روح بھی رہ رہ کر اپنے آپ کو فریب دینے پر تلی ہوئی تھی۔ اسے پھر خیال آیا کہ چودہ برس کی عمر میں جب لڑکیاں
جوان ہوتی ہیں۔ وہ بوڑھی ہو چلی تھی۔ جوان ہونے کی امنگ تو اس میں تھی ہی نہیں۔ وہ تو بچپنے سے ایک ہی چھلانگ میں عورت بن گئی
تھی۔ نہ امنگ نہ ارمان۔ تمنا نہ خواہش۔ طاہرہ نے ایک معجزہ کر دکھایا کہ اسے..."طاہرہ کتنی اچھی ہے" — جانے کس نے اس
کے کان میں کہا — "واحد سہارا تھکی ہوئی روح کا سکون" — اسے یاد آیا کہ وہ کس طرح طاہرہ کے ہاں آکر کٹیا کی اذیتیں اور محرومیاں
بھول گئی تھی۔

اس مقام پر آکر اس کا ذہن رک گیا اور خیالوں کا چکر اس طرح طاہرہ کے گرد گھومنے لگا جس طرح کیچڑ میں پھنسی ہوئی لاری
کے پچھلے پہیے ایک ہی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔ طاہرہ کے ساتھ اسے ارشد کا خیال بھی آگیا اور اس نے دیکھا کہ ارشد اور طاہرہ
اکٹھے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

"یہ سہارا بھی فریب ثابت ہوا" — عفت نے اپنے آپ کو پھر بے سہارا پایا۔ نجمہ کا خیال آیا تو وہ بھی ڈھلتے سائے کی
طرح گم ہو گئی۔ نجمہ نے تو جاتے جاتے یہ بھی کہہ دیا تھا — "طاہرہ اب اس گھر میں نہیں رہے گی" — جسم لرز اٹھا۔ ہونٹ تھرتھرا

لگے۔ سر چکرانے لگا۔

"تو نے بہت برا کیا کہ طاہرہ کو بلا سوچے سمجھے رسوا کر کے رکھ دیا ہے" — کسی نے اس کی دنیا میں سے ہی اٹھ کر کہا —
وہی تیرا سہارا تھی اور وہی اس اندھیرے میں روشنی کی کرن تھی۔"

طاہرہ کا نام اس کے تصوروں پر ایسا غالب آیا کہ اس نے اپنے اوپر کسی جادو کا اثر محسوس کیا۔ طبیعت بوجھل ہونے لگی۔
غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی اور دل ایک ان جانے خوف کی گرفت میں ایسا آیا کہ اسے سنگار میز کے آئینے میں اپنے عکس سے
بھی ڈر آنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حالت اس بچے کی سی ہو گئی جو اندھیرے میں اکیلا رہ جاتے اور ڈراؤنی خیالی صورتیں
اسے نگلنے کو آگے بڑھ رہی ہوں۔

طاہرہ اپنے کمرے میں بیٹھی بیٹھی اکتا گئی تو اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ وہ عفت کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے
گزر رہی تھی کہ اسے اندر سے ہلکی سی چیخ کی آواز سنائی دی۔ اس نے عفت کی اس دبی گھٹی چیخ کو پہچان لیا اور دروازہ کھول کر کمرے میں
چلی گئی۔ دیکھا کہ عفت اوندھے منہ پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کی پیٹھ یوں دھچکے کھا رہی تھی جیسے وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی ہو۔ طاہرہ نے
ہاتھ پیچھے کر کے دروازہ بند کیا تو کواڑ کے دھماکے سے عفت چونک اٹھی۔ لیٹے لیٹے اس نے سر اٹھایا اور گھوم کر دروازے کی
طرف دیکھا۔

طاہرہ کو دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں جو ایک لمحہ پہلے آنسو بہا رہی تھیں خشک ہو گئیں۔ آنکھیں حیرت اور خوف
سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہونٹ کچھ کہنے کو کانپنے لگے۔ طاہرہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ عفت نے بازو لمبا کر کے طاہرہ کی طرف انگلی کا
اشارہ کیا لیکن کانپتے ہوئے ہونٹ کچھ کہہ نہ سکے۔ طاہرہ کو نجمہ بتا چکی تھی کہ عفت کو دورہ سا پڑتا ہے۔ اس نے اسے جہانگیر کے
مقبرے کا حال سنایا تھا۔ طاہرہ کو ایسی صورت حال سے کبھی پالا نہ پڑا تھا وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے کہ

"تم!" عفت نے بازو لمبا کر کے طاہرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کانپتے الفاظ میں کہا — "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"عفت!" — طاہرہ نہایت آہستگی سے بولی — "عفت! میں تمہاری آواز سن کر اندر آئی ہوں... تکلیف ہے کچھ؟"

عفت کا بازو جو ابھی تک طاہرہ کی طرف بڑھا ہوا تھا کٹی ہوئی ٹہنی کی طرح اس کے پہلو میں گر پڑا اور اس کے نیم وا ہونٹ
بند ہو گئے۔ طاہرہ بولی — "کہو تو پاس بیٹھ کر سر دباؤں؟... عفت!"

عفت اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ہونٹوں پر پھر کوئی بات آئی جو سینے میں ٹوٹ گئی۔ اس کے چہرے کی حالت
دیکھتے ہوئے طاہرہ نے اس کی اندرونی حالت کا اندازہ کرلیا۔ اس کی ظاہری حالت بلاشک و شبہ غیر معمولی تھی۔

"عفت! اتنی دشمنی اچھی نہیں ہوتی" — طاہرہ نے کہا — "میں نے کہا تھا اپنی بہن کا سر دبا دوں؟... بولو نا عفت!"

پیشتر اس کے کہ طاہرہ اپنے آپ کو سنبھال سکتی یا کم از کم یہی سمجھ سکتی کہ عفت اس پر حملہ آور ہو رہی ہے یا شکست کھا کر
اس کے سامنے گر رہی ہے۔ عفت ایک ہی جست میں طاہرہ کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور طاہرہ کو اپنے بازوؤں میں دبوچ کر اس
کی پیشانی، رخساروں اور اس کے کندھوں کے اس طرح بوسے لے رہی تھی جیسے جانے کتنے عرصے بعد دو بہنیں مل رہی ہوں۔

طاہرہ نے اپنے آپ کو جلدی سنبھال لیا اور اپنے بازو عفت کی گرفت سے آزاد کرا کے اس کے چہرے کو تھام کر آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ رقت کا یہ عالم کہ طاہرہ کی تو جیسے طاقت گویائی ہی سلب ہو گئی تھی۔ آنسوؤں نے آگے آکر عفت کا چہرہ دھندلا دیا تھا۔ طاہرہ نے آنکھیں بند کر کے کھولیں تو آنسو بہہ گئے اور اسے عفت کا لال انگارہ سا چہرہ صاف دکھائی دینے لگا۔ ایک دوسرے کے کس قدر قریب تھیں لیکن ایک مرد نے درمیان میں آکر دونوں کو کہاں سے کہاں پھینک دیا تھا۔ طاہرہ الگ اور عفت الگ ہو گئی تھی اور اعصاب زدگی اور نفسیاتی خلفشار نے عفت کے بھی دو حصے کر دیتے تھے اس کی شخصیت دو حصوں میں کٹ چکی تھی۔ اس وقت اس کی وہ شخصیت غالب تھی جو طاہرہ کو یار، بہن، محبوبہ اوڑھنا اور بچھونا سمجھتی تھی

"میری اچھی طاہرہ" ــــ عفت نے روندھی ہوئی آواز میں کہا ــــ "کہاں تھیں تم؟ بھول گئی تھیں اپنی بہن کو؟"

رقت نے طاہرہ کو بولنے نہ دیا۔

"چلی تو نہ جاؤ گی طاہری؟" ــــ عفت کی لرزتی ہوئی آواز نے پوچھا۔

طاہرہ نے نفی میں سر ہلایا اور جانے کہاں سے مسکراہٹ کی ایک کرن اس کے ہونٹوں پر آگئی۔

"مجھے معاف کر دو گی، طاہری؟"

طاہرہ نے سر ہلایا اور مسکراہٹ چمک اٹھی۔

"ناراض تو نہیں ہو، طاہری؟"

طاہرہ نے عفت کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر زور سے بھینچا اور رخسار اس کے رخسار کے ساتھ لگا کر آہستہ آہستہ رگڑنے لگی۔ اس کے کانوں میں سرگوشی سرسرانے لگی "میری پیاری بہن! مجھے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے نہ چھوڑ جانا۔"

طاہرہ نے اسے پلنگ پر لٹا دیا اور اس کا ہاتھ سہلانے بیٹھ گئی۔ عفت نے آنکھیں بند کر دیں اور دو چار منٹ بعد اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ طاہرہ نے اس کے اوپر ذرا سا جھک کر اسے آواز دی ــــ "عفت!" ــــ طاہرہ نے زیر لب کہا "عفت! سو گئی؟"

عفت سو گئی تھی۔ طاہرہ کمرے سے نکلی اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

سائے لمبے ہو گئے تھے۔ ابا جان حسب معمول دفتر سے لوٹے لیکن ارشد اور اس کا بھائی ساتھ نہیں تھے۔ طاہرہ برآمد

میں کھڑی تھی۔ ابا جان نے دور ہی سے کہا ــــ "لو، طاہرہ بیٹی! خدا نے تمہاری نیکی قبول کر لی ہے۔ آج ہی ان لوگوں کو مکان الاٹ ہو گئے ہیں۔ ارشد اور یوسف انہیں مکان دکھانے اور قبضہ دلانے کے لیے ساتھ لے گئے ہیں" ــــ اور ابا جان طاہرہ کا جواب سنے بغیر اندر چلے گئے۔ طاہرہ نے سکون آمیز آہ لی۔

ارشد اور اس کا بھائی رات ساڑھے آٹھ بجے واپس آتے۔ گھر کے افراد کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ آتے ہی اعلان کیا ــــ "اب انہیں ٹھکانے لگا کے آتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد دونوں بھائی منہ ہاتھ دھو اور کپڑے بدل کر کھانے کے لیے سب کے ساتھ شامل ہو گئے۔ کھانے پر عورتیں ناشتے کے وقت کی طرح خاموش تھیں۔ مردوں نے اس خاموشی کو محسوس کیا لیکن ان کے پاس ان چھ پناہ گزینوں کی آبادکاری کا موضوع تھا۔ وہ اسی پر باتیں کر رہے تھے۔ ابا جان دوراندیش اور تجربہ کار بزرگ تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر چند باتیں ارشد کی ماں سے مخاطب ہو کر کیں اور اس طرح اسے باتوں میں لگا لیا۔ اسی طرح بھابی کو بھی گفتگو میں گھسیٹ لیا گیا۔ ارشد کے بھائی نے عفت کو بھی ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار دبی ہوئی "جی" کے سوا کچھ نہ بولی۔ طاہرہ نے اس موضوع میں خوب دلچسپی لی۔ وہ گھر میں پھیلی ہوئی بے مزگی کو جیسے بھول ہی گئی تھی۔ ارشد کا بھی یہی حال تھا۔ اس حال میں عفت کا احساس کمتری اور زیادہ گہرا ہو گیا۔

کھانے کے بعد ارشد اور ابا جان علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ بھابی اور اس کا خاوند اپنے کمرے میں۔ ایک بچہ عفت کے ساتھ اس کے کمرے میں جا گھسا۔ باقی دو طاہرہ کو کہانی کا وعدہ یاد دلا کر اسے اس کے کمرے میں گھسیٹ کر لے گئے۔ ارشد کی ماں نوکر کے ساتھ باورچی خانے میں جا پہنچی۔

"مجھے بھی کچھ سناؤ، ارشد میاں! گھر میں عورتوں نے یہ کیا اودھم مچا رکھا ہے" ــــ ابا جان نے ارشد کو اپنے کمرے میں لے جا کر پوچھا۔

ارشد اسی سوال کا منتظر اور جواب کے لیے تیار تھا۔ اس نے ابا جان کے ساتھ کبھی بے تکلفی سے بات نہیں کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے درمیان ایسا موضوع آگیا جس پر کھل کر بات چیت صرف ہمجولیوں سے ہی ہو سکتی ہے لیکن موضوع میں جو خطرات پنہاں تھے ان کا تقاضا تھا کہ بلا جھجک بات کی جائے۔ ارشد کے کردار میں اخلاقی جرأت تو تھی ہی۔ اس نے بلا تکلف واردات کا ایک ایک شوشہ سنانا شروع کر دیا۔ البتہ وہ عفت کی اصلی حیثیت اور طاہرہ اور اپنی محبت کو چھپا گیا۔ اس نے یہاں تک بتا دیا کہ عفت عورت اور محض عورت ہے۔ ظاہر پرست عورت۔ اس کی فطرت میں انسانیت کی بلندی نہیں ہے۔ وہ الگ تھلگ بیٹھ کر کڑھنے کی عادی ہے۔ اس کے برعکس طاہرہ کی فطرت پاک ہے اور اس کی روحانی دنیا اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہر انسان اور ہر انسان کا دکھ اور درد سما جاتا ہے۔ ارشد نے اعتراف کیا کہ وہ عفت کو چھوڑ کر کئی بار طاہرہ کے کمرے میں گیا ہے اور اس وقت بھی گیا ہے جب کہ اسے عفت کے پاس ہونا چاہیئے تھا۔

"ہوں!" ابا جان نے ساری بات سن کر حکیمانہ انداز میں "ہوں" کہی اور گہری سوچ میں کھو گئے۔

"میں نے بہت کوشش کی ہے کہ عفت کو اپنی راہ پہ لا سکوں" ــــ ارشد نے کہا ــــ "لیکن اس کی فطرت۔ کیے ۔۔۔ تھا

ایسے میں جو میری فطرت پورے نہیں کر سکتی "

"تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم عفت سے اکتا گئے ہو؟" ــــ ابا جان نے پوچھا ــــ "تم کہیں اس سے علیحدگی کا تو نہیں سوچ رہے؟"

"نہیں! بالکل نہیں!" ــــ ارشد نے پرزور لہجے میں جواب دیا ــــ "ابا جان! اس کا صحیح حل تو یہی تھا لیکن میں نے ا نے وعدہ کر کے مصمم ارادہ کر رکھا ہے کہ عفت کو راہ راست پر لائیں گے۔ میں بچے کی پیدائش کا انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے توقع کہ عفت کی محبت بچے کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اس کے کردار میں جو جذبہ ملکیت پیدا ہو گیا ہے۔ بچے کو پا کر یہ جذبہ سکون ہو جائے گا اور اس طرح میں عفت کی اس قدر شدید گرفت سے آزاد ہو جاؤں گا۔ پھر اسے آہستہ آہستہ سنبھال لوں گا۔ وقت تو وہ یہی چاہتی ہے کہ میں کسی دوسرے کے ساتھ خصوصاً طاہرہ کے ساتھ بات تک نہ کروں۔"

"اگر اس کا دماغ ساتھ دیتا تو شاید میں بھی اسے سمجھا سکتا" ــــ ابا جان نے کہا ــــ "لیکن معلوم ہوا ہے کہ اس پر اعصاب کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ اس حال میں پند و نصیحت مریض کے لیے جارحانہ اقدام بن جاتا ہے اور مریض اپنے دفاع پر اتر آتا ہے۔ مجھے ڈر ہے اسے ہسٹیریا نہ ہو گیا ہو۔ جذبات کا ابال اور تمہارا اس سے دور رہنا۔ یہ وجوہات اکثر ہسٹیریا کی ہیں۔ امید رکھنی چاہیئے کہ بچے کی پیدائش کے بعد وہ بچے میں مگن ہو کر اپنا آپ سنبھال لے گی اور تم میاں اس کے ساتھ کرو کہ اسے یہ تسلی رہے کہ تم اس سے دل برداشتہ نہیں ہو۔ جہاں تک اس کے مرض کا تعلق ہے میں کسی اچھے ڈاکٹر کے کروں گا۔ یہ تو نفسیاتی الجھن معلوم ہوتی ہے۔ اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ بچہ بھی کہیں ماں کا ذہنی خلفشار لے کر پید تم عفت کے لیے نہیں تو ہونے والے بچے کی خاطر ہی عفت میں دلچسپی لو اور اس کی یہ ذہنی حالت درست کرو۔" ابا توقف کے بعد بولے ــــ "میں سمجھ نہیں سکا تم نے یہ غلط انتخاب کیوں کیا تھا۔ دونوں لڑکیوں کے درمیان اس قدر عظیم فرق ہوتے تم نے یہ غلطی کی۔"

"نہیں، ابا جان!" ــــ ارشد نے خود اعتمادی سے جواب دیا ــــ "شادی سے پہلے یہ فرق کبھی اشارۃً بھی ظاہر نہ ہوا آباد اور لاہور میں شادی کے دن تک عفت آج کی عفت سے بالکل مختلف رہی۔ یہ میرا انتخاب نہ تھا۔ طاہرہ شادی کے نہیں تھی۔ آپ نے اسے دیکھ لیا ہے کہ وہ شادی سے کہیں زیادہ اہم مسائل کو سینے میں اٹھائے پھرتی ہے۔ میں خود اولوالعزم لڑکی کو بیوی بنا کر گھریلو زندگی میں قید نہیں کر لینا چاہتا تھا۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ طاہرہ شادی شدہ ہوتی یہ جو اجڑے ہوئے مہاجر خاندان سڑکوں کے کنارے سردی میں اکڑ کر مر جاتے۔ اس کے مقابلے میں عفت اتنی بلند نہیں تھی لیکن وہ اتنی پست خیال بھی نہیں تھی جس کے مظاہرے وہ آج کر رہی ہے۔ اچھی خاصی سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔"

"پست خیالی کی بھی حد ہے بھئی!" ــــ ابا جان نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا ــــ "میں اس قدر بہتان طاہرہ خلاف تو ماننے سے رہا۔"

"ابا جان!" ــــ ارشد نے ابا جان سے حوصلہ لیتے ہوئے کہا ــــ "طاہرہ بھی وہ جو مجھے کتنے کتنے گھنٹے جانے طریقوں سے عفت کے حق میں قائل کرتی رہی ہے ... ختیں کرتی رہی ہے کہ میں عفت کی ہر اچھی بری عادت کو بر

کے اسے اپنا لوں۔ ایسے ہی کسی وقت جب طاہرہ میرے ساتھ عفت کے ہی متعلق باتیں کر رہی تھی کہ عفت نے اور ب رات بھابی نے بھی میرے اور طاہرہ کے دو چار فقرے سن لیے اور انہیں موضوع سے اور پوری بات سے الگ کر کے ایسا تجزیہ کیا کہ طاہرہ جیسی لڑکی کو آوارہ، بدچلن اور نہ جانے کیا کیا بنا دیا۔ پھر ان دونوں نے امی جان کو بھی ساتھ ملا لیا اور انہیں پریشان کیا۔ اب طاہرہ کا یہ حال ہے کہ اس میں وہ شوخی رہی ہی نہیں۔"

"اسے کس طرح پتہ چلا ہے کہ اس کے خلاف بہتان تراشی ہو رہی ہے؟" ــــ ابا جان نے غصہ بھری سنجیدگی سے پا ــــ "میں نے عورتوں سے کہ دیا تھا کہ منہ بند رکھیں۔"

"اسے تجربہ بتا گئی ہے" ــــ ارشد نے جواب دیا ــــ "عفت نے یہی باتیں پہلے تجربہ سے کی تھیں، پھر امی اور بھابی کو سنائیں ں روز تجربہ آتی ہوتی تھی۔ امی جان اور بھابی نے اس کے ساتھ بھی ترش کلامی کی۔ صرف اس لیے کہ اس نے طاہرہ کی وکالت کی تھی ں اب طاہرہ کے لیے پریشان ہوں، ابا جان! امی اور بھابی نے اس کے ساتھ جو برتاؤ اور رویہ شروع کر دیا ہے وہ سخت اگوار ہے۔"

"میں نے یوسف سے کہ دیا ہے کہ وہ زینت کا منہ بند رکھے اور اسے صحیح بات سے آگاہ کر دے" ــــ ابا جان نے لی آمیز لہجے میں کہا ــــ "تمہاری امی کو پہلے بھی سمجھا چکا ہوں۔ پھر سمجھا دوں گا۔ امید تو ہے فضا صاف ہو جائے گی لیکن ان عورتوں کے عورت پن کا کیا علاج کیا جائے؟ انہیں تو سنسنی خیز بات سے پیار ہوتا ہے۔ طاہرہ کو تم تسلی تشفی دیتے رہنا اور سب سے مقدم نت کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کی نفسیاتی الجھنوں کو صرف تم سلجھا سکتے ہو۔ میں ڈاکٹر سے بات کروں گا ساری ت تو ڈاکٹر کو تم ہی بتا سکو گے۔ اس کا علاج جلدی شروع ہو جانا چاہیئے۔"

"میں اس کی طرف پوری توجہ دینے کی کوشش کروں گا، ابا جان!" ارشد نے وعدہ کیا اور کہا ــــ "آپ مطمئن رہیئے لیکن خدا سے لیے امی اور بھابی کا صرف منہ ہی بند نہ کریں بلکہ ان کے دل صاف کریں ورنہ طاہرہ کی شوخیاں اور ولولہ ختم ہو جائے گا۔"

"اس کا تم فکر نہ کرو، میاں!" ــــ ابا جان نے کہا ــــ "یہ کام میرا ہے۔ میں نے تمہیں جو ہدایات دی ہیں تم ان پر عمل کرو۔ طاہرہ کے ساتھ بے تکلفی سے اٹھو بیٹھو اور اسے تسلی تشفی دیتے رہو۔ ایسی مومن لڑکی کو پراگندگی سے پاک رکھنا ہے۔ یہ جو ہر نایاب ہوتے ہیں۔ طاہرہ کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ وہ میری بچی ہے اور تمہاری بہن ہے۔ اپنے دلوں کو صاف رکھو، جاؤ... تم تھکے ہوئے ہو، جلدی سو جانا اور سنو!.... سیدھے عفت کے کمرے میں جاؤ اور وہیں سونا۔ یہ بڑا ظلم ہے کہ تم الگ کمرے میں سوتے ہو اور لڑکیوں کی تعلیم کا کیا حال ہے؟"

"ماسٹر باقاعدگی سے آ رہا ہے۔"

ارشد عفت کے کمرے میں داخل ہوا۔ عفت نے ارشد کو دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے ارشد اور وہ کہیں راستے میں ملے تھے۔ ذرا سی دیر اکٹھے چلے، ایک دوراہے پر علیحدہ ہو گئے اور آج پھر اتفاق سے مل گئے ہیں۔ اگلے دوراہے پر اپنی اپنی راہ الگ جانے کے لیے ــــ عفت کو خواب کا دھوکا ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ ارشد کا استقبال کرے تو کیونکر یا استقبال نہ کرے۔ جانے کیوں آیا ہے۔ شاید طاہرہ کی حمایت میں اسے جھاڑنے آیا ہے۔ عفت کو اطمینان سا ہوا کہ چلو اسی بہانے

ارشد آگیا ہے۔ گالی ہی دے گا۔ مخاطب تو ہو گا۔ شاید امی جان اور بھابی نے اسے سمجھایا ہو اور وہ راہ پر آگیا ہو۔ عفت کا دل
سے اچھلنے لگا۔ اس خیال نے اسے حوصلہ دیا۔ صرف دو ہی سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ عفت نے یہ سب کچھ سوچ لیا اور
سے کہا۔ "آ جیے نا! کھلے دروازے میں سردی نہیں لگتی؟"

"سنا تھا تم بیمار ہو!" ارشد نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر عفت کے پاس پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"آپ آگئے ہیں تو میں بیمار بھی نہیں رہی" — عفت نے قدرے بے تکلفی سے کہا — "افسوس آپ میری بیماری
نہیں سمجھ سکے۔"

"آپ کہاں آگئے، چچا جان! ہم کہانی سن رہے تھے" — رضائی میں سے ارشد کے چھوٹے بھتیجے کی صدا
بلند ہوئی۔ عفت اور ارشد نے اسے نظر انداز ہی کر دیا تھا۔ عفت ہنس پڑی اور ارشد نے لپک کر بچے کو رضائی میں سے گھ
گود میں لے لیا۔

"جاؤ، ننھے میاں! اب سو جاؤ" — عفت نے بچے کو پیار سے کہا — "باقی کہانی کل سنائیں گے۔"

"نہیں جی!" — بچہ ضد پر اتر آیا — "ہم پوری کہانی سن کے جائیں گے۔"

عفت چاہتی تھی کہ بچہ بھاگ جائے اور ارشد نے شکر کیا کہ بچے نے اسے ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ
اس نے عفت سے کہا — "مایوس نہ کرو، کہانی سناؤ اسے۔ میں آج بہت تھکا ہوا ہوں۔ کل یہیں سوؤں گا۔"

"جائیے جائیے" — [illegible] ارشد سے کہا اور اچک کر رضائی میں لیٹ گیا — "اٹھیے، بھاگیے یہاں
"آپ آئے کس [illegible]" عفت نے اداس لہجے میں پوچھا۔ ارشد اٹھ کے جانے کو تھا — "رستہ بھو
گئے کیا؟" — عفت نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"یہی بتانے آیا تھا کہ کل یہاں سوؤں گا" — ارشد نے جماہی لے کر جواب دیا اور کہا — "اپنے آپ کو قابو میں رکھ
پیٹ میں اس ننھی سی جان کا خیال رکھو۔ تم نے اپنا جو حال بنا لیا ہے اس کا اثر بچے پر پڑے گا۔"
پیشتر اس کے کہ عفت کوئی جواب دیتی ارشد جا چکا تھا۔

•

ایک ہفتہ گزر گیا۔ پورے سات دن اور سات راتیں۔ اس دوران طاہرہ کا ساڑھے سات ہزار روپیہ بنک
ا یاں دو ہزار روپیہ ارشد کے ابّا جان نے شامل کیا اور ان چھ مہاجر خاندانوں میں سارا روپیہ تقسیم کر دیا گیا۔ نور دین کو یہ ڈیو
وہ وقتاً فوقتاً جا کے دیکھتا رہے کہ وہ لوگ روپے کو کاروبار میں صرف کر رہے ہیں یا یوں ہی اڑا رہے ہیں۔ ان سب
کھول لی تھیں اور نور دین ہر شام ان کی دوکانوں کو ایک نظر دیکھ آیا کرتا تھا اور وہ لوگ اسے دیکھتے ہی اس پر دعاؤں کی با
کرتے تھے۔ ہفتے کے آخر میں ابا جان کو یقین ہو گیا کہ یہ پناہ گزین اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں تو نور دین کی ڈیوٹی
پانچ سو روپیہ طاہرہ نے اپنے ٹرنک میں محفوظ رکھ لیا تھا۔ ارشد نے کہا بھی کہ یہ روپیہ بنک میں جمع کرا دو لیکن طاہرہ نے
اس ہفتے کے دوران ارشد نے چند راتیں عفت کے ساتھ گزاریں لیکن ان کے درمیان اجنبیت اور بیگا

گزر سکی۔ عفت جیسے برف کے تودے کے ساتھ کھیلتی رہی۔ اس کے جسم اور جذبات کی تپش اس تودے کو پگھلا نہ سکی اِس
نے طاہرہ پر جو بہتان باندھے تھے، ارشد نے ان کا ذکر تک نہ کیا۔ ارشد اور عفت آپس میں باتیں کرتے رہے جن میں ایک طرف
زیادہ تر پند و نصیحت تھی اور دوسری طرف پند و نصیحت سے بیزاری اور محض جذبات۔ خلیج اس قدر وسیع تھی کہ اس پر پل تعمیر نہ کیا
جا سکا۔ عفت جس قدر جذبات میں الجھتی رہی، ارشد اسی قدر فلاسفر بنتا گیا۔ ایک نے جذبات کو سہارا نہ دیا۔ دوسرے نے فلسفے
پر کان نہ دھرے۔

ان سات شب و روز میں ارشد طاہرہ کے کمرے میں جاتا رہا اور کھل کر باتیں ہوتی رہیں۔ ہر موضوع پر اور ہر کسی کے متعلق۔
اپنے متعلق بھی اپنی محبت کے متعلق بھی۔

امی اور بھابی کو ابا جان اور یوسف نے قائل کر لیا تھا کہ عفت کی باتیں غلط فہمی کی پیداوار اور بہتان تراشی ہیں اور یہ
نفسیاتی معاملہ ہے۔ دونوں عورتوں نے طاہرہ کے ساتھ برتاؤ میں بظاہر اچھی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ مردوں نے ایک سکیم کے مطابق
حول سے یہ کھچاؤ دور کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اسی سلسلے میں ایک روز پورا خاندان پک نک پر گیا، ہر رات کھانے کے
ہفتوں سے زیادہ دیر گپ شپ اور ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ عفت کو باتوں باتوں میں اس کی بنائی ہوئی دنیا سے گھسیٹنے کی کوشش
گئی مگر وہ کچھوے کی طرح اپنے خول میں ہی گھستی گئی۔ البتہ ان سات دنوں میں اسے دورہ نہ پڑا۔ بعض اوقات تنہائی میں وہ روتی
رہتی اور بعض اوقات آئینے میں اپنے عکس میں محو ہو جاتی تھی۔

اس میں یہ تبدیلی بھی آئی کہ ذہنی افراتفری اور کچھ سمجھ نہ سکنے سے گھبرا کر وہ خدا کے حضور رو رو کر دعائیں مانگنے لگی۔ طاہرہ
کو دل ہی دل میں کوستی رہی۔ اس سے گھبراتی بھی رہی اور جب طاہرہ اس کے سامنے آتی تو عفت نے ہزار کوشش کی کہ اس
کے ساتھ بات نہ کرے لیکن اس کے سامنے مسحور ہو جاتی رہی اور اس کی اپنی ہستی کی یہ آواز دب نہ سکی — "طاہرہ کے بغیر تم جی
سکو گی؟" — عفت کی شخصیت دو حصوں میں تو بٹ ہی چکی تھی، اب دونوں حصے ایک دوسرے کے ساتھ شدت سے
متصادم ہونے لگے تھے۔

طاہرہ کی صلح جو طبیعت نے جب پراگندہ فضا کو صاف ہوتے دیکھا تو اس نے اس کے مکمل طور پر صاف ہونے کا
انتظار نہ کیا۔ ہلکی سی جو خلش، امی اور بھابی کے رویے میں جو تیکھا پن ابھی باقی تھا، طاہرہ نے اسے نظر انداز کر دیا اور پہلے کی طرح
سب میں گھل مل گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ عفت کے پاس وہ جب بھی جاتی اسے اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے نکال ہی لیتی
لیکن وہ محسوس نہ کر سکی کہ وہ اسے مزید پیچیدگیوں میں ڈال آتی ہے۔ طاہرہ نے ماحول کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا لیکن کبھی کبھی
یوں محسوس کرتی تھی جیسے ایک خلش سی باقی ہے۔ اس نے اس خلش کو بھی قبول کر لیا تھا۔

آٹھویں دن طاہرہ کو نجمہ کا خط ملا جس میں اس نے طاہرہ کو راولپنڈی آنے پر قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے لکھا
— "خدا کرے تمہارے گھر کے حالات سدھر گئے ہوں لیکن جو چنگاری سلگ چکی ہے وہ بجھ نہ سکے گی جس گھر کو تم اپنا جہان
رہی ہو کسی دن دوزخ نہ بن جائے۔ تم نے اپنے آپ کو اس گھر کے ساتھ جذباتی پابندیوں میں جکڑ لیا ہے۔ ان زنجیروں
کل آؤ۔ میں نے تمہارے بھائی جان (اپنے خاوند) سے تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ وہ تہ دل سے تمہیں اپنے گھر میں رکھنے

کے لیے تیار ہیں۔"

نجمہ نے اسے بہت کچھ لکھا تھا۔ طاہرہ نے اُسی دن جواب دیا جس میں اس نے "آشا بھون" کے تمام تر حالات لکھے۔ ایک دو تبدیلیوں کا ذکر کیا اور آخر میں لکھا۔ "اگر فضا اسی طرح سدھرتی گئی تو میں راولپنڈی نہیں آؤں گی۔ دعا کیجیے بار بار پھر پناہ گزین نہ بنوں۔ اگر حالات نے ناگوار کروٹ بدلی تو آپا! آپ کے سوا کون ہے۔ میری ماں بھی آپ ہیں بہن بھی آپ اور ہمراز بھی آپ۔ آپ کے پاس نہ آؤں گی تو کہاں جاؤں گی۔"

ابا جان کی ہدایت کے مطابق ارشد عفت کے کمرے میں آنے جانے لگا تھا۔ جذبات اور حقیقت کو یکجا کر جیسے آگ اور برف اکٹھی رکھ دی جائے لیکن آگ کی گرمی تیز ہوتی گئی اور برف نہ پگھلی۔ پیاسے کی پیاس بڑھتی گئی اور پانی ہوتے ہوئے بھی دسترس سے دور رہا۔ سراب دور ہی دور ہٹتا گیا۔ عفت ایک لاش کے ساتھ ہمکلام رہی۔ لاش بولتی لیکن روح سے بیزار۔

اس کے باوجود عفت نے امید کا دامن نہ چھوڑا اور کمرے میں ہی گھُسے رہنا بھی نہ چھوڑا۔ باہر کی دنیا کے ساتھ اسے ہی نفرت تھی جتنی ارشد سے محبت۔ اب نفرت میں بھی اضافہ ہونے لگا محبت میں بھی۔ عفت اس امید پر مسرور و مطمئن رہی کہ ارشد تک آ گیا ہے تو دو قدم آگے بھی آ جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو تسکین دیتی رہی۔ اس کی اندرونی خلفشار دب سی گئی تھی لیکن وہ محسوس کر سکی کہ وہ چنگاریوں کو بارود میں چھپا رہی ہے۔

ارشد اب بلاناغہ عفت کے کمرے میں سونے لگا لیکن وہ دل کسی اور کمرے میں چھوڑ جاتا تھا۔ اُس نے عفت کو ان پستیوں میں سے نکالنے کی کوشش کی۔ مایوس تو وہ پہلے ہی تھا، اب بیزار بھی ہوا جا رہا تھا۔ اسے کم ہی امید تھی کہ اس کامیاب ہو گی۔ عفت کے پاس چلے آنے کی ایک وجہ تو ابا جان تھے، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس طرح طاہرہ کے خلاف طوفان دب جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ عفت کی ذہنی حالت ہسٹریا کی صورت اختیار نہ کر جائے۔

"آشا بھون" کی دنیا میں جو ہنگامہ اُٹھا تھا وہ ختم ہوتا گیا۔ حالات معمول پر آ گئے۔ ناک جو سکڑ گئے تھے۔ وہ اپنی اپنی جگہ پیشانیوں کے شکن سیدھے ہو گئے۔ فضا کا تکدر دور ہو گیا لیکن مابعد کے اثرات کا سایہ نہ گیا۔ بدبو چلی تو گئی لیکن اس کا ہلکا سا رہا۔ زخم تو بھل گیا، زخم کا نشان نہ گیا۔ طاہرہ نے اپنی دنیا پھر سے بنالی تھی لیکن عفت اپنے خول میں سکڑتی رہی اور ارشد جا قریب آیا تو اس کے گرد یا اس کے خیال کے گرد منڈلانے لگی۔ درد آلود سی ایک سرخوشی اسے اپنے آپ میں مقید رکھنے لگی۔ اسے صرف ارشد کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت بظاہر پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اب امی اور بھابی بیزار بے رخی کر تھا تو سب کچھ تھا۔ اس نے جو حملہ طاہرہ پر کیا تھا اس کے جواب میں اُس پر کسی نے حملہ نہ کیا۔ کسی نے (سوائے نجمہ کے) نہ کی تھی۔ ارشد نے تو اشارۃً بھی اس سے ذکر نہیں کیا تھا۔ اس سے عفت کے دل میں فتح کا احساس پیدا ہو گیا۔ وہ سمجھی کا وار کام کر گیا۔ اس حربے کی کامیابی نے اس کے دل میں فتح کے ساتھ برتری کا احساس بھی پیدا کر دیا اور عفت نے خیالوں خیالوں میں اپنے آپ کو زمین سے اُٹھا کر کسی ایسی بلندی پر پہنچا دیا جو پستیوں سے بدتر تھی۔

"بخدا میں نے تو اس گھر سے جانے کی ٹھان لی تھی"۔۔۔ طاہرہ نے ارشد سے کہا۔

"کہاں؟"۔۔۔ ارشد نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"خدا کی زمین تنگ تو نہیں"۔۔۔ طاہرہ نے بظاہر مذاق کے رنگ میں کہا اور پوچھا۔۔۔ "کہو! عفت کس حال میں ہے؟ اب خوش ہو گی۔ خدا کے لیے اسے یہ باتیں جو اس نے میرے خلاف کی ہیں یاد نہ دلانا۔ پریشان ہو گی اور اس سے جواب کوئی نہیں بن پڑے گا۔ فائدہ کوئی نہیں ہو گا، وہ ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جائے گی۔"

"ہاں! فائدہ ہی کیا!"۔۔۔ ارشد نے آہ سی لے کر کہا۔۔۔ "میں اس کے ساتھ اس قدر طویل بات کرتا ہی نہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ کہتی رہتی ہے اور میں حسبِ توفیق 'ہوں، ہاں' کرتا رہتا ہوں۔ میں کم ہی بولتا ہوں۔"

"نہ بھئی!"۔۔۔ طاہرہ نے ملتجی لہجے میں کہا۔۔۔ "یہ بات غلط ہے۔ جہاں اتنا وقت اس کے پاس گزارتے ہو وہاں اس کا دل رکھنے کے لیے سہی، دو چار باتیں کر دیا کرو۔ اتنے پتھر بھی نہ بن جاؤ۔"

"لیکن وہ پتھر تو میں کا دیں ہے"۔۔۔ ارشد نے جواب دیا۔۔۔ "معلوم ہوتا ہے اس کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے اس کا دورہ تو نہیں دیکھا لیکن ذہنی حالت کی ناہمواری ضرور دیکھی ہے۔ کبھی تو تمہاری تعریفیں کرتے کرتے پاگل ہوئی جاتی ہے اور بعض اوقات تمہارا ذکر یوں کرتی ہے جیسے تمہارے ساتھ اس کا دور پار کا بھی تعلق نہیں اور تم گھر میں برتن مانجھنے والی کوئی نوکر جا کر ہو۔ کبھی باتوں میں میں نے اسے دیکھا ہے کہ ہر چیز کے متعلق، خصوصاً تمہارے متعلق، اس کی دو متضاد رائیں ہوتی ہیں۔ اس کے مزاج میں جو اتار چڑھاؤ پیدا ہو گیا ہے وہ غیر معمولی ہے۔ میں اس کی نفسیاتی کیفیت کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ اس کی جذباتی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جذباتیت نے اس کا یہ حال کر دیا ہے کہ اسے اپنے اوپر بالکل قابو نہیں رہا۔ یہ علامات اچھی نہیں ہوتیں۔ ہمیں شاید کسی ڈاکٹر سے مشورہ لینا ہی پڑے گا۔ طاہرہ! مجھے زیادہ فکر بچے کی ہے۔ اگر بچہ ماں کے نفسیاتی اثرات ورثے میں لے کر پیدا ہوا تو نہ جانے میرا اور میرے بچے کا تمام عمر کیا حشر ہوتا رہے گا۔ عفت کی یہ علامت سب سے زیادہ خطرناک ہے کہ وہ کبھی کبھی کسی خوف کی گرفت میں دبوچی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسے میں وہ بچوں کی طرح زیادہ سے زیادہ میرے قریب رہنے کی کوشش کرتی ہے۔"

"ارشد!"۔۔۔ طاہرہ نے ارشد کے ہاتھ پکڑ لیے اور التجا کے لہجے میں بولی۔۔۔ "خدا کے لیے تم اس بے چاری کو اپنے دل میں جگہ دو۔ کون جانے اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ پسماندہ ہی سہی، کچھ ہی سہی لیکن ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم اسے دھتکار دیں۔ وہ جو کچھ بھی ہے ہمیں قبول کرنا چاہیے۔ بخدا مجھے اس کے ساتھ اتنی ہمدردی ہے جتنی تمہارے ساتھ نہیں۔ ارشد! یہ ظلم ہے اور خدا تمہیں کبھی نہیں بخشے گا۔ کہاں گئی تمہاری وہ فطرت جو انسانیت کی خدمت کے لیے تڑپ اُٹھتی تھی؟ کہاں ہے تمہارا جذبۂ ایثار؟ کیا عفت انسان نہیں؟ خدا کی راہ میں تم نے کیا کچھ نہیں کیا؟ خدا کے لیے ہی تم عفت کو اپنے دل میں بٹھا لو۔"

طاہرہ جذباتی ہو گئی۔ اس کی آواز لرزنے لگی۔۔۔ "خدا کے لیے، ارشد! خدا کی راہ میں قربان ہو جاؤ، ورنہ تمہاری جوانی کو کیڑے کھا جائیں گے۔ عفت کی آہیں تمہیں جینے دیں گی نہ مرنے دیں گی۔۔۔۔ جاؤ! اسی وقت چلے جاؤ۔ عفت کے پاس جا بیٹھو اور اس کے ساتھ دل کھول کر باتیں کرو۔"

طاہرہ نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے اور قریب ہو گئی۔ ارشد نے دیکھا کہ طاہرہ کی دلکش آنکھوں میں دو آنسو

تیر رہے ہیں۔ ارشد ذرا سی دیر طاہرہ کے سامنے کھڑا رہا۔ اس کے سینے میں ہلچل سی مچ گئی۔ آنسوؤں نے ان سرمئی آنکھوں میں جادو گھول دیتے تھے اور ارشد نے رگ و ریشے میں اس جادو کو محسوس کیا۔ یوں نہیں کہ وہ ان آنکھوں میں کھو جاتے بلکہ یوں کہ یہ آنکھیں جس کے لیے روتی ہیں اس کے پاس چلا جائے۔

ارشد کی کلائیاں طاہرہ کے ہاتھوں کی گرفت میں تھیں۔ اُس نے کلائیوں کو ذرا سی جنبش دے کر طاہرہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ انہیں دبایا اور ایک بار پھر طاہرہ کی نمناک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زبانِ خاموشی کہا۔ "تمہارا یہ جذبہ میرے سر آنکھوں پر۔ میں ان آنسوؤں کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔"

اور دوسرے لمحے ارشد عفت کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اس پر طاہرہ کی باتوں، آنسوؤں اور اس کی وارفتہ کیفیت کا طاری تھا۔ وہ اسی کے زیر اثر خماری سی کیفیت میں عفت کے کمرے میں داخل ہوا۔ عفت نے ایک عرصے کے بعد ارشد کے چہرے پر ایسا تاثر دیکھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل میں آج مسرت اور پیار موجزن ہے۔ عفت مسکرا دی ––– یہ ملتجی مسکراہٹ تھی بیار اور بھٹکی ہوئی ––– ارشد نے مسکراہٹ کا جواب مسکرا کر دیا اور ارشد جان ہی نہ سکا کہ وہ کس وقت اور کس طرح عفت کی گرفت میں آ گیا۔ گرفت بھی ایسی جو تنگ تر اور مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ ارشد نے اپنے ہونٹوں پر گرم سانسیں بھی محسوس کیں اور یہ احساس بھی ہوا کہ یہ سانس اس کی اپنی نہیں۔

"آج تو آپ جلدی آ گئے ہیں" ––– عفت نے ارشد کو کندھوں سے دھکیل کر پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا ––– "آج پڑھنے میں دل نہیں چاہ رہا تھا یا...؟"

"ہوں؟" ––– ارشد نے یوں کہا جیسے نیند سے جاگ اُٹھا ہو اور اسی بوکھلاہٹ میں بولا ––– "یوں ہی چلا آیا ہوں۔۔۔ ہاں! پڑھنے پر طبیعت مائل نہ ہوتی تو۔۔۔ طاہرہ کے کمرے میں چلا گیا تھا۔۔۔ نہیں! تمہاری طرف آ رہا تھا تو طاہرہ۔۔۔؟" وہ اس طرح گھبرا گیا جیسے کرتے پکڑا گیا ہو۔

عفت پر یہ بوکھلاہٹ عیاں ہوتے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ گھبراہٹ محض اس لیے ہے کہ ارشد نشے کی کیفیت میں یا بے خودی میں غلط جگہ چلا آیا تھا۔ اس پر ابھی طاہرہ کے چمکتے ہوئے نورانی آنسوؤں کا سحر طاری تھا کہ طلسم ٹوٹ گیا اور وہ عفت کے بازوؤں کے گھیرے میں تھا۔ اس کے نتھنوں میں ابھی طاہرہ کے تنفس کی بُو باقی تھی کہ اس کی بُو کو عفت کے سانسوں نے ... عفت نے ارشد کی گھبراہٹ محسوس کر لی۔ طاہرہ کا نام بھی سنا اور ارشد کا ٹوٹا پھوٹا جواب بھی سُنا جیسے وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ عفت کی طبیعت کو صدمہ ہوا اور وہ سلجھنے لگی۔

"پھر وہی قصہ!" ––– عفت نے اپنے آپ کو ایک خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے سوچا ––– "تان پھر وہیں آ کر ٹوٹ رہی ہے۔"

ارشد ابھی خاموش تھا اور یوں خلاؤں میں دیکھ رہا تھا جیسے اندھیری رات میں بجلی چمک کر اس کی آنکھوں میں ٹیڑھی میڑھی لکیر چھوڑ گئی ہو اور وہ اس لکیر کو آنکھوں میں محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عفت سمجھ گئی کہ طاہرہ کا جادو ابھی سر سے نہیں اترا۔ اپنی مسرت اور فتح کا مذاق سخت ناگوار گزرا۔ خیالوں کی چکی تیزی سے چلنے لگی۔ ایک دو لمحوں میں جانے کیا کچھ اور کتنے ہی خیال چکر میں گھوم گئے۔

ارشد ابھی تک خاموش اور ساکت بیٹھا سوچ رہا تھا کہ عفت کے ساتھ کیا باتیں کرے۔ وہ آنکھوں کی زبان میں طاہرہ کے آنسوؤں کے ساتھ وعدہ کر آیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو عفت پر قربان کر دے گا۔ "کیا بات کروں؟" ––– اُس نے اپنے آپ سے کوئی جواب نہ پا کر بیٹھے بیٹھے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ اگر اس کا دل اس کمرے میں ہوتا تو باتوں کی کیا کمی تھی لیکن وہ اپنے اوپر زبردستی کر رہا تھا۔ اندرونی کشمکش کا اثر چہرے پر بھی ظاہر ہوا۔ چند منٹ پہلے مسکراتی ہوئی صورت سنجیدہ ہو گئی۔ دل کی بے قراری عقل و دل کی دھینگا مُشتی، ایک بے چینی اور بے اطمینانی کی صورت چہرے کے ایک ایک نقش پر نمایاں ہو گئی۔ عفت کو یہ احساس اندر گھرا لگا کہ اس نے آج کھل کر باتیں کر لینے کا تہیہ کر لیا۔

"اگر دل اس قدر اداس ہو گیا ہے تو تھوڑی دیر اور طاہرہ کے کمرے میں گزار آتے" ––– عفت نے شگفتہ مگر طنزیہ لہجے میں کہا ––– "میں تو آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہاں نہیں تو وہاں سے ہی اپنے لیے خوشیاں چن لاتے۔"

ارشد بڑی مشکل سے اپنے آپ کو عفت کے ساتھ کسی اچھے موضوع پر باتیں کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا لیکن عفت کے الفاظ نے اس کی کوشش کے پرخچے اُڑا دیئے۔ اس کا دماغ چشم زدن میں خالی ہو گیا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے گردن گھما کر عفت کی طرف دیکھا۔ اگر عفت اپنے آپ میں ہوتی تو بات کا رُخ بدل کر ارشد کے مزاج کو سنبھال لیتی لیکن اس کے سینے میں "عورت" بیدار ہو چکی تھی اور آج یہ عورت فیصلہ کن حملے پر اُتر آئی تھی۔

"آپ طاہرہ کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں" ––– عفت بولی ––– "میں آپ کو دیکھ کر خوش ہوتی ہوں۔ مجھے آپ کی خوشی چاہیئے۔ آپ طاہرہ کے تصور میں ہی ہوں۔ میں نے تو اب یہ صورت قبول کر لی ہے کہ میں آپ پر فدا ہوں اور آپ طاہرہ کے تصور میں کھوئے رہتے ہیں۔"

ارشد باریک سے ایک تار پر چل رہا تھا۔ ذرا سے دھکے کی ضرورت تھی جو عفت کی اس طنز اور رشک نے دے دیا اور ارشد دھڑام سے نیچے آ رہا۔ صلح سمجھوتے کی تو وہاں گنجائش ہی نہ تھی۔ عفت کی بات سن کر ارشد نے اس کی طرف دیکھا۔ عفت کے چہرے کا ایک ایک نقش پڑھ ڈالا۔ ان نقوش میں نہ اسے روحانیت نظر آئی اور نہ وہ پاکیزہ خیالی جس کا وہ متلاشی تھا۔

ارشد نے غصے سے مگر دھیمی آواز میں کہا ––– "تمہاری کھوپڑی میں کبھی اچھی بات بھی آئی ہے؟ کبھی تم نے خیالوں کی غلاظت سے نکلنے کی کوشش بھی کی ہے؟ تم اس پراگندگی میں اس طرح گھس گئی ہو جس طرح۔۔۔؟"

"جس طرح آپ طاہرہ کے کمرے میں گھسے رہتے ہیں" ––– عفت نے سنجیدہ مسکراہٹ سے فقرہ کاٹتے ہوئے کہا۔

ارشد کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سینے کے بند ٹوٹنے لگے اور ارشد جو باتیں نہیں کہنا چاہتا تھا، سیاہ بادلوں کی طرح برسنے کے لیے اس کے سینے میں سے اُمڈ آئیں۔

"سُنو عفت!" ––– ارشد نے اٹھ کر کہا ––– "آج میں تمہیں وہ باتیں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں جنہیں میں ہضم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں تمہیں اشاروں میں سمجھاتا رہا لیکن میں بھول گیا تھا کہ اشارہ صرف عاقل کے لیے ہوتا ہے۔ تمہیں اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ میں نے تمہیں کبھی بھی نہ چاہا تھا" ––– ارشد بے قابو ہونے لگا ––– "میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے

تمہیں چاہنے کی کوشش کی تھی لیکن میں تمہیں محض برداشت بھی نہ کر سکا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں طاہرہ کو چاہتا ہوں۔۔۔ کو چاہتا ہوں۔۔۔" ارشد کی آواز بلند ہوتی گئی۔ "مجھے طاہرہ سے محبت ہے۔ طاہرہ کی روح سے۔ عفت! اس کے جسم

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں" — عفت نے تڑپ کر جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سرخی چھا گئی۔ کہنے لگی کسی اور کو دینا۔ آپ نے اس کے کمرے میں راتیں گزاری ہیں۔"

"خاموش رہو بدتمیز!" — ارشد دانت پیس کر آہستگی سے چیخا۔ اس قدر آہستگی سے کہ اس کی آواز کمرے سے باہر نہ لہجے میں بولا — "تمہیں تہمت لگاتے شرم نہیں آتی جس لڑکی نے تم پر اپنی محبت اور دل نچھاور کر دیا ہے، جس لڑکی نے تمہیں سے نکال کر دو منزلہ مکان میں بسایا تھا اور جس لڑکی نے تمہاری زبان سے بدنام اور رسوا ہو کر تمہیں ایک لفظ تک نہ کہا۔ تم لگا رہی ہو کہ۔۔۔۔"

"اور چیختے! اور زور سے کہئے کہ عفت یتیم تھی، غریب تھی، عفت بھوکی اور ننگی تھی اور اسے طاہرہ نے پناہ دی تھی زور سے کہیئے کہ عفت طاہرہ کی روٹیوں پر پلی ہے۔" — عفت غم و غصے سے بھرپور لہجے میں بول رہی تھی — "یہی میری کم میں تم لوگوں کی نظروں میں ابھی تک غریب اور مفلس ہوں۔" — اس کے آنسو نکل آتے اور وہ روندھی ہوئی آواز میں بولی احسان جتلاتے، ارشد صاحب! طاہرہ کو بلا لاتے، وہ بھی احسان گنواتے۔ اسے بھی افسوس ہو رہا ہے کہ اس نے دیا تھا۔ وہ بھی چاہتی ہے اور آپ بھی چاہتے ہیں کہ مجھے میری مفلسی اور بے کسی کے دن یاد دلاتے رہیں تاکہ میں آپ غلام بنی رہوں۔ احسانوں تلے دبی رہوں اور آپ عیاشیاں کرتے رہیں اور میں ہونٹ سی کر دیکھتی رہوں۔ آپ دونوں نے سہارا لے کر میری غریبی کا مذاق اڑایا ہے۔"

"اگر تم میں عقل ہوتی تو۔۔۔"

"تو میں خاموشی سے تمہیں اور طاہرہ کو ایک ہی کمرے میں سوتا دیکھ کر گلہ نہ کرتی۔ یہی ہوتی نا میری عقل؟" — عفت عروج تھا کہ وہ "آپ" کی جگہ "تم" پہ اتر آئی — "کہاں گئے تمہارے وہ پاکستان زندہ باد کے نعرے؟ تمہارے وہ جلسے گئے؟ ایک طرف تم اور تمہاری طاہرہ پناہ گزینوں کو بسانے کی فکر میں ہو، ہزاروں روپیہ خرچ کر رہے ہو اور دوسری کو اجاڑ رہے ہو۔ یہ فریب ہے۔ تم بھی مکار ہو، تمہاری طاہرہ بھی مکار ہے۔"

عفت اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں کہا — "اگر میرے پاس اتنی دولت ہوتی تو میں بھی کے لیے چند ہزار روپے خرچ کر کے پاکبازوں میں شامل ہو جاتی اور رات کے اندھیروں میں ہر کرتوت پر پردہ ڈال لیتی۔"

"پہلے میری سن لو پھر اپنی بکواس کر لینا۔ تم ضرورت سے زیادہ۔۔۔"

"مجھے آج یہ بکواس کر لینے دو ارشد!" — عفت نے ایسے لہجے میں کہا جو ارشد کے لیے بالکل ہی نیا اور غ دب سا گیا۔ عفت کہہ رہی تھی — "میں نے یہ بکواس اس طرح سینے میں چھپاتے رکھی ہے جس طرح تمہارے بچے کو ہوئے ہوں۔ مجھے ان دونوں سے پیار ہے۔ میں ان دونوں کو جگر کا خون دے کر زندگی دے رہی ہوں۔ ان دو ارشد وابستہ ہے۔ مجھے ارشد سے محبت ہے اور ہر چیز سے محبت ہے جس کے ساتھ ارشد کا ذرا سا بھی تعلق

ارشد! جس وقت تم طاہرہ کی آغوش میں مسکرا رہے ہوتے ہو، اس وقت میں تمہاری یاد کو سینے سے لگائے رو رہی ہوتی نے چمگادڑوں کے پروں کی آواز میں میں تمہارے قدموں کی آہٹ سنتی ہوں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے میری نظریں دروازے لیکن تم آ کے دروازہ نہیں کھولتے۔ کھولو بھی کیسے! تم تو ایک اور بند دروازے کے پیچھے قید ہوتے ہو۔"

"صرف اس لیے کہ اس دروازے میں پاک محبت ہے اور یہاں تم نے غلاظت اور بدبو کو محبت کا نام دے رکھا ہے۔" ارشد نے کہا — "وہاں روحانی محبت ہے اور یہاں صرف جسمانی۔ اگر تم میں ذرا سی بھی پاکیزگی ہوتی تو میری روح کے مطابق بن جاتی۔ اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو گرد و پیش کے انسانوں میں مل بیٹھتی۔ میں نے تمہیں ہزار بار سمجھایا ہے کہ انسان بانسان جاتا ہے اور انسان کو انسانوں میں کس طرح رہنا چاہیے لیکن تم نے اپنے گوشۂ تنہائی میں مجھے بھی قید کرنا چاہا اور اپنے مجھے بھی حیوان بنانا چاہا۔ حیوانوں میں بھی کچھ اعتدال ہوتا ہے لیکن تم میں۔۔۔"

"کاش تم بھی انسان ہوتے۔" — عفت نے کہا — "وہ حیوان ہی ہوتے ہیں جنہیں اپنے پرائے کی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ ہر پابندی آزاد ہوتے ہیں۔ اگر یہی کرتوت اچھی لگتی تھی تو میرے ساتھ شادی کیوں کی تھی؟ طاہرہ کہیں بھاگ تو نہیں گئی تھی؟ لیکن تمہاری ذہن میں فتور تھا۔ تم مجھے بیوی بنا کر میرے جسم سے کھیلنا چاہتے تھے اور میری آڑ میں طاہرہ کے ساتھ۔"

"خاموش رہو بے ہودہ اجڈ!" — ارشد آپے سے باہر ہو گیا — "بے حیا! تمہیں ہزار مخمل میں سلایا، تمہاری اصلیت وہی رہی، اس سے زیادہ بات کی تو زبان کھینچ لوں گا۔"

عفت کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن غصے سے بھڑکے ہوئے جذبات نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ تھوڑی دیر اور بولتی رہتی تو اس کے دل کا غبار نکل جاتا پھر وہ اپنے آپ میں آ جاتی لیکن ارشد میں صبر کی تاب نہ رہی۔ عفت کی ذہنی کیفیت سمجھے بغیر وہ اپنے غصے سے مغلوب ہو گیا تھا۔

"میں نے اور طاہرہ نے تم پر اپنی محبت قربان کی اور تم نے اسے پاؤں تلے مسل دیا" — وہ قہر بھری آواز میں بولا — "طاہرہ مجھے اپنے کمرے میں بٹھا کر گھنٹوں اس قربانی پر قائل کیا ہے کہ میں تمہارے قریب ہو کر تمہیں اپنا بنا لوں۔ تم نے سمجھا میں طاہرہ وش میں پڑا تھا۔ طاہرہ نے رو رو کر اور اپنی محبت کا واسطہ دے دے کر مجھے تمہارے کمرے میں بھیجا ہے اور تم نے ریاکاری اور بدچلنی کے الزام لگائے ہیں۔ تم نے اسے گھر بھر میں بدنام کر کے رکھ دیا ہے اور اس نے تمہارے اکھڑے ہوئے تسلیاں دی ہیں۔ اس نے تمہارا سر دبایا، تمہاری تیمارداری کی۔ تم سمجھتی ہو گھر والے اندھے ہیں؟ جاہل ہیں؟ ان کے دماغ نہیں؟ آنکھیں نہیں ہیں ان کی؟ وہ تمہیں بھی سمجھتے ہیں اور طاہرہ کو بھی جانتے ہیں۔ تم نے امی کو بیوقوف بنایا۔ بھابی کو گمراہ کیا اور سب کی ہمدردیوں کو ضائع کر کے اپنے ہی راستے میں کانٹے بوئے۔ طاہرہ کا خدا اس کے ساتھ ہے اور تمہارے ساتھ کوئی نہیں۔"

عفت کی شخصیت ٹوٹ کر پھر دو ٹکڑے ہو گئی۔ کمزور کڑیاں تڑاخ تڑاخ کر کے ٹوٹ گئیں۔ اس کے اعصاب ڈھیلے گئے۔ ہو گیا۔ ارشد کو وہ جو کچھ کہہ بیٹھی تھی وہ "ایک عورت" نے کہا تھا۔ وہ عورت جو عفت کے سینے میں قید ہوتے ہوئے پابجولاں کیسے ہوتے تھی۔ یہ عورت دبک گئی اور عفت اعصابی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ پھر یہ کشمکش اعصاب زدگی بن گئی۔

اس کی اندرونی خلفشار اور کشمکش کا تاثر اس کے چہرے پر گہری سرخی، خشک آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں سے ہویدا ہو رہا تھا۔ ارشد نہ سمجھا۔ عفت کی ٹھوڑی کانپنے لگی اور مٹھیاں بند ہونے لگیں۔ آگ سینے میں جو سلگ رہی تھی بھڑک اٹھی۔ زہر جوالا مکھی کے لاوے کی طرح بہ نکلا۔ ارشد کی غصہ بھری باتیں اور طعنہ زنی اس آگ کو ہوا دے رہی تھیں۔

"تم تنہا ہو"۔۔۔ ارشد بے قابو ہو کر اپنی سطح سے بہت نیچے آ گیا اور عورتوں کی طرح طعنہ زنی پر اتر آیا۔۔۔ "تم تنہا ہو؟ تم اس قدر ہیچ ہو کر جس کا نمک کھایا ہے۔۔۔"

عفت کی مٹھیاں بند ہو گئیں۔ اس نے دونوں گھونسے اپنی کنپٹیوں پر مارے اور زور سے چیخ ماری۔ وہ کھڑی تھی، ہوا میں لہراتے ہوئے پودے کی طرح ہلنے لگا۔

"چیخو! اور زور سے چیخو!"۔۔۔ ارشد کے غصے نے اس پر یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ ایذا رسانی اور اذیت پرستی کی حد تک گیا ہے۔ "اتنی زور سے چیخو کہ۔۔۔"

لیکن عفت اب اس کی باتیں سن نہیں رہی تھی۔ وہ بہت دور پہنچ چکی تھی۔ اس نے دونوں بازو پھیلا دیئے، مٹھیاں بند کر کے اور سر اُوپر کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک بار پھر دونوں گھونسے اپنی کنپٹیوں پر مارے۔ ایک بار پھر چیخ ماری۔ ایسی چیخ کہ کمرے کی ایک ایک چیز لرز اٹھی اور عفت جھوم کر دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں مڑتے جا رہے تھے۔

ارشد کو یوں لگا جیسے وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار وحشی پن کیا ہے۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور طاہرہ گھبرائی ہوئی داخل ہوئی۔ دو منٹ بعد امی، اور ان کے پیچھے یوسف کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے کسی نے بھی نہ دیکھا کہ طاہرہ کس وقت اس کمرے میں

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ جب ڈاکٹر بے ہوش عفت کی نبض دیکھ کر اُٹھا تو اس نے بلڈ پریشر ناپنے کا آلہ ہٹاتے ہوئے کہا۔۔۔ "میں ایک انجکشن لگا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس سے مریضہ ہوش میں آ جائے۔ اگر ہوش میں نہ آئے تو سمجھئے کہ سو گئی ہے۔ خون کا دباؤ زیادہ ہے۔ بہرحال گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"چلیئے، ڈاکٹر صاحب! ذرا بیٹھیں گے"۔۔۔ ابا جان نے کہا۔۔۔ ارشد اور اس کا بھائی بھی ڈاکٹر اور ابا جان کے ساتھ اس کمرے میں چلے گئے جہاں نوکر چائے کی پیالیاں رکھ رہا تھا۔

"اس قسم کا دورہ اکثر کسی جذباتی تحریک سے پڑا کرتا ہے۔ میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا۔ یہ ہسٹیریا ہے"۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ نے بتایا ہے کہ اس سے پہلے صرف ایک یا دو مرتبہ ہلکا سا دورہ پڑا ہے۔ اگر آپ مجھے مریضہ کی ہسٹری بتا سکیں تو بہتر مشورہ دے سکوں گا۔"

"مریضہ کی نفسیات کا اس میں زیادہ دخل ہے"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔ "میں آپ کو تفصیلات بتا سکتا ہوں۔"

"صبح میرے پاس آ جائیے گا"۔۔۔ ڈاکٹر نے ذرا سوچتے ہوئے کہا۔۔۔ "دس بجے آپ کو میرے کلینک میں

فی الحال یہ احتیاط کیجئے کہ مریضہ کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے اس کے دل کو ذرا سی ٹھیس پہنچے۔ معلوم نہیں کیس کی تفصیلات کیا ہیں، وہ تو بعد میں سُنوں گا۔ میں ایک بات کہ دُوں کہ مریضہ کے سامنے ایسے آدمی یا عورت کو بھی نہ جانے دیجئے جس کے ساتھ اسے کوئی ہلکی سی بھی عداوت ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مریضہ کے دماغ اور اعصابی نظام کو مکمل طور پر سکون دیا جائے۔ وہ امید سے بھی ہے اور اپنی جگہ یہ ایک پیچیدگی ہے۔ اس کے اثرات علیحدہ کام کر رہے ہیں۔"

"میں اس کے لیے زیادہ فکر مند ہوں ڈاکٹر صاحب!"۔۔۔ ابا جان نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔۔۔ "خدانخواستہ بچے پر بھی ماں کا اثر ہو گیا تو۔۔۔"

"میں اس کو پیشِ نظر رکھوں گا"۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا۔۔۔ "میری کوشش یہی ہو گی کہ اسقاط بھی نہ ہو اور بچے پر کوئی اثر بھی باقی نہ رہے۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ بچہ ماں کے اثرات لے کر پیدا ہو گا۔"

باقی رات گھر والے بے چین رہے۔ عفت انجکشن کے اثر سے بے سدھ پڑی رہی۔ صرف ایک بار اُس نے آنکھیں کھولیں اور اس طرح دیکھا جیسے کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ تین بجے کا وقت تھا۔ ہاتھ اسی طرح ٹھنڈے تھے اور تشنج کچھ باقی تھا۔ بھابی اور طاہرہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کی پیشانی اور ہتھیلیاں ملتی رہیں۔

ایک بار عفت نے سر کو جھٹکے دیئے اور منہ سے اس طرح کی آوازیں نکلیں جیسے خواب میں درد کی شدت سے رو رہی ہو۔ تین بجے کے بعد اس کا جسم ڈھیلا ہونا شروع ہُوا۔ پیشانی پر پسینہ آ گیا اور اس نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس وقت امی بھی پاس بیٹھی تھی۔ عفت نے تینوں کو باری باری دیکھا اور زیرِ لب کہا۔۔۔ "وہ طاہرہ کے کمرے میں چلے گئے نا؟ میں انہیں کہ رہی تھی کہ اُس کے کمرے میں سے ہو کر میرے پاس آیا کریں تاکہ آپ کے چہرے پر مسکراہٹ اور رونق آ جایا کرے۔"

"طاہرہ تمہارے سامنے بیٹھی ہُوئی ہے عفت!"۔۔۔ بھابی نے پیار سے کہا۔

"اسے بھیج دو۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے"۔۔۔ عفت نے ذرا بلند سرگوشی کی۔

طاہرہ کو یوں لگا جیسے اس کا سر چکرانے لگا ہے۔ امی نے طاہرہ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ بھابی نے اپنا نیچے والا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ جس داستان کو وہ مردوں کے کینے پر سینے میں دفن کر چکی تھیں وہ اُمڈ کر سامنے آ گئی۔ یہ سمجھنے میں انہیں دیر نہ لگی کہ عفت کے اس دَورے کا باعث کیا تھا۔ معاً دونوں کو یاد آ گیا کہ جب رات کو وہ عفت کی چیخ سُن کر اس کے کمرے میں آئی تھیں تو طاہرہ پہلے سے اس کے کمرے میں موجود تھی۔

"جانے وہ اور ارشد کس بے ہودگی سے عفت کے پیچھے پڑے ہُوئے ہوں گے کہ بے چاری کا یہ حال کر دیا"۔۔۔ امی نے سوچا اور بھابی کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ بھابی نے امی کو ایسی ہی نگاہوں سے دیکھا۔ عفت کو دیکھا، وہ سو گئی تھی اور طاہرہ سوالیہ نشان بنی پلنگ پر بیٹھی تھی۔

"یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ یہ پہلے ہی کس حال میں ہے"۔۔۔ امی نے طاہرہ کو دھیمی آواز مگر تیکھے لہجے میں کہا۔۔۔ "برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہ پتھر یا فولاد تو نہیں۔"

"میں نے کیا کیا ہے امی؟"۔۔۔ طاہرہ نے فرمانبرداری کے لہجے میں پُوچھا اور کہا۔۔۔ "میں بھی تو اس کی چیخ سُن کر آپ سے

ذرا پہلے اس کمرے میں آئی تھی۔ ارشد کھڑا تھا اور عفت فرش پر پڑی تھی۔"

"طاہرہ!" —— بھابی نے عفت کے سرہانے سے اُٹھتے ہوئے کہا —— "یہ گھر شریفوں کا ہے۔"

"یہ لچھن کہیں اور جا کر دکھائیں صاحبہ!" —— امّی نے پھٹتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکلنے لگی۔ بھابی نے عفت کے اوپر رضائی سیدھی کی۔

"تو آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں شریفوں کے گھر میں بدمعاشی کر رہی ہوں؟" —— طاہرہ نے محسوس کیا جیسے وہ رو پڑے گی لیکن اخلاقی جرأت نے اس کا ساتھ دیا اور وہ خوداعتمادی سے بولی —— "بات کرنے سے پہلے سوچ تو لیا ہوتا قصہ کیا ہے۔ شریفوں کے گھروں میں یہ اوچھا پن نہیں ہوتا۔"

"لو اور سن لو" —— امّی نے فوری جواب تیار نہ پاتے ہوئے کہا۔

لیکن طاہرہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

گھر کے ہر فرد و بشر پر شب بیداری کا خمار طاری تھا۔ عفت انجکشن کے اثر سے بےخبری کی نیند سو رہی تھی۔ "آشنا بھون" کا اونگھ رہا تھا لیکن جو طوفان چند دن پیشتر طاہرہ کے گرد منڈلا کر سو گیا تھا جاگ اُٹھا اور گھر میں صرف طاہرہ تھی جو مکمل طور پر بیدار تھی۔ اس بھی اور دماغ بھی۔ وہ سمجھی تھی کہ عفت کی من گھڑت کہانی مردوں کی بروقت مداخلت اور کوشش سے دب گئی ہے اور عورتوں دل صاف ہو گئے ہیں مگر ان کے آج کے طنز آلود ردیّے سے انہیں یقین ہو گیا کہ یہ آگ ان کے سینوں میں کبھی نہیں تھی۔ اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ اب مرد چاہے کچھ کریں وہ ان عورتوں کی زبانیں بند نہ کر سکیں گے۔ اب ان کی نیت اور دماغ کو سنبھالنا مشکل طاہرہ نے سوچا کہ اب فرار کے سوا کوئی علاج نہیں لیکن..... اسے خیال آیا —— "یوں بےآبرو ہو کے تو نہ نکلا جائے۔ کہیں ایسا ابا جان اور بھائی جان جیسے مشفق بزرگ بھی اس کی غیر حاضری میں اُس کے خلاف بدظن ہو جائیں" —— وہ ان بزرگوں کو کسی قیمت غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

طاہرہ افسردہ نہ ہوتی، نہ ہی اسے اپنی نیکیوں کا ماتم کرنے کی سُوجھی۔ ایک ارادہ اس کے سینے میں جاگ اُٹھا تھا۔ وہ بھی کہ اس کا روپیہ ٹھکانے لگ چکا ہے اور پانچ سو روپیہ سوٹ کیس میں رکھا ہے جو ہنگامی حالات میں کام دے گا۔ اُن بھابی کے دو فقروں نے اس کی رگوں کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔

اس نے خدا کو یاد کیا۔ دل ہی دل میں وہ خدا کے حضور گڑگڑائی۔ اس کی سوچ و فکر میں اب یاسیت اور اُداسی نہیں تھی۔

"مجھے تیرے طوفانوں کی قسم میرے خدا!" —— وہ آنکھیں بند کر کے خدا سے مخاطب ہوتی —— "مجھے استقلال دے کہ تیری راہ میں ان طوفانوں کا مقابلہ کر سکوں۔ طوفان کو اور تیز کر دے اور مجھے ثابت قدمی دے۔ مجھے ایمان کی مضبوطی دے۔ آمین۔ ثم آمین۔"

اور خدا نے اسے اپنے نور کی ایک کرن دکھائی —— نجمہ —— طاہرہ کو محسوس ہوا جیسے اس کے ہونٹ مُسکرا رہے ہوں کے رگ و ریشے میں ایک انوکھی سی لہر دوڑ گئی اور اُسے یوں لگا جیسے اس میں بجلی کی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ اچانک یہ اراد —— "نجمہ کو اطلاع دے کر خاموشی سے نکل جاؤں گی۔"

اسے پھر ابا جان اور بھائی یُوسف کا خیال آ گیا اور اس نے یہ ارادہ ذرا سا التوا میں ڈال کر فیصلہ کیا کہ بزرگوں کا یہ ردِعمل دیکھ لے، وہ اس کے لیے اتنا کچھ کر رہے ہیں، ان کو ناراضی کا موقع نہ دیا جائے۔ اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ اپنی زبان سے شکایت نہیں کرے گی۔ ایک وہ دن تھا جب طاہرہ کے خلاف یہ الزام تراشی پھیلی تھی تو وہ باہر نکلنے سے بھی ڈرتی تھی اور آج کی صبح وہ انوکھے سے برتری کے احساس سے سرشار کمرے سے نکلی جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ غسل خانے میں گئی اور سب کے ساتھ معمول کے مطابق ناشتہ کیا۔

ناشتے پر آج بھی ماحول پر مُردنی چھائی ہُوئی تھی۔ کچھ نیند کے بوجھ سے اور کچھ عفت کی حالت کی وجہ سے۔ طاہرہ کو اپنے اُوپر نہیں، سارے گھر پر افسوس ہو رہا تھا کہ یہ کیا کبھی کس حادثے کا شکار ہو گئی۔ ارشد خاص طور پر خاموش اور گم سم تھا۔ ابا جان ڈاکٹر کے متعلق ہی ہدایات دیتے رہے۔ صرف بچے تھے جو اکّا دُکّا بات کر کے محفل میں لطیف سا ارتعاش پیدا کرتے تھے۔

"سنو بھئی! سبھی عورتیں سُن لو" —— ابا جان نے کہا —— "عفت کے کمرے میں باہر کی کوئی عورت نہ جائے۔ ڈاکٹر نے سخت ہدایت کی ہے کہ اس کے سامنے کوئی ایسا انسان نہ جائے جسے وہ ذرا سا بھی ناپسند کرتی ہو۔ اس کے دماغ کو مکمل سکون کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات اڑوس پڑوس کی عورتیں آ جمع ہوتی ہیں۔"

عفت ابھی تک سو رہی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ فضا میں اذیت ناک کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ہر کوئی ملول نظر آ رہا تھا۔ مرد دفتر چلے گئے۔ ارشد ڈاکٹر کی طرف، امّی اور بھابی باورچی خانے اور عفت کے کمرے کے چکر کاٹنے لگیں۔ طاہرہ اپنے آپ کو ہر پابندی اور الجھن سے آزاد سمجھ رہی تھی۔ وہ برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ امّی پاس سے گزری اور ذرا قدم آہستہ کر کے طاہرہ سے کہا —— "تم عفت کے کمرے میں نہ جانا۔ ڈاکٹر کی ہدایت تم نے سن لی ہے" —— اور جاتے جاتے بڑبڑانے کے لہجے میں کہہ گئی —— "کرموں جلی کو دو دن تو آرام سے جینے دو۔"

طاہرہ کے اردگرد یہ دو فقرے کتنی ہی دیر اس طرح گونجتے رہے جس طرح بھڑوں کا غول اس کے گرد بھنبھنا رہا ہو اور اسے سنے کو غول کا گھیرا تنگ ہو رہا ہو۔ اس کے سینے میں درد کی ہلکی سی ٹیس اُٹھی جسے اس نے وہیں دبوچ لیا۔ اب وہ ان ٹیسوں سے بھی آزاد ہو رہی تھی اور دور بہت دور اُڑ جانے کو پَر تول رہی تھی۔ بظاہر وہ پسپا ہو رہی تھی لیکن اس پسپائی میں ایک پیش قدمی تھی۔ اُڑنے والے ایک ہی میدان کے پابند نہیں رہتے۔ طاہرہ نے نظروں سے اوجھل ہوتی امّی کی پیٹھ دیکھی اور زیرِ لب مُسکرا دی۔ اسے خیال آیا کہ خاموشی بہترین جواب ہے۔

ذرا سا اِدھر اُدھر ٹہل کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ غیر ارادی طور پر سُوٹ کیس کھولا۔ ساجدہ امّی کی تصویر نکالی۔ اس کے ساتھ ہی ارشد کی تصویر رکھی تھی، وہ بھی اُٹھا لی۔ اس نے دونوں تصویروں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ خود ارشد کے پہلو میں کھڑی ہے۔ اس کی نگاہیں ایک تصویر کو دیکھتیں پھر دوسری کو اور اس کے ذہن میں امّی ساجدہ کا تصور بیدار ہو گیا۔ اس امّی کا تصور جسے اس نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

ایک انوکھا سا خیال، ایک اجنبی سا، بظاہر مضحکہ خیز خیال اس کے دماغ میں آیا —— "کاش! ارشد میرا باپ ہوتا" —— اس کے جسم و جان کے گوشے گوشے میں پیار و محبت اور پدرانہ شفقت کی پُرلطف اور پُرسوز لہر دوڑ گئی —— ارشد اور ساجدہ —— دو تین ثانیے

کے لیے ارشد اسے جہانِ دگر کی مخلوق دکھائی دیا۔ اس نے چاہا کہ ان دونوں تصویروں کے سامنے سجدہ کرے۔ یہ عشق کا عروج تھا۔ محبت کی وہ حد جہاں تک صرف طاہرہ اور ارشد کی ہی محبت پہنچ سکتی ہے، روحوں میں سموئی ہوئی محبت۔

ذہن کے کسی کونے سے بگولا سا اُٹھا اور خیالوں کو بہت اوپر اُڑا لے گیا۔ پھر ایک آندھی اس کے ذہن کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ گرد و غبار سے جیسے طاہرہ کی آنکھیں بند ہو گئی ہوں اور وہ بھٹک کر اندھا دُھند آندھی کی سمت چل پڑی ہو۔ امّی مرحومہ نے اس کے آنسو نکال دیئے اور ارشد کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا ارادہ اسے بچھو کی طرح ڈس گیا۔ وہ استقلال اور حوصلہ جو اس نے بلا تکلف اور بلا کوشش پا لیا تھا خیالوں کی چکراتی ہوئی آندھی میں اڑ گیا۔ طاہرہ کے تو جیسے پاؤں اُکھڑ رہے تھے۔

وہ بے خیالی میں بلکہ بے بسی میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ دونوں تصویریں پہلو بہ پہلو میز پر رکھ کر ماضی و حال کے چکر میں اُلجھ گئی۔ دُکھتے دل سے اعتراف کیا کہ ارشد کو چھوڑ کر جانا آسان نہیں۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو حوصلہ دینے کی کوشش کی لیکن آندھی بہت تیز اور تند تھی۔ اس کے سوچنے کی رفتار سے زیادہ تیز۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ امّی مرحومہ کی تصویر پر پڑے ہوئے دو آنسو کب گرے ہیں اور وہ کس وقت سے کہنیاں میز پر ٹیکے سر ہاتھوں میں تھامے میز پر جھکی ہوئی ہے۔

اس نے امّی کی تصویر کو اٹھایا تو دونوں آنسو یوں بہ گئے جیسے اس کی امّی اس کی بے بسی پر رو دی ہو۔ طاہرہ سے رہا نہ گیا۔ اس نے دونوں تصویریں دل کے ساتھ لگا لیں اور کھُل کر روتی اور جانے کتنی دیر روتی رہی۔

جب نوکر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی ”بی بی جی! کھانا تیار ہے“ تو طاہرہ نے دیکھا کہ وہ چپلیوں سمیت پلنگ پر تھی۔ کس وقت لیٹی تھی؟ کس وقت سوئی تھی؟ کیا خواب دیکھا تھا؟ اسے کچھ یاد نہ آیا۔ اسے تصویریں یاد آئیں۔ پلنگ پر دیکھا تو تصویریں الٹی پڑی تھیں۔

”اوہ! تم کھڑے ہو ابھی؟“ — طاہرہ نے نوکر سے کہا ”میرا کھانا یہیں لے آؤ۔“

اسے معلوم تھا کہ مردوں کا کھانا تو دفتر جا چکا ہے۔ امّی اور بھابی کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں کیا تک ہے۔ نوکر کے جانے کے بعد طاہرہ کو پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ اس نے نجمہ کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس فیصلے کی پابند نہ رہ سکے گی۔ اس کے جذبات اسے اس گھر سے نکلنے نہ دیں گے۔ اس کے ارادے، حوصلے اور ہمت متزلزل تھے۔ اس نے ہر فیصلہ وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور دماغ کو خالی کر کے غسلخانے میں ہاتھ منہ دھونے چلی گئی۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر محو تھی کہ اسے عفت کا خیال تک نہ آیا۔

شام ساڑھے چار بجے مردوں کے آجانے سے گھر میں پھر چہل پہل شروع ہو گئی۔ ارشد طاہرہ کے کمرے میں آیا۔ تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگا ”ڈاکٹر خاصا متفکر ہے۔ میں نے عفت کے متعلق اسے بہت کچھ بتایا ہے۔ اس کی شادی کا خاص طور پر ذکر کیا تھا اور ازدواجیات کے متعلق اس کے نقطۂ نگاہ کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس نے ذہنی امراض کے ایک ڈاکٹر کا پتہ دیا ہے اور کچھ انجکشن بھی لکھ دیئے ہیں۔“

”آخر ہوا کیا تھا اسے؟“ — طاہرہ نے پوچھا۔

ارشد نے رات کی بات سنا ڈالی۔

”تمہیں برداشت کرنا چاہیئے تھا“ — طاہرہ نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

”اگر تم ہوتیں تو بھی برداشت نہ کر سکتیں“ — ارشد نے جواب دیا۔

”امّی اور بھابی کے دل میں وہ باتیں پھر تازہ ہو گئی ہیں“ — طاہرہ نے کہا — ”دونوں مجھے جلی کٹی سنا بھی چکی ہیں۔ معلوم نہیں انجام کیا ہوگا؟“

ارشد نے گردن کو ذرا سا خم دیا اور زیرِ لب صرف اتنا کہا — ”اللہ بچائے۔“

وہ کمرے سے باہر نکلتے نکلتے رک گیا اور بولا — ”طاہرہ! میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ ثابت قدم رہنا۔ ہمارا خیال تھا تم محفوظ ہو گئی ہو۔ میں آج ہی ابا جان اور بھائی جان سے بات کرتا ہوں۔ تم ذرا ان عورتوں سے دُور رہنا۔“

ارشد چلا گیا تو طاہرہ نے سوچا کہ ان عورتوں سے دور رہنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ وہ ان سے کہیں دُور چلی جائے۔ اس نے وہاں سے چلے جانے کا جو ارادہ کیا تھا وہ پختہ ہو گیا۔

عفت کو اسی روز انجکشن شروع ہو گئے۔ شام کو کمپونڈر آ کر ایک انجکشن دے گیا۔ ڈاکٹر نے اسے باغیچے میں ذرا سا ٹہلنے کے سوا اور کسی طرف جانے کی ممانعت کر دی۔ خوراک کا چارٹ بنا کر بھیج دیا اور یوں اسے مکمل طور پر مریض بنا دیا گیا۔

رات کھانے کے بعد گھر والوں کی محفل جلدی منتشر ہو گئی۔ ابا جان کی سخت ہدایت کے مطابق ارشد کو عفت کے کمرے میں بیٹھنا پڑا۔ طاہرہ اپنے کمرے میں تھی۔ ذرا سا پڑھا لیکن کتاب میں طبیعت جم نہ سکی۔ ایسی تنہائی میں بھابی کے بچے اس کا خوب ساتھ دیا کرتے تھے۔

وہ اُٹھ کر بھابی کے کمرے کی طرف چل پڑی کہ کسی بچے کو پکڑ لائے لیکن دروازے پر ہی رک گئی۔ بھابی کے بند دروازے میں سے بھابی کی سخت تیکھی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے چند الفاظ نے ہی طاہرہ پر موضوعِ سخن آشکار کر دیا۔ بھابی اور اس کا خاوند، ارشد اور طاہرہ کے درپردہ تعلقات، عفت کا ردِ عمل اس مرض کی صورت میں اور طاہرہ کے خلاف عفت کے الزامات پر جھگڑ رہے تھے۔ بھابی عفت کو سچا اور مظلوم ثابت کر رہی تھی اور اس کے حق میں طاہرہ کو جی بھر کے کوس رہی تھی۔

یوسف بھائی جو شاید دلائل سے اپنی بیوی کو سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے یک لخت تیز ہو گئے اور بولے — ”دیکھو، زینت! بہت جھک جھک ہو چکی۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ یہ بکواس دوبارہ میرے کانوں میں نہ پڑے۔ ایک شریف لڑکی کو بدنام کرتے تمہیں شرم نہیں آتی؟ عفت کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔ اس کے دل میں جو آتا ہے کہہ گزرتی ہے۔ جیسے تم ذی ہوش سمجھتی ہو وہ نیم پاگل ہو چکی ہے۔ اس کا باقاعدہ علاج شروع کرایا جا رہا ہے۔ طاہرہ کے خلاف میں آئندہ ایک لفظ نہ سنوں گا۔ بے حیائی اور بدتمیزی کی کوئی حد ہوتی ہے۔“

”گھر میں سارا دن ہم رہتی ہیں“ — بھابی کہاں تھی اتنی جلدی ہار ماننے والی۔ جوابی حملہ کرتے ہوئے بولی — ”ہماری نظروں کے سامنے جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ لوگ نہیں جانتے اور نہیں دیکھتے۔ آپ کی اس لاڈلی کا چلن شریفانہ نہیں۔ میں ایک بار نہیں سو بار پوچھوں گی کہ کل رات وہ عفت کے کمرے میں کیا کر رہی تھی؟ میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہ ارشد کو وہاں سے اپنے کمرے میں

لانے کے لیے گئی تھی جسے عفت برداشت نہ کرسکی اور اس پر دورہ پڑ گیا"۔

"یہ تمہیں کس نے بتایا؟" ـــــ ارشد کے بھائی نے پوچھا۔

"ابھی بتایا نہیں کسی نے؟" ـــــ بھابی نے غصہ بھری خود اعتمادی سے کہا ـــ "عفت کو ذرا بہتر ہونے دو وہ خود بتا دے گی"۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے یہ واقعہ فرض کرلیا ہے" ـــــ یوسف نے کہا ـــ "تمہاری نیت کی خرابی کا اندازہ یہیں سے ہوتا ہے۔ اگر تم میں ذرہ بھر اخلاق ہوتا تو منہ سے بات نکالنے کی بجائے اصلی واقعہ کی چھان بین کرلیتیں۔ لیکن زینت! بعض اوقات تم اس قدر پست خیال ہو جاتی ہو کہ شکل وصورت ہی بگاڑ لیتی ہو۔ اگر تمہارا مقابلہ طاہرہ سے کیا جاتے تو ...."

بھابی عورت تھی، وہ اپنا مقابلہ ایسی لڑکی کے ساتھ کیسے برداشت کرتی جس کی تعریف اس کا خاوند کر رہا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہوگئی۔ باہر بھی ایسی ہوئی کہ عقل کی حدود سے ہی باہر چلی گئی۔ یک لخت رونے لگی اور روتے روتے کہنے لگی ـــ "میری شکل اور خدا نے بنائی جو ایسی ہے کہ آج میرا مقابلہ ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ مردوں کی نیت ہوتی ہی ایسی ہے"۔

"اوہ خداوند! اوہ میرے خدا!" ـــــ یوسف جھنجلا کر بولا ـــ "زینت! تمہاری کھوپڑی میں مغز ہے کہ نہیں۔ میں کیا کہ رہا ہوں"

"میں سب سمجھ گئی ہوں" ـــــ بھابی نے غم وغصہ سے لرزتی آواز میں کہا ـــ "مجھے پہلے ہی سے شک تھا"۔

"کیا شک تھا؟"

"آپ بھی تو ارشد کے بھائی ہیں نا" ـــــ بھابی نے دلیری سے کہا ـــ "ابھی معلوم نہیں یہ لڑکی اور کتنے مردوں کو انگلیوں پر نچائے گی، نہ معلوم اور کتنے گھر اجاڑے گی"۔

"خدا کے لیے بات کرنے سے پہلے ذرا سوچو" ـــــ ارشد کے بھائی نے طنز آلود لہجے میں کہا ـــ "شرم وحیا کا بھی خیال رکھو، تین بچوں کی ماں ہو اور کیا بک رہی ہو"۔

طاہرہ دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑی سنتی رہی۔ جھگڑا جانے کب سے چل رہا تھا اور یہ مکالمے جھگڑے کا عروج تھے۔ بھابی کے یہ آخری فقرے طاہرہ کو تیروں کی طرح لگے۔ رات سرد ہونے کے باوجود اس نے کپڑوں کے اندر پسینے کی نمی محسوس کی اور ذرا اسی لمحے ایک خیال اس کے دماغ میں آگھسا۔ اس نے سوچا کہ بھابی کے الزامات اور شکوک درست ہوں یا نہ ہوں ـــــ سوال یہ ہے کہ گھر میں یہ فساد میرے وجود کی بدولت شروع ہوا ہے ـــــ اس نے کھڑے کھڑے سوچا ـــ "بھابی جیسی ذہین اور صلح پسند عورت آج اس ذلالت تک جا پہنچی ہے۔ کیوں نہ میں ہی اس منظر سے نکل جاؤں اور ہنستے کھیلتے گھر کو اس آسیب سے پاک کردوں .... اب تو میرا نکل جانا ہی بہتر ہے۔ راہِ نجات ایک ہی ہے۔ میری بھی اور اس گھر کی بھی"۔

طاہرہ نے آہ لی اور وہاں سے چل پڑی۔ تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ اپنے خیالوں میں گم لیکن اب یہ خیال بے جان خیال نہیں تھے۔ ان میں اڑان کی قوت تھی۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ کس سمت کو جا رہی ہے اس کے کانوں سے ارشد کی امی کی غصہ بھری آوازیں ٹکرانے لگیں۔ وہ چونک اٹھی، ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ ابا جان اور امی کے کمرے کے پاس کھڑی تھی۔

"اب دو ہی صورتیں ہیں جو پسند ہو ویسے کرو" ـــــ امی فیصلہ کن لہجے میں ابا جان سے کہہ رہی تھی ـــ "یا تو اس طاہرہ کو یہاں سے چلتا کر دو یا بہتر صورت یہ ہے کہ ارشد اور عفت کو الگ کوٹھی الاٹ کرادو۔ شہر کے کسی دوسرے سرے پر"۔

"معلوم ہوتا ہے تم اب میری جان لے کے رہو گی" ـــــ ابا جان نے تھکے ہوئے غصے میں کہا ـــ "اس بڑھاپے میں تم نے مجھے کانٹوں پر پھینک دیا ہے"۔

"میں نے نہیں" ـــــ امی نے اور تیز ہو کر طنزیہ کہا ـــ "تمہاری اس لاڈلی نے۔ اگر اسے اس گھر میں رکھنا ہے تو میں کل یہاں سے چلی ـ میں چپ تھی شاید آپ لوگ خود ہی اچھا بُرا سوچ لیں گے"۔

امی کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اور ابا جان بہت دیر سے لڑ رہے ہیں۔ طاہرہ وہاں سے تیزی سے چل پڑی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا سینہ اٹھ اٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔ بظاہر وہ ہیجانی کیفیت میں تھی۔ اداس بھی تھی لیکن اس کا دماغ پورے سکون سے سوچ وفکر میں مصروف تھا۔ وہ رنجیدہ تھی لیکن مایوس ونامراد نہیں تھی۔ اس کا عزم اور ولولہ پوری آب وتاب سے بیدار ہوچکا تھا۔ طاہرہ نے سوٹ کیس کھولا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ایک گھنٹہ بعد وہ پیڈ اور قلم لے کر میز کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

تیرہ وتار رات کے اسرار رات کی خاموشی میں طلوعِ صبح کی پہلی سپید کرن کے سہارے افق کے دوسری طرف چھپ گئے۔ سورج ابھرا۔ اٹھتا گیا بڑھنے لگا اور سوتے ہوتے اسرار کو جگا کر خود افق کی اوٹ میں چھپ گیا۔

ایک اور رات آئی اور "آشا بھون" کو تیرگی کے پردوں میں لپیٹ لیا۔

راولپنڈی ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر بکھری ہوئی گٹھڑیوں، ٹرنکوں، بوریوں اور گٹھڑیوں کی طرح کمبلوں میں لپٹے
ہوئے انسانوں میں ہلچل مچ گئی۔ صبح ٹھٹھری ہوئی تھی۔ یوں تو سردی موسم بہار کے آغاز میں دم توڑتی جا رہی تھی لیکن دو
پہلے کے اَدلوں اور بہار کی آمد کا اعلان کرنے والی پہلی بارش نے سردیوں کو دو چار روز کے لیے روک لیا تھا۔ سورج
کرنیں بہار کے پیغام کو سینے سے لگائے راولپنڈی ریلوے سٹیشن کی عمارت کے منڈیر پر بیٹھی کانپ رہی تھیں۔ پلیٹ
پر بکھری ہوئی مخلوق بھی کانپ رہی تھی۔ انجن نے سٹیشن میں داخل ہو کر وسل جو دی تو لرزتے ہوئے جسموں میں بلا کی گرمی آگئی
لوگوں میں یوں ہلڑ مچ گیا جیسے وہ گاڑی کو پلیٹ فارم سے باہر ہی روک لیں گے۔ نجمہ اور اس کا خاوند سیکنڈ کلاس کے انتظا
کے برآمدے میں ہی کھڑے ہو گئے۔ گاڑی کی رفتار سست تھی لیکن نجمہ کی نگاہیں تیزی سے گاڑی کی کھڑکیوں کو طے کر رہی

"تار تو اسی گاڑی کا دیا تھا طاہرہ نے؟" —— نجمہ کے خاوند نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" —— نجمہ نے جواب دیا۔ "اسی گاڑی کا.... وہ رہی طاہرہ" نجمہ نے خاوند کو کلائی سے پکڑ کر گھسیٹتے ہو
کہا —— "اس نے ابھی ہمیں نہیں دیکھا"

دھکے دیتی اور دھکے کھاتی مخلوقِ خدا کو چیرتی نجمہ انٹر کلاس کے ایک زنانہ ڈبے میں گھس گئی۔

"یہ رہے تمہارے بھائی جان، اطہر صاحب" —— نجمہ نے طاہرہ کو مسافروں کے بے ہنگم ریلے سے باہر
اور ایک خالی جگہ روک کر تعارف کرایا —— "دیکھئے صاحب! ملیے میری سگی بہن طاہرہ سے"

"تمہارا تار کل شام پانچ بجے ملا تھا" —— نجمہ نے کہا —— "بخدا اتنی خوشی ہوئی کہ صبح کے انتظار میں کمبخت را
گزرنے میں نہیں آتی تھی"

"میں نے تو آنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا" —— طاہرہ نے پرسکون لہجے میں کہا —— "لیکن وہاں کے حالات اچانک
اس قدر بگڑ گئے ہیں کہ....؟"

"چلو ہٹاؤ" —— نجمہ نے اس کا فقرہ کاٹتے ہوئے کہا —— "یہ جھک جھک پھر سنیں گے" —— اس کے کان پر
—— "کسی کو بتا کر آئی ہو؟"

"نہیں!" —— طاہرہ نے جواب دیا —— "ارشاد اور عفت کے نام خط چھوڑ آئی ہوں۔ مجھے تو توقع ہی نہیں کہ اتنی

آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ ٹائم ٹیبل دیکھا اور یہی گاڑی موزوں نظر آئی۔ یہ رات ساڑھے دس بجے لاہور سے چلتی ہے
فکر کرو آپا! یہ تار میں نے خود لکھا تھا اور خود ہی تار گھر جا کر دیا تھا.... ہاں سنیں آپا! اور آپ بھی بھائی جان! وہ لوگ میری
ں میں یہاں تک ضرور پہنچیں گے یا ارشد کا خط ضرور آئے گا۔ خواہ کچھ ہی ہو، آپ انہیں کہیں کہ میں یہاں نہیں آئی"

"اس کی فکر نہ کرو" —— نجمہ نے کہا اور خاوند کو قلی لانے کو بھیجا۔ طاہرہ سے کہنے لگی —— "ہم نے تمہیں اغوا تھوڑے
کیا ہے۔ تم بالغ ہو۔ اپنی مرضی سے آئی ہو۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ تم نہ ان کی رشتہ دار ہو نہ کچھ لگتی ہو۔ پتہ چل بھی گیا
یا حرج ہے لیکن کوشش یہی ہو گی کہ انہیں تمہارا سراغ نہ ملے"

"بات یہ ہے آپا!" —— طاہرہ نے ملول لہجے میں کہا —— "میں اب ان لوگوں کو اور اس گھر کے بچے بچے کو دل سے
دینا چاہتی ہوں ورنہ میرے دل میں ایک ہلچل مچی رہے گی اور سکون نہیں مل سکے گا"

تانگے میں طاہرہ نے مختصراً نجمہ کو عفت اور گھر والوں کی مزاجی تبدیلیوں کا حال سنایا، چھ پناہ گزین کنبوں کی آبادکاری
ضہ بھی سنایا۔ نجمہ کے خاوند، اطہر، نے یہ بات سنی تو گھوم کر ایک بار پھر طاہرہ کو دیکھا۔ وہ طاہرہ کے متعلق بہت کچھ سن
تھا لیکن جس انداز سے طاہرہ یہ باتیں سنا رہی تھی اس کے لیے حیران کن تھا۔ اس کے انداز میں خود ستائی اور خود نمائی کا عنصر
نہ تھا۔ وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے اس کا یہ ایثار معمولی سی بات ہو جیسے ایک چیز یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دی۔

نجمہ کا گھر "آشنا بھون"، جیسا بنگلہ تو نہ تھا تاہم اچھا خاصا وسیع مکان تھا۔ کئی کمرے تھے۔ بجلی اور پانی کا انتظام
فرنیچر بھی اچھا تھا۔ نجمہ نے طاہرہ کا تار ملتے ہی اس کے لیے ایک کمرہ تیار کر دیا تھا۔ اس وسیع مکان میں نجمہ، اس کا خاوند
بوڑھی ملازمہ اور ایک نوکر رہتا تھا۔ اطہر گزیٹڈ پوسٹ پر ملازم تھا اور نجمہ ایک سکول میں پڑھاتی تھی۔

یہ سکول امریکن کنوینٹ کی طرز پر چلایا جا رہا تھا جس میں اردو اور عربی کو انگریزی کے برابر اہمیت دی جاتی تھی۔ بچوں
لیے باقاعدہ یونیفارم تھی۔ استانیاں تجربہ کار اور بچوں کی تربیت اور نفسیات کی سوجھ بوجھ رکھنے والی تھیں۔ فیس زیادہ ہونے
وجہ سے سکول میں کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے آتے تھے۔ چوتھی جماعت تک لڑکے اور لڑکیاں اکٹھی پڑھتی تھیں۔
ں صرف استانیاں پڑھاتی تھیں۔ پانچویں جماعت سے سکول کے دو حصے ہو جاتے تھے۔ ایک لڑکیوں کے لیے دوسرا
وں کے لیے۔ لڑکوں کو مرد پڑھاتے تھے اور لڑکیوں کو استانیاں۔ سکول سے ملحق سکول کا ہوسٹل بھی تھا جس میں معدودے
لڑکے اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ ان کی نگرانی کے لیے چند ایک استاد اور استانیاں بھی وہیں رہتی تھیں۔

سکول کے نظم و نسق پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ تمام استاد اور استانیاں صرف ڈگری یافتہ ہی نہیں تھیں۔ دیانت دار
تھیں۔ دو استانیوں کو محض اس لیے ملازم رکھا گیا تھا کہ وہ دیانت دار اور محنتی تھیں ورنہ ان کے پاس کوئی ڈگری یا سند
ں تھی۔ بچوں میں دل چسپی لینا، بچوں کو قوم کی امانت سمجھنا اور بچے کو سکول کے دوران میں محسوس نہ ہونے دینا کہ وہ ماں
سے الگ ہو کر بے آسرا ہو گیا ہے، کو بہترین سند سمجھا جاتا تھا۔

طاہرہ بھی اسی زمرے میں آتی تھی۔ نجمہ نے استانیوں میں طاہرہ کا خوب پروپیگنڈہ کر رکھا تھا۔ اس کے قصے سب
ناتی رہتی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن طاہرہ کو سکول لے گئی۔ استانیوں سے تعارف کرایا۔ پھر ہیڈ مسٹریس اور ہیڈ ماسٹر کے

پاس لے گئی۔ سبھی طاہرہ کی حسین شخصیت اور بھولی بھالی، شگفتہ اور خود اعتمادی سے بھرپور باتوں سے متاثر ہوئے۔

ہیڈ مسٹرلیس نے صرف اتنا کہا ۔۔۔ "لڑکی بڑی ذہین ہے، نجمہ! لیکن سکول میں ملازم رکھنے سے پہلے ہمیں
سوچنا پڑتا ہے" ۔۔۔ ہیڈ مسٹرلیس نے ایک آدھ لمحہ سوچ کر کہا ۔۔۔ "کل سے طاہرہ کو پہلے درجے میں لگا لیتے ہیں لیکن
اگر ہمارے معیار پر پوری اتری تو میں مستقل ملازمت کا وعدہ کرتی ہوں۔"

"میں آپ کی بے حد مشکور ہوں مسز فاروقی!" ۔۔۔ نجمہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں اسے گھر میں
رہوں گی جس لڑکی نے سات آٹھ ہزار روپیہ انسانیت کی فلاح و بہبود پر خرچ کر دیا ہے، اس کی روح کا مقام
سکتی ہیں۔"

"ہاں مسز اطہر!" ۔۔۔ ہیڈ مسٹرلیس نے تعریف کے لہجے میں کہا ۔۔۔ "یہ تفصیلات تو آپ سنا ہی چکی ہیں۔ میں ا
کی قدر کرتے ہوئے اسے اس سکول میں جگہ دے رہی ہوں ورنہ آپ نے خود دیکھا ہے کہ ہم نے کتنی ہی تجر
کو صاف جواب دیا ہے۔"

اور طاہرہ کو سکول میں پہلے درجے میں لگا لیا گیا۔

"آشا بھون" کی صبح ہر صبح کی طرح طلوع ہوئی۔ باغیچے میں بہار کے آغاز کی پُر رومان انگیز فضا نے جگا رہی تھی
گزرتی ہوئی رات کی طرح رخصت ہو رہی تھیں۔ صبح کی سردی کے ساتھ بہار کے لطیف سوز کا بھی پتہ ملتا تھا۔ عفت
سے سنبھل چکی تھی۔ وہ بستر سے اٹھی اور کھڑکی کھول دی۔ سورج کی ایک زرد کرن یوکلپٹس کے لمبے تڑنگے تنے
تھی۔ کھڑکی کھلتے ہی خوشبو سے معطر ایک جھونکے نے عفت کی پیشانی اور رخساروں کو چُوما اور اس کے دل دما
راتوں اور ایک دن کی اعصاب زدگی کے مابعد کے اثرات اور نیند کے خمار کو دھو ڈالا۔

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس کے ہونٹ اس طرح ہل گئے جیسے اس روح افزا جھونکے کا بوسہ لے
اس نے انگڑائی لی اور بہار کے اس پیغام کو جیسے اس انگڑائی میں سمو لیا ہو۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے گردن گھ
میز پر رکھی ہوئی ارشد کی تصویر کو دیکھا۔ تصویر مسکرا رہی تھی۔ عفت کے ہونٹ بھی مسکرا دیئے۔ اس مسکراہٹ میں پیا
تھا اور ہلکی سی طنز بھی تھی شکست کا عنصر بھی تھا لیکن اس کے سینے میں ایک تپش تھی جس نے اس کی تگ و دو کو
ہونے دیا تھا۔

"پاہی نوں کی سمجھے" ۔۔۔ عفت کے گرد ایک سرگوشی منڈلانے لگی جو اس کی اپنی تھی اور یہ سرگوشی صبح بہ
میں تحلیل ہو گئی۔

"ناشتہ تیار ہے بی بی جی!" ۔۔۔ نیم وا دروازے میں سے نوکر کی آواز نے عفت کو اس عالمِ وارفتگی میں سے
ایسے میں وہ باہر کی دنیا کا ایک لفظ نہ سننا چاہتی تھی۔ اس نے بکھرے ہوئے خیالات کو پھر اکٹھا کرنا چاہا لیکن یہ کا
تھا۔ وہ سٹپٹا سی گئی اور آہستہ آہستہ باہر نکل گئی۔

"ارے دیکھو نا میاں! غسل خانے میں ہو گی" ۔۔۔ ابا جان نے نوکر کو ذرا سختی سے کہا۔

سبھی ناشتے پر بیٹھے طاہرہ کا انتظار کر رہے تھے لیکن نوکر نے آکر اطلاع دی کہ طاہرہ کمرے میں نہیں ہے اور نہ ہی
مل خانے میں ہے۔

"باورچی خانے میں ہو گی" ۔۔۔ ارشد کے بھائی نے کہا۔

"وہاں بھی نہیں ہیں" ۔۔۔ نوکر نے جواب دیا۔

"آجائے گی" ۔۔۔ ابا جان نے تحمل سے کہا ۔۔۔ "ذرا دیکھ لو۔"

امی، بھابی اور عفت اس توقع پر خوش ہو رہی تھیں کہ طاہرہ اور دیر سے آئے تاکہ اس کی خود سری ثابت کی جا سکے۔
ی کے دل میں اس قسم کی خواہش بھی آئی ۔۔۔ کاش! طاہرہ اکیلی سیر کو نکل گئی ہو اور مردوں کے سر ذرا سے تو جھک جائیں۔

"باہر نکل گئی ہو گی" ۔۔۔ عفت سے رہا نہ گیا اور امی کے دل کی بات کہہ ڈالی ۔۔۔ "سیر کو گئی ہو گی۔"

سب نے عفت کی طرف دیکھا۔ عورتوں کی آنکھوں میں تائید اور مردوں کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔
لمحے تیزی سے گزر رہے تھے۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ارشد نے گھڑی دیکھی، وہ بے چین تھا۔ اس قدر بے چین کہ
گھڑی دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ ابھی ابھی گھڑی دیکھ چکا تھا۔ پانچ منٹ گزر رہے، دس بھی گزر گئے۔ ارشد کے دماغ میں ایک
خیال آیا اور وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے اس بے قراری کو چھپانے کے لیے نوکر کو ایک بار پھر طاہرہ کے کمرے میں بھیجا لیکن
جواب نفی میں آیا۔

"کیا بیہودگی ہے" ۔۔۔ ارشد اپنے خیال کے تحت بھنا کر اٹھا اور طاہرہ کے کمرے میں پہنچا۔

ایک شک کے تحت اس نے طاہرہ کی میز پر نگاہ ڈالی۔ وہاں دو لفافے پڑے تھے۔ ایک اس کے نام اور دوسرا
عفت کے نام۔ ارشد نے اپنے نام والا لفافہ کھولا۔ کانپتے ہاتھوں سے کاغذ کی تہیں سیدھی کیں اور ایک ہی فقرہ پڑھ کر کمرے
کے اس کونے میں دیکھا جہاں طاہرہ کا ٹرنک اور سوٹ کیس رکھا ہوتا تھا۔ سوٹ کیس غائب تھا۔ خط میں لکھا تھا۔

پیارے ارشد!

"آشا بھون" کو جس دکھ بھرے دل سے چھوڑ رہی ہوں آپ میں سے کوئی بھی اس کا صحیح اندازہ
نہیں کر سکتا۔ میں نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن حالات نے تعاون نہ
کیا۔ کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن وقت کم ہے اور یہ خدشہ بھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ میرے ارادے
ٹھنڈے نہ پڑ جائیں۔ گذشتہ چند دنوں میں میری جو دلی کیفیت رہی ہے میں نے اسے کچلنے اور احوال و کوائف
کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو الزامات مجھ پر لگائے گئے، میں نے ان پر ہنس دینے کی کوشش
کی ہے۔ میں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ تم عفت کو اپنے دل میں جذب کر لو، میں نے یہ بھی کوشش کی ہے
کہ عفت اپنی عادتوں کو تمہاری پسند کے سانچے میں ڈھال لے۔ تم دونوں کو ایک راہ پر چلانے کی جتنی سعی میں
نے کی ہے اسے صرف تم جانتے ہو کہ میں نے عفت کو تمہارے حوالے کر کے کتنی عظیم ذمہ داری اپنے

کندھوں پر ڈال لی تھی۔ میں اس پودے کو اپنے خونِ جگر سے سینچتی رہی۔ میں تمہیں گھنٹوں عفت کا کر دیتا
میں لگی رہی۔ میں نے عفت کے لیے کیا کچھ نہیں کیا مگر میں بدنام اور رُسوا ہوتی، صرف اس لیے کہ میں
اپنی قربانیوں کو مشتہر نہیں کیا تھا تشہیر میرا مقصود نہ تھا۔ میں اپنی رُوح کے تقاضوں کو پُورا کرنے کی قائل ہوں۔ یہ
مجبوری ہے اور جو کچھ عفت، امّی جان اور بھابی نے کیا ہے وہ اُن کی مجبوری ہے۔ کاش! یہ عورتیں ذرا سی
کے لیے میرے مقام تک پہنچ سکتیں۔ معلوم نہیں مقام کس کا اونچا ہے لیکن جب یہ دیکھتی ہوں کہ ان
اور میرے مقام آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح دُور دُور ہیں تو میں نے یہی بہتر سمجھا کہ بیشتر اس
تین ستارے ایک ستارے پر ٹوٹ گرا سے اور اپنے آپ کو بھی فنا کرلیں۔ کیوں نہ یہ تنہا ستارہ ٹوٹ جا
اور ان تینوں کی تابندگی کو قائم رکھنے کی خاطر آسمان کی وسعتوں میں کھو جاتے۔

ارشد! مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب مجھے نہ پا سکو گے۔ مجھے تمہارے گھر کا وہ اچھا ماحول
یاد آرہا ہے جب بچے سے بوڑھے تک ہنستے کھیلتے تھے۔ دکھ تھا نہ کوئی غم۔ جلال آباد کی تو یاد ہی مٹ
گئی تھی۔ پھر میں نے اپنے ہاتھوں تمہیں اور عفت کو دُلہا دلہن بنایا اور "آشا بھون" کی کوٹھی ایسی دلہن بن گ
جس کے جوبن کو میں سدا بہار اور جس کی خوشیوں کو میں دائمی سمجھتی تھی۔ لیکن انسان کی فطری کمزوریوں نے کوٹھی
سہاگ اجاڑنا شروع کر دیا۔ اس تباہی میں میرے وجود کو کتنا دخل تھا؟ صرف تم ہی جانتے ہو یا میرا اور تم
خُدا جانتا ہے، لیکن گھر میں یہ شک یقین کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ یہ بربادی صرف میری وجہ سے ہے۔ ابا جا
بھائی جان، اور تم نے میری وکالت بھی کی اور گھر پر چھاتے ہوئے تکدّر کو دور کرنے کی پوری کوشش
لیکن عفت کے کل رات کے دَورے نے چنگاریوں کو پھر سلگا دیا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ ا
تلاطم کا بھی مقابلہ کر دں لیکن انسان کہاں تک گوارا کر سکتا ہے۔ ایک انسان اپنی زندگی کو کوششوں کا ایک تھ
سلسلہ بنا کر کسی وقت تھک بھی جاتا ہے۔ میں جس دماغ اور دِل کو تعمیری کاموں اور صحت مند سوچ کی طرف
لگانا چاہتی تھی اس پر طنز کی چوٹیں پڑنا شروع ہو گئیں اور دماغ ایک مقام پر آ کر رک ہی نہیں گیا بلکہ پیچھے ہٹنا
شروع ہو گیا تھا۔

تم سب کو الوداع کہتے دکھ ہو رہا ہے لیکن سب سے بڑا دکھ جو میں اپنے اوپر آسیب کی
طرح لے کے یہاں سے نکل رہی ہوں وہ یہ ہے کہ تم اور عفت میرے سامنے ذرا سی دیر کے لیے بھی اس
طرح نہ رہے جس طرح میں نے سوچا تھا۔ میں تم دونوں کو ہنستا بستا، رستا اور ایک دوسرے میں شیر و شکر دیکھنے
کی خواہشمند تھی۔ صد افسوس! تم دونوں نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

ارشد! بہت کچھ یاد آرہا ہے، بہت ہی کچھ یاد آرہا ہے۔ جی چاہتا ہے لکھتی ہی چلی جاؤں لیکن اس
خیال سے رک رہی ہوں کہ یہ غبار نکل گیا تو میرے عزم کی حرارت ہی نہ سرد ہو جاتے۔ میرے سمندر کی موجوں
کا اضطراب ہی نہ ختم ہو جاتے۔ مجھے ایک زندگی جینا ہے، میں اپنی زندگی بنانے جا رہی ہوں، اپنا ایک

گھر بسانے۔ خدا تمہارا گھر بسا تے۔ آمین۔ اب دعاؤں کے سوا میرے پاس کچھ نہیں رہا یا یہ التجا رہ گئی ہے
کہ خدارا اپنا گھر آباد کرو۔ عفت میں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔ انہیں تلاش کرو۔ اس کی عادتوں کو برداشت کرو۔ اپنے
آپ میں ذرا سی تبدیلی پیدا کرو۔ جب تمہارا بچہ پیدا ہو تو اسے میرا پیار دینا۔ بہت سارا پیار۔ کاش! میں
اس پودے کی پہلی کونپل تو دیکھ سکتی جسے میری تمناؤں نے سینچا تھا۔

ابا جان، امی جان، یوسف بھائی جان اور بھابی کو دست بستہ سلام کہنا اور میری طرف سے معافی
مانگنا۔ میری ہستی نے انہیں بہت دکھ دیئے ہیں۔ بچوں کو پیار۔ روفی کو بتا دینا کہ تمہارے لیے میز کے دوسرے
دراز میں چار ٹافیاں رکھی ہیں۔

خدا حافظ، ارشد! تمہاری طاہرہ

ارشد خط پڑھ چکا تو اس نے ویران اور اجاڑ کمرے کے کونے کونے کو دیکھا۔ ہر ایک چیز کو دیکھا۔ اس کمرے میں طاہرہ
ابھی زندہ تھی اور ارشد کو یوں لگا جیسے طاہرہ پلنگ پر بیٹھی ہے۔ وہی مسکراہٹ، وہی مسکراتی ہوئی آنکھیں، رخساروں پر شباب
کی رنگ اور پیشانی پر نور کا پرتو۔ اس نے کمرے میں جیسے ہلکی سی سرسراہٹ سنی ہو۔ اس نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا وہاں
کبھی نہ تھا۔ اس کی اپنی آہ ہُو حق سے ویران کمرے میں دوپہر کو اڑتے چمگادڑ کی طرح دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔

اس نے سر جھکا لیا اور ذہن کو بھی ایک لمحے کے لیے کمرے کی طرح خالی پایا۔ اسے اچانک خیال آ گیا کہ وہ اس کمرے
میں کیوں آیا تھا۔ وہ اپنے خط کو لفافے میں بند کر کے، عفت کے لفافے کو ہاتھ میں لے کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا
بھی بے تابی سے منتظر تھے اور سب کے چہروں پر بے تابی ظاہر ہونے لگی تھی۔ عورتوں کی بیتابی میں غصے کا عنصر غالب تھا
وہ اس منتظر محفل کے پاس جا کھڑا ہوا اور اپنا لفافہ ابا جان کے سامنے، دوسرا عفت کے سامنے پھینک کر دروازے
کی طرف لپکا اور زور سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ابا جان خط پڑھ رہے تھے اور ان کے چہرے پر بڑھاپے کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ عفت نے
لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا اور اس کے چہرے کی رنگت جو کچھ دنوں سے زردی مائل ہوتی جا رہی تھی۔ سفید ہو گئی۔
ہونٹ خشک ہو گئے اور اس نے پیاس کی شدت محسوس کی۔ باقی افراد حیرت سے دونوں خطوں کو دیکھ رہے تھے۔ سبھی
سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ہے؟ ارشد کو کیا ہوا؟ وہ بتائے بغیر کہاں چلا گیا؟ کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ طاہرہ اکیلی گھر سے جا بھی
سکتی ہے۔

ابا جان نے خط ختم کیا تو ان کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ آنسوؤں کو روک رہے تھے۔ انہوں نے خط یوسف
کے سامنے پھینک دیا اور ناشتہ کیے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ عفت کو غشی سی آ رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے خط ختم
کیا اور اُٹھ بیٹھی۔ امی اور بھابی نے اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑی۔ اس کے
قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ کسی نے اُٹھ کر اسے سہارا نہ دیا اور وہ کمرے میں سے نکل گئی۔

"آخر یہ ہے کیا؟" ——— امی نے بے صبری سے پوچھا ——— "یوسف! ہمیں بھی تو کچھ بتاؤ۔"

"معلوم ہوتا ہے گھر میں کوئی نئی کارروائی ہوئی ہے" ——— بھابی نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا حالانکہ وہ بھی حیرت زدہ

تھی کہ یہ ہے کیا؟

"جس گھر میں تم جیسی چڑیلیں موجود ہوں وہاں یہی کارروائی باقی رہ جاتی ہے جو طاہرہ نے کی ہے" ــــ یوسف نے پڑھ کر کہا۔ اس نے خط بھابی کے آگے پھینکا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ امّی بھی بھابی کے اُوپر جھک کر خط پڑھنے لگی۔

"ہائیں؟" ــــ امی نے دو تین فقرے پڑھ کر حیرت زدگی کے عالم میں کہا ــــ "وہ چلی گئی ہے کہیں؟ ... ہول ... گئی کہاں ہو گی؟"

"کسی اور کا گھر اجاڑنے" ــــ یُوسف نے سخت تیکھے اور طنز سے بھرے ہُوئے لہجے میں جواب دیا ــ "یہ وہ گھر جیسے تم [illegible] کہتی ہو۔ وہ تمہاری باتوں سے بھاگی ہے۔ ذرا سوچئے امّی جان! ذرا سوچئے! اس ظالم کو سوچئے [illegible] ایک لاوارث اور کنواری لڑکی پر کیا ہے۔ اس لڑکی پر جس نے پناہ گزینوں کو پناہ دی ہے اور خود جانے کہاں پناہ ڈھونڈنے چلی گئی ہے۔"

"ہو نہ ہو، وہ راولپنڈی نجمہ کے پاس چلی گئی ہے" ــــ بھابی نے خط پڑھتے ہُوئے کہا ــــ "نجمہ کو خط لکھ کر پوچھ لیتے ہیں کیوں پوچھ لیتے ہیں؟" ــــ یُوسف نے جلے ہُوئے لہجے میں کہا ــ "اسے واپس بلانے کا خیال ہے؟"

لیکن امّی اور بھابی کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ کیا جواب دیں۔ کچھ تو صورت ہی ناقابلِ فہم حد تک پیچیدہ تھی اور کچھ یُوسف کا لب و لہجہ جارحانہ تھا۔ وہ اباجان کی پھٹکار کا اندازہ کرنے لگی تھیں۔

عفّت کا تو ابھی کسی کو خیال ہی نہیں تھا اور بھابی کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ بچے ناشتہ کر چکے ہیں، انہیں سکول کے لیے تیار کرنا ہے۔ امّی پھر خط کے اوپر جھک گئی اور آنکھیں سکیڑ کر پڑھنے لگی۔ یوسف ٹہلتے ٹہلتے باہر نکل گیا۔ اباجان کی آواز لائبریری سے آ رہی تھی۔ ارشد کو اُنہوں نے وہیں بلا لیا تھا۔ یوسف بھی ان کے پاس جا بیٹھا۔

"یوسف میاں! میں تو گمان ہی نہ کر سکتا تھا کہ یہ لڑکی اس حد تک بھی پہنچ جائے گی" ــــ اباجان نے کہا ــــ "اتنی عمر میں پہلی لڑکی دیکھی ہے جو اس قدر عجیب و غریب ثابت ہُوئی" ــــ ذرا توقف کے بعد وجد میں آ کر بولے ــــ "بڑا بلند اخلاق، بڑا ہی بلند مقام ہے۔ سبحان اللہ!"

"لیکن سوال تو یہ درپیش ہے اباجان کہ وہ گئی کہاں ہے"؟ ــــ یُوسف نے فکرمند لہجے میں کہا ــــ "ذرا اس کا تصور کریں۔ جانے رات بھر کہاں رہی۔ لاہور میں ہی کہیں رہی ہے یا کہیں باہر چلی گئی ہے۔"

"ارشد کہتا ہے وہ یقیناً راولپنڈی نجمہ کے ہاں چلی گئی ہوگی" ــــ اباجان نے کہا۔

"جی ہاں بھائی جان!" ــــ ارشد نے اُکھڑی ہوئی آواز میں کہا ــــ "وہ اتنی اوچھی اور جاہل نہیں۔ اس کے پاس پانچ سو روپیہ تھا۔ وہ گئی راولپنڈی ہے۔ بھابی کو نجمہ کے رشتہ داروں کے ہاں بھیجتے ہیں۔ وہاں سے نجمہ کا ایڈریس منگوا کر تار دے کر پوچھ لیتے ہیں۔"

"ارشد!" ــــ اباجان کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو ــــ "عفّت کے خط میں طاہرہ نے جانے کیا کچھ لکھا ہے۔ ذرا جا کے دیکھو تو عفّت کی حالت کیسی ہے؟ اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا، اس حادثے کا ردِ عمل تو دیکھ آؤ۔"

ارشد بادلِ نخواستہ اُٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ دو ہی منٹ بعد وہ بھاگا ہُوا آیا اور گھبرا کر کہا ــــ "اباجان! عفّت اوندھے منہ فرش پر بے ہوش پڑی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد گھر کے مرد اور عورتیں بے ہوش عفّت کو پلنگ پر لٹا رہے تھے۔ وہ فرش پر قے کرتی رہی تھی۔ اباجان نے فرش پر پڑا ہُوا لفافہ اٹھا کر جیب میں ڈال لیا اور ارشد کو ڈاکٹر کی طرف بھگایا۔

ارشد ابھی کوٹھی کے پھاٹک سے نکل ہی رہا تھا کہ اباجان نے اسے روک لیا اور قریب جا کر کہا ــــ "ڈاکٹر کو طاہرہ کے متعلق کچھ نہ بتانا۔ اتنا ہی کہنا کہ عفّت کو پھر دورہ پڑ گیا ہے اور دورے سے پہلے قے آئی تھی۔"

عفّت کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوتے اور ٹھنڈے تھے۔ اوپر اور نیچے کے دانت آپس میں شکنجے کی طرح بھنچے ہُوئے اور ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ سارا جسم ہی اکڑ گیا تھا۔ عورتوں نے بڑی مشکل سے ناک دبا کر اور دانتوں میں چمچ دے کر دانتوں کو الگ کیا لیکن یہ کیفیت شدید ہوتی گئی۔ اباجان اور یوسف برآمدے میں عفّت کے نام طاہرہ کا خط پڑھ رہے تھے۔ لکھا تھا

میری پیاری عفّت! آخری سلام قبول کرو۔

میں تمہیں خُدا اور ارشد کے حوالے کر کے جا رہی ہُوں۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ میں اب کبھی نہ لوٹوں گی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ گھر کی موجودہ فضا میں میرا رہنا محال ہو گیا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہاری غلط فہمیاں دُور کرنے بیٹھ جاؤں۔ یہ داستان تو مختصر ہے لیکن اس کی تفصیلات میرے لیے اذیت ناک ہیں۔ میں صرف اسی قدر کہوں گی کہ تمہارے تمام الزامات محض غلط فہمیاں ہیں جنہیں خُدا کی ذات اور وقت دور کر دے گا۔ تمہیں یاد ہوگا، ایک دن تم نے مجھے کہا تھا۔ "طاہرہ! تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تم میری راہ سے ہٹ جاؤ گی تو ارشد میرے قریب آ جائے گا۔" تم نے اس خواہش کا اظہار نجمہ کے سامنے بھی کیا تھا۔ میں نے تمہاری اس خواہش کو کبھی نظر انداز نہ کیا۔ لیکن میں اس گھر میں کیوں پڑی رہی، صرف اس لیے کہ شاید میں تمہیں اور ارشد کو ایک دوسرے کے قریب کر سکوں۔ میں نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ تمہیں معلوم نہیں اور میرا مقصود ہی یہی تھا کہ تمہیں معلوم نہ ہو۔ اس کا انجام بہت بھیانک ہُوا۔ تم نے میری باتیں سمجھنے کی بجائے مُجھے ہی تہمتوں کی زد میں لے لیا جس سے ارشد اور زیادہ بھٹک گیا۔ اگر تم یہی دماغی قوتیں ازدواجی زندگی کو بہتر بنانے میں صرف کرتیں تو آج گھر کی یہ حالت نہ ہوتی۔ گھر کا ہر فرد ایک دوسرے کو شکی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ ایک طرف اباجان اور امی جان ایک دوسرے سے اُلجھے ہُوئے۔ دوسری طرف بھائی جان اور بھابی دست و گریبان ہو رہے ہیں۔ میرا جو حال ہُوا اسے مجھ تک ہی رہنے دو اور اس ہنگامے کا جو اثر ارشد پر ہُوا، اُس نے ارشد کو تم سے اور دور کر دیا ہے۔ میں نے اس صدمے کو اپنے دل میں جذب کر کے یہی کوشش کی ہے کہ ارشد اور تمہارے درمیان جو دیوار حائل ہے اسے گرا سکوں لیکن تم نے تعاون نہ کیا۔ تمہارے مزاج کے شکی پن اور زود پشیمانی نے اس دیوار کو اور مضبوط بنا دیا۔ میرے پیشِ نظر

چونکہ تمہاری فلاح و بہبود تھی، اور میں نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا، اس لیے میں نے آخری کوشش کی ہے کہ تمہاری خواہش کے مطابق اپنے وجود کو تمہارے سامنے سے، یا ارشد کے سامنے سے جیسا تمہارا خیال ہے ہٹا لوں۔ یہ میری آخری کوشش ہے اگر یہ بھی ناکام ہوگئی تو یہ میری بہت بڑی شکست ہوگی۔ مجھے اب لوٹ کے اس میدان میں نہیں آنا۔

عفت پیاری! میرا مقصد احسان گنوانا نہیں۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں اور یہ میری آخری التجا ہے کہ میں نے تمہیں ارشد کے ساتھ بیاہ کر اپنی ان آرزوؤں کی تکمیل کی تھی جو میرے دل میں تمہارے لیے تڑپ رہی تھیں۔ تم نے مجھ پر جو الزام لگاتے ہیں مجھے ان کا ذرہ بھر افسوس نہیں۔ غم ہے تو اپنی آرزوؤں کی ہار کا ہے۔ تم نے میری امنگوں کو بڑی بے دردی سے مسلا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میری بہن! اپنے آپ میں صرف اتنی سی تبدیلی پیدا کر لو کہ محبّت جسم اور جسمانی آسودگی سے آزاد ہوتی ہے جسے تم محبت کا عروج سمجھتی ہو وہ اس پاک جذبے کی موت ہے۔ میرا مطلب جسم کو نظر انداز کر دینے سے بھی نہیں، لیکن اعتدال کی ضرورت ہے۔ ارشد کو روحانی محبت کی ضرورت ہے۔ ذرا اس کے مقام کو سمجھو اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دو۔ اس پر قبضہ کر لینے کی کوشش نہ کرو۔ تم اسے اپنی گرفت میں لے کر اس طرح بیدردی سے دبوچ رہی ہو جس طرح بچہ چڑیا کو پکڑ کر مٹھی میں دبا لیتا ہے۔ ذرا چڑیا کے احساسات کا تصور کرو۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو کمرے کی محدود اور تنگ دنیا سے نکالو اور گردوپیش کے انسانوں میں اُٹھو، بیٹھو اور ہنسو کھیلو۔ تم نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں قید کر لیا ہے اور تم ارشد کو بھی قید کر لینا چاہتی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ارشد تمہارے قریب آنا چاہتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ خُدا کے لیے، اپنے اور اپنے ارشد کے لیے اور پیٹ میں پلتے ہوئے اپنے بچے کے لیے اپنے آپ سے نکلو اور طبیعت سے شکی پن نکال دو۔

خُدا تمہیں صحت یاب کرے اور بچے کی پیدائش بخیر و خوبی ہو جائے۔ آمین۔ کاش! میں بھی تمہارے ننھے کا منہ چوم سکتی لیکن....

پیاری عفت! میں صرف تمہارے لیے اپنے وجود کو آشنا بھون، سے دور لے جا رہی ہوں۔ خُدا میری یہ کوشش کامیاب کرے۔ آمین۔ میں اپنا تمام زیور تمہارے لیے چھوڑ چلی ہوں۔ ٹرنک کے بائیں کونے میں رکھا ہے۔ یہ سب تمہارے لیے ہے۔ پرانے نمونے کا زیور اتار دینا اور ہلکی چیزیں پہنا کرنا۔ اگر میری بات مانو تو پرانا زیور بیچ ڈالو۔ یہ پیسے تمہارے کام آئیں گے۔ ان میں سے اپنے کمرے کے لیے اچھا سا ریڈیو خرید لینا۔ تمہارے کمرے میں ریڈیو ضرور ہونا چاہیئے۔ اچھا عفت پیاری! الوداع!

ہمیشہ تمہاری طاہرہ

ابا جان اور یُوسف نے خط ختم کیا تو دونوں خاموشی سے باغ میں لہلہاتے پودوں کی طرف دیکھنے لگے۔

"عفت کی یہ حالت اور طاہرہ کی گمشدگی"— ابا جان نے خلا میں دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں کہا — "دونوں مسئلے ٹیڑھے نظر آتے ہیں۔"

"اگر وہ راولپنڈی چلی گئی ہے اور ہم اسے واپس لانے وہاں چلے جائیں تو وہ واپس آئے گی نہیں۔"— یُوسف نے کہا — "لڑکی ارادوں کی بڑی پکی ہے، ابا جان! طاہرہ معمولی قسم کی لڑکی نہیں۔"

"صرف یقین ہو جائے کہ وہ نجمہ کے پاس ہے"— ابا جان نے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے کہا — "میں تسلّی ہو جائے گی۔ جہاں تک واپس لانے کا سوال ہے، ہم زبردستی تو کر نہیں سکتے۔ جو چلی گئی ہے وہ آئے گی نہیں لیکن میں اس کی سلامتی کے لیے فکر مند ہوں اور یُوسف!...." ابا جان کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو گیا اور وہ تھوک نگل کر بولے — "میں طاہرہ کو ایک بار دیکھنا ضرور چاہتا ہوں۔ میں اس کے سر پر الوداعی ہاتھ ضرور پھیرنا چاہتا ہوں۔ کس قدر پیاری بچی ہے۔"

"میں تو اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا ہوں، ابا جان!"— یُوسف نے کہا — "ہمارے گھر کی عورتوں نے اسے بدنام کر کے گھر سے نکالا ہے۔ عفت نے اپنی محدود ذہنیت کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ...."

"نہیں! عفت کا اس میں قصور نہیں"— ابا جان نے تردید کی — "نوجوان بیوی کے احساسات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اس کا یہ ردِ عمل قابلِ فہم ہے۔ جانتے ہو اس پر آج دورہ کیوں پڑا ہے؟ حالانکہ اسے خوش ہونا چاہیئے تھا کہ اس کی راہ سے طاہرہ ہٹ گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ ایسے مریض کا رویہ اور برتاؤ بھی غیر منظم ہو جاتا ہے۔ خیالوں میں انتشار، ذہن میں کشمکش اور ایسا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے جس سے اس کے اعصاب اس فساد کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ عفت طاہرہ کو ہزار دشمن سمجھتی ہے لیکن اسے اپنی ہی ہستی سے ایسی آوازیں اٹھتی سنائی دیتی ہیں کہ طاہرہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس کے ضمیر کی آوازیں دو اور بعض اوقات دو سے بھی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ ہر آواز دوسری آواز کی مخالفت کرتی ہے عفت کے معاملے میں اس کا ضمیر ایک خیالی جرم کی گرفت میں آ گیا ہے۔ یہ مرض بلاشک و شبہ نفسیاتی ہے۔ ڈاکٹر نے ایک ماہرِ نفسیات کا پتہ دیا ہے۔ آج اس سے بات کروں گا.... لو ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔"

ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر، ابا جان، یُوسف اور ارشد ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر بغیر ناشتہ کیے آ گیا تھا اور یہاں بھی کسی نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔

"مریضہ کو تندرست ہونے میں ذرا وقت لگے گا"— ڈاکٹر نے کہا — "میں اس وقت زیادہ تر توجہ بچّے کی طرف دے رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ بچہ خیریت سے پیدا ہو اور وہ ماں کے مرض کے اثرات سے بچا رہے.... یہ کتنا مہینہ ہے؟"

"ابھی تو چھ ماہ باقی ہیں ڈاکٹر صاحب!"— ارشد نے پریشان لہجے میں جواب دیا — "طویل عرصہ ہے۔ خدارا آپ بچے کا بہت خیال رکھیں۔ میں آج آپ کے دیئے ہوئے ایڈریس پر پروفیسر عاقل سے مل رہا ہوں۔"

"ہاں ضرور ملیے"— ڈاکٹر نے کہا — "نفسیاتی علاج بہت جلد شروع ہو جانا چاہیئے۔"

مسلسل تین دن عفت کی یہ حالت رہی کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے آنکھ کھولتی تھی جسم نارمل حالت پر آتا تھا۔ اُکھڑی ہوئی سانسیں سنبھل جاتی تھیں پیشتر اس کے کہ وہ اپنے آپ کا اور گردوپیش کا جائزہ

لے سکے، اس پر پھر دورے کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر ہر صبح آتا تھا اور دن میں دو انجکشن لگتے تھے۔

چوتھے دن وہ تمام دن ٹھیک رہی، دیر تک خاموش رہی اور سو گئی۔ آنکھ کھلی تو ہر کسی کو اور ہر طرف دیکھتی رہی کھوئی کھوئی، سہمی ہوئی نظروں سے۔ کھانے پر اس کی طبیعت مائل نہ ہوتی تھی۔ پچھلے پہر ابا جان کے اصرار پر اس نے ایک جو پانچ سات منٹ بعد قے کے ذریعے نکل گیا۔ نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ صرف بھابی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ عفت کی حالت کمزوری کے سوا اچھی معلوم ہوتی تھی۔ بھابی سے پوچھا ـــــ "طاہرہ نہیں آئی؟"

بھابی ان تین دنوں میں بیدار ہو چکی تھی۔ مردوں کی پھٹکار اور طاہرہ کی گمشدگی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ آنکھ اس کی اور امی کی اسی پہ کھل گئی تھیں کہ طاہرہ اتنا بیش بہا زیور ان کے گھر پھینک کر چلی گئی تھی۔ بھابی کے دل میں اب محبت جو ذرا سی دیر کے لیے سو گئی تھی جاگ اٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ عفت کی ذہنی حالت کو بھی سمجھ چکی تھی۔ اسے ساتھ بھی ہمدردی تھی۔ اس نے عفت کے سوال کا جواب دینے سے پہلے ذرا سوچا اور مسکرا کر جواب دیا ـــــ "آجائے ایک دو روز کے لیے نجمہ کے پاس چلی گئی ہے" ـــــ بھابی نے مسکراہٹ میں ایک درد چھپا لیا۔

"سچ، بھابی"؟ ـــــ عفت کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

"ہاں، عفت! تو کیا وہ آئے گی ہی نہیں؟" ـــــ بھابی نے کہہ تو دیا لیکن اس کا دل جیسے حلق تک پہنچ گیا ہو۔

عفت کی علیل نگاہیں کمرے کی اداس فضا میں بھٹکنے لگیں۔ آہستہ آہستہ نہایت آہستگی سے جیسے وہ کسی آہستہ اڑتی ہوئی چیز کا تعاقب کر رہی ہوں۔ اسے طاہرہ کی پیار بھری سرگوشیاں بھٹکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں، وہ سن بھی رہی اور دیکھ بھی رہی تھی۔ وہ لپک کر ان سرگوشیوں کو پکڑ کر ان میں سے پیار کا رس چوس لینا چاہتی تھی۔ یہی اس کی زندگی کا سرمایہ یہی اس کا سہارا ـــــ طاہرہ کا پیار!

"میری طاہرہ تو آگیا" ـــــ اس نے زیر لب کہا۔ اجڑی ہوئی سی ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی۔ عفت آپ سے ہمکلام تھی، خیالوں میں۔

طاہرہ کے خیال نے ارشد کے تصور کو جنم دیا۔ خیالوں کے دیئے بجھنے لگے۔ آندھی کے تھپیڑے تیز ہونے لگے ہونٹوں کی پژمردگی میں گم ہو گئی۔ اس کے ساتھ یہ خیال ـــــ "میں نے طاہرہ اور ارشد کے خلاف کیا کچھ کہہ دیا ہے؟ بہت ہے" ـــــ یہ خیال ـــــ "ارشد مجھ سے بہت دور ہے" ـــــ اور بجلی کی کڑک۔ ایک دھماکہ ـــــ "ارشد طاہرہ کے پیچھے بھاگ جاتے" ـــــ خیال اور خیالوں کے ریلے۔ خیالوں کے بھنور۔ خیالوں کے بگولے ـــــ شکوک اور شکوے ـــــ طاہرہ بری۔ طاہرہ اچھی ہے۔

عفت کی دنیا میں قیامت خیز آندھیاں اور طوفان امڈ آئے اور اس کی کائنات کے ذرے ذرے کو کہاں کہاں پہنچا دیا۔

اس کا جسم لرزنے لگا۔ بھابی اس کی جسمانی حالت کی تبدیلی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو اب عادی ہو چکی تھی اس لیے گھبرا

...فت نے بھابی کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا اور سرک کر سہمے ہوئے بچے کی طرح بھابی کے قریب ہو گئی۔ بھابی کے آنسو نکل آئے۔ اسے معلوم تھا کہ عفت پر دورہ پڑنا شروع ہو گیا ہے۔ اس کے دل سے ہوک سی نکلی ـــــ "اے خدا! تو اس ننھی سی جان کی خاطر ہی عفت کو بخش دے، تیری ایک کلی کھل رہی ہے۔ اسے کھلنے دے، میرے خدا!" ـــــ اور بھابی نے منہ دوسری طرف پھیر کر آنسو پونچھ ڈالے۔

"وہ نہیں آئے گی" ـــــ عفت کے منہ سے نکلا۔ اس کے الفاظ یخ بستہ سردی میں کانپتے جسم کی طرح کانپ رہے تھے اور ربط ناپید تھا۔ "وہ گئی.... میں نے ہی تو.... ارشد بھی گیا.... وہ نہیں آئے گا.... بھابی!".... اس کی آواز ڈوبنے لگی۔ زیر لب بولی ـــــ ...سے کہنا.... کیا کہو گی بھابی؟.... کچھ نہ کہنا.... طاہرہ نے زیور مجھے دے دیا ہے.... تو کیا ہوا؟.... بھابی! میرا دل.... ڈر لگتا ہے بھابی!.... ارشد کہاں ہے؟.... اسے بھی ڈر لگتا ہے.... باہر آندھی بڑے زور سے چل رہی ہے.... طاہرہ کو بلا لو.... ارشد کہاں چلا گیا ہے.... آندھی...." اور اس کی آواز کو جسم کے تشنج نے دبوچ لیا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو کر مڑنے لگے اور عفت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

ارشد نے اسی روز بھابی کو نجمہ کے رشتہ داروں کے گھر بھیج کر نجمہ کا پنڈی کا ایڈریس منگوا لیا تھا۔ اسی روز اس نے نجمہ کو تار دیا تھا اور دوسرے روز نجمہ کا جواب بذریعہ تار آ گیا تھا کہ طاہرہ پنڈی نہیں پہنچی۔

"آشا بھون" پر موت کے سائے پڑنے لگے۔ طاہرہ ان کی کچھ نہیں لگتی تھی، پھر بھی اس گھر میں طاہرہ کی جو جگہ تھی اسے ...ن کے سوا کوئی پر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ جگہ ایک خلا بن گئی۔ ارشد کی تنہائی کی آہیں اور آنسو۔ ابا جان کا تاسف اور پریشانی۔ امی اور بھابی کی خفت اور پچھتاوا۔ یوسف کی اداس خاموشی اور عفت کے دوروں پر دورے اس خلا کو بھرنے میں لگے رہے لیکن خلا خلا ہی رہا۔

نجمہ نے تار کا جو جواب دیا تھا وہ انگریزی کا ادھورا سا ایک فقرہ تھا لیکن اس ادھورے فقرے میں نجمہ اور طاہرہ کی نصف ...ات صرف ہوئی تھی۔ نجمہ کا خیال تھا کہ ارشد کو طاہرہ کے متعلق صحیح اطلاع دے دی جاتے اور یہ بھی لکھ دیا جاتے کہ طاہرہ اب لاہور واپس نہیں جائے گی۔ طاہرہ نے بہت سی دلیلیں دیں جن میں اہم ترین یہ تھی کہ لاہور والوں کو اس کا علم ہو گیا تو وہ زبردستی واپس نہیں لے جا سکتے لیکن اسے ڈر تھا کہ اپنا ہی دل زبردستی پہ نہ اتر آئے۔ اسے توقع تھی کہ ارشد ضرور راولپنڈی پہنچ جائے اور یہ احساس بھی تھا کہ وہ ارشد کے ساتھ ایسی زنجیر میں بندھی ہوئی ہے کہ وہ پا بجولاں ارشد کے ساتھ چل پڑے گی اور یہ ڈر بھی تھا کہ ابا جان یا یوسف ہی نہ آ جائیں۔ پھر تو انکار کا سوال ہی ختم ہو جائے گا۔

"خدا کے لیے، آپا!" ـــــ طاہرہ نے تھک ہار کر انوکھے سے لہجے میں التجا کی تھی ـــــ "میں جو زنجیریں توڑنے کی کوشش کر رہی ہوں انہیں ٹوٹ جانے دو۔ میں زندگی کی جو راہ بنا رہی ہوں، اس راہ میں کانٹے نہ بو۔ ارشد کی محبت اور عفت کا پیار مجھے ایک بار پھر لاہور کی اس پیلی کوٹھی میں قید کر لے گا۔ امی اور بھابی دن رات میرا خون چوستی رہیں گی۔ آپ کو آخر ڈر ہی کیا ہے؟ میں ...ابھو بیٹی تو نہیں کہ آپ پر اغوا کا دعویٰ دائر ہو جائے گا"

"میں صرف ارشد کے متعلق سوچ رہی ہوں کہ اس بے چارے کو کسی پل چین نہیں آئے گا" ـــــ نجمہ نے کہا تھا ـــــ "اسے

کیسے یقین آئے گا کہ تم کسی محفوظ جگہ ہو۔ وہ تمہارے لیے بے حد پریشان ہوگا اور اسی فکر میں بے حال ہوتا رہے
جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہی ہوگی"۔

"سنو! تم دونو سنو!" ——— اطہر خاموش بیٹھا دونوں کی باتیں سن رہا تھا اور کوئی حل سوچ رہا تھا بولا ——— "میرے ذہن میں ایک سکیم آتی ہے۔ صبح ارشد صاحب کو تار کا جواب تو یہ دے دیتے ہیں کہ طاہرہ یہاں نہیں آئی۔ پھر میں ایک خط لکھوں گا ارشد صاحب کے نام۔ اپنا نام فرضی لکھوں گا۔ یہ خط تم دونوں کو سناؤں گا۔ اگر تم نے منظور کیا تو پوسٹ کر دوں گا۔ مجھے بلکہ یقین ہے کہ اس خط کو پڑھ کر ان لوگوں کا فکر دور ہو جائے گا اور وہ طاہرہ کی تلاش میں نہ یہاں آئیں گے نہ کچھ کریں گے۔ اور تم طاہرہ! مجھے چند باتیں بتا دو۔ تمہاری باقی باتیں تو نجمہ نے پہلے ہی سنا ڈالی تھیں۔ میں تم سے تمہارے رشتہ داروں کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں"۔

اطہر نے طاہرہ سے جلال آباد کے خویش و اقارب کے متعلق چند ایک معلومات پوچھ لیں۔

ارشد کو جب تار کے جواب میں نجمہ کا تار ملا تھا تو اسے یوں لگا تھا جیسے ایک راکٹ اس کے جسم کے پرخچے اڑا گیا ہو۔ اپنے کمرے میں جا کے رو پڑا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ رویا بھی تھا۔ اس نے طاہرہ کی تلاش کے کئی ڈھنگ سوچ ڈالے لیکن کوئی صورت ڈھنگ میں نہیں آتی تھی۔ اسی رات اباجان، یوسف اور ارشد نے سر جوڑ کر بھی غور کیا تھا لیکن بات نہ بنی تھی، سوائے اس کے کہ تینوں نے امی، بھابی اور عفت کو بھی کوس لیا تھا۔

امی اور بھابی کا تو یہ حال تھا کہ ان کے سر جھک گئے تھے اور مردوں کے سامنے اُف تک نہ کرتی تھیں۔ ان کا ضمیر ان کے سامنے ناچنے لگی تھیں۔ دونوں علیحدگی میں کھسر پھسر کر لیتی تھیں لیکن دونوں کے ضمیر مجرم تھے۔ وہ ایک دوسرے سے آنکھ نہ ملاتی تھیں۔ امی بعض اوقات بڑبڑا سی اٹھتی تھیں ——— "نہ چڑیلیں ہمارے گھر میں آتیں، نہ آج یہ ماتم ہوتا"۔

نجمہ کا تار آئے تیسرا روز تھا۔ ادھر عفت موت و حیات کی کشمکش میں تھی۔ ارشد کا یہ حال کہ دفتر دیر سے جاتا، کبھی جلدی لوٹ آتا کبھی رات کو آتا۔ کھانا پینا بے قاعدہ ہو گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دیر کمرے میں گھسا رہتا تھا۔ اباجان اور یوسف اس کے دل کا حال سمجھتے تھے اور اس کا دل لگانے کے لیے وہ اسے ڈاکٹر اور عفت کے ساتھ لگائے رکھتے۔

شام کو عفت کو دورہ پڑا تو بھابی روتی ہوئی اس کے کمرے سے باہر نکلی۔ امی کو بتایا کہ عفت کی حالت ویسی ہی ہو گئی ہے۔ اباجان نے جا کے عفت کو دیکھا تو گھبرا گئے۔ یہ دورہ غیر معمولی طور پر شدید تھا۔ اباجان نے زیادہ انتظار نہ کیا اور رات کو ہی عفت کو ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ علیحدہ کمرہ لے لیا گیا۔ امی اور ملازمہ وہیں رہنے لگیں۔

پروفیسر عاقل (ماہر نفسیات) نے اگلے دن ہسپتال میں جا کر عفت کی حالت دیکھی۔ اتفاق سے وہ ہوش میں تھی۔ عاقل نے گھنٹہ بھر کی بات چیت کے بعد کچھ باتیں نوٹ کر لیں اور اباجان سے کہا ——— "اگر مریضہ کی حالت ذرا بہتر ہو تو کام آسان ہو جاتا۔ بہر حال میں اسی حالت میں کوشش کروں گا۔ ہر صبح ایک چکر لگا جایا کروں گا لیکن خدشہ ہے مریضہ تعاون نہ کر سکے گی۔ میں لیڈی ڈاکٹر اور نرسوں سے بات کر جاتا ہوں۔ وہ میری مدد کر سکتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں ان مشکلات کے باوجود مریضہ کو اس کیفیت سے نکال لوں گا۔۔۔ مریضہ خطرناک حد تک INTROVERT معلوم ہوتی ہے"۔

"لاؤ ذرا طاہرہ کو بھی بلا لو نجمہ!" ——— اطہر نے دفتر سے آ کر چائے پیتے ہوئے کہا ——— "میں نے دفتر میں ہی خط لکھ لیا تھا۔ سناؤں اور دیکھیں کہ مسئلہ حل ہوتا ہے یا نہیں"۔

"السلام علیکم بھائی جان!" ——— طاہرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا ——— "سنائیے آپ کیا لکھ لائے ہیں۔ میں نے لکھا ہے" ——— اطہر نے خط پڑھنا شروع کیا۔

محترم ارشد صاحب! آداب و تسلیمات۔

طاہرہ کی زبانی آپ سے غائبانہ تعارف ہوا۔ میں آپ کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے طاہرہ کو اتنا عرصہ اپنے گھر رکھا اور آپ کے گھر والوں نے بیٹیوں کی طرح اس کا خیال رکھا۔ میں طاہرہ کا قریبی رشتہ دار ہوں۔ گو ہم جلال آباد میں طاہرہ کے گھر بار سے دور رہے لیکن تشکیل پاکستان کے بعد عزیز و اقارب کا فکر لازمی تھا۔ میں ہمیشہ طاہرہ اور خالہ خاتون کے لیے پریشان رہا۔ کسی نے بتایا تھا کہ خالہ راستے میں ہی فوت ہو گئی تھیں اور طاہرہ لاہور پہنچ گئی تھی۔ جلال آباد کے کچھ لوگوں نے اسے والٹن کیمپ میں دیکھا تھا لیکن میں اسے وہاں سے لانے اس وقت پہنچا جب وہ کسی نامعلوم منزل کو روانہ ہو چکی تھی۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے، اور کس قدر عجیب اتفاق ہے کہ میں ایک دوست کو الوداع کہنے ریلوے سٹیشن پر گیا تو طاہرہ کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی سہیلی سے ملنے پنڈی آئی ہے۔ میں نے اس موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے اسے اس کی سہیلی کے ہاں نہ جانے دیا اور اپنے گھر لے آیا۔ اس نے میرے گھر میں اجنبیت محسوس نہ کی اور ایک ہی دن میں میری بیوی اور بچوں میں گھل مل گئی جیسے ایک عرصے سے اسی گھر میں رہتی تھی۔ میری اور میری بیوی کی پریشانی دور ہوئی۔ میری بیوی بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

طاہرہ نے آپ کا ایڈریس دیا ہے اور تاکیداً کہا ہے کہ آپ کو اطلاع دے دوں تاکہ آپ فکر نہ کریں۔ آپ قدرتی طور پر میرا ایڈریس معلوم کریں گے لیکن میں ابھی اپنا ایڈریس بتانے کی پوزیشن میں نہیں کیونکہ میں مع اہل و عیال پرسوں ایبٹ آباد جا رہا ہوں۔ ایک ماہ یا اس سے لگ بھگ مدت کے بعد میری تبدیلی کوئٹہ یا کراچی ہو جائے گی۔ یہ تبدیلی بھی عارضی ہوگی۔ اس کے بعد مستقل طور پر جانے کہاں تبدیل کر دیا جائے۔ دعا کیجیے کہ لاہور آ جاؤں۔ میں جہاں بھی جاؤں گا بال بچے ساتھ جائیں گے۔ میں ابھی تک اس خانہ بدوشی کی وجہ سے مکان الاٹ نہیں کرا سکا۔

طاہرہ کہتی ہے کہ آپ اس کے متعلق مطمئن رہیں۔ وہ بھی کسی وقت آپ کو خط لکھے گی۔ اس نے عفت اور خصوصاً نور دین کو سلام کہا ہے۔ اباجان، امی جان اور بھابی صاحبہ کو سلام کہتی ہے اور بچوں کو پیار۔

بہر حال یہ خط آپ کی تسلی کے لیے لکھا جا رہا ہے۔ میرے آئندہ خط کا انتظار کیجیے گا۔

والسلام   آپ کا   افتخار بیگ

نجمہ اور طاہرہ نے خط سنا تو دونوں نے پوسٹ کر دینے کی منظوری دے دی۔ طاہرہ کے دماغ میں ایک بات
بولی — "لایئے بھائی جان! اسی خط پر میں بھی کچھ لکھ دوں۔ تصدیق ہو جائے گی" — اس نے اطہر کا قلم لیا اور اسی خط کے
ذرا سی جگہ باقی تھی۔ وہاں لکھا۔

محترم ارشد صاحب! اسلام علیکم!
میں نجمہ کے پاس آ رہی تھی کہ اتفاق سے میرے ایک رشتہ دار بزرگ سٹیشن پر مل گئے اور ان
کے اصرار پر میں ان کے گھر چلی آئی۔ یہ گھر میرا اپنا ہے اور اب اسی گھر کو اپنا بنا لیا ہے۔ میں اب نجمہ آپا سے
نہیں ملوں گی۔ میں پرسوں صبح چچا افتخار صاحب کے ساتھ ایبٹ آباد چلی جاؤں گی۔ افسوس ہے کہ ہمارا ابھی
مستقل ایڈریس کوئی نہیں۔ مجھے عفت کی بیماری کا بہت خیال ہے۔ خدا اسے صحت عطا فرمائے۔ آمین۔

والسلام
طاہرہ

ارشد دفتر سے لوٹ کر ہسپتال گیا۔ عفت کی حالت بہتر تھی یا ارشد کو دیکھ کر چہرے پر کچھ رونق آ گئی تھی لیکن آنکھ
اندر کو دھنس گئی تھیں۔ عفت کو دیکھ کر ارشد کو افسوس سا ہوا۔

"طاہرہ کا کچھ پتہ چلا؟" — عفت نے مریل سے لہجے میں پوچھا۔

ارشد کے دل میں عفت کی ہمدردی زیادہ ہو گئی تھی۔ ذرا سا سوچ کر جواب دیا — "پتہ تو نہیں چلا لیکن وہ آ جا
— ذرا سا رک کر پوچھا — "عفت! طاہرہ یاد آتی ہے؟" — ارشد نے ایسے لہجے میں پوچھا جیسے چاہ رہا ہو کہ کوئی اس
سوال پوچھے اور وہ داستانِ دل کھول کر بیٹھ جائے۔

ارشد کے لہجے میں والہانہ پیار کی جھلک تھی۔ عفت نے اس جھلک کو محسوس کیا۔ اس کا دل غم سے ڈوبنے لگا۔ ا
آنسو نکل آئے۔ اس نے سرہانے پر سر کو یوں ہلایا جیسے کہنا چاہتی ہو — "ہاں! طاہرہ بہت یاد آتی ہے.... اور تم بھی"

ارشد پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنسو روکے۔ طاہرہ اس کے تصور پر چھانے لگی۔ ارشد نے
میں اپنا ہاتھ عفت کے ہاتھ پر رکھ دیا اور ہمدردی سے بھرپور لہجے میں کہا — "سو جاؤ، عفت! سو جایا کرو۔ تندرست
تک طاہرہ کو یاد نہ کرو۔ وہ آ جائے گی"

ارشد نے بظاہر عفت کو لیکن درحقیقت اپنے آپ کو تسلی دی تھی۔ اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا اور کچھ ایسا ہی
عفت نے پایا۔ ارشد امی کے ساتھ دو باتیں کر کے نکل آیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو بھابی نے اسے خط دیا۔ اس نے برآمد
کھڑے کھڑے خط کھولا اور پڑھ لیا۔

"کہاں سے آیا ہے؟" — بھابی نے جو ابھی اس کے پاس کھڑی تھی پوچھا — "طاہرہ کا تو نہیں؟"

"اُسی کا ہے!" — ارشد نے خط بھابی کے حوالے کرتے ہوئے کہا — "ایک فکر تو دور ہوا۔ خدا کا شکر ہے ا

ہاں گئی ہے"

ارشد کو سکون تو ہوا لیکن دل کی بے چینی میں اضافہ بھی ہو گیا۔ اس بے چینی کو اس نے "افتخار بیگ" کے آئندہ خط کے
انتظار میں تسکین دینی شروع کر دی۔

صبحیں طلوع ہوتی رہیں۔ سائے لمبے ہو کر چھوٹے ہوتے رہے، چھوٹے ہو کر پھر لمبے ہوتے اور راتوں کی تاریکی
میں گم ہوتے رہے۔ راتیں دن کے تعاقب میں بھاگتی رہیں۔ ارشد ایک انتظار کی تلخی میں سوتا رہا، اسی تلخی میں جاگتا رہا۔ طاہرہ کی
یاد اس کے دل و دماغ پر اَن مٹ نقش بن گئی اور اس کی زندگی ایک مسلسل انتظار بن کے رہ گئی۔ دل بے قرار، آنکھیں بے چین۔
سانسیں اداس۔ سانسوں کا تسلسل ہی جیسے بے ربط ہوا جا رہا تھا۔ وہ مشین کی طرح صبح و شام کے چکر کے ساتھ چلنے لگا۔ گھر
سے دفتر، دفتر سے ہسپتال۔ ہسپتال سے گھر۔ اور اپنے کمرے میں وہی تنہائی اور طاہرہ کا سرگوشیاں کرتا ہوا تصور۔ اعصاب
پر بوجھ۔ دل پر بوجھ اور ایسا ہی ایک بوجھ ضمیر پر جیسے کسی جرم کا بوجھ ہو — "طاہرہ کو ہم نے بدنام کر کے بھگا دیا ہے؟"

پانچ مہینے گزر گئے۔ "افتخار بیگ" کا دوسرا خط نہ آیا۔

عفت ابھی ہسپتال میں تھی جیسے ہسپتال میں اس کا گھر بن گیا ہو۔ امی چند ہی روز بعد گھر آ گئی تھی۔ صرف ملازمہ وہاں
تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مرض بڑھتا جا رہا ہے اور علاج میں کچھ عرصہ لگے گا۔ عفت کے دوروں میں تو بہت کمی آ گئی تھی۔ دو
دو تین تین دن بغیر دورے کے گزر جاتے تھے لیکن کمزوری اور خون کی کمی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی
جسمانی اور ذہنی حالت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ غذا پوری طرح کھا نہ سکتی تھی۔ متلی اور قے کی بھی شکایت رہتی تھی۔

پروفیسر عاقل اپنا زور لگا رہا تھا کہ مریضہ کے لاشعور کے مہیب سائے دھو سکے لیکن اس کی کوششیں ضائع ہوتی جا رہی تھیں۔
اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ارشد نے اور نہ ہی عفت نے ماہرِ نفسیات کو پتہ چلنے دیا کہ اس کے بچپن کے اثرات کیا ہیں اور اس
نے کس ماحول اور کس محرومی میں چودہ سال گزارے تھے۔ یہی مرض کی جڑ تھی اور یہی پروفیسر سے چھپائی جا رہی تھی۔ ارشد طاہرہ سے
کیے ہوئے وعدے کو پورا کر رہا تھا۔

عفت خود بھی اس حقیقت کو ظاہر کرنے سے گریز کرتی تھی۔ ارشد نے اسے ایک بار کہا تھا کہ اپنے آپ کو طاہرہ کی چچا زاد
ظاہر کرتی رہے۔ اس سے عفت کو بڑا اطمینان ہوا تھا۔ اب پروفیسر عاقل نے کریدنا جو شروع ہو گیا تو عفت نے لپک کر
اس عیب پر پردہ ڈال لیا۔ یہی آسیب تھا جس نے اس کے شعور اور عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس معاملے میں ارشد
اس کا ساتھ دے رہا ہے اور یوں مریضہ کے اہم ترین پہلو کو ماہرِ نفسیات سے چھپا کر اسے مزید پیچیدگیوں میں ڈال دیا گیا۔ عفت
کی بیماری کی دوسری بڑی وجہ طاہرہ اور ارشد کی محبت تھی جسے ارشد نے ظاہر کیا نہ عفت نے۔

"مریضہ کو بچپن کے متعلق کوئی اہم بات یاد نہیں رہی" — ایک دن پروفیسر عاقل نے اکتا کر کہا — "یا یہ ہے کہ اس کا ذہن
ساتھ نہیں دے رہا۔ نہ ہی آپ میں سے کوئی میرا یہ مسئلہ حل کر سکتا ہے۔ یہ میری سب سے بڑی مشکل ہے جسے میں
حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں"

لیڈی ڈاکٹر اپنا زور لگا رہی تھی۔ سب کو زیادہ فکر زچگی کے وقت کی تھی۔ یہ ایک عجیب الجھن تھی۔ ڈاکٹروں نے اس
کا اظہار کر دیا تھا کہ پیدائش کے وقت دونوں یا ایک جان کے ضائع ہونے کا امکان ہے۔ طاقت کے انجکشن بھی د
رہے تھے۔

بچے کے پیدا ہونے میں صرف ایک ماہ باقی تھا ـــــ آخری ماہ!

ان پانچ مہینوں میں طاہرہ تیسری جماعت کی اُستانی بن چکی تھی۔ چند دنوں میں ہی اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ بچوں کو پڑھانے
ہو ءاان کی تربیت کے متعلق ایک خاص صلاحیت رکھتی ہے جسے ذرا ابھارنے اور موقعہ دینے کی ضرورت تھی۔ ہیڈ
ں نے اسے ایک تجربہ کار استانی کے ساتھ لگا دیا تھا اور نجمہ گھر میں اسے ٹریننگ دیتی رہتی تھی جس سے طاہرہ کی یہ قدرتی
بت صرف جاگ ہی نہیں اٹھی چمک اٹھی تھی۔ ہیڈ مسٹریس نے ایک بار اس کا معائنہ کرنے کے لیے اس کی کلاس میں ایک
زارا تھا اور اسے ہر پہلو سے جانچ دیکھ کر پہلی کی جگہ تیسری جماعت میں لگا دیا تھا۔

گو طاہرہ کی روح اور دماغ کسی بھی ذہنی پابندی کے قائل نہیں تھے، امی خاتون کی تربیت اس کے رگ و ریشے میں رچی ہوئی
ں نے اس کے سینے میں سوز بھر رکھا تھا، پھر بھی بعض اوقات اس کا ذہن گئی گزری باتوں اور یادوں میں اُلجھ ہی جاتا تھا۔ اسے
ر عفت یاد آ ہی جاتے تھے۔ اسے امی ساجدہ، امی خاتون اور جلال آباد کی گلیاں بھی یاد آتی تھیں۔ ان تصورات نے اسے مسرور
خیالوں میں مُسکراتی بھی، اداس بھی ہوتی لیکن اس نے محسوس کیا کہ یہ تصورات اور یادیں اس کا وقت ہی ضائع نہیں کرتیں بلکہ ان
مد کے اثرات روح کو مرجھا دیتے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سکول کے بچوں میں جذب کرنا شروع کر دیا اور تمام توجہ ان نونہالوں
ت کرنے لگی۔

گھر میں نجمہ اور اطہر کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کُود میں لگی رہتی جس سے نجمہ اور اطہر نے اپنے گھر میں عجیب و غریب رونق
ی کی۔ وہ چند دنوں میں ہی بھول گئے تھے کہ طاہرہ پرائی لڑکی ہے۔ طاہرہ نے جلال آباد اور لاہور میں گزارے ہوئے شب و روز
ش کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ امی ساجدہ اور ارشد کی تصویر دیکھ لیتی تھی اور یوں اس نے ماضی کے ساتھ بے ضرر سا
م کر رکھا تھا۔

یہ طاہرہ ہی جانتی تھی کہ اپنے آپ کو سر کرنے کے لیے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ منزل کتنی دور ہے۔ جب
تی تھی تو لوگ اس کی جادُو بھری مسکراہٹ دیکھ کر ہی کھِل اُٹھتے تھے لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ اس مُسکراہٹ میں ایک
دردناک کہانی کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ طاہرہ نے اب بلند قہقہے لگانے شروع کر دیتے تھے۔ یہ بھی رنج و آلام
تے رکھنے کی ایک کوشش تھی۔ وہ اپنے اندر سے اٹھتی ہوئی ان آوازوں کو بلند قہقہوں میں دبا لیتی تھی جو اسے چوری چھپے
طرف بلاتی تھیں۔ ارشد کو قریب نہ پا کر اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ ایسے میں طاہرہ نجمہ کے پیچھے پڑ جاتی تھی، اور نجمہ خواہ کسی

بھی حالت میں ہوا سے بچّوں کی طرح چھیڑنے اور شرارتیں کرنے لگتی تھی۔ طاہرہ نے بہت حد تک اپنے آپ کو سرِ بھی کر لیا اور فریب بھی دے لیا تھا۔

ایک شام جب اطہر دفتر سے واپس آیا تو اس نے نجمہ کو بتایا کہ اس کا ایک دوست پشاور سے آ رہا ہے۔ وہ راولپنڈی اپنے ایک محکمانہ کورس کے لیے جس کی میعاد تین ماہ تھی آ رہا تھا۔ اطہر کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی۔

"کیوں نہ اسے تین ماہ کے لیے اپنے گھر رکھ لیا جائے" ——— اطہر نے نجمہ سے کہا ——— "پنڈی میں اس کا کوئی ایسا دوست یا رشتہ دار نہیں جس کے ہاں وہ ٹھہر سکے۔ کہاں ہوٹلوں میں خراب ہوتا پھرے گا۔ تم اور طاہرہ نے پردے کی پابندی رکھی تو تم دونوں کو اور اسے بھی دقّت ہو گی۔ بھلا آدمی ہے اور بڑے اچھے خاندان سے ہے۔"

"تو ہم پہلے کون سا پردہ کرتی ہیں" ——— طاہرہ نے کہا ——— "خواہ مخواہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو فریب دے رکھا ہے۔ آدمی کیسا ہے؟"

"آدمی خوب ہے" ——— اطہر نے مطمئن ہو کر جواب دیا ——— "شگفتہ مزاج آدمی ہے اور ہنستی کھیلتی محفل کو پسند کرتا ہے۔"

"نام کیا ہے اس کا؟" ——— نجمہ نے پوچھا۔

"نعیم!" ——— اطہر نے جواب دیا ——— "باپ اس کا خاصا دانشمند اور سیدھا سادہ آدمی ہے لیکن اس کی ماں کچھ ایسی ویسی۔ نعیم ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ماں باپ نے اسے بے جا لاڈ و پیار سے کسی حد تک بگاڑ رکھا ہے۔"

"اکلوتا جو ہُوا" ——— نجمہ نے کہا۔

"اس کی ماں شکی مزاج بھی ہے" ——— اطہر نے کہا ——— "اس سے نعیم بھی بعض اوقات تنگ آ جاتا ہے مگر ماں کے لیے کچھ بھی نہیں سکتا۔"

"شادی شدہ ہے؟" ——— طاہرہ نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی نہیں۔ چوبیس پچیس برس تو اس کی عمر ہے" ——— اطہر نے کہا ——— "بہرحال یہ طے ہُوا کہ وہ ہمارے ساتھ رہے گا اور تم دونوں اس سے پردہ نہیں کرو گی۔ وہ آئندہ ہفتے کسی دن آ جائے گا۔ میں اسے آج ہی خط لکھ دیتا ہوں۔ اس نے دراصل رہائش کے لیے ہی لکھا ہے۔"

دوسرے ہفتے کی شام اطہر کے ساتھ ایک خوش شکل، خوش وضع، جالندھر کی زرخیز مٹی کی پیداوار ایک جواں سال گھر میں داخل ہُوا۔ پیچھے پیچھے دو قلی تھے۔ ایک نے دو اٹیچی کیس اور دوسرے نے بستر اُٹھا رکھا تھا۔

"لو بھئی! نعیم صاحب تشریف لے آتے ہیں" ——— اطہر نے تعارفاً کہا۔

"یہ ہیں جناب نجمہ، جن کا آپ سے غائبانہ تعارف ہے" ——— اطہر نے تعارف کرایا ——— "اور یہ ہیں طاہرہ جن کا میں نے رستے میں ذکر کیا تھا۔"

طاہرہ نے نعیم کو اچٹتی نگاہ سے دیکھا۔ پھر اسے کمرے میں جاتے گہری نظر سے دیکھا۔ پھر اسے کمرے میں داخل ہوتے اس کی پیٹھ اور جسم کی ڈیل ڈول دیکھی۔ طاہرہ کو معاً ارشد یاد آ گیا لیکن اس نے اس یاد کو جھٹک دیا۔ اس لیے نہیں اس کے سامنے

ایک اور مرد آ گیا تھا بلکہ اس لیے کہ ارشد کی یاد نے اس کے دل میں ایک خلش پیدا کر دی تھی۔ اسے جلال آباد کا وہ دن اور وہ لمحہ یاد آ گیا تھا جب ارشد اجنبی کی حیثیت سے اس کے کمرے میں داخل ہُوا تھا اور طاہرہ اسے دیکھ کر مسحور ہو گئی تھی۔

نعیم کو دیکھ کر طاہرہ کی یادوں کی دنیا میں بھونچال آ گیا۔ راہی کو چھوڑی ہُوئی منزل یاد آ گئی۔ وہی شرم و حجاب اور ایک جھجک آج پھر اُس پر طاری ہو گئی جو اس وقت طاری ہُوئی تھی جب ارشد اس کے کمرے میں داخل ہُوا تھا۔ اس حجاب کا تاثر کچھ اور تھا نعیم نے کچھ اور ہی تاثر پیدا کر دیا۔ طاہرہ اداس سی ہو گئی۔ ارشد کی یاد نے اسے تڑپا دیا۔ وہ سمجھی تھی کہ ارشد کو بھول جائے گی مگر ارشد آسیب کی مانند اس کی روح میں موجود تھا۔

طاہرہ نے دیکھا کہ نجمہ بھی اطہر اور نعیم کے ساتھ کمرے میں چلی گئی ہے۔ طاہرہ کو بھی ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا لیکن وہ جھجک کر وہیں کھڑی رہی۔ اگر اطہر اسے کمرے میں بلا نہ لیتا تو وہ فیصلہ ہی نہ کر سکتی کہ اسے کمرے میں نعیم کے سامنے جانا چاہیے یا کہیں چھپ جانا چاہیے۔ وہ کسی ایسی چیز، کسی ایسے انسان کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی جو اسے ارشد یاد دلا دے۔

"آ جاؤ، طاہرہ! آ جاؤ" ——— اطہر کی آواز آئی جس کے ختم ہوتے ہی طاہرہ کمرے میں چلی گئی۔

"یہ جناب! آپ سے شرما رہی ہے" ——— اطہر نے نعیم کو بے تکلفی سے کہا۔ اسے معلوم تھا طاہرہ اسی قسم کی بے تکلفی کی قائل ہے اور وہ ہر قسم کا ہنسی مذاق اور بات گزر جاتی ہے۔

طاہرہ کے لال گلابی ہونٹوں پر شرم سے بھرپور مسکراہٹ آ گئی اور اس کی مسکراتی آنکھیں جھک گئیں۔ اطہر نے پہلی بار محسوس کیا کہ طاہرہ اصلی ہیئت سے زیادہ حسین ہے اور اس کے حسن میں ایک وقار بھی ہے۔ اس شرم میں ایک جادو تھا۔ نعیم کو یہ بھی محسوس ہُوا کہ نجمہ اسے کہہ رہی تھی ——— "بھائی جان! آپ پہلے نہا لیجئے" ——— وہ طاہرہ کے شرم آلود حسن اور دلکشی میں اس قدر کھو گیا تھا کہ نجمہ کی آواز اسے چونکا نہ سکی۔

تھوڑی سی دیر بعد طاہرہ کھل گئی اور جب اس نے باتیں شروع کیں تو سب نے محسوس کیا کہ اب نعیم شرما رہا تھا۔ نعیم جس قدر زندہ دل تھا اسی قدر شرمیلا بھی تھا۔ یہی شرمیلا پن اس کے مردانہ حسن میں اضافہ کر دیا کرتا تھا۔ جب طاہرہ نے اس کے شرم اور جھجک کو دیکھا تو وہ اور کھل گئی اور براہِ راست نعیم سے مخاطب ہونے لگی۔ وہ جوں جوں نعیم کے ساتھ باتیں کرتی جا رہی تھی نعیم تو جیسے لٹا ہی جا رہا تھا۔ طاہرہ نے جب مذاق شروع کیے تو وہ کھل کر ہنسا اور یہ ہنسی تھی جو طاہرہ کو بہت ہی پسند آئی۔ پھر طاہرہ اسے بار بار چھیڑنے اور ہنسانے میں ہی لذت محسوس کرنے لگی۔

نعیم ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور دونوں کے لاڈ و پیار کا مرکز بنی۔ اسے پاس کرتے ہی اسے اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اس کی ماں ابھی تک بچوں کی طرح اس سے پیار کرتی تھی جس نے نعیم کو بگاڑ سا دیا تھا۔ چودہ برس کی عمر تک ماں اسے اپنے ساتھ اپنے بستر میں سلایا کرتی تھی۔ باپ حقیقت بین آدمی تھا۔ اس نے کئی بار نعیم کی ماں سے کہا تھا کہ لڑکا بگڑ جائے گا، جوان ہو رہا ہے، ایسا نہ ہو کہ بچے کا بچہ ہی رہ جائے لیکن ماں کے پاس ایک ہی جواب تھا ——— "ابھی بچہ ہی تو ہے۔"

باپ اس کی ماں کو تو قائل نہ کر سکا تھا، اس نے نعیم کو اپنے طور پر تربیت دینی شروع کر دی اور اسے دنیا کے حقائق اور نشیب

خراز کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح نعیم کا کردار پختہ ہوتا گیا مگر ماں کے پیار کے اثرات بھی زندہ رہے۔ ماں کا سایہ ہر وقت اس کے دل و دماغ پر سوار رہنے لگا۔ ذرا سی تکلیف پر وہ ماں ہی کو یاد کیا کرتا اور ماں ہی اس کے آڑے آتی تھی۔ اس سے وہ ذہنی طور پر بالغ نہ ہو سکا۔

سر درد، کھانسی زکام اور ہلکی پھلکی چوٹیں تو آئے دن کا معمول ہوتی ہیں۔ باپ اسے یہ سکھانے کی کوشش کرتا تھا کہ تکالیف تو زندگی کا لازمی جزو ہیں۔ گر جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی لیکن گر پڑنا نعیم کے لیے قیامت سے کم نہ ہوتا تھا خصوصاً اس وقت جب کہ ماں دیکھ رہی ہو۔ ماں نعیم کو گرتے دیکھتی تھی تو وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹا مار کر اسے اٹھا لیا کرتی اور نعیم کے سارے جسم کا معائنہ کیا کرتی تھی کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ اگر چوٹ نہ آتی ہو تو بھی وہ جسم کے کسی نہ کسی حصے پر ہاتھ رکھ کر ہائے ہائے کراٹھتا

اس کے رگ و ریشے میں ماں اور ماں کا سہارا سمویا ہوا تھا۔ شرمیلا پن، جھجک، سہارے کی تلاش اور نامعلوم سا ایک خوف اس کی شخصیت کے لازمی جزو بن گئے تھے۔

باپ نے اس کی ان خامیوں کو سمجھ لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لوگوں میں گھماتا پھراتا رہتا اور اسے باتیں کرنے کا موقعہ دیتا رہتا تھا۔ باپ کی یہ کوششیں کسی حد تک کامیاب ہو جاتی تھیں لیکن ماں کے جذبۂ ملکیت کے جو تخریبی اثرات نعیم کا اتنو ... پہنچ چکے تھے ان کوششوں کو اندر ہی اندر ختم کر دیا کرتے تھے۔ نعیم ماں کو کبھی وقت بھولتا نہ تھا۔

اظہر کے گھر آکر نعیم نے تین چار روز شرم اور گھبراہٹ سی محسوس کی خصوصاً طاہرہ کے سامنے تو وہ دب کے رہ جاتا۔ تین چار روز بعد وہ سب میں گھل مل گیا اور اس گھر کی رونق اور ہماہمی کا حصہ بن گیا۔ طاہرہ اس میں خاص طور پر دلچسپی لینے لگی نعیم نے بھی یہی کوشش شروع کر دی کہ طاہرہ کے ساتھ ہی باتیں کیا کرے۔ طاہرہ کے انداز میں ہمدردی کی جھلک نمایاں ہوتی تھی جو اس کی عادت تھی۔ نعیم کو طاہرہ کی اس عادت میں شاید اپنی ماں کی جھلک نظر آتی تھی، مگر وہ طاہرہ کے ساتھ بے تکلف ہونے سے گھبراتا تھا۔ یہ اس کی عادت بن گئی تھی۔

وہ اس جھجک سے تنگ آ گیا اور اس سے گلو خلاصی کرانی چاہی کیونکہ اس کے دل کی بیشتر باتیں طاہرہ کے کانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی اس جھجک کی نذر ہو جاتی تھیں۔ بعض اوقات کسی بات پر نعیم کے دل میں طاہرہ سے کسی بات پر اختلاف رائے پیدا ہو جاتا تو وہ مخالفت کی جرأت ہی نہ کر سکتا تھا اور طاہرہ کی ہاں میں ہاں ملاتا جاتا تھا۔ اس سے طاہرہ کو فتح کا سا احساس حاصل ہوتا جس کے زیر اثر وہ نعیم کے ساتھ اور زیادہ پیار بھری اور بے تکلفانہ باتیں کیا کرتی تھی۔

دو ہفتوں بعد نعیم کا کمرہ طاہرہ نے اپنی ذمہ داری میں لے لیا۔ اس کی صفائی، سجاوٹ اور دیکھ بھال طاہرہ خود کرنے لگی۔ ملازمہ کو وہاں صرف جھاڑو دینے کی اجازت تھی۔ نعیم کا ردِ عمل بھی طاہرہ کے لیے بہت پیارا تھا۔ ایک دو مرتبہ طاہرہ یہاں تک کیا کہ رات نعیم سونے کے لیے لیٹا تو طاہرہ نے چادر کھول کر اس پر ڈال دی۔ طاہرہ کی اس حرکت نے نعیم کے اندر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کے دل میں "ماں" بیدار ہو گئی۔ طاہرہ کے انداز میں جو بے ساختگی اور اپنائیت تھی، اس میں نعیم کو ماں کی وہ بھینی بھینی بو آنے لگی جس نے اسے اس عمر تک بچہ بنا رکھا تھا۔

ایک رات جب طاہرہ نعیم پر چادر ڈال کر اپنے کمرے میں آئی اور اپنے اوپر چادر اوڑھی تو اس نے اپنے آپ

...سا ایک احساس محسوس کیا۔ ایک مانوس جذبہ جو پہلے بھی کبھی اس کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ وہ خیالوں کے تانے بانے ...گئی۔ اسے ارشد یاد آ گیا۔ نکھرا ہوا ایک تصور جو ہزار جھٹکنے پر بھی نکھرتا ہی گیا۔ اسے والٹن کے رفیوجی کیمپ کے قریب ...تی ہوئی ریلوے لائن اور چھٹکی ہوئی چاندنی یاد آ گئی۔ ایسے میں طاہرہ نے محسوس کیا کہ ارشد کے تنفس اور جسم کی بو ابھی ...کے سینے میں باقی ہے۔ اس عطر بیز بو نے طاہرہ کے سانسوں کا تسلسل اکھاڑ دیا اور وہ تصوروں سے دل بہلانے لگی۔ طاہرہ نے بہت کوشش کی کہ اس تصور کو ذہن سے نکال پھینکے لیکن یہ کانٹا چبھتا ہی رہا اور جیسے اس کے اپنے ...ے آواز آئی ہو۔ "ذرا سی دیر اور" —— اس نے آخر ہمت کی اور اس قربانی کو یاد کیا جو اس نے عفت کی خاطر کی تھی۔ ...فت یاد آئی، اس کا ہونے والا بچہ یاد آیا اور طاہرہ نے اپنے آپ کو اس حقیقت کے سامنے جھکا لیا کہ ارشد اب ...باپ ہے اور عفت ارشد کے بچے کی ماں ہے۔

"ارشد جب میری دسترس سے ہی باہر ہے تو میرے خیالوں پر کیوں چھایا رہے؟" —— طاہرہ نے اپنے آپ سے کہا۔ ...رنج ہو رہا ہے کہ میں نے ارشد کو عفت کے حوالے کر دیا ہے؟ کیا میں اپنی قربانی کا ماتم کر رہی ہوں؟" —— طاہرہ نے ...دمانی قوتیں یکجا کیں تو ارشد کی جگہ نعیم نے لے لی۔ طاہرہ کو یوں لگا جیسے وہ گھپ اندھیرے میں بھٹک گئی تھی کہ سیاہ بادلوں ...ے اچانک چاند نکل آیا ہو۔ اسے گرد و پیش کا ذرہ ذرہ دکھائی دینے لگا۔

"میں ارشد کو دھوکہ تو نہیں دے رہی؟" —— اس نے اپنے آپ سے اس طرح کہا جیسے وہ ضمیر پر ایک جرم کا بوجھ محسوس ...ہو —— "میں نے ارشد کو عفت کے حوالے کر دیا ہے۔ اب مجھے اپنے آپ کو کسی کے حوالے کرنا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ...ہے میں خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔ مجھے کسی کی بیوی بننا ہے۔ اپنا گھر آباد کرنا ہے ورنہ میں ارشد کے تصوروں میں بھٹکتی ...اور ایک روز زندگی کی حقیقی راہ سے ہی بھٹک جاؤں گی۔ مجھے ماضی سے رشتہ توڑنا ہے۔ مجھے مستقبل سے رشتہ جوڑنا ...مجھے ماں بننا ہے، اور...... اور...... میرے پہلے بچے کا نام ارشد ہوگا۔"

ارشد کے نام سے وہ چونک اٹھی لیکن وہ حقیقی دنیا میں لوٹ آئی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اپنے جس بچے کا نام ارشد رکھے ...اس کا باپ کون ہوگا؟ کیا نعیم اس قابل ہے کہ ارشد کا باپ کہلا سکے؟ نعیم تو خود بچہ ہے۔

اس کے آنسو نکل آئے۔ اس احساس نے اسے رلا دیا کہ آج ماں ہوتی تو وہ اسے کہتی —— "بیٹی! فلاں کا بیٹا مجھے اچھا لگتا ...ہے، اسے تمہارے لیے پسند کر لیا ہے" —— مگر وہ تنہا تھی۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ اسے خود کرنا تھا۔

...وہ خلاؤں میں دیکھنے لگی۔ دل پر ایک گھبراہٹ طاری ہو گئی اور پھر جرم کا احساس ضمیر پر سوار ہو گیا۔ اس نے لیٹے لیٹے گڑگڑا ...کر کہا "اے خدا! مجھے ہدایت دے کہ میں اپنی زندگی کی راہ بنا سکوں۔ مجھے میری منزل دکھا دے" —— طاہرہ نے اپنے جسم ...میں ایک بے چینی محسوس کی اور اس کے دل اور دماغ میں ایک کشمکش بیدار ہونے لگی۔

...نعیم طاہرہ کے ساتھ باتیں کر بھی لیتا تھا اور باتیں دبا بھی لیتا تھا۔ اکیلے میں وہ سوچا بھی کرتا تھا کہ طاہرہ آئے گی تو اسے یوں ...اور یوں بھی کہوں گا لیکن طاہرہ سامنے آتی تو زبان ہی نہ کھل سکی سوائے ایک شگفتہ مسکراہٹ کے۔ اس مسکراہٹ ...میں بھی جوانی کی امنگ تھی۔ ایسے میں تو اس کی آنکھیں بھی مسکرا اٹھتی تھیں اور چہرے کا ایک ایک نقش گلاب کی پتیوں

کی طرح نکھر آتا تھا لیکن وہ جو کچھ سوچ کے بیٹھا ہوتا اسی مسکراہٹ میں تحلیل ہوجاتا تھا۔ طاہرہ ہی بات شروع کرتی
تھی اور نعیم لبساط کے مطابق اس کا ساتھ دیتا اور کھل کر ہنستا تھا۔

نعیم نے تنہائی میں کئی بار چاہا کہ طاہرہ کو اپنے کمرے میں بلا لے یا اس کے کمرے میں چلا جائے۔ اب تو
سے پہلے اسے بلاناغہ طاہرہ کا خیال آنے لگا تھا۔ پھر اس کی یاد میں انگڑائیاں بھی لینی شروع کردی تھیں اور طاہرہ کے
وہ زیرِ لب مسکرا بھی اٹھتا تھا اور اپنے آپ میں جھینپ بھی جاتا تھا ——"نہیں! یوں نہیں۔ جانے وہ کس خیال سے
میں آتی ہے اور میں ...." نعیم کا تذبذب اور شرم اسے آگے بڑھنے نہ دیتی تھی لیکن نعیم اس احساس کو نہ ہی دبا سکا
کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا جب طاہرہ اس کے سامنے نہیں ہوتی تو جیسے کوئی بھی نہیں ہوتا۔

اس نے رفتہ رفتہ نجمہ اور طاہرہ کی محفل میں اکتاہٹ سی محسوس کرنی شروع کردی۔ وہ صرف طاہرہ کے پاس
تھا لیکن طاہرہ کے خیال کے ساتھ اس کے دماغ میں ایک لغزش کا خیال بھی پیدا ہوجاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس خیال
طاہرہ کے خیال سے باز رکھنے لگا۔ دونوں خیال اپنی اپنی جگہ حقیقت بنتے جا رہے تھے۔ پھر دونوں خیال آپس میں
لگے اور یہ تصادم صرف اس وقت تھمتا تھا جب طاہرہ اس کے کمرے میں یا وہ طاہرہ کے کمرے میں پہنچ جاتا تھا۔
علیحدہ ہوکر نعیم، اطہر اور نجمہ سے یوں کتراتا تھا جیسے اس نے ان کی چوری کی ہو اور انہوں نے اسے پکڑ لیا ہو۔

اطہر اور نجمہ اسے پکڑنا نہ چاہتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ نعیم اور طاہرہ ایک دوسرے میں کتنی دلچسپی لے رہے
ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ چوری نہیں تھی۔ نجمہ طاہرہ کے اخلاق کو جانتی تھی اور اطہر نعیم کے اخلاق سے واقف تھا۔
طرح جانتے تھے کہ دونوں میں آوارگی ہے نہ پست خیالی۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ دو دل ایک پاکیزہ جذبہ لیے ایک
کے قریب ہو رہے ہیں۔ نعیم اپنی جن حرکات کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اطہر اور نجمہ پر ظاہر ہوتی رہتی تھیں۔
دھواں چھپایا نہ جاسکا۔ نعیم طاہرہ کی ملاقاتوں کو شرمیلے پن میں چھپاتا تھا اور طاہرہ شوخی میں لیکن دونوں کی آنکھیں اور مسکرا
راز فاش کرتی رہیں۔ اطہر اور نجمہ خوش ہوتے رہے کہ انہوں نے جو منصوبہ نعیم کے آنے کے تیسرے روز بنایا
ہی کامیاب ہو رہا تھا۔

"میں نے ایک بار طاہرہ سے کہا تھا...." نجمہ نے ایک روز اطہر سے کہا کہ "تمہارا بیاہ اپنے ہاتھوں کرا
خدا کی قسم فسٹ کلاس آدمی سے کراؤں گی.... سُنیئے!" نجمہ نے اطہر سے پوچھا ——"نعیم آدمی تو خوب معلوم ہوتا ہے
نعیم کا جوڑا بھی خوب ملتا اور پھبتا ہے۔"

"تم نے تو میرے دل کی بات کہہ ڈالی ہے" —— اطہر نے جواب دیا —— "جانتی ہو نعیم میرا کس قدر گہرا دوست
ہے؟ میرا اس کے ساتھ وعدہ ہے کہ تمہاری شادی میں کراؤں گا بلکہ ایک بار اس کے والد صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں
نے انہیں بھی یہی وعدہ دے دیا تھا۔ اس کے والد صاحب نے کہا تھا —— 'بیٹا! تم نہ کراؤ گے تو کون کرائے گا؟'
تم بھی تلاش میں رہو اور میں اپنے طور پر تلاش میں لگا رہتا ہوں" —— اُس وقت تو طاہرہ کا خیال بھی دماغ میں نہیں
نعیم کو اس گھر میں آئے بیسویں رات تھی۔ راولپنڈی کا شہر گہری نیند سو رہا تھا۔ نعیم طاہرہ کے خیال کو دل

تھا۔ نہ جانے کیا خواب دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی، پھر سونے کی کوشش کی مگر سو نہ سکا۔ بے کلی سی تھی جس سے
وہ اٹھ کر بیٹھ رہا تھا اور دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جارہی تھیں۔ سانسوں کا تسلسل اکھڑا اکھڑا اور وہ اس بیقراری اور بے چینی
میں لذت آگیں قرار محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سامنے طاہرہ کا تصور محسوس پیکر کی طرح آگیا۔ اب اس کے ذہن میں نہ دو متضاد
خیالوں کا تصادم تھا۔ نہ شرم و جھجک اور نہ ہی یہ خدشہ کہ ——"کوئی کیا کہے گا" —— جذبات اور احساسات نے اُبل کر سب
کچھ بہا دیا تھا سوائے طاہرہ کے۔ اس کے اعصاب اور سوچ اور فکر پر طاہرہ ایک سحر کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ خواب کا
اثر بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

اس نے کروٹ بدلی۔ اس بیقراری کو تسکین دینے کی خاطر گہرا سانس لیا لیکن یہ پر لطف بیقراری بڑھنے لگی اور وہ
ایک سوز نے اسے بے بس کر دیا —— "طاہرہ! طاہرہ! طاہرہ!" —— اسے ہر سمت سے ایک ہی سرگوشی سنائی دے
رہی تھی۔ وہ اس قدر بے خود اور مضطرب ہوگیا کہ بے قابو سا ہوکر بستر سے نکلا اور کمرے سے باہر آگیا۔ رات کی ہلکی ہلکی خنکی نے اس کے
اندر کی آگ کو اور تیز کر دیا۔ ایک رومان پرور تلاطم امڈ آیا اور وہ نڈھال ہوکر اس تلاطم میں بہہ نکلا۔ شعور اور عقل ایک غیبی گرفت میں
تھے اور وہ بے خودی میں چل پڑا۔

"کون؟" —— گھبرائی ہوئی ایک دھیمی آواز نے اسے چونکا دیا اور پیشتر اس کے کہ وہ جان سکتا کہ وہ کہاں ہے،
بتی جل چکی تھی۔

"وہ! آپ؟"

نعیم نے خیرہ آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے مَل کر دیکھا تو اسے خواب کا دھوکہ ہوا لیکن طاہرہ کا محسوس پیکر اس کے سامنے
تھا اور وہ بڑی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"معاف رکھنا!" —— نعیم نے گھبرا کر کہا ——"میں اندھیرے میں آپ کے کمرے میں چلا آیا۔ آپ.... اوہ! معاف
کیجئے! آپ دروازہ کھلا کیوں رکھتی ہیں؟ بند کرکے سویا کریں۔ کوئی چور گھس آئے تو؟" —— نعیم سنبھل چکا تھا لیکن اس کا سارا
وجود پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

"آپ چور تو نہیں" —— طاہرہ نے ایسے لہجے میں کہا جو نعیم کے لیے کسی حد تک غیر متوقع تھا ——"آئیے! بیٹھ جائیے۔"
"طاہرہ!" —— طاہرہ کے استقبال نے اس کی گھبراہٹ ختم کر ڈالی اور اس پر رومانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اُس نے
سر جھکا لیا۔ طاہرہ نے اسے کلائی سے پکڑ کر بستر پر بٹھا لیا اور خود بھی بستر پر بیٹھ گئی —— "طاہرہ!" —— اس نے طاہرہ کی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فوراً آنکھیں جھکا لیں اور کہا ——"مجھے آپ نہ کہا کرو۔ تم کہا کرو۔"
"غلطی تو آپ.... اوہ بھول گئی.... تم نے شروع کیا تھا" —— طاہرہ نے اسے پہلی دفعہ تم جو کہا تو ایک برقی رو اس کے
جسم میں دوڑ گئی اور اس کے جسم نے جھرجھری لی۔ طاہرہ بولی ——"سچ بتاؤ نعیم!.... ٹھہرو بتی بجھا دوں"…. نعیم کا دل اس قدر
زور سے دھڑکنے لگا کہ کمرے کے گہرے اندھیرے میں اسے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی ——"ہاں! تو سچ بتانا"…. طاہرہ
نعیم کے قریب پلنگ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا ——"کیا واقعی بھولے سے چلے آئے ہو یا...."

اندھیرے میں طاہرہ کا دمکتا ہوا چہرہ چھپ گیا تھا جس سے نعیم کو حوصلہ ہُوا ورنہ وہ بات نہ کر سکتا۔ بولا "...
گزرے تو کہہ دینا، میں چلا جاؤں گا۔ میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہارے بغیر دل گھبرا گیا تھا۔ طاہرہ! مجھے صرف اتنا...
مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ خُدا کے لیے بتا دو، طاہرہ! میں آج بے بس ہو کر آیا ہوں "

وہ کہہ رہا تھا اور طاہرہ کا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رینگتا جا رہا تھا۔ وہ بے اختیار بولا "میں نے بہت کوشش...
طاہرہ! کہ یہاں تک نوبت نہ پہنچنے دوں۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا یہاں سے چلا جاؤں اور ہوٹل میں جا رہوں۔ میں نے...
تھا! کیا کیا بتاؤں، میں تمہارے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میں صرف تمہاری یاد لے کر یہاں سے دور ہو جانا چاہتا...
آج تمہارے خیال نے بے بس کر دیا ہے۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔" اس نے طاہرہ کی انگلیوں کو ہاتھ میں دبا کر کہا "بولو...

میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے، اور میں چلا جاؤں "

طاہرہ سرتاپا کانپ گئی۔ دو چار لمحوں کے لیے تو اسے یوں لگا جیسے اس کے پاس ارشد آن بیٹھا ہے گر یہ آواز...
یہ الفاظ ارشد کے نہیں تھے۔ اظہار کا یہ طریقہ اور انداز ارشد کا نہیں تھا۔ ہاں، اس سے نعیم جو محبت مانگ رہا تھا وہ ارشد کا...
سینے سے آہ اٹھی جو سسکی بن گئی۔ اس نے اسے ہونٹوں سے آزاد نہ ہونے دیا۔ اس نے سینے میں بہت کچھ روک ر...
بھی اسی میں گم ہو گئی۔

"میں بے خیالی میں آ گیا تھا طاہرہ!" نعیم نے اسے اندھیرے میں اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا۔ بولا "...
ہنس کر بات کرنا تمہاری عادت ہے۔ میری دیکھ بھال کو تم اپنا فرض سمجھتی ہو۔ یہ تمہارا کردار ہے۔ میں ویسے ہی چلا آ...

طاہرہ کی خاموشی اسے پریشان کر رہی تھی اور طاہرہ خود اپنی خاموشی سے پریشان ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نعیم کو اس...
سے بچانا چاہتی تھی کہ اسے اس کے کمرے میں اتنی رات گئے نہیں آنا چاہیے تھا اور اسے یہ احساس بھی نہیں...
اس نے اچھا کیا ہے جو اس کے کمرے میں چلا آیا ہے۔ دن کی بات اور تھی۔

"دن کی بات اور ہے نعیم!" طاہرہ نے اپنی آواز کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اس...
بھی کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ میں تمہاری نیت پر کوئی شک نہیں کرتی۔ اطہر بھائی جان اور نجمہ آپا کا خیال آتا ہے
جانے کیا سوچیں "

"تم نے مجھے معاف کر دیا ہے؟" نعیم نے پوچھا۔

"بچوں کی سی باتیں نہ کیا کرو" طاہرہ نے شگفتہ لہجے میں کہا "جاؤ سو جاؤ۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا...

نعیم نے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا "میں کسی ایسی ویسی نیت سے نہیں آیا تھا۔ ایک...
سوچ سی آئی تھی۔ اکیلا ہوتا ہوں تو فیصلہ کر لیتا ہوں، تم سامنے ہوتی ہو تو۔۔۔"

"یہ خیال میرے دل میں بھی آیا تھا" طاہرہ نے کہا "سوچیں مجھے بھی پریشان کیا کرتی ہیں۔۔۔ مجھ...
لیے سوچنے والے ماں باپ زندہ ہیں۔ میرا کوئی نہیں۔۔۔ میرا کوئی نہیں نعیم" طاہرہ کی آواز دب گئی "میر...
کی ہوں، اور یہی میرا گناہ ہے۔ اسی گناہ نے مجھے جلاوطن کرایا ہے "

"تم رو رہی ہو طاہرہ؟" نعیم نے گھبرا کر کہا "میں نے بہت بُرا کیا ہے "

"نہیں" طاہرہ نے نعیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "میں نے تم پر کوئی الزام عائد نہیں کیا۔ اپنے دل کی بات کی ہے
مجھ پر جو بیتی ہے وہ چند لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ اتنا بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں نے ظلم کبھی نہیں دیکھی۔ اس لیے مکالمے نہیں
بول سکتی۔ جو دیکھتی ہوں اور جو محسوس کرتی ہوں وہ کہہ دیتی ہوں۔ میں نے لفظوں میں کم ہی کبھی اظہار کیا ہے۔ میرے دل کی بعض باتیں میرے
آنسو کہہ دیا کرتے ہیں۔۔۔ مجھے اپنے متعلق فیصلہ کرنا ہے۔ تم اپنے متعلق فیصلہ کر لو لیکن جذبات سے نکل کر۔ زندگی کے متعلق میرا جو مختصر
سا تجربہ اور مشاہدہ ہے وہ یہی ہے کہ زندگی لاڈ اور پیار کا نام نہیں۔ ایک سے ایک بے رحم انسان پڑا ہے "

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے" نعیم نے کہا "اگر تم قبول کرو "

"کروں گی نعیم۔۔۔۔ کروں گی "

نعیم چلا گیا اور طاہرہ کی باقی رات کی نیند اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ اندھیرے میں ارشد اُسے اپنے کمرے میں چلتا سنائی دیتا
تھا۔ طاہرہ اس تصور سے آزاد ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ ارشد کی جگہ نعیم کو کھڑا کرتی تھی مگر نعیم کا چہرہ ارشد کے چہرے میں تحلیل ہو
جاتا تھا۔ اسے نعیم اچھا لگتا تھا لیکن اس حد تک کہ اسے مستقبل کا ساتھی بنا لے۔ اس نے بہت سوچا کہ اسے نعیم کے ساتھ ارشد والی
محبت ہے یا ہو سکتی ہے یا نہیں۔ وہ اس حقیقت سے بیگانہ نہیں تھی کہ ارشد کو وہ کسی اور کے حوالے کر چکی ہے۔ اسے وہ اب کبھی
نہیں پا سکے گی۔ اسے اب اپنے متعلق دو ٹوک فیصلہ کرنا ہے۔۔۔۔ اور نعیم بُرا نہیں۔

"نہ جاؤ۔ خُدا کے لیے نہ جاؤ ارشد! آج کی رات میرے قریب رہو" ہسپتال کے کمرے میں عفت ارشد کے دونوں ہاتھ
پکڑ کر گڑگڑا رہی تھی "یہ میری بھٹکی ہُوئی زندگی کی آخری رات ہے مجھے تنہا نہ چھوڑنا میرے ارشد!"

ارشد نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ اس کے آنسو پھوٹ رہے تھے جنہیں وہ آنکھوں میں ہی جذب کرنے کی کوشش
کر رہا تھا۔ وہ لپک کر عفت کو اس جانکاہ بیماری سے نکال لینا چاہتا تھا۔ عفت کی علالت اور یہ بے بسی ارشد سے دیکھی نہ جاتی تھی
بچے کی پیدائش میں صرف سات دن باقی تھے۔

عفت کے دورے اب بہت کم ہو گئے تھے۔ گذشتہ بیس دنوں میں اسے صرف دو دفعہ دورہ پڑا تھا۔ انجکشن لگ رہے
تھے اور پروفیسر عاقل ابھی تک محنت کر رہا تھا۔ اس نے عفت کو کسی حد تک اپنے زیر اثر کر لیا تھا لیکن اس کی نقاہت میں کوئی فرق نہ آیا۔
بڑی ڈاکٹر نے تازہ خون کے لیے کہہ دیا تھا اور خون کا انتظام ہو رہا تھا۔

مریضہ کی حالت کبھی کبھی دگرگوں ہو جاتی تھی۔ اب وہ ارشد کی محبت کو اتنا محسوس نہیں کرتی تھی جتنا طاہرہ کی جدائی کو۔ اس کے
ساتھ ایک احساس جرم بھی شامل تھا۔ یہ احساس اسے پریشان کرتا رہتا تھا کہ طاہرہ کے فرار کی ذمہ دار وہ ہے۔ اسے اپنے ہی ضمیر
کی آوازیں لعنت ملامت کرتی رہتی تھیں۔ ایک پچھتاوا اس کی ذہنی حالت کو بگاڑتا رہتا تھا۔ دو تین موقعوں پر ایسے ہوا کہ وہ رات کو
ہڑبڑا کر جاگ اٹھی اور کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر آہستہ آہستہ کہنے لگی "وہ آئی تھی۔ ابھی میرے پاس آئی تھی" ملازمہ نے جو رات
اس کے کمرے میں سوتی تھی، پوچھا "کون آئی تھی، بی بی؟"

"طاہرہ نہیں آئی تھی یہاں؟..... ابھی نکل کے گئی ہے۔ دیکھو تو ذرا وہ برآمدے میں ہوگی۔"

"خواب میں دیکھا ہوگا طاہرہ بی بی کو، چھوٹی بیگم!" ۔۔۔ ملازمہ نے کہا ۔۔۔ "سو جائیے۔"

"نہیں، مائی! تم غلط کہتی ہو۔ خواب یوں تو نہیں ہُوا کرتے" ۔۔۔ اور وہ اتنی دیر بستر میں بیٹھی ہر طرف متلاشی نظروں سے دیکھتی رہی کہ پیٹھ تھک کر درد کرنے لگی اور وہ بے بس ہو کر لیٹ گئی۔

طاہرہ نے اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا فیصلہ کرتے وقت اس پہلو پر توجہ ہی نہیں دی تھی کہ عفت پر اس کا رد عمل کس قدر تباہ کن ہوگا۔ گھر میں کسی نے نہیں سوچا تھا۔ گھروں میں سوچیں گہرائی تک نہیں جایا کرتیں۔

"ارشد!" ۔۔۔ عفت نے بچے کی پیدائش سے سات راتیں پہلے ایک رات ارشد کے ہاتھ تھام کر کہا ۔۔۔ "میں اب زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ اللہ! چلے نہ جانا۔ میں نے تو اپنے ساتھ تمہاری زندگی بھی اجیرن بنا دی ہے۔"

"سو جاؤ، عفت!" ۔۔۔ ارشد نے آنسو ضبط کرتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا ۔۔۔ "وہ زندگی گزر گئی ہے۔ اب تم تندرست ہو جاؤ تو ہم ایک اور زندگی کا آغاز کریں گے جس میں ہمارا بچہ بھی شامل ہوگا۔"

"طاہرہ بھی ہوگی" ۔۔۔ عفت نے علیل سی مسرت سے اضافہ کیا ۔۔۔ "ہوگی نا؟ طاہرہ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ وہ تو ہنا رہی ہے۔ ہے نا؟" عفت ڈرنے کے بعد بہلے ہوئے بچے کی طرح کہنے لگی ۔۔۔ "کل رات وہ میرے پاس آئی تھی۔"

"ہاں! وہ تمہارے اچھا ہوتے ہی آجائے گی اور ہمارے بچے کا نام وہی آکر رکھے گی" ۔۔۔ ارشد نے کہا اور اس نے بڑی ہی مشکل سے آنسو روکے۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ عفت کی دماغی حالت متزلزل ہو چکی ہے۔ وہ اسے بھی فریب دے رہا تھا اور اپنے آپ کو بھی عفت کو فریب دے کر ذرا سی دیر کے لیے بہلایا جا سکتا تھا، وہ اپنے آپ کو کیونکر بہلاتا؟ اس کے ساتھ دوسرا بڑا مسئلہ بچے کا تھا۔ ارشد اپنے آپ کو ایک عظیم حادثے کے لیے تیار کر رہا تھا لیکن جب سوچتا تو اس کا دل بیٹھ جاتا تھا۔ ابا جان اور اس کا بھائی اسے حوصلہ دیتے رہتے لیکن ان کے بھی پاؤں ہلے ہوئے تھے۔

آج کی رات تو عفت ارشد کو چھوڑ ہی نہیں رہی تھی۔ ارشد کو گھر واپس جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا آج کی رات عفت کو مایوس نہ کیا جائے۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور عفت نے دکھے ہوئے سکون کی آہ لی۔ اس نے ارشد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور آہستہ آہستہ اس ہاتھ کو مسلنے لگی۔

"ارشد!" ۔۔۔ عفت کی مریل سرگوشی سنائی دی۔ ارشد نے اس کی طرف دیکھا۔ عفت کے ہونٹوں پر ملتجی مسکراہٹ تھی۔ لہجے میں بولی ۔۔۔ "چلے تو نہ جاؤ گے؟"

"نہیں!" ۔۔۔ ارشد نے کہا اور عفت نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے چہرے پر رکھ دیا۔ پھر اس کی ہتھیلی کا بوسہ لیا۔ ارشد نے اس کے رخسار سہلائے تو عفت نے آنکھیں بند کر لیں اور ارشد کا ہاتھ اپنے رخسار کے ساتھ دبا لیا۔ بہت دیر تک اسی حالت میں رہی۔ پھر اس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔ ذرا سی دیر بعد اس کے ہاتھ سرہانے پر گر پڑے۔ ارشد نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بیٹھا۔ نیند کی گولیاں اثر کر چکی تھیں اور عفت سو گئی تھی۔ ارشد نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے عفت کی پیشانی چوم لی۔ ایسے میں اس کا ایک آنسو نکل ہی آیا اور عفت کی زرد پیلی مانگ میں گر پڑا۔

لیڈی ڈاکٹر اور پروفیسر کی ہدایت کے مطابق ارشد نے پندرہ روز کی چھٹی لے لی۔ پروفیسر نے ارشد کو کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ عفت کے پاس بیٹھا رہے اور اس کے ساتھ محبت بھری باتیں کرتا رہے ۔۔۔ "جذبات سے بھرپور باتیں کیجیے، ارشد صاحب!" پروفیسر کو ہی معلوم تھا کہ یہ ہدایت کس قدر اہم ہے۔ اس نے تو یہ بھی پوچھا تھا کہ طاہرہ کون ہے؟ اور اس کا مریضہ کی زندگی میں کیا دخل ہے؟ لیکن ابا جان، ارشد اور عفت بھی ٹال گئے تھے۔ پروفیسر نے کہا تھا کہ وہ لڑکی عفت کے پاس آجائے تو مرض میں بہت افاقہ ہو سکتا ہے۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر چپ ہو گئے تھے۔

ارشد اب سب کچھ فراموش کر کے ہونے والے بچے کی عافیت کا خواہاں تھا۔ طاہرہ تو اس کے خیالوں پر غالب ہی رہتی تھی مگر اس نے اس حزنیہ کو زندگی کا جزو سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو تبدیل کر کے حالات اور وقت کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ وہ جذباتی قسم کا انسان نہ تھا ورنہ کبھی کا گھٹنے ٹیک چکا ہوتا۔ گو وہ کبھی کبھی جذبات میں الجھ جاتا تھا لیکن اس کی فطرت میں حقیقت بینی کا عنصر تھا وہ اس ابتلا کے دور میں آڑے آگیا۔ ابا جان اور یوسف بھائی کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی بھی شامل تھی۔

ارشد نے پندرہ روز کی چھٹی لے کر دن رات کا بیشتر حصہ عفت کے پاس گزارنا شروع کر دیا۔ عفت کے پاس اور گھر میں عفت ایک اذیت سے دوچار رہتا تھا۔ عفت اسے اپنے پاس سے اٹھنے نہ دیتی تھی۔ اس کی باتیں اب بالکل الکھڑی الکھڑی ہوتی تھیں۔ بے تعلق اور ہذیانی باتیں کرتی تھی، یا یک لخت اس کی حالت ایسے ہو جاتی جیسے اس نے کوئی ڈراؤنی چیز دیکھ لی ہو۔ ایسے میں وہ ارشد کے ساتھ لپٹ جاتی تھی۔ ایک دو بار ارشد نے پوچھا کیا ہُوا ہے؟ تو وہ خلاؤں میں کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "معلوم نہیں کیا ہُوا تھا..... دل بیٹھ گیا تھا۔"

ایسی کیفیت کے معاً بعد وہ ارشد کو ضرور کہتی تھی ۔۔۔ "میرے ارشد! چلے نہ جانا" ۔۔۔ پھر اس نے یہ کہنا بھی شروع کر دیا ۔۔۔ "ارشد! عفت تم میری ہو اور میں تمہارا ہوں" ۔۔۔ اور ارشد نے ویسے ہی کہنا شروع کر دیا تھا۔ عفت کے مزاج میں کبھی کبھار تبدیلی آتی تھی لیکن وہ پیٹ میں بچے کی حرکت کی وجہ سے دب جاتی تھی۔ نفسیاتی اثرات مرض میں اضافہ کر رہے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر نے اب اسے تازہ خون دینا شروع کر دیا تھا۔

صرف تین دن باقی تھے۔

عفت کی ذہنی خرابی اب عروج پر پہنچتی جا رہی تھی۔ وہ اب اس بچے کی طرح حرکتیں کرتی تھی جو ڈرا ہُوا ہو اور یہ ڈر اس کے اعصاب پر سوار ہو جائے۔ وہ ارشد کو اپنے پلنگ پر بٹھاتی تھی۔ اگر ارشد بیٹھے بیٹھے کروٹ بدلنے کے لیے ہلتے تو عفت لپک کر اس کا بازو پکڑ لیتی اور گھبرا کر نحیف آواز میں کہتی ۔۔۔ "نہ جانا، ارشد" ۔۔۔ ارشد گھر اس وقت آتا جب عفت سو جاتی تھی۔ اس کی نیند بھی نیند ہی کہاں۔ یہ خواب آور دواؤں کا اثر تھا ورنہ عفت کبھی بھی نہ سوتی۔

"آشا بھون" کے ماحول میں ایک بے چینی مسلط ہو چکی تھی۔ ہر کوئی خاموش اور چپ تھا اور ہر کوئی کسی نہ کسی رنگ میں مصروف تھا۔ ارشد کی امی نے عفت اور بچے کی صحت کے لیے پانچ سو نفل اور دو بکرے مانے ہوئے تھے اور بھابی نے پچاس روپوں کی خیرات مانی تھی۔ گذشتہ دس روز سے وہ دونوں ہر شام چار پانچ فقیروں کو گھر بٹھا کر کھانا کھلاتی اور ان سے دعا کراتی تھیں۔

نوردین نے بھی دو روپے کی نیاز مانی تھی لیکن طاہرہ کی واپسی کے لیے۔ اُسے تو کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہوا،
طاہرہ کیوں اور کہاں چلی گئی ہے۔ گھر کی عورتوں اور مردوں کی باتوں اور قرائن سے جو اندازہ لگایا تھا اس سے نوردین کو بھی علم ہوا تھا،
ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے۔ وہ اکثر خدا کے حضور دعا کیا کرتا تھا — "یا خدا! میری چھوٹی بی بی کو جلد واپس لا یا مجھے اس کے پاس،
اور وہ جہاں کہیں ہے اسے آرام اور عزت و آبرو سے رکھنا۔"

دو دن گزر گئے جو ارشد کے لیے دو سال سے کم نہ تھے۔ عفت کی باتیں اب بے ربط ہو چلی تھیں۔ تازہ خون کا اثر ہوتا
ہوتا تھا لیکن دماغی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ پروفیسر عاقل نے اب اس کے پاس دو دو گھنٹے بیٹھنا شروع کر دیا تھا، ان او
میں ارشد ذرا گھر جا کر سستا لیتا تھا۔ پروفیسر کی موجودگی میں عفت ارشد کی غیر حاضری کم ہی محسوس کرتی تھی۔

تیسرے دن جو لیڈی ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق آخری دن تھا۔ عفت نے پروفیسر عاقل کے آنے پر بھی ارشد کے بازو
کو پکڑ لیا اور کہا — "نہ ڈاکٹر صاحب! آج یہ نہیں جائیں گے۔ خدا کے لیے انہیں نہ بھیجیے، ڈاکٹر صاحب!"

ارشد رک گیا اور پروفیسر ذرا سی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ ارشد حیران و پریشان اس طرح کمرے میں ٹہل رہا تھا جیسے پھانسی کا
سزا یافتہ قیدی زندگی کے آخری لمحے پورے کر رہا ہو۔ لیڈی ڈاکٹر نے زچگی کے کمرے میں سارا سامان تیار رکھا ہوا تھا خطرہ تھا کہ آپریشن
تک نوبت پہنچ جاتے گی۔ تازہ خون بھی رکھ لیا گیا تھا۔ آکسیجن کا انتظام بھی تھا۔

عفت اب اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔ وہ یک لخت چپ ہو گئی اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر تڑپ
ساتھ ہی ایسی دلدوز چیخ ماری کہ ارشد کا پسینہ نکل آیا۔ ملازمہ نے لیڈی ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے آتے ہی نبض اور دل کی حرکت دیکھی اور معائنہ
کیا۔ تھوڑی سی دیر میں عفت نارمل حالت پر آ گئی۔ ارشد اس کے پاس بیٹھ گیا۔

عفت نے اس کا بازو کلائی سے مضبوطی سے پکڑ لیا اور سہمے ہوتے لہجے میں پوچھا — "یہ کیا ہوا تھا ارشد صاحب؟"

عفت کی آواز اس قدر نحیف تھی جیسے وہ گہری کھائی میں سے بول رہی ہو۔ ارشد نے اسے تسلی اور حوصلہ دیا لیکن کوئی اس
ارشد کو تسلی دیتا۔ اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے جلال آباد کی گلیوں میں فسادات کی ایک رات اور ایک دن ایسی سینکڑوں چیخیں سنی
تھیں — عورتوں کی، بچوں کی، بوڑھوں کی — لیکن وہ ذرا بھر نہ گھبرایا تھا بلکہ ان چیخوں نے اسے نیا حوصلہ اور نئی ہمت دی تھی اور
ایک چیخ سے وہ بنیاد دل تک ہل گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ اس صورت حال میں ثابت قدم نہ رہ سکے گا۔ وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ ابا جان کو بلوا لے کہ عفت نے
ویسی ہی چیخ ماری اور وہ تڑپتے تڑپتے ارشد کے ساتھ لپٹ گئی۔ عفت کے دانت آپس میں چپک گئے اور آنکھیں بند ہو گئیں
کے چہرے پر ہول طاری تھا۔ ارشد نے بازو چھڑا کر لیڈی ڈاکٹر کو بلایا۔ اس کے ساتھ دو نرسیں بھی آ گئیں۔ ارشد کی جان میں جان آئی
یہ جان بری طرح کانپ رہی تھی۔

چار گھنٹے اسی عالم میں گزرے۔ لیڈی ڈاکٹر نے آخری معائنہ کیا تو نرسوں سے کہا — "لے چلو۔"

اسے پہیوں والے سٹریچر پر لٹایا جا رہا تھا تو ابا جان، یوسف اور ارشد کی امی بھی پہنچ گئے۔ ارشد نے انہیں دیکھا تو ہزار
پر بھی اس کے دو آنسو پھوٹ آتے۔ ابا جان نے تو جو دو قدم رہ گئے تھے ایک جست میں طے کیے اور ہڑبڑا کر پوچھا "خیریت؟"

ارشد نے سر ہلایا اور صرف اسی قدر کہہ سکا — "ہاں! ابھی تو خیریت ہے۔"

عفت کو ڈیلیوری روم میں لے جایا جا چکا تھا کہ نرس نے ارشد کو بلایا اور کہا — "بیگم آپ کو بلا رہی ہیں۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی ہیں بیلیش
بس اب کوئی دیر نہیں کسی لمحے ہو جاتے گی۔ آپ انہیں ذرا تسلی دے آئیے۔ وہ آپ کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہیں۔"

عفت میز پر لیٹی ہوئی تھی اور دونوں نرسیں باہر نکل رہی تھیں۔ ایک نے نکلتے نکلتے ارشد کے کان میں کہا — "ذرا جلدی۔
ت نہیں ہے۔"

ارشد عفت پر جھکا تو اس نے دونوں ہاتھ اوپر کر کے چہرہ تھام لیا اور اس کے چہرے کو نیچے کیا۔ ارشد جھکتا گیا اور عفت نے
س کے ہونٹ چوم لیے۔ بولی — "خدا حافظ میرے ارشد! میرے بچے کو سلام کہنا اور پیار دینا۔"

عفت کی آنکھوں میں اب آنسو نہیں تھے [illegible]
طرح تھے۔ ان میں ایک گونہ سکون بھی جھلک رہا تھا۔ اس کی آواز نحیف اور نقاہت زدہ تھی لیکن لہجے میں خنکی تھی اور وہ تیزی سے
بول رہی تھی۔ الفاظ زبان سے بہتے چلے آ رہے تھے۔ ارشد اس پر جھکا ہوا تھا۔ عفت نے ایک بازو اس کی گردن کے گرد ڈال رکھا تھا
اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بال سہلا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔

"طاہرہ کو میرا سلام کہنا ... سے بہت سارا پیار دینا۔ کہنا تم پاس ہوتیں تو پاؤں پڑ کے معافی مانگتی لیکن
تم چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ارشد میرے بچے کو میری قبر پر لایا کرنا اور اسے یہ نہ بتانا کہ یہ تیری ماں کی قبر ہے اور سنو۔ ارشد! میری
آخری باتیں ..... طاہرہ آ جاتے تو اچھا ہے۔ نہیں تو اسے ڈھونڈ لینا اور میرا بچہ اسے دے کر اسے بچے کی ماں بنا لینا۔
میری روح تمہاری شادی پر آتے گی اور تمہارے سہرے کو چومے گی۔ طاہرہ کے سوا میرا بچہ کسی کو نہ دینا۔ اگر تمہیں میری
محبت کا پاس ہے تو طاہرہ کے سوا کسی دوسری لڑکی سے شادی نہ کرنا ..... کہو کرو گے؟"

"نہیں! میری عفت، نہیں۔ تم زندہ رہو گی" — ارشد نے روندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایک بار پھر کہو — میری عفت۔"

"میری اپنی عفت!" — ارشد نے کہا اور عفت کے علیل ہونٹ چوم لیے۔

"تیرا شکریہ، میرے ارشد! میں نے ساری عمر اس بوسے کے انتظار میں گزار دی ہے۔" عفت نے بدستور اس کے گلے میں
بازو ڈالے ہوئے کہا — "مجھے بخش دینا ارشد ..... اور ..... اور ..... عفت کا چہرہ کھنچ گیا۔ جیسے درد کا ایک اور دورہ اٹھنے والا تھا۔ وہ بمشکل کہہ سکی ..... میرا بچہ طاہرہ کے سوا کسی کو نہ دینا۔ طاہرہ ہی اس کی ماں ہو گی اور بچے کو بھی یہی بتانا کہ تیری ماں ....." اور اس کی آواز ایک
ہلکی سی چیخ میں دب گئی۔

"آپ تشریف لے جائیے" — نرس نے ارشد کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اور ارشد کمرے سے نکلا۔ دروازے میں رک کر اس نے عفت کو پھر دیکھا لیکن عفت کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ پیٹ سے
اٹھتے ہوتے درد کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ارشد انتظار گاہ میں ابا جان وغیرہ میں جا بیٹھا۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ ابا جان تھوڑی دیر بعد برآمدے میں نکلتے

تھے اور ویسے ہی ایک چکر کاٹ کر لوٹ آتے تھے۔ ہر ایک کا دل خدا کے حضور سجدہ ریز تھا۔ اس عالم میں تین گھنٹے گزر گئے۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر انتظار گاہ میں داخل ہوئی۔ سب نے اس کی طرف دیکھا۔ کسی کو ہمت نہیں پڑ رہی کہ اس سے کچھ پوچھتا۔ آخر ابا جان اُٹھے اور آہستہ آہستہ لیڈی ڈاکٹر کی طرف چلے۔

"مبارک ہو۔ لڑکا پیدا ہُوا ہے" ـــــ لیڈی ڈاکٹر نے ذرا تھکے ہوئے لہجے میں کہا ـــــ "بچّہ ذرا کمزور ہے لیکن ٹھیک ہے۔"

"اور بچے کی ماں؟" ـــــ ارشد نے اچھل کر پوچھا جس طرح وہ اچھلا تھا اسی طرح اس کا دل بھی اچھل رہا تھا۔

"بچے کی ماں!" ـــــ لیڈی ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا، آہستہ آہستہ، اور کہا ـــــ "نہایت سکون سے ..." وہ چپ ہوگئی اور ایک ثانیے کے بعد، جو سب کے لیے طویل مدت تھی، بولی ـــــ "فوت ہوگئی ہے۔"

سب کے سر جھک گئے اور آنسو رواں ہو گئے۔

"مجھے افسوس ہے" ـــــ لیڈی ڈاکٹر نے کہا ـــــ "لیکن یہ حادثہ متوقع تھا۔ خُدا کا شکر ہے۔ بچہ صحیح سلامت ہے" ـــــ اس نے فضا کی تلخی کو کم کرنے کی خاطر کہا ـــــ "ارشد صاحب! بچے کے خدوخال آپ جیسے ہیں۔ اللہ زندگی دے۔ بچہ گورا چِٹا اور بہت خوبصورت ہے۔"

ارشد نے خالی خالی نگاہوں سے لیڈی ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ کہ رہی تھی ـــــ "بچے کو یہاں سات روز ہسپتال میں ہی رہنے دیجئے۔ ہم اسے تندرست کر کے آپ کے حوالے کریں گے۔ ویسے کسی کی ضرورت تو نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کی والدہ یہاں رہ سکتی ہیں۔ اور بچے کو بوتل سے اپنے ہاتھ سے دودھ پلا سکتی ہیں۔"

"میں یہیں رہوں گی" ـــــ ارشد کی امی نے کہا۔

ارشد کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ اس کے سامنے ہسپتال کا چھوٹا سا باغیچہ تھا جس میں گھاس کا مخملی سبزہ قرینے سے بچھا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف رنگا رنگ کے پھول کھلے ہوتے تھے۔

ارشد کے دل کا کنول مرجھا گیا۔

نعیم کے دل کا کنول کھل گیا۔ یہی راولپنڈی کا شہر جو اسے ماں کے بغیر سونا سونا لگتا تھا۔ اب اس کے لیے جنت ارضی بن گیا تھا۔

پچیس روز پہلے کی اس رات کے بعد جب وہ طاہرہ کے کمرے میں چلا گیا تھا اور طاہرہ نے اس کے ساتھ ٹھوس باتیں کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا نعیم کا رنگ روپ ہی نکھر آیا تھا۔ اس کا شرمیلا پن تو جوں کا توں تھا اور جھجک بھی ویسی ہی تھی لیکن اب اس شرم اور جھجک میں خوداعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اب شرماتا تو اس انداز سے شرماتا جیسے یہی حرکت موزوں ترین ہو۔ جھجک کر وہ سمجھتا تھا کہ اسے جھکنا ہی چاہیئے تھا۔ اطہر اور نجمہ اس کی حرکات کا اچھی طرح جائزہ لے رہے تھے اور جان بوجھ کر نادان بنے ہوئے تھے طاہرہ پہلے سے زیادہ شوخ اور چنچل ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ بیٹھے کہ طاہرہ نعیم میں محو ہوکر "آشا بھون" اور ارشد کو فراموش کر چکی ہے مگر اس کے سینے میں کوئی جھانک نہیں سکتا تھا جہاں ایک خونریز معرکہ لڑا جا رہا تھا۔ نعیم اور ارشد گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے میں تحلیل بھی ہو رہے تھے۔ حقیقت جذبات کو کچل رہی تھی۔ طاہرہ اسی شوروغل کو دبانے کے لیے قہقہے لگاتی تھی۔

"طاہرہ"! ـــــ نجمہ نے ایک دن طاہرہ سے پوچھا ـــــ "سچی بتانا۔ نعیم تجھے اچھا لگتا ہے؟"

"کون؟ نعیم؟ ..." ـــــ طاہرہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ـــــ "لاحول ولاقوۃ۔"

"دیکھو! بکواس نہ کرو۔ کیوں چھپاتی ہو!" ـــــ نجمہ نے بے تکلفی سے کریدنا شروع کر دیا اور کہا ـــــ "مجھے سب معلوم ہے۔"

"اچھا بتاؤ، آپا! آپ کو کیا معلوم ہے؟" ـــــ طاہرہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بتاؤں؟ ..... اچھا سن!" .... نجمہ نے کہا ـــــ "آدھی رات کے وقت نعیم تمہارے کمرے میں گیا تھا اور دو گھنٹے بعد نکلا تھا۔"

"ارے؟" ـــــ طاہرہ نے زندہ مزاجی سے کہا ـــــ "آپ جاگ رہی تھیں؟"

"ہاں! تو کیا ہم سو رہے تھے؟" ـــــ نجمہ نے کہا ـــــ "رات کے بارہ ہی بجے ہم تھوڑا سو جاتے ہیں محبت کرنے والے سوتے ہیں بھلا؟ جیسے نعیم اور تم نہیں سوتے ویسے مَیں اور اطہر صاحب جاگتے رہتے ہیں۔"

"اچھا تو یہ محبت ہوگئی!" ـــــ طاہرہ نے شگفتہ طنز کی ـــــ "اور اس کا مطلب یہ ہُوا کہ میں اور نعیم بھی آپ کی طرح میاں بیوی ہیں کہ ..."

"اری ہٹ دفع ہو۔ مَیں نے یہ شک تو نہیں کیا ..." نجمہ نے طاہرہ کو ہلکا سا دھکا دے کر کہا ـــــ "اللہ تیرے دشمنوں کو

ذلیل کرے۔ میں تو بات کر رہی تھی کہ تم اور نعیم اب جو چھپ چھپ کے ملنے لگے ہو اس میں کچھ راز ہے۔ ہے نا، طاہرہ؟
"جھوٹ نہیں بولوں گی" ۔۔۔ طاہرہ نے لمبا سانس لیا اور کہا ۔۔۔ "لیکن آپ کہیں گی کہ تم ارشد کو دھوکہ دے رہی ہو۔ تم ہرجائی ہو"۔

"نہیں طاہرہ! خدا جانتا ہے۔ میں یوں نہیں کہوں گی" ۔۔۔ نجمہ نے سنجیدہ ہو کر کہا ۔۔۔ "پہلے میری سن لو۔۔۔ میں چاہتی ہی یہی ہوں کہ تم نعیم کو اپنا لو۔ یقین کرنا، طاہرہ! میں نے اور اطہر صاحب نے شروع سے ہی سوچا تھا کہ ہو سکے تو تم دونوں کو باندھ دیں۔ مجھے، طاہرہ! تمہاری زندگی سے دلچسپی ہے۔ اگر تمہاری شادی ارشد کے ساتھ ہو جاتی تو مجھے بے حد خوشی ہوتی لیکن وہ بات ہی ختم ہو گئی ہے۔ لاہور میں جو کچھ ہوا، چھوڑو، بھولو اسے، اب تم جوان ہو گئی ہو۔ اب بہترین صورت یہی ہے کہ تمہارا بیاہ ہو جائے اور تم اپنے ٹھکانے لگو۔ میں جانتی ہوں، تم ہزار کوشش کرو، تم نہ جلال آباد کو بھول سکتی ہو، نہ عفت کو، نہ ارشد کو اور نہ لاہور والی کوٹھی کو۔ تم نے کبھی بھی ان کا ذکر نہیں کیا لیکن یہ یادیں اور باتیں درپردہ تمہیں پریشان کرتی رہتی ہیں۔ پیشتر اس کے کہ تم ماضی کی گرفت میں آ کر بھٹک جاؤ، میں اور اطہر چاہتے ہیں کہ تم شادی کر لو۔ نعیم موزوں آدمی ہے۔ اسے تم نے بھی اچھی طرح دیکھ بھال لیا ہے اور اطہر صاحب تو اسے ایک عرصے سے جانتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم پہلے ہی نعیم کے قریب ہو گئی ہو اور نعیم تم میں سما گیا ہے۔ اب کہو تو نعیم کے ساتھ بات کر لی جائے اور جلد ہی تمہارا بیاہ کر دیا جائے" ۔۔۔ نجمہ نے ہنس کر کہا ۔۔۔ "یہ تمہارا میکہ ہوگا اور پشاور سسرال"۔

طاہرہ کھل کر مسکرائی اور نجمہ کی طرف دیکھ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ بولی ۔۔۔ "نعیم کے ساتھ تو بات ہو ہی چکی ہے لیکن اچھی طرح نہیں ہوئی۔ بھائی جان کو کہیے وہ اسے کہہ دیں اور نعیم ماں باپ کو خط لکھ کر پوچھ بھی لے" ۔۔۔ طاہرہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ نجمہ نے اس کا سر اوپر کیا تو اس نے طاہرہ کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔

"ارے!" ۔۔۔ نجمہ نے کہا ۔۔۔ "ابھی ہنس رہی تھی، ابھی رو رہی ہے؟"

"میری ہنسی ایک فریب بن کے رہ گئی ہے آپا!" ۔۔۔ طاہرہ نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر اور آہ بھر کر کہا ۔۔۔ "آہوں کو دل میں جکڑے رکھنے کے لیے میں قہقہہ لگا کر ہنسا کرتی ہوں۔ اب آپا یوں سمجھ لیں کہ میری مسکراہٹیں روتی ہیں اور آنسو مسکراتے ہیں۔ اب تو میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ کس کس کو یاد کروں اور کس کس کو بھول جاؤں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ سب یاد آ جاتے ہیں جنہیں جلال آباد چھوڑ آئی تھی، وہ بھی جنہیں پاکستان کے راستے میں ہندوستان کی دھرتی میں دفن کیا تھا اور وہ بھی جو لاہور میں رہ گئے ہیں۔ ان کی باتیں بھی یاد آ جاتی ہیں۔ وہ راتیں بھی یاد آ جاتی ہیں جو میں نے لاہور میں روتے گزاری تھیں، وہ دن یاد آ جاتے ہیں جو ہنستے کھیلتے گزر گئے ہیں۔ میری اچھی آپا! یادوں کا یہ ہجوم آتا ہے تو میری حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے میں ریل کی پٹڑی پر پڑی ہوں اور میرے اوپر سے ریل گاڑی گزر رہی ہے۔ جسم قیمہ بن جاتا ہے مگر میری جان نہیں نکلتی"۔

طاہرہ ٹھہری ہوئی، سنبھلی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر لطیف سا تبسم اور آنکھوں میں اشکوں کی نمی تھی۔ اس نے سچ کہا تھا کہ میرے آنسو مسکراتے ہیں۔ نجمہ جانتی تھی کہ اس لڑکی پر ایسی کیفیت کبھی کبھی طاری ہوا کرتی ہے۔ اسے اس کیفیت سے نکالنا نہیں چاہتی تھی۔

ابھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ میں ارشد کو بھول جاؤں" ۔۔۔ طاہرہ نے کہا ۔۔۔ "یہ ممکن ہی نہیں کہ نعیم ارشد کا خلا پر کر سکے لیکن میں بھٹکتی بھی نہیں رہنا چاہتی۔ میں جذبات کی آندھیوں میں اڑتی نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے اس حقیقت کو قبول کرنا ہے کہ میں لڑکی ہوں۔ آپ اور اطہر بھائی مجھے پناہ دے سکتے ہیں میرے وارث نہیں بن سکتے۔ اگر میں یہاں زیادہ عرصہ پڑی رہی تو بھائی جان کو بدنام کر دے گا۔ یہ عورتیں جن کے ارد گرد اینٹوں کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں ایک روز مجھے اطہر بھائی جان کی بیوی بنا ڈالیں گی۔ پھر وہ دن بھی آ جائے گا جب آپ کو یہ سوچ پریشان کرنے لگے گی کہ میں نے کہیں سچ مچ، درپردہ آپ پر قبضہ تو نہیں کر لیا؟ میں ایک گھر سے بدنام ہو کر نکلی ہوں۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنی بڑی بہن اور بڑے بھائی کے گھر سے ہو کر نکلوں، کیوں نہ میں اپنا گھر بسا لوں؟ اگر نعیم مجھے چاہتا ہے تو میں اسی کو زندگی کا ساتھی بنا لوں گی۔ میں اسے محبت کا بت سے دوں گی۔ لیکن میں ارشد کو۔۔۔؟" اسے ہلکی سی ہچکی آئی۔ پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"میں تمہاری کسی ایک بات کا بھی جواب نہیں دوں گی" ۔۔۔ نجمہ نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا ۔۔۔ "لیکن طاہرہ! اپنے لاوارث نہ سمجھو۔ میں جانتی ہوں تم دودھ کی جلی ہوئی ہو، چھاچھ کو بھی پھونکیں مار رہی ہو۔ اللہ نہ کرے تم میرے گھر سے بدنام ہو، تمہیں دلہن بنا کر یہاں سے نکالوں گی، پھر تمہاری راہ دیکھا کروں گی"۔

نجمہ نے اپنے خاوند کو بتایا کہ طاہرہ رضامند ہے۔ اطہر نے نعیم سے بات کی تو وہ کچھ دیر عادت کے مطابق شرماتا رہا۔ اطہر نے ...ت پسندی سے اس کے ساتھ باتیں کیں اور اسے کہا کہ وہ اپنے والد صاحب کو خط لکھ دے اور شادی کی اجازت لے۔ ...اسی روز خط لکھنے بیٹھ گیا۔

اطہر نے اس کے والد کو علیحدہ خط لکھا جس میں اس نے طاہرہ کا غائبانہ تعارف کرایا۔ اس کے اخلاق، عادات، اطوار، ...ستان سے پہلے کی زندگی، خاندانی پس منظر اور دیگر باتیں تفصیلاً لکھیں۔

جب نعیم کے باپ کو نعیم اور اطہر کے خطوط ملے تو اس کی خوشی کا کیا ٹھکانہ تھا۔ اس نے نعیم کی ماں کو بتایا۔ ماں نے بھی دونوں ...شی کا اظہار کیا اور ذہن میں طاہرہ کی تصویر بنانے میں محو ہو گئی۔

"...انہیں لکھ دوں کہ ہمیں یہ رشتہ منظور ہے؟" ۔۔۔ نعیم کے باپ نے پوچھا۔

"...ہاں لکھ دو" ۔۔۔ اور ذرا سوچ کر کہنے لگی ۔۔۔ "لڑکی کے پاس معلوم نہیں زیور ہوگا کہ نہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ لڑکی لاوارث ہے۔ ...کے پاس کیا ہوگا؟ یہ بات بُری ہے۔ کچھ تو ہونا چاہیئے"۔

"...کیا بے تکی باتیں لے بیٹھی ہو نعیم کی ماں!" ۔۔۔ باپ نے کہا ۔۔۔ "میں تو اسی قسم کی لڑکی کی تلاش میں تھا جو خدا نے کرم کیا مل گئی ہے۔ زیور کا فکر لے بیٹھی ہو۔ ان حالات میں کون بیوقوف زیورات اور جہیز کی سوچ سکتا ہے؟ جہاں تک لڑکی کے لاوارث ہونے کا تعلق ہے یہ اور زیادہ اچھا ہے۔ شادی کے بعد کی سیاست بازیوں اور رشتہ داروں کی جھک جھک سے بچے رہیں گے۔ دیکھا جاتا ...نہیں۔ اطہر نے اسے منہ بولی بہن بنا کر گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لڑکی سکول میں استانی ہے۔ سو سوا سو روپیہ ...تی ہے۔ یہاں آ کر بھی سکول میں لگ جائے گی۔ میں تو کہتا ہوں کہ شور شرابا کیا ہی نہ جائے۔ نعیم کو لکھ دیتا ہوں کہ پنڈی میں ہی

خاموشی سے شادی کر کے لڑکی کو ساتھ لے آتے۔ ہمارا ہے ہی کون یہاں جسے دکھانا ہے۔ جو تھے وہ مشرقی پنجاب میں رہ گئے ہیں اور جو آئے تھے وہ جانے پاکستان میں کہاں کہاں بکھر گئے ہیں۔"

"نہ جی یوں نہیں" — ماں نے بگڑ کر کہا — "بارات تو لے جانی چاہئیے۔"

"تم ابھی تک مشرقی پنجاب سے نکلی نہیں ہو" — باپ نے اکتاہٹ سے کہا — "تم نے ابھی تک حالات کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا۔ کیوں ناحق اپنا دو ڈھائی ہزار اور ان کا بھی اسی قدر روپیہ برباد کرانے لگی ہو؟ ہمیں لڑکی سے غرض ہے اور ہمیں نعیم سے دلچسپی ہے۔ سنا نہیں تم نے نعیم نے کیا لکھا ہے؟ میں اسے لکھ دیتا ہوں کہ وہیں دن مقرر کر لو اور میں اس دن پہنچ جاؤں گا۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی" — ماں نے ذرا دبدبے سے کہا — "اور نعیم کی خالہ کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں؟ میری سگی بہن یہ پاس ہی تو رہتی ہے۔ پھر وہ بال بچے والی ہے۔ دکھ سکھ میں ساتھ دیتی ہے۔"

"ارے بھئی!" — نعیم کے باپ نے کہا — "تمہاری بہن جاتے تو اس کا خاوند کیوں نہ جاتے؟ وہ دونوں جائیں گے تو نعیم کی دونوں پھوپھیوں کو کیوں نہ بلایا جائے؟ سنو، نعیم کی ماں! میں تمہیں بتاتا ہوں نعیم ماشاءاللہ پچیس برس کی عمر کا ہے اپنی کمائی کھاتا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ وہ مکمل طور پر آزاد ہے۔ ہمارے لیے یہ بہانہ کافی ہے۔ کوئی گلہ کرے گا تو کہہ دیں گے کہ لڑکے نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ اپنے بُرے بھلے کو سمجھتا ہے.... بس چپ رہو۔ میں سنبھال لوں گا۔"

جب نعیم کو اور اطہر کو الگ الگ نعیم کے باپ کے خطوط ملے تو گھر میں جیسے خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ ہر چہرے پر مسکراہٹیں اور ہنسی تھی۔ نعیم اور طاہرہ کی مسکراہٹوں پر شرم و حجاب تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے جھینپنے لگے۔ نجمہ نے چھیڑ چھیڑ کر پریشان کر دیا۔

طاہرہ نے اطہر والا خط تو پڑھ لیا تھا لیکن وہ نعیم کی طرف آیا ہوا خط دیکھنا چاہتی تھی۔ نجمہ سے پوچھا تو اس نے کہا لے لے۔ اب کیا شرم آ رہی ہے؟ لیکن طاہرہ اب نعیم کے کمرے کی طرف دیکھ کر شرم سے سرخ ہو جاتی تھی۔

"نہ آپا! جائیں نا! لا دیں وہ خط" — نجمہ نے اسے بازو سے پکڑ کر نعیم کے کمرے کی طرف گھسیٹا تو وہ صحن میں لیٹے لیٹے ہی گھسٹتی نعیم کے دروازے تک لے گئی۔ نعیم کمرے میں بیٹھا باپ کے خط کو تیسری بار پڑھ رہا تھا۔ اس نے تو دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ طاہرہ کو فرش پر لیٹے دیکھا تو وہ دروازے کی اوٹ میں ہو گیا اور طاہرہ بھاگ کر اپنے کمرے میں

"لائیں ابا جان کا خط دیں، وہ مانگ رہی ہے۔"

نعیم نے خط نجمہ کو دے دیا۔

طاہرہ نے خط پڑھا تو اطمینان و سکون کی لہر اس کے جسم و جان میں سرایت کرتی چلی گئی۔ بزرگ کے ایک ایک ہی حقیقت تھی اور یہ فقرے تو طاہرہ کو جانے کون سے آسمان پر لے گئے.... "آپس میں دن طے کر لو۔ میں ایک روز گا۔ زیادہ شور کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی انہیں زیور اور کپڑوں کے لیے پریشان ہونے دینا۔ گھر کا معاملہ ہے، کرنا۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہ سمجھو۔ دن مقرر کرنے میں تم آزاد ہو۔ مجھے تین چار روز پہلے اطلاع دے دینا۔"

طاہرہ نے دو صفحوں کا خط بہت دیر لگا کر پڑھا جیسے وہ ایک ایک لفظ کا ذائقہ چکھ رہی تھی۔ وہ تصوروں میں پہنچ گئی۔ داخلی اور خارجی ہر ایک ایک ذرہ اسے حسین اور دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خیالوں کے زیر و بم میں بہے جا رہی تھی کہ وہ ماضی میں جا پہنچی۔ اسے جدہ اور امی خاتون یاد آ گئیں اور اس کے آنسو بہنے لگے۔

وہ اپنے آپ میں اس قدر گم تھی کہ اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ نجمہ اس کے کمرے کے دروازے میں کھڑی ہے۔ طاہرہ پلنگ پر سر لٹکائے، ٹانگیں لٹکائے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ سر کے نیچے تھے اور خط پلنگ پر پڑا تھا۔ نجمہ اسے پھر چھیڑنے آئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو آہستہ آہستہ اس کے قریب گئی۔ طاہرہ کو نجمہ کی موجودگی کا احساس ہوا لیکن وہ اسی حالت میں پڑی رہی۔ وہ ابھی یادوں کے تانے بانے سے نکلنا نہ چاہتی تھی۔

"آج میری امی زندہ ہوتیں تو".... طاہرہ نے زیرلب کہا اور اس کی آواز دب گئی۔

"یہ آنسو خوشی کے معلوم ہوتے ہیں، طاہرہ!" — نجمہ نے اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کا مزاج بدلنے کی خاطر کہا — "ایسے موقعوں پر گئے گزرے، زندہ اور مرے ہوئے سبھی یاد آتے ہیں۔"

"امی ہوتیں تو میں ان سے اجازت لیتی...." طاہرہ نے سر کو نجمہ کی طرف گھما کر آہستہ سے کہا — "نعیم نے تو اپنے ماں باپ سے پوچھ لیا ہے اور میں؟"

"میں تمہاری امی نہیں ہوں طاہری؟" — نجمہ نے اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا — "میری اجازت کافی نہیں کیا؟ میں تمہیں اپنے ہاتھوں مہندی لگا کر رخصت کروں گی۔"

کمرے میں سائیں سائیں کرتا ہوا سکوت بھر گیا جس میں اداس سی مسرت ہولے ہولے سانس لے رہی تھی۔ اداسیوں میں دمان نے کمرے کی فضا میں جیسے بھینی بھینی خوشبو بھر دی تھی جس میں طاہرہ اور نجمہ کی پیار بھری سرگوشیاں تیر رہی تھیں۔ طاہرہ نے نجمہ کی آغوش میں چھپا لیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ نجمہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ آنسو بہ جانے سے اور نجمہ کے ہاتھوں کے پیار بھرے لمس سے طاہرہ اس کیفیت سے نکل آئی اور اطمینان کا سانس لے کر اٹھ بیٹھی۔

"بھائی جان ارشد اور عفت کس حال میں ہوں گے" — طاہرہ نے آنسو پونچھ کر کہا — "عفت بے چاری کو خدا صحت دے۔ ہماری شادی کا پتہ چلے گا تو کیا کہیں گے۔ ارشد کو دکھ تو نہ ہو گا آپا؟"

"دکھ ہو گا تو کیا ہو گا!" — نجمہ نے کہا — "اور اسے پتہ چلے گا ہی کیونکر؟ چھوڑو، طاہرہ! ختم کرو اب اس قصے کو۔ وہ باتیں ہیں۔ تم اور نعیم ایک ہو جاؤ گے تو سب کچھ بھول جاؤ گی۔"

نجمہ کی شفقت اور پیار سے لبریز باتوں کے اثر سے طاہرہ نے اداسیاں جھٹک دیں اور وہ نجمہ کی طرف دیکھ کر بولی — "آپا! یہ آنسو کس قدر آسودگی دیتے ہیں۔"

نجمہ نے اس کا گال تھپکایا اور کہا — "خدا تمہیں خوشیاں مبارک کرے۔"

"خدا خوشیاں مبارک کرے" کی آواز سے ارشد کو چڑ ہو گئی تھی کیونکہ اس کے بعد اسے یہ بھی سننا پڑتا تھا — "عفت مرحومہ کا

بہت افسوس ہے۔ خدا کو یہی منظور تھا۔"

بچے کو سات روز ہسپتال میں رکھا گیا تھا اور آج پانچواں دن تھا کہ وہ اچھا بھلا ہو کر گھر آ گیا تھا۔ ارشد کی امی نے تو گھر کا سارا کام کاج زینت کے حوالے کر کے ساری توجہ اور پیار بچے کے لیے وقف کر دیا۔ یوسف اور ارشد کو دی ہوئی بھولی بسری لوریاں اسے اس طرح یاد آ گئیں جیسے وہ اس کے ذہن کے کسی کونے میں محفوظ رکھی تھیں۔

ارشد بعض اوقات قدرت کے معصوم حسن کو دیکھتا ہی رہتا تھا اور اس کا سینہ غم واندوہ سے بھر جاتا تھا۔ بچے کو دیکھ کر اسے کیا کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ ہر وہ بات اور ہر وہ واقعہ جو بچے کے ساتھ وابستہ تھا۔ دل میں تازہ ہو کر سامنے آ جاتا اور ارشد کا ذہن بچے کو چل پڑتا تھا جب ارشد کے اعصاب تھک جاتے تھے تو وہ جھک کر اپنی انگلی بچے کی ہتھیلی پر رکھ دیتا تھا۔ بچے کی انگلیاں پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح اس کی انگلی کے گرد لپٹ جاتی تھیں۔ ارشد بچے کے رخسار پر اپنا گال رکھ دیتا تھا۔ ایسے میں اسے ایسا قرار آتا جیسے وہ باقی زندگی اس روئی کے گالے سے لپٹ کر گزار دینا چاہتا ہو۔ بچے کے وجود سے جو دکھ اس کے سینے میں بیدار ہوتے تھے وہ آنی بچے کے لمس سے دور ہو جاتے تھے۔

لیکن ارشد کے دل و دماغ سے طاہرہ محو نہیں ہوتی تھی۔ عفت کی موت کے بعد طاہرہ ایک نئے روپ میں اس کے خوابوں اور خیالوں پر چھانے لگی۔ کسی پل اور کسی کروٹ وہ اس کی نظروں کے سامنے سے ہٹتی نہیں تھی۔ وہ ہر روز ڈاک کا وقت گزر جانے کے بعد دل کو وعدۂ فردا دے کر تسلی دے لیتا تھا — "افتخار بیگ" کا خط نہ آیا۔ وہ اس کے پہلے خط کو کئی بار پڑھ چکا تھا اور حساب کرتا رہتا تھا کہ اب طاہرہ ایبٹ آباد ہو گی۔ اب کوئٹہ پہنچ گئی ہے اور اگلے ماہ کے دوران کراچی ہو گی یا وہ یقیناً لاہور آ جائے گی — "وہ آئے گی ضرور"۔ اس کی تسلی اسی فقرے سے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دکھ بھری لرزتی آواز اس کے گرد منڈلانے لگتی تھی — "میرا بچہ طاہرہ کے سوا کسی کو نہ دینا۔ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ شادی نہ کرنا۔"

دو مہینے گزر گئے۔ بچے نے آنکھیں کھول دیں اور وہ مسکرانے بھی لگ گیا۔ پہلے سے زیادہ مضبوط اور ہٹا کٹا ہو گیا۔ غنچہ کھلتا جا رہا تھا اور ارشد کے خدوخال بچے کے چہرے پر نکھرتے آ رہے تھے۔ ارشد نے سارے دکھ بچے کی مسکراہٹ میں ڈبونے شروع کر دیئے لیکن وہ تنہائی کی گھڑیاں اس سوچ و فکر میں ڈوبا رہتا کہ طاہرہ کو کہاں اور کیونکر تلاش کرے۔ اب اس نے اباجان اور بڑے بھائی کے ساتھ بھی اس موضوع پر باتیں شروع کر دی تھیں۔

امی اور بھابی بھی اب کچھتانے لگی تھیں کہ "طاہرہ چلی گئی ہے"۔ امی جب ارشد کو یوں تنہا تنہا اور کھویا کھویا دیکھتی تھی تو اس کے آنسو پھوٹ آتے تھے۔ اباجان اور یوسف کا خیال تھا کہ ارشد کے غموں کا علاج دوسری شادی ہی ہے۔ امی اور بھابی نے بھی اپنے طور پر ادھر ادھر نظریں دوڑانی شروع کر دی تھیں۔

"مرنے والوں کے ساتھ کون مرا ہے، ارشد!" — ایک دن بھابی نے ارشد سے کہا — "ہمیں اجازت دو تو ہم عفت اور طاہرہ سے کئی گنا خوبصورت لڑکی گھر میں لا بسائیں۔"

ارشد کو یوں لگا جیسے بھابی نے اس کے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہو۔ اسے معاً یاد آ گیا کہ یہی وہ عورت ہے جس کی باتوں نے طاہرہ کو میری دنیا سے نکالا ہے۔ ارشد نے بھابی کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اسی شام یہی بات امی

نے کی تو ماں کے احترام کا خیال کرتے ہوتے اس نے صرف اتنا کہا — "امی! آئندہ میرے سامنے شادی کا ذکر نہ کرنا۔ میں شادی کروں گا تو طاہرہ کے ساتھ، ورنہ یہ بچہ ہوگا اور میں ہوں گا۔"

دو مہینے گزر گئے تھے اور ابھی تک بچے کا نام ہی نہیں رکھا گیا تھا۔ جب کبھی گھر کی محفل میں سب افراد اپنے اپنے نام تجویز کرتے تو ارشد یا تو خاموش رہتا یا اٹھ کے باہر نکل جاتا۔ آخر ایک دن اباجان نے اسے کہا — "ارشد میاں بچہ تمہارا ہے۔ یا تو ہمیں اجازت دو یا اپنا کوئی نام بتاؤ۔"

ارشد نے پیشانی پر شکن ڈال کر ذرا سوچا اور نہایت آہستگی سے صرف اتنا کہا — "طاہر پرویز۔"

"طاہر پرویز" — اباجان نے نام دہرایا۔ ان کے چہرے کا تاثر ذرا سا بدلا۔ وہ بولے — "بڑا اچھا نام ہے۔ طاہر پرویز۔ پیارا نام ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ آمین۔"

اور گھر کی فضا میں ایک بار پھر مبارک۔ مبارک کی صدائیں گونج اٹھیں۔ ارشد اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا زندگی کے جوار بھاٹا کو دیکھ رہا تھا۔ برآمدے اور کمروں سے اٹھتی آوازیں اسے سنائی دے رہی تھیں — "طاہر پرویز، میرا پرویز، اچھا طاہر، میرا طاہر" بچوں نے اور عورتوں نے شور برپا کر رکھا تھا۔ یہ خوشیوں کا ہنگامہ تھا۔

"طاہر۔ طاہر" کی آواز ارشد کے اندر جلتی ہوئی آگ کو ہوا دینے لگی اور وہ بیتاب ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سینہ زور زور سے دھڑکنے لگا، دماغ پھٹنے لگا۔ گزرے ہوئے دنوں کی یاد اور طاہرہ کا خیال اس کی رگ رگ میں زہر بن کر سرایت کرنے لگا۔ برآمدے سے طاہر پرویز۔ طاہر۔ طاہر کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ ارشد نے چاہا کہیں بھاگ جائے، اتنی دور جہاں "طاہر" کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

ایک شور جو باہر بلند ہو رہا تھا اور ایک شور جو اس کی ہستی میں خیالوں اور یادوں نے بپا کر رکھا تھا جوار بھاٹا بن گیا، بھنور بن گیا۔ وہ بے بس ہو کر یوں فضا میں ٹکٹکی باندھ کے بیٹھ گیا جیسے اسے وہاں کچھ نظر آ رہا تھا جسے وہ دیکھنا بھی چاہتا تھا اور نہیں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ حلق میں کوئی چیز اٹک کے رہ گئی۔ اس پر خاموشی طاری تھی لیکن اس خاموشی میں ایک بے کلی اور اضطراب تھا۔ وہ رونا چاہتا تھا۔ آنکھیں خشک تھیں۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کا دم گھٹ جائے گا۔

اس کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ارشد نے دروازے کی طرف نہ دیکھا۔ گم سم بیٹھا رہا۔ بھابی نے بچے کو اس کی گود میں رکھ دیا اور آہستہ سے کہا — "طاہر پرویز مبارک ہو۔"

ارشد نے آہستہ آہستہ بے خیالی میں بچے کو بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا اور نظریں جھکا کر بچے پر ڈالیں۔ ذرا سی دیر کو دیکھتا رہا اور یک لخت بچے کو گلے لگا کر بے تحاشہ رو پڑا۔ بھابی پاس کھڑی رہی اور چند منٹ بعد آنسو پونچھ کر بچے کو اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ ارشد کو ایک گونہ قرار آ گیا۔ رکا ہوا غبار آنسو بن کر بہہ گیا۔ اس نے سر پیچھے کرسی پر پھینک کر آہ لی جیسے کہا ہو "طاہرہ!"

"طاہرہ!" — جارجٹ کے لال دوپٹے کے گھونگھٹ میں سے چھن کر آتی ہوئی نعیم کی آواز نے طاہرہ کے سارے جسم میں

برقی رَو دوڑا دی۔ اس سے پہلے اس نے یہی آواز کئی بار سُنی تھی اور آج کی رات جب یہ کمرہ گلدستوں اور تصویروں سے سجایا گیا تھا، طاہرہ کے نئے پلنگ پر نجمہ نے اپنے ہاتھوں پھول بچھائے تھے یہ آواز اسے اجنبی سی معلوم ہوئی۔ اس اجنبیت میں بھی پیار تھا، اس آواز میں بھی پیار تھا لیکن وہ جھینپ گئی۔

وہ بیر بہوٹی کی طرح سکڑی جا رہی تھی کہ نعیم نے اس کا گھونگھٹ اُٹھا دیا اور اس کی ٹھوڑی اس طرح ہاتھ سے تھام کر اُوپر کی جیسے زمین پر پڑا ہُوا پھول اٹھایا ہو۔ طاہرہ نے چہرہ تو اُوپر کر دیا لیکن پلکوں نے جھک کر کاجل بھری آنکھوں کو جو کاجل کے بغیر ہی فتنے جگایا کرتی تھیں، پردے میں چھپا لیا۔ پلکیں اوپر اُٹھیں تو آنکھوں کے سامنے وہی نعیم تھا اور نعیم کا وہی کمرہ جس میں طاہرہ ہر روز اور اکثر رات کو بے دھڑک آیا کرتی تھی۔ آج کی رات اس کمرے کی ہر چیز میں انوکھا پن اور اجنبیت تھی لیکن اس انوکھے پن اور اجنبیت میں جو رومان، جو آرزوئیں اور کیف تھا وہ انوکھا نہیں تھا۔ طاہرہ پلنگ پر سرخ کپڑوں میں ملبوس اسی طرح بیٹھی تھی جس طرح ہر نئی نویلی دلہن بیٹھا کرتی ہے۔ نعیم اس کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس کے قریب ہُوا اور قریب ہوتا چلا گیا۔

طاہرہ کی آنکھوں کے سامنے نعیم کا پُر شباب چہرہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک ایک نقش اسے اچھا طرح دکھائی دے رہا تھا۔ پھر یہ نقش اور خط و خال دھندلے ہونے لگے۔ پھر دھندلا گئے۔ پھر یوں جیسے آتشیں شیشے میں کسی چیز کو دیکھ رہی ہو جو اس قدر بڑی ہو گئی ہو کہ پہچانی نہ جاتے۔ یہ نقش اس قدر دھندلا گئے جیسے وہاں کچھ تھا بھی اور کچھ بھی نہ تھا۔ چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ طاہرہ کی آنکھوں کے سامنے چھت بھی پنکھے کے ساتھ گھومنے لگی — تیز — تیز — اور تیز — بہت تیز — طاہرہ نے محسوس کیا جیسے وہ پنگھوڑے پر بیٹھی ہے جسے بہت تیز گھمایا جا رہا ہے اور گرد و پیش کی ہر ایک چیز ایک چکر میں گھوم رہی ہے۔ وہی سرور، وہی کیف جو بچہ گھومتے پنگھوڑے پر محسوس کرتا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ، نہایت آہستہ آہستہ، آرام آرام سے سنبھل سنبھل کر، ہر ایک چیز اپنی اپنی جگہ پر آ گئی۔ چھت رک گئی۔ پنکھا چل رہا جس کی دھیمی دھیمی ہوا اب اور زیادہ خنک ہو گئی تھی — سکون، قرار، چین، سانسوں کے اکھڑے ہوئے تسلسل میں سرور، جیسے اعصاب زدہ کے اعصاب ٹھکانے آ گئے ہوں اور اب وہ سو جانا چاہتا ہو۔

طاہرہ نے بند آنکھوں کو ذرا سا کھولا۔ نعیم کا چہرہ جو ابھی دھند کی اوٹ میں چھپ گیا تھا، نکھر آیا اور مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو منور کر دیا۔ طاہرہ نے بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا مگر جھینپی ہوئی مسکراہٹ کو چھپا نہ سکی۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ نئے پھولدار پردے پنکھے کی ہوا سے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے جیسے عروسی کے بستر پر بچھے ہوئے پھولوں کی خوشبو سے وجد میں آ گئے ہوں۔ کمرے میں رومان پرور سکوت تھا جسے ریلوے سٹیشن پہ شنٹ کرتے ہوئے کسی انجن کی وسل۔ مال گاڑی کے ڈبوں کے ہلکے ہلکے تصادم، بجلی گھر کے انجنوں کی "زوم۔ بوم۔ زوم۔ بوم" کی گونجدار آوازیں سڑک پر گزرتے تانگے کے گھوڑے کی ٹپ۔ ٹپا۔ ٹپ اور گھنٹی ذرا سا متعرض کرتی تھی۔ ان مختلف آوازوں میں موسیقیت تھی۔ تمام آوازوں کی سُر تال ایک ہی تھی جیسے وہ ایک ہی نغمہ الاپ رہے ہوں، جیسے قدرت نے آج کی رات انہیں ایک تال پر منظم کر دیا ہو۔

طاہرہ کو نعیم کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن وہ آج کی رات کے ایک ایک لمحہ سے اور آج کی رات کی ایک ایک آواز

کی موسیقی سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے وہ انجن کی وسلوں اور بجلی گھر کی گڑگڑاہٹ سے تنگ آ جایا کرتی تھی، لیکن آج اسے ان آوازوں میں بانسری اور تانبورے کی سنگت میں ایک راگ سنائی دے رہا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ آج نعیم کو دیکھنا نہ چاہتی تھی، آج اسے محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ نعیم کے ہاتھ میں تھا۔ طاہرہ نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اس کے لمس کے قرار کو اور نصف شب کی تاریکی اور سکوت میں تیرتی ہوئی آوازوں کے ترنم کو روح کی گہرائیوں میں محفوظ کر لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ نعیم کی ایک ایک سانس کو، جو اس کے حجاب آلود رخساروں سے ٹکرا رہی تھیں، سینے میں سمو رہی تھی۔

طاہرہ نے عیاں طور پر محسوس کیا کہ ماضی مر گیا ہے — "اپنی تمام تر جھوٹی اور بے بُنیاد خوشیاں اپنے ساتھ لیے ماضی مر گیا ہے۔ کس قدر بے معنی تھیں وہ یادیں، ماضی، ایک فریب —" مگر یہ بھی ایک فریب تھا جو طاہرہ اپنے آپ کو دے رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ماضی مر گیا ہے۔ نعیم کے پہلو میں، ازدواجی زندگی کی پہلی رات جب وہ رومانوں کے خمار سے مخمور ہو گئی تھی ماضی نے اسے ڈس لیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے ایک ثانیے کے لیے یوں لگا تھا جیسے وہ کمرۂ عروسی میں نہیں والٹن کیمپ کے قریب سے گزرتی ریلوے لائن کے پاس ارشد کے ساتھ لگی نیم دراز ہو۔ اس نے ماضی سے بھاگ آنے کی جدوجہد کی۔ اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ نعیم ہے ارشد نہیں اور اب وہ اپنے آزاد فیصلے سے ارشد کی محبوبہ نہیں نعیم کی بیوی ہے۔

اس کے ذہن میں ٹیڑھے سے سوالات بیدار ہونے لگے اور اس نے نعیم کا ہاتھ اس طرح مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے ڈوبنے سے بچنے کی کوشش کی ہو یا جیسے نعیم اُٹھ کے بھاگ چلا ہو۔ طاہرہ کسی حد تک چونک سی گئی اور نعیم کے اور قریب ہو گئی۔

"نعیم!" — ایک سرگوشی، زیرِ لب۔

"طاہرہ!"

"یہ رات گزر جائے گی؟"

"پھر ایک اور رات آ جائے گی، طاہرہ!"

"اسی طرح؟"

"اس سے بھی خوبصورت!"

"خدا کرے!"

خاموشی — ایک سکوت، عطر بیز۔

نعیم کا ہاتھ طاہرہ کے ہاتھ میں تھا — سینے پر رکھا ہُوا — طاہرہ اس کے ہاتھ کے شیریں لمس کے سہارے ماضی سے نکل آئی۔ اس نے اپنے آپ کو اتنا زیادہ مسرور کرنے کی کوشش کی جیسے خُدا نے اس کی روح کے دریچے کھول دیئے ہوں اور فرشتے ان دریچوں سے نئی روشنی ڈال رہے ہوں۔ اس نے محسوس کیا جیسے عورت کے وجود میں ایک عورت جنم لے رہی ہو۔ نسوانیت خُدا کا پیغام بن کر اس کے ریشے ریشے میں سما رہی تھی اور طاہرہ نے محسوس کیا جیسے وہ شکریہ کا پیغام بن کر بادلوں کے دوش پر آسمانوں کی طرف اڑی جا رہی ہو — خدا کی طرف، خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہونے کو — "اے خدا! تیرا شکریہ تو نے مجھے عورت کے روپ میں

پیدا کیا۔ مجھے عورت کے روپ میں ہی پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ اس نے ماضی خدا کے سپرد کر دیا۔

رات کے لمحات رنگ برنگی چڑیوں کی طرح ایک ایک کر کے اُڑتے جا رہے تھے۔ لمحات گزر گئے اور طاہرہ کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات کے بطن سے صبح طلوع ہوئی جو ہر صبح سے زیادہ پرنور اور روشن تھی۔

نعیم کا باپ دوسرے ہی دن واپس پشاور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے اطہر، نجمہ، نعیم اور طاہرہ کو پاس بلا کر کہا۔

"میں تم سب کا بے حد ممنون ہوں کہ تم نے مل کر میری ایک آرزو اور ایک فرض پورا کر دیا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب تم بھی محسوس کرو گے کہ اولاد کی شادی باپ کے لیے کتنی عظیم اور نازک ذمہ داری ہوتی ہے۔ تم بچوں نے مل کر جس طرح میرے اعصاب سے بوجھ اٹھایا ہے میں اسی طرح باقی عمر تمہارے لیے دست بدعا رہوں گا۔ میں اس بات کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے شادی جیسے اہم مسئلے کو خوشگوار فضا میں طے کر لیا ہے۔ جس طرح تم نے یہ رسم ادا کی۔ اپنی نوعیت کی غالباً پہلی مثال ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم رسمی رشتہ داریوں سے دور رہے اور بے جا اخراجات سے بچ گئے۔ میرے بچو! دعا کرو خدا تمہاری یہ مقدس کوشش ہمیشہ کے لیے کامیاب رکھے جس سادگی اور خلوص سے یہ رسم ادا ہوئی ہے، خدا کرے کہ ان دونوں کی زندگی اسی خلوص میں گزرے۔"

"آمین!" سب نے کہا۔

"اور اطہر صاحب!" باپ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "نعیم صاحب کی یہ جھجک تو دور کرو۔ ماں تو اسے ابھی تک گود میں اٹھانے کو پھرتی ہے اور یہ صاحب ہیں کہ محفل میں کھل کر بات بھی نہیں کر پاتے۔"

"اب کیا کریں گے؟" نجمہ نے کہا اور طاہرہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ نعیم کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو گئی۔

"خدا کرے بھئی!" باپ نے شگفتہ لہجے میں کہا اور پوچھا۔ "کورس کا یہ آخری ہفتہ ہے نا نعیم؟ .... ٹھیک ہے۔ تو تم آئندہ اتوار آ جاؤ گے؟"

"جی نہیں!" اطہر نے کہا۔ "آئندہ سوموار کہیئے۔ اس آخری اتوار کو یہاں پک نک منائی جائے گی۔"

"جی ہاں ابا جان!" نعیم نے کہا۔ "ہم سوموار ایکسپریس پر رات نو بجے پشاور پہنچ جائیں گے۔"

نعیم اور طاہرہ کے پشاور جانے میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔ طاہرہ نئی زندگی کے پربہار آغاز کے کیف و سرور میں پشاور، نعیم اور سسرال کے خواب دیکھ رہی تھی۔ نعیم سے وہ پشاور کے متعلق، اس کی ماں کی طبیعت اور مزاج کے متعلق سوالات پوچھ پوچھ کر اسے پریشان کرتی رہتی تھی۔ بعض اوقات وہ ایک گہری سوچ میں کھو جاتی جس میں ایک فکر تھا اور بے چینی بھی۔ ایسے میں وہ نعیم کا ہی سہارا لیتی تھی اور وہ اس کا فکر دور کر دیتا تھا لیکن یہ فکر تھوڑی دیر بعد پھر عود کر آتا تھا۔

"اگر آپ کی امی جان نے مجھے پسند نہ کیا تو آپ انہیں کیا کہیں گے؟" یہ سوال طاہرہ پہلے تین بار نعیم سے پوچھ چکی تھی اور نعیم اسے تفصیلاً جواب دے چکا تھا کہ کوئی وجہ ہی نہیں کہ وہ اسے پسند نہ کرے۔

"لیکن مجھ میں ایک جو خامی ہے اُسے کس طرح چھپایا جائے گا؟"

"کیا خامی ہے تم میں؟" نعیم نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ بھی تو خامی ہے نا کہ میں لاوارث ہوں۔" طاہرہ نے کہا۔ "مہاجر ہونا بھی تو ایک کمزوری بن گیا ہے۔ لوگ کہیں گے

کیمپ سے مہاجر لڑکی بیاہ لایا ہے۔ نہ زیور نہ جہیز۔"

"سنو، طاہرہ!" نعیم نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "پشاور میں کیا ہو گا، کیا نہیں ہو گا، لوگ کیا کہیں اور ہم ان کے جواب میں کیا کہیں گے یا ہم کیا نہیں کہیں گے، یہ وقت پر منحصر ہے جو کوئی جیسی بات کرے گا اسے موقع محل اور اس کی بات کے مطابق ویسا ہی جواب دے دیں گے۔ تم کیوں بیکار باتیں سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہی ہو؟"

"میں اس لیے فکرمند ہوں کہ مجھے خانہ داری کا تو کچھ سلیقہ نہیں۔" طاہرہ نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "آپ کی امی بُرا نہ مانیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ساس کے ساتھ کیسے برتاؤ کیا جاتا ہے؟"

"طاہرہ!" نعیم اسے چوتھی مرتبہ بتا رہا تھا۔ "امی کے متعلق میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے ساتھ ان کا پیار عام ماؤں جیسا نہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر جیتی ہیں۔ تم جانتی ہو میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ انہیں میری ہر چیز سے پیار ہے۔ انہیں میری غلطیوں اور لغزشوں سے بھی پیار ہے۔ وہ تمہارے ساتھ بھی اسی طرح محبت کریں گی جس طرح میرے ساتھ کرتی ہیں۔ اس لیے نہیں کہ تم ان کی بہو ہو بلکہ اس لیے کہ تم میری بیوی ہو۔ امی کے متعلق میں تمہیں ایک بات بتا دوں، جو معلوم نہیں پہلے بتائی تھی یا نہیں، کہ وہ ذرا تنگ مزاج ہیں۔ میرے معاملے میں زیادہ شکی اور وہمی ہیں۔ بعض اوقات تو یوں کر بیٹھتی ہیں کہ جیسے مجھے کوئی اغوا کر کے لیے جا رہا ہے۔ کیا مجال کہ میں ضرورت سے زیادہ وقت باہر رہ جاؤں۔ جہاں وہ میرے دوستوں کے ساتھ اُنس سے پیش آتی ہیں وہاں بعض اوقات یہ کہہ کر کہ میرے بچے کو اتنی اتنی دیر باہر رکھتے ہیں، انہیں کوس بھی لیتی ہیں۔ بہرحال، طاہرہ! تم مطمئن رہو۔ سب ٹھیک رہے گا۔ تم امی کے ساتھ مکمل طور پر بے تکلف رہنا اور فرمانبردارانہ قسم کی محبت کرتی رہنا۔ تمہیں خانہ داری کی تو فکر ہی نہیں ہونی چاہیئے۔ تمہیں تو جاتے ہی ہم سکول میں استانی لگوا دیں گے اور گھر کے کام کا فکر نہ کرو۔ اگر نوکرانی رکھ لی تو بھی امی سارا کام خود کریں گی۔ یہ ان کی عادت ہے۔"

سسرال خصوصاً ساس کے متعلق طاہرہ کا فکر نہ ہی دور ہوا اور وہ نجمہ پر سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگی۔ نجمہ اسے ہر بات تفصیلاً سمجھا دیتی تھی۔ "تم خود بھی خاصی عقل مند ہو۔ اتنا فکر کیوں کرتی ہو؟" نجمہ نے اسے ہر بار کہا۔ "جیسا انسان اور موقع دیکھو گی ویسی ہی بات اور برتاؤ کرنا۔ یہ کوشش کرنا کہ ساس کی طرف سے زیادتی ہو تو برداشت کر لینا اور اپنی طرف سے محتاط رہنا۔ جھگڑا بڑھانا تو اپنی زندگی خراب کرنے والی بات ہے۔ وہ تو بوڑھی ہو گی۔ بات بات میں نکتہ چینی کرے گی۔ تم اس کا دل بھی رکھ لینا اور اپنی مرضی بھی کرتی رہنا۔ نعیم تو تم سے دل برداشتہ ہونے سے رہا۔ تم اس کے دل میں سما چکی ہو، وہ تو سو فیصد امید ہے کہ تمہاری ہی طرف داری کرے گا۔ گھروں میں جھک جھک ہوتی رہتی ہے۔ اپنی طرف سے کوشش کرنا کہ نہ ہونے پائے۔ اگر ہو جائے تو درگزر کرنا۔"

سوموار کی شام کو، طاہرہ، اطہر اور نجمہ کو الوداع کہہ کر نعیم کے ساتھ پشاور پہنچ گئی۔ نعیم کی امی نے بغلگیر ہو کر طاہرہ کا استقبال کیا۔ بیٹے اور بہو کی سو سو بلائیں لیں۔ دوسرے دن محلے میں یہ خبر پھیلتے ہی کہ نعیم پنڈی سے دلہن لایا ہے، عورتوں نے نعیم کے گھر پر بول دیا۔ اس کی خالہ کو پتہ چلا تو وہ جلی کٹی آ کے نعیم اور اس کی ماں پر برس پڑی۔ "اندر ہی اندر سب کچھ کر لیا اور ہمیں پوچھا تک نہیں۔ ہم ہیں کہ منہ سے نکال کر تم لوگوں کا حق اور حصہ پورا کریں اور ایک تم ہو کہ...."

نعیم کے باپ نے جھوٹ موٹ کی باتیں بنا کر اسے راضی کر لیا اور دو تین روز میں فضا سے رشتہ داروں کے گلوں شکووں کا تکدر دور ہو گیا۔

آہستہ آہستہ نئی دلہن پرانی ہونے لگی۔

"اِس خط کے حساب سے طاہرہ ان دنوں کراچی ہوگی"۔۔۔۔ ارشد نے اباجان اور یُوسف سے کہا۔ "خط لکھنے والے حضرت اگر اپنے محکمے کا نام ہی لکھ دیتے تو میں کراچی جاکر انہیں تلاش کر لیتا۔"

"کراچی میں کسی کو تلاش کرنا ممکن نہیں، بیٹا!"۔۔۔۔ اباجان نے کہا۔ "انتظار کرو۔ جس طرح طاہرہ نے اس خط میں دو چار فقرے لکھ دیئے تھے وہ کم از کم ایک اور خط ضرور لکھے گی۔ اس کے علاوہ افتخار بیگ کے خط کے مطابق امید رکھنی چاہیئے کہ وہ لاہور آجائیں گے۔"

"مجھے تو مکمل یقین ہے کہ طاہرہ آجائے گی"۔۔۔۔ یوسف نے کہا۔ "اس گھر کی یاد اسے ہم سے دور رہنے نہیں دے گی۔"

ارشد اپنے آپ کو طفل تسلیاں دے کر خاموش ہوگیا لیکن اس کی داخلی دنیا میں ایک واویلا بپا رہتا تھا۔ وہاں ایک مسلسل بھونچال، زلزلے اور آندھیاں چلتی رہتی تھیں۔ عفت کے مرجانے کے بعد اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے عفت سے اسی قدر پیار تھا جس قدر طاہرہ سے۔ یہ احساس کہاں سے امڈ آیا تھا؟ ارشد کو معلوم نہ ہوسکا لیکن یہ احساس ایک تلخ حقیقت بن گیا تھا۔ کیا طاہرہ اور عفت! اسے جو بھی یاد آتی وہ تڑپ اٹھتا تھا۔ اس کی زندگی مسلسل تڑپ اور انتظار بنتی جارہی تھی۔

عفت جس طرح ترس ترس کر اور سسک سسک کر مری تھی اسے ارشد اپنا جرم سمجھنے لگا تھا۔۔۔۔ "کاش! میں عفت کے جیتے جی اس سے محبت کر سکتا"۔۔۔۔ یہ خیال کانٹا بن کر اس کے ضمیر میں اتر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی۔۔۔۔ "کاش! طاہرہ اس قدر غلطیاں نہ کرتی"۔۔۔۔ یہ خیال اکثر اوقات پچھتاوا بن کر اسے پریشان کرنے لگتا۔ وہ یا تو گہری سوچ میں ڈوبا ہُوا طاہرہ کو تلاش کرنے کے امکانات پر غور کرتا رہتا یا اندرونی خلفشار کے زیر اثر برآمدے یا کمرے میں ٹہلنے لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ بے چینی سے عجیب عجیب حرکات کرتے رہتے تھے جیسے مٹی کے ڈھیروں میں سے کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ بعض اوقات تو وہ رات کو اُٹھ کے بیٹھ جاتا اور رات کے اندھیرے سکوت میں ماضی کے ہنگاموں کو دیکھ کر راتوں کی بے چینی کو فریب دے لیتا تھا۔ اس کے اباجان، بھائی، امی اور بھابی گھسیٹ گھسیٹ کر اس دلدل سے نکالنے میں مصروف تھے لیکن طاہرہ کی جدائی کے دکھ اور عفت کے غم میں جو قوت تھی وہ خاصی آسانی سے شکست کھانے والی نہیں تھی۔

ارشد کو کوئی شے سکون دیتی تھی تو وہ اس کا بچہ تھا۔۔۔۔ طاہر پرویز۔۔۔۔ جو تین ماہ کا ہوگیا تھا۔ صحت کے ساتھ بچے کے ہاتھوں اور ٹانگوں میں وہ شوخی آگئی کہ مشین کی طرح چلتے رہتے تھے جیسے لیٹے لیٹے سائیکل چلا رہا ہو۔ وہ جتنی دیر جاگتا رہتا، ہنستا اور چیختا رہتا تھا۔ ہنسی کا بھی یہ عالم تھا جیسے قدرت نے اپنی تمام ترمسرتیں اس ننھے سے غنچے میں سمو دی ہوں۔ ارشد اسے اٹھا کر اپنے گال کے ساتھ گال رگڑتا تھا تو بچہ ارشد کے گال کو بغیر دانتوں کے منہ سے جیسے کاٹ کھانا چاہتا تھا۔ چوس چوس کر اس کے گال کو تھوک سے بھر دیتا اور ساتھ ہی ارشد کے کان یا ناک کو مضبوطی سے پکڑ لیتا تھا۔ ایسے میں ارشد کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس ذرا سے بچے نے اس کے تمام غم، سارے دکھ، ماضی کے فریب اور حال کی تلخیاں چوس لی ہوں اور اس کے رگ و ریشے میں سکون اور فرحت بھر دیا ہو۔

ارشد نے اب اپنے آپ میں یہ تبدیلی پیدا کرلی کہ بجائے آہیں بھرنے اور زیادہ دیر سوچ و فکر یا بے چینی میں برآمدے یا کمرے میں ٹہلنے کے، بچے کے ساتھ کھیلنے لگ گیا۔ وہ بچے کو سینے پر لٹاتے منہ اس کے منہ کے ساتھ رگڑتا رہتا تھا لیکن بچے سے علیحدہ اور بعض اوقات بچے کی موجُودگی میں بھی اسے عفت اور اس کی وصیت یاد آجاتی تھی تو ارشاد کی بے چین نگاہیں خلاؤں میں طاہرہ کو ڈھونڈنے لگتی تھیں۔

"کیوں طاہر؟"۔۔۔۔ ارشد نے ایک روز بچے کی چشمے کی طرح شفاف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "طاہرہ امی کے بغیر اداس رہو گے؟"۔۔۔۔ اور بچہ باپ کی آواز پر اُچھلنے لگا جیسے کہہ رہا ہو "کیوں نہیں رہوں گا، کیوں نہیں رہوں گا۔ ڈھونڈ کر لاؤ۔ میں نے تو دیکھا بھی نہیں اُسے۔"

"طاہرہ کو نہیں جانتے تم؟ وہ آئے گی تمہیں تو ل سے دودھ پلایا کرے گی تمہیں اپنے پاس سلایا کرے گی۔ تمہاری وہ امی بڑی اچھی ہے۔ دیکھو گے تو اس کے ساتھ لپٹ جاؤ گے۔ پھر تو تم میرے پاس بھی نہیں آیا کرو گے۔ آیا کرو گے؟۔۔۔۔ نہیں جھُوٹ وعدہ کرو! اگر نہ آئے تو کان کھینچ لوں گا۔"

ارشد نے بچے کا کان جو پکڑا تو بچے نے دونوں ہاتھوں سے ارشد کے مُنہ پر تھپیڑ مارنے شروع کر دیئے۔ اس طرح جیسے مشین چل پڑی ہو۔

"اچھا بھئی! معاف کر دو۔ اب کان نہیں پکڑوں گا۔۔۔۔ چلو، طاہر! دونوں مل کر دعا کریں کہ خدا تیری طاہرہ امی کو جلدی واپس لے آئے۔ آمین۔"

اس نے بچے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر دعا کے لیے اٹھانے چاہے تو بچے نے دونوں ہاتھوں سے اس کا انگوٹھا پکڑ کر مُنہ میں ڈال لیا اور چوُسنے لگا۔۔۔۔ "بہت لالچی ہو طاہر! میں دعا کے لیے کہہ رہا ہوں اور تمہیں پیٹ کی فکر لگ گئی ہے۔ چلو چھوڑو میرا انگوٹھا۔"

اور ارشد یوں ہی بچے کے ساتھ کھیل کھیل کر اور باتیں کر کر کے فرقت کے شب و روز کو فریب دیتا رہا۔ طاہرہ کے اگلے خط کا انتظار کرتا رہا۔ عفت کی قبر پر بچے کو لے جاتا رہا۔ گاہے دل ہی دل میں عفت کی قبر پر عفت سے معافی مانگتا رہا اور یوں دل و دماغ سے احساسِ جرم کو دھوتا رہا۔ خیالوں میں طاہرہ سے بھی معافی مانگتا رہا اور طاہر پرویز کے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر طاہرہ کی واپسی کی دعائیں کراتا رہا۔

دن راتوں کے تعاقب میں بھاگتے رہے۔ چاند سُورج کے تعاقب میں، ستارے ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے رہے۔ ارشد کے تخیلات طاہرہ کے تعاقب میں سرگرداں رہے لیکن کوئی کسی کو نہ پاسکا۔ تعاقب کرنے والے بھاگتے رہے۔ سب کی دوڑ بے سود رہی۔ دن رات کا چکر روزِ اول کی رفتار سے چلتا رہا۔ دن گزرے، ہفتے گزرے، مہینے بھی گزرے۔

اور پورے پندرہ مہینے گزر گئے۔

طاہر پرویز ڈیڑھ برس کا ہوگیا۔ اب وہ ارشد کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا، ایسے ہی جیسے عفت اور طاہرہ اس کے خیالوں

میں کھیلتی رہتی تھیں۔ طاہر باتیں بھی کرنے لگا تھا۔ گو وہ ارشد کی باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا جو وہ اس کے ساتھ تنہائی میں کیا کرتا تھا
ضرور دیتا تھا۔ اب ارشد اسے طاہر کی بجائے طاہری کہنے لگا تھا۔

"طاہری بیٹے!" — ارشد کبھی کبھی بے تابی سے کہتا — "تمہاری امی تو اب آنے ہی والی ہوں گی۔"

"امی دُو دُو" — طاہر کے پاس یہی ایک جواب تھا اور اگر موڈ میں ہوتا تو ایک گردان شروع کر دیتا تھا — "امی آؤں
امی آئی۔ امی گئی۔ بابا آئے۔ بابا ٹھائی" — ارشد کے ابا جان کو وہ بابا کہا کرتا تھا۔ وہ اس کے لیے ٹافی لایا کرتے تھے۔
رٹ روزمرہ کا معمول بن گیا تھا — "بابا آئے، بابا ٹھائی۔"

اب ارشد پہلے سے زیادہ وقت بچے کے ساتھ باتوں میں گزارنے لگا۔ ارشد کا ماضی اس ننھے سے بچے میں
تھا اور اس میں اسے گزرے ہوئے دنوں کی ایک ایک جھلک دکھائی دیا کرتی تھی۔ جب طاہر "امی ماؤں ماؤں" کہتا تھا تو ارشد
آتا تھا جیسے بچے نے اسے ماضی کا ایک قصہ سنا دیا ہو۔

اس ڈیڑھ برس کے بعد صرف ایک تبدیلی آئی جو بجلی کی چمک کی طرح آئی اور گزر گئی۔ وہ یہ کہ نجمہ لاہور اپنے رشتہ داروں
آئی تو اتفاق سے ارشد اسے باہر کہیں مل گیا۔ وہ اس طرح ملے جس طرح بچھڑے ہوئے دو بہن بھائی ملتے ہیں۔ ارشد اسے
گیا۔ وہ جانا تو نہ چاہتی تھی لیکن وہ لے ہی گیا۔

نجمہ کو ڈیڑھ برس بعد علم ہوا کہ عفت مر چکی ہے اور اس کا بچہ ڈیڑھ برس کا ہو گیا ہے۔ امی اور بھابی کے پاس ذرا سا بیٹھ
ارشد کے اصرار پر اس کے کمرے میں گئی اور ارشد اس کے سامنے دل کھول کر رو دیا۔ نجمہ کو عفت کا بہت دکھ ہوا۔ وہ طاہر کو
گود میں لیے روتی رہی۔ ارشد نے جگر کا ایک ایک ٹکڑا نجمہ کے آگے رکھ دیا۔ گزرے ہوئے ایک ایک لمحے کی بات سنائی
بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر ارشد کو یہ بتا دیا جائے کہ طاہرہ شادی کر کے اپنا ٹھکانہ کر گئی ہے تو ارشد کی حرکت قلب
گی۔ اس نے سوچا بہتر ہے اسے امید اور انتظار میں ہی رہنے دیا جائے کم از کم ایک آدھ بھولی بسری مسکراہٹ تو اس کے
پر آ جاتی ہے، ورنہ یہ بھی ختم ہو جائے گی۔ نجمہ دیکھ رہی تھی کہ ارشد وہ ارشد رہا ہی نہیں جو محفل کی جان ہوا کرتا تھا۔

نجمہ کا یہ خیال درست تھا۔ ارشد کی زندگی کو طاہرہ کے لوٹ آنے کی امید اور انتظار جلا دے رہے تھے ورنہ دیا کبھی
ایک امید پر ٹمٹما رہا تھا۔ نجمہ نے سوچا یہ دیا ٹمٹماتا ہی رہے، وقت ہر مرض کی دوا ہے لیکن نجمہ کو معلوم نہ تھا کہ اس انتظار کو انکا
یہ روز بروز جوان ہوتا جا رہا ہے۔ نجمہ نے اس کا اندازہ کرتے ہوئے ارشد کو بڑی بہنوں کی بے تکلفی سے کہا — "ارشد! کیوں نہیں
کر لیتے! سجد اسب کچھ بھول جاؤ گے۔ اس جوانی میں رونے بیٹھ گئے ہو۔ اس طرح کیسے عمر کٹے گی؟"

ارشد نے حیرت زدہ نگاہوں سے نجمہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں۔ ہونٹ لرز اٹھے اور وہ روندھی ہوئی
بولا — "آپا! یہ تم کہہ رہی ہو؟ تم جو میری ہمراز اور میری غمخوار ہو؟ یہ جانتے ہوئے کہ میں طاہرہ ....!" اس کے آگے وہ بول ہی نہ سکا۔
کچھ ایسی ہی کیفیت نجمہ پر طاری ہو گئی اور کمرے میں اداسیوں سے لبریز سکوت چھا گیا جس میں بچے کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں تحلیل
ارشد ذرا سی خاموشی کے بعد بولا "مجھے عفت کی وصیت کا بھی پاس ہے آپا! میں طاہرہ کے سوا اور کسی کے ساتھ ایک لمحہ بھی
سکوں گا۔ ایک لمحہ، آپا، تم تو زندگی کی بات کر رہی ہو۔ میں عفت کی روح اور طاہرہ کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ عفت اور طاہرہ کی ایک ایک بات

آپا میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ اس بچے کی ہنسی میں طاہرہ کی ہنسی اور اس کے رونے میں عفت کی سسکیاں سنائی دیتی
ہے کہ میں اس بچے کو اپنے سے الگ نہیں کرتا۔ امی کے ہزار منع کرنے کے باوجود اسے اب میں اپنے پاس سلاتا ہوں صرف
میں عفت اور طاہرہ کو نہ بھول جاؤں .... آپا! سچ بتاؤ۔ طاہرہ تمہیں نہیں ملی تھی؟"

"نہیں ارشد! نہیں" — نجمہ نے کہا۔ وہ دراصل اپنے اچھلتے دل کو دبا رہی تھی کہ جذبات میں آ کر کہیں سچی بات نہ اگل دے۔ بولی
"میرے پاس آتی تو کیا میں اسے تم سے چھپاتے رکھتی؟ اور وہ بھی تمہاری اس حالت میں؟"

نجمہ چلی گئی اور ارشد کو یوں دھچکا لگا جیسے امید کی ایک کرن نظر آئی تھی اور شب کی تیرگی نے اسے بھی نگل لیا ہو۔ اس نے
ہاتھ اٹھا کر دعا کی — "اے خدا! طاہرہ جہاں بھی ہو اسے خیریت اور آرام سے رکھنا۔"

طاہرہ کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ نجمہ کا طویل خط اس کے سامنے یوں پڑا تھا جیسے کسی نے ماضی کی ساری داستان سامنے پھیلا دی ہو۔ ایک وہ لمحہ جب ارشد، جلال آباد میں اس کے کمرے میں انجانے راہی کی طرح داخل ہوا تھا اور اس کے دل و دماغ معموں اور تلخیوں کی آماجگاہ بن گئے تھے۔ حالات سے ہم آہنگی کے اس نے سارے جتن کر لیے تھے اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو تیار ہی نہیں ہو رہا تھا نعیم کے ساتھ شادی کر کے اس نے کیا کیا خواب دیکھے سہانے سپنے اس نے سوتے جاگتے میں ذہن میں لبا لیے تھے۔ اس نے ماضی کی تلخ یادوں کو نعیم کی زوجیت اس نے ایک آگ نعیم کے سانسوں کی پرسوز خنکی میں بجھالی تھی۔ ایک تڑپ کو اس نے ازدواجیت کی لذت میں دفن کر وہ سمجھتی تھی شاید جہانِ دگر میں پہنچ گئی ہے اور اس نے اپنی منزل کو پا لیا ہے جہاں دکھ ہیں نہ غم۔ بے چینی نہ مسرت ہی مسرت ہے۔ سرور ہی سرور ہے۔ اس کے کردار میں جو تڑپ تھی کچھ کر نے کی اور جو جذبہ تھا محبتِ انسانی کا اسے کے لیے اس نے نعیم کے والدین کی منظوری سے سکول میں ملازمت کر لی تھی۔ بچوں کو پڑھانے، اور وہ بھی اپنے انداز میں اسے روحانی کیف محسوس ہوتا تھا۔ وہ ہیڈ مسٹریس کے بناتے ہوتے سلیبس، جمع تفریق اور سلیٹوں تختیوں کی پابند کے بچوں کو وہ اپنے بچے سمجھ کر ایک سلجھی ہوئی ماں کی طرح لکھاتی پڑھاتی تھی اور انہیں وہ بات جو ان کی چھوٹی چھوٹی کتابوں اور جسے وہ سمجھنے کے لیے بیتاب ہوتے تھے، سمجھایا کرتی تھی۔

کلاس میں اسے بعض اوقات امّی خاتون یاد آیا کرتی تھی اور اس کی وہ کہانیاں جن میں پریاں دیو کی نذر نہیں ہو کر جاتی تھیں۔ وہ کہانیاں جن کے کرداروں میں خود اعتمادی اور استقلال ہوتا تھا۔ طاہرہ کو وہ کہانیاں یاد تھیں اور وہ کہانیاں اس کی بسی ہوئی بھی تھیں۔ ایسی ہی کہانیاں وہ بچوں کو سنا سنا کر ان میں خود ارادیت اور خودداری پیدا کرتی اور دین و ایمان کے سبق دیا کے وقت ان کے ساتھ کھیلا کرتی اور بچے "طاہرہ آپا! طاہرہ آپا!" کی رٹ سے تھکتے نہ تھے اور جو سکون، جو قرار اور جو راحت کو ان ننھی ننھی روحوں کی مسکراہٹوں میں ملتا تھا وہی اس کی انتھک اور جدّوجہد سے بھرپور زندگی کا حاصل تھا۔

جب سکول سے گھر آتی تو نعیم کی ماں کی پیشانی پر پڑے ہوئے شکنوں کو سیدھا کرنے کی کوشش میں مصروف طاہرہ کے پشاور آنے کے دس ہی روز بعد نعیم کی ماں کی ناک ذرا ذرا سکڑنے لگی تھی اور ماتھے پر بل پڑنے لگے تھے۔ بظاہر اس کی وجوہات ایسی تھیں جنہیں ہر ذی ہوش انسان نظر انداز کر دیا کرتا ہے اور جو ہر کسی سے سرزد ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن در پردہ نعیم کی

...نہ سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ یہ وجہ ایک نہیں، ہر روز نئی سے نئی شکایتوں کو جنم دیتی تھی۔ نعیم کی ...اں وہ "ماں" بیدار ہو گئی تھی جس کا بچہ چھین لیا جاتے اور پنجرے میں بند کر کے اس کے سامنے رکھ دیا جائے۔

...نے بچے کو وہ چودہ برس تک اپنے پاس سُلاتی رہی تھی وہ کیسے برداشت کرتی کہ اسے کوئی اور اپنے پاس سُلا لے۔ وہ کھاتی تھی ...کھلا کر۔ نماز کے بعد دعا کرتی تھی تو صرف نعیم کے لیے بعض اوقات تو وہ دعا کیا کرتی تھی ــــ "یا خدا! میری زندگی نعیم کو دے دے" ...ب نعیم سکول، پھر کالج اور پھر دفتر جانے لگا تھا تو وہ دن بھر اٹھتے بیٹھتے نعیم کی بخیریت واپسی کی دعائیں مانگا کرتی تھی ...ایسی ایسی باتیں بھی اس کے منہ سے نکل جاتی تھیں جیسے اس کا بیٹا جنگ پر چلا گیا ہو۔ طاہرہ کے آنے سے پہلے ماں ...بتا تھا کہ اس کا خاوند اس کے بیٹے کی محبت پر ڈاکہ زنی کر رہا ہے۔ وہ نعیم کے باپ سے الجھ بھی پڑتی تھی جب وہ اسے ...لڑکے کو اپنے ساتھ یوں چپکا کر تباہ کر رہی ہے ــــ "خدا کے لیے اسے اب اپنے پاؤں پر چلنے دو اور اسے مرد ...بنا، عمر سہارے ہی ڈھونڈتا رہے گا۔ تم تو اس پر ظلم کر رہی ہو ــــ لیکن ماممتا تڑپ اٹھتی تھی ــــ "پیار بھلا ظلم ہوتا ہے؟"

...باپ نعیم کے کردار سے ماں کے لیے جالا ڈو پیار کا سارہ وہ ... بتا تھا لیکن جو اثرات گہرائیوں تک پہنچ چکے تھے وہ اس ...ترس سے بہت ہی دور تھے۔ ان اثرات کی بدولت نعیم کی شخصیت کی تشکیل میں کچھ کڑیاں کمزور رہ گئی تھیں۔ دل کمزور ...فکر کی قوتیں خام تھیں۔ ذرا سی برہمی اور حالات کی ہلکی سی ناموافق کروٹ سے وہ بے حد پریشان ہو جاتا اور اس کا دل ...ہلکا سا صدمہ بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کا دل صرف پیار، وہ بھی نسوانی پیار کا حاجت مند رہتا تھا اور دل ہر لمحہ ایک ...رف کی گرفت میں جکڑا رہتا تھا۔

...سے طاہرہ اور طاہرہ کا پیار جو ملا تو اسے جیسے جنت مل گئی ہو۔ پیار محبت کے خزانے مل گئے۔ اس کا جسم اور روح ...پانے لگے۔ وہ بچوں کی طرح ہر وقت طاہرہ کی آغوش میں سر رکھے رہنے کی ضرورت محسوس کرنے لگا اور یہ ضرورت اس طرح اس کے کردار کی کڑیاں اور زیادہ کمزور ہونے لگیں۔ اسے اس دنیا کا ہوش ہی نہ رہا۔ اسے خیال ہی نہ تھا کہ ...کے حقائق میں داخل ہو چکا ہے اور اسے ان حقائق سے نبرد آزما بھی ہونا ہے لیکن اس میں نبرد آزما ہونے کی ...تھی، جرأت بھی نہیں تھی، یہ صلاحیت ماں کے پیار نے سُلا دی تھی۔

...دفتر سے لوٹتا، ادھر طاہرہ سکول سے آتی تو دونوں اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ کھانا وہیں کھاتے۔ گہری لمبی ...تے اور زیادہ سے زیادہ دیر کمرے میں ہی بند رہتے۔ نعیم کے باپ نے یہ حال دیکھا تو وہ کسی حد تک خوش ہوا کہ چلو ...ماں کا سایہ تو ہٹا، اب وقت کے تقاضوں کو بھی سمجھ لے گا۔

...سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ اس نے آغاز کے دس دنوں میں ہی اپنے دل میں یہ وہم بٹھا لیا تھا ــــ "تیرا بچہ اس لڑکی ...لیا ہے۔ اب تجھے واپس نہیں ملے گا" ــــ اس نے نعیم کی شادی سے پہلے کی طرح نعیم پر مکھی کی طرح بھنبھنانے ...عیم کو اب ماں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

...تو اس وقت لگی جب دو چار موقعوں پر نعیم اور طاہرہ بہت دیر سے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کچھ محبت کی باتیں ہو ...نہ بنانے کی سوچ رہے تھے کہ ماں نے نعیم کو بلایا۔ نعیم گیا تو معلوم ہوا کہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ماں نے ویسے

ہی بلالیا تھا۔ وہ ماں کو ٹال کر پھر طاہرہ کے پاس آبیٹھا۔

دوسری بار ماں نے بلایا تو نعیم نے ذرا ترش روئی سے کہا— "امی! خواہ مخواہ نہ بلالیا کرو۔ کوئی بات ہو تو—" ال
تھام کے رہ گئی۔ اس کے کلیجے میں ایک ٹیس اٹھی جو ذرا سی دیر میں چنگاری بن گئی اور اس کے سینے میں سلگتے سلگتے الاؤ
بن گئی۔ ماں اپنے بیٹے کو واپس لینے پر تل گئی۔ زہر جو لاشعور میں تھا نکل کر ڈنک میں آگیا۔ ماں کی دنیا اور محدود ہو گئی۔ ذہنیت
زیادہ پست ہو گئی۔

ماں کے سینے میں ساس بیدار ہو گئی۔

نعیم نے پشاور پہنچتے ہی گھر میں نوکرانی رکھ لی تھی۔ اس نے ماں کو کہا تھا کہ کھانا پکانا اسی سے کروایا کرے لیکن
سے ہی ہانڈی روٹی اپنے ہاتھ سے کرنے کی عادت تھی، وہ نہ مانی۔ نوکرانی کو کچھ تو کرنا تھا۔ وہ زیادہ دیر طاہرہ کی خدمت میں
ایک دن طاہرہ صحن میں کرسی پر بیٹھی دھوپ میں بال خشک کر رہی تھی اور کتاب پڑھ رہی تھی۔ نعیم کی ماں ذرا پرے بیٹھی
کر رہی تھی۔

"امی جان!"— طاہرہ نے کہا— "دال وغیرہ نوکرانی سے صاف کروالیا کریں۔ وہ کیا حرام کی تنخواہ لیتی ہے؟"

"ہم کہاں تھے نوکرانیوں سے خدمت کرانے والے جس کے لیے خادمہ آئی ہے وہ خدمت کروائے۔ ہمارا
ماں نے بے رخی اور طنز سے بھرپور لہجے میں جواب دیا۔

طاہرہ اس قسم کے لب و لہجے سے ناآشنا تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔

"کیوں، امی جان؟"— طاہرہ نے پیار سے لہجے میں کہا— "آپ کی خدمت نہیں کرے گی تو کس
اگر اس کا کام پسند نہیں تو مجھے کہا کریں۔ میں آپ کی بیٹی بھی ہوں، خادمہ بھی ہوں۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں، بیگم صاحبہ!"— ماں کی سوچ اور عقل کو اس کے اپنے ہی سینے کا زہر ڈس چکا تھا۔
زہر بھر کے بولی— "ہم نے بھی شادی کی تھی۔ نئی نئی شادی کے چاؤ چونچلے بھی کر دیکھے تھے۔ یوں نہیں کہ شرم و حیا ہی
کو سے کھائیں جا ہے کہتے جائیں۔ نہ چھوٹے کا لحاظ نہ بڑے کا ادب۔"

طاہرہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ بڑھیا دل میں کوئی بہت بڑی شکایت لیے ہو۔
ظاہر کرنے سے گریز کر رہی ہے لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اس قسم کی باتوں کا کیا جواب دے۔

ماں بولے جا رہی تھی— "ایک تو لڑکا پہلے ہی گمراہ تھا۔ اب ساری کسر پوری ہو گئی ہے۔ اتنا بے حیا نہ تھا
ہی ایسا مل جائے تو کوئی کیا کرے۔" وہ باتیں اس طرح کر رہی تھی جیسے طاہرہ سے مخاطب نہیں۔ دال صاف کر
بول رہی تھی.... "ہمیں تو کسی نے نوکرانیاں رکھ کر نہیں دی تھیں۔ شادی کے چوتھے روز اگلوں نے چکی پر بٹھا دیا تھا۔ را
ہم چرخہ کاتتے تھے، پھر بھی ساس تھی کہ جوتا سر پر ہی رکھا رہتا تھا۔ کیا مجال بڑوں کے سامنے سر بھی اونچا کر کے
ہی رہتا تھا۔ یہ ہے مرد ہو یا ہے عورت کبھی بھولے سے کسی کے سامنے خاوند سے آنکھ نہیں ملائی تھی اور آج کل
جیسے ویسے اپنے گھر میں دیکھ لیا۔ دن دیکھا نہ رات دیکھی۔"

امی جان! آپ مجھے کہہ رہی ہیں کچھ؟"— طاہرہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔
کہنا کسے ہے!.... سنتا ہی کون ہے!...." آتش فشاں پہاڑ کا لاوا آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور طاہرہ اس کی حرارت محسوس
تی.... "گئے وہ سمے بیت گئے جب کوئی کہتا تھا اور کوئی سنتا تھا۔"
خدا کے لیے آپ مجھے بھی کچھ سمجھائیں"— طاہرہ نے کتاب بند کر کے، کرسی سے اتر کر ساس کے پاس فرش پر بیٹھتے
ا— "معلوم ہوتا ہے میری کسی حرکت یا بات سے آپ سخت خفا ہیں۔"
خاہوں تو تیرا کیا بگاڑ رہی ہوں"— ماں نے اسی طرح اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز میں کہا— "اپنا ہی دماغ
ل۔ سوچا تھا کہ...." اور ماں کے آنسو نکل آئے۔

اہرہ کا دل تو جیسے ڈوب ہی گیا۔ کچھ پلے نہ پڑا یہ قصہ کیا ہے۔ اگر پہیلی ہے تو بوجھے کون؟ طاہرہ کے پلے صرف اسی قدر
اس کی کسی ایسی لغزش پر ناراض ہے جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی یا بڑھیا کو یہ شک ہے کہ طاہرہ اپنی غلطی مانے گی نہیں۔
جان! خدا کے لیے مجھے کچھ بتائیں تو سہی آپ میری کون سی خطا پر خفا ہیں؟"— طاہرہ نے اس کے دونوں کندھے اس
پوچھا جس طرح وہ امی خاتون سے کوئی بات منوایا کرتی تھی۔ اس کی نظر میں امی خاتون اور ساس میں کوئی فرق نہ تھا لیکن ساس
ایک فرق کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا جسے طاہرہ کا سلجھا ہوا دماغ قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ طاہرہ کہہ رہی تھی— "آپ نے
ہے، عمر گزاری ہے۔ میں کیا ہوں؟ آپ کے سامنے کل کی بچی تو ہوں۔ آپ سمجھائیں گے تو میری غلطیاں اور خامیاں
آپ مجھے غلطی بتائیں گی تو میں آپ سے معافی مانگوں گی اور آئندہ محتاط رہوں گی۔"
جھنے والے خود ہی سمجھ لیتے ہیں"— نعیم کی ماں نے ایک اور تیر چلایا اور اٹھ کر کمرے کی طرف چل دی۔ چلتے چلتے بڑبڑانے
لگی— "میں نے کہا بھی تھا کہ کیمپوں میں رہنے والے مہاجروں کی لڑکیوں کا کچھ بھروسہ نہیں"..... اور وہ جانے کیا کیا
رے میں چلی گئی۔

رہ کو یوں لگا جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو اور زہر سارے جسم میں پھیل رہا ہو۔ اس پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔
بنان، گم صم، اس دروازے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی جس میں اس کی ساس دل میں جانے کیا کچھ لیے غائب ہو گئی
ہن چند لمحے اجڑے ہوئے گھر کی طرح خالی رہا۔ پھر یک لخت کئی خیال اس میں چمگادڑوں کی طرح گھس آئے۔
وہم یا پھر آہٹ کہ طاہرہ اپنی ذات میں اس بھیانک ہنگامے سے سٹپٹا اٹھی۔
نے ارادہ کیا کہ اٹھ کر ساس کے پاؤں پکڑ لے اور اسے کہے— "مجھ پر کرم کرو اور بتاؤ میں نے کیا کیا ہے"— لیکن
ماظ ابھی تک صحن میں منڈلا رہے تھے— "سمجھنے والے خود سمجھ لیتے ہیں۔ کیمپوں میں رہنے والے مہاجروں کی لڑکیوں
لیے لگا جیسے وہ بھیانک خواب دیکھ رہی ہو۔
نے سر کو جھٹکا، شاید یہ واہمہ تھا لیکن صحن میں بھٹکتی ہوئی صدائے بازگشت اسے یقین دلا رہی تھی کہ یہ واہمہ نہیں۔ وہ ساس
ی تھی لیکن یہی صدائے بازگشت اس کا راستہ روک رہی تھی۔ طاہرہ کو یوں نظر آنے لگا جیسے اس کی منزل آگے آگے
وہ اس کے پیچھے پیچھے ذہنیت کا پتلی بھاگی جا رہی ہو۔

طاہرہ نے دروازے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے بہت کچھ سوچا، ارادے باندھے، تڑپی بھی لیکن ایک پہیلی مکڑی کی طرح اس کے گرد جالا بنتی گئی اور ساس کے معمہ نما الفاظ کے لیس دار تاروں میں اُلجھتی گئی۔ الجھتی گئی اور الجھ کے رہ گئی۔ کوئی راہ فرار نظر آتی نہ کوئی حل۔ کسی کل، کسی پہلو اور کسی خیال سے اس کے استعجاب اور اضطراب کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔

طاہرہ اپنی سطح سے ذرا سی نیچے اُتر آتی تو گھر میں "ساس بہو" کی روایت تازہ ہو جاتی۔ وہ اپنی ساس کو سب سے پہلے کہتی کہ مہاجر ہونا جرم ہے تو تم بھی تو مہاجر ہو لیکن طاہرہ کی روح کا پرتو تھا جو عزائم کا عکس بن کر اس کے دل و دماغ کے پردوں پر لگا تھا۔ قلب و روح کا یہی ارتعاش اس کی زندگی تھی۔ یہ تھی اس کی شخصیت جو اس صورتِ حال میں بے بس بھی ہو گئی تھی اور اب جدوجہد میں مصروف بھی۔ یہ ہلچل اور رکاوٹ طاہرہ کی ذات کو اس طرح جھٹکے دے رہے تھے جیسے موڑ چلے اور رکے، چلے اور رکے۔

طاہرہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں عقلِ سلیم تو تھی لیکن تجربہ نہ تھا۔ اسے نعیم کا خیال آیا۔ اس کا دماغ شل ہو گیا۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تو اس نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا — "اب تو اچھی بُری جیسے گزرے گی نعیم کے ساتھ گزرے گی اور نعیم کے سہارے گزرے گی۔ لاہور کے حالات سے نجمہ نے نکالا تھا، یہاں کے حالات کا رُخ نعیم بدل دے گا۔ رات اسی سے ذکر کرے گی۔ وہ اپنی امی سے پوچھ لے گا کہ میں نے کون سی غلطی کی ہے اور آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔"

چھٹی کا دن تھا۔ نعیم کہیں باہر گیا ہُوا تھا۔ طاہرہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کتاب کھولی تو کتاب کو یوں پرے پھینک دیا جیسے ساس کا کہا ہُوا ایک ایک لفظ اس پر لکھا ہو۔ وہ پلنگ پر چت لیٹ گئی اور چھت پر نظریں گاڑ دیں لیکن وہاں بھی وہی الفاظ لکھے تھے۔ ہر طرف سے اسے ساس کی ہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس ہیجان و اضطراب سے وہ اس قدر بیزار ہوئی کہ آنسو نکل آئے، اس لیے نہیں کہ اسے ساس نے ناگوار کلمے کہے تھے بلکہ اس لیے کہ، اس کے خیال کے مطابق، اس کی کسی حرکت نے ان ناگوار کلموں کو جنم دیا تھا اور نعیم کی ماں کا دل دکھایا تھا۔

آنسوؤں کے دھندلکے میں اس نے اپنے سامنے نعیم کو کھڑے دیکھا۔ طاہرہ جلدی جلدی اٹھی اور مُنہ پرے کر کے آنسو پونچھ ڈالے لیکن نعیم نے آنسو دیکھ لیے تھے۔ اس سے پہلے تو طاہرہ کی روح افزا مسکراہٹ نعیم کا استقبال کیا کرتی تھی اور آج یہ آنسو؟ نعیم کے جسم میں لرزہ سا طاری ہو گیا جیسے اس نے طاہرہ کو نزع کی حالت میں دیکھ لیا ہو۔ دروازہ بند کر کے وہ طاہرہ کے پاس جا بیٹھا اور اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا کر پوچھا — "کیا ہُوا؟ خیریت تو ہے؟"

طاہرہ نے دل کو سنبھال کر نعیم کو ساری بات سُنائی اور کہا — "خدا کے لیے امی جان سے پوچھیں کہ میری کس غلطی سے وہ ناراض ہیں تاکہ میں دوبارہ وہی لغزش کر کے انہیں پریشان نہ کروں۔ وہ تو کچھ بتاتی ہی نہیں۔ امی تو اس قدر خفا معلوم ہوتی ہیں کہ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کیمپوں میں رہنے والے مہاجروں کی لڑکیوں کا کیا بھروسہ۔"

نعیم اگلی پچھلی ساری باتیں بھول گیا اور بلا سوچے جاماں کے دماغ پر سوار ہُوا۔ اس نے ماں کو صرف اسی فقرے پر بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

طاہرہ کا یہ مدعا نہ تھا۔ وہ شکایت کے جواب میں شکایت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو آئندہ شکایتوں کا وجود ہی ختم کرنا چاہتی تھی لیکن نعیم نے مسئلے کو ایسے طریقے سے ہاتھ میں لیا جیسے ننھا سا بچہ کھلا چاقو ہاتھ میں لے لے۔ صورت ہی بدل گئی اور ماں جلی بیٹھی اور بھڑک اُٹھی۔ وہ بجائے نعیم کو جواب دینے کے صحن میں آ کھڑی ہُوئی اور بے تکی باتوں پر اُتر آئی۔

"اندر گھس کر چغلی کی ہے تو اس کے ہاتھ میں لاٹھی بھی دے دے، میرے سر پر مارے۔"

وہ طاہرہ سے مخاطب تھی اور طاہرہ کمرے میں بند نہ کچھ سوچ سکتی تھی نہ سوچے بغیر رہ ہی سکتی تھی۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اس کی تمام روحانی قوتیں اور اخلاقی قوت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ نعیم اور اس کی ماں کی دل خراش آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

"خدا کے لیے کچھ سمجھو امی" — نعیم نے جھنجھلا کر کہا — "اُس نے چغلی نہیں کی۔ اس نے تو..."

"ہاں ہاں تو اب میری طرف داری تھوڑے ہی کرے گا" — ماں نعیم کا فقرہ کاٹ کر چلائی — "پرائی بیٹیاں یوں ہی گمراہ کر دیا کرتی ہیں۔ جس ماں نے پیٹ میں رکھا، جنا، پالا اور گو مُوت اٹھایا وہ کمبخت دشمن ہو جاتی ہے۔"

نعیم کو یوں لگا جیسے یہ تو اس کی ماں ہے ہی نہیں، کوئی اور عورت بول رہی ہے یا ماں کو کوئی دورہ پڑ گیا ہے۔ اس نے اسے اس حالت میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے جہاں غصہ آ رہا تھا وہاں اضطراب آلود استعجاب بھی تھا اور اس کے ساتھ ہی ماں کی محبت شامل تھی۔ ملے جلے جذبات اور احساسات کی اس کیفیت نے نعیم کو ہلا کے رکھ دیا اور وہ سر پکڑ کر صحن میں بچھی ہُوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

ماں نے اسے اس حالت میں دیکھا تو ممتا کا دوسرا رُخ سامنے آ گیا اور اسے بیٹے پر پیار سے بھرپور ترس آ گیا۔ ذرا دیر ماں بیٹا اکٹھے کمرے میں بیٹھے ہُوئے تھے اور طاہرہ اپنے کمرے میں اکیلی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔

اتنی دیر میں نعیم کا باپ بھی باہر سے آ گیا۔ اس نے حسبِ معمول صحن میں کھڑے ہو کر "السلام علیکم" کہی تو خلافِ معمول کسی کونے سے "وعلیکم السلام" کی آواز نہ آئی۔ اس نے جھک کر نعیم اور طاہرہ کے کھلے دروازے میں سے اندر جھانکا تو دیکھا کہ طاہرہ صوفے پر بیٹھی رو رہی ہے۔ طاہرہ نے اُٹھ کر "السلام علیکم" کہی اور مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ باپ کی بوڑھی آنکھوں نے اچٹتی ہوئی ایک ہی نگاہ میں طاہرہ کا تاثر پہچان لیا اور صرف اتنا پوچھا — "نعیم کہاں ہے؟"

"امی جان کے پاس ہیں۔"

"نعیم!" — باپ نے اسے آواز دی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"سنو نعیم!" — باپ نے نعیم کو اپنے کمرے میں بلا کر پوچھا — "طاہرہ رو رہی ہے! کیا بات ہے؟ تم نے پوچھا تھا؟"

"امی جان نے کچھ کہہ دیا تھا ابا جان" — نعیم نے کرسی پر بیٹھتے ہُوئے جواب دیا۔

"کیا کہہ دیا تھا اور کیوں کہہ دیا تھا؟"

"یہ تو اب مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ کیوں کہہ دیا تھا" — نعیم نے افسوسناک لہجے میں جواب دیا — "میں جب آیا تو طاہرہ رو رہی تھی۔ پوچھا تو اس نے بتایا کہ امی کسی وجہ سے خفا تھیں اور انہوں نے ایسی ایسی باتیں کہہ دی ہیں..."

اور نعیم نے وہ ساری باتیں باپ کو سُنائیں جو اسے طاہرہ نے بتائی تھیں۔ پھر جو کچھ اور جس طرح ماں نے نعیم کو کہا تھا وہ بھی اور باپ کو بتایا... "پھر امی مجھے اندر لے گئیں اور کہنے لگیں کہ طاہرہ بہت آزاد اور بے شرم ہو گئی ہے۔ بڑی مُنہ پھٹ

نے کتنی بار کتنی گھروں میں دیکھی تھی۔ کئی کہانیاں، اسی قسم کی، اس کے چہرے کی گہری جھریوں میں محفوظ تھیں جو اُبھر کر اس کی آنکھ سامنے آگئیں اور خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی اپنی بھی ماں ہُوا کرتی تھی نعیم کی ماں اس کی بہو ہُوا کرتی تھی۔ آج جو نعیم رہی تھی وہ اس پر بیت چکی تھی۔

"دیکھو نعیم!" ــــ باپ نے کہا ــــ "یہ قصہ بہت پرانا ہے جسے آئے دن گھر گھر دہرایا جاتا ہے۔ جب سے انہ شادی کی سوجھی ہے، اُس وقت سے یہ فتنہ ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے۔ ساس بہو کا یہ مسئلہ جس قدر پرانا ہے اسی قدر ٹیڑھا وقت کے ساتھ ساتھ یہ ٹیڑھا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ آج تک کوئی اسے سلجھا نہیں سکا۔ تم یوں کرو کہ طاہرہ کو سمجھاتے رہا کر کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے تمہاری ماں کو بات کرنے کا موقع ملے۔ ماں کو تم بھی ناراض نہ ہونے دو اور میں اسے سمجھاتا رہوں گا۔ تمہاری ماں اس قدر کوڈی جو ہے تو طاہرہ کی طرف سے ضرور کوئی اشارہ ملا ہوگا۔ طاہرہ آخر کم عمر ہے کی آزادی پر معترض نہیں لیکن تمہاری ماں کو یہ آزادی یقیناً اچھی نہیں لگتی۔"

"ابا جان!" ــــ نعیم نے کہا ــــ "امی کو تو طاہرہ کے سکول جانے پر بھی اعتراض ہے۔"

"ہوگا.... ضرور ہوگا" ــــ باپ نے کہا ــــ "میں تمہاری ماں کو قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم جاؤ اور طاہرہ وہ رو رہی ہے۔"

نعیم کم عقل تو نہ تھا، لیکن یہ مسئلہ اس نوعیت کا تھا کہ اس نے کم فہموں والی حرکتیں کیں۔ مسئلے کی پیچیدگی کے سا کی شخصیت میں بھی ایک پیچیدگی تھی جسے وہ شعوری طور پر سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ ماں کو بھی ملزم نہیں بنانا چاہتا تھا۔ دو طاہرہ کی محبت تھی۔ طاہرہ کا حسن اور محبت اس پر سائے کی طرح سوار تھے۔ یہ دونوں پیار ــــ ایک ماں کا، دوسرا طاہرہ کا چکی کے دو پتھر تھے جس کے درمیان نعیم کا سر آچکا تھا۔

نعیم اپنے کمرے میں گیا۔ طاہرہ نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ نعیم نے بغیر تمہید کے طاہرہ کو ماں کے نصیحتیں کرنی شروع کردیں۔ طاہرہ کے لیے نعیم کا یہ رویہ غیر متوقع تھا۔ طاہرہ کو توقع تھی کہ نعیم ماں کے دل سے وہ بات لاتے گا جس سے وہ اس قدر خفا ہوئی ہے لیکن نعیم نے پند و نصیحت کا جو سلسلہ شروع کیا تو طاہرہ اور زیادہ مضطرب ہو اور زیادہ پیچیدہ ہوگیا۔

نعیم کی باتیں بے بنیاد تھیں، اگر ان کی بنیاد تھی بھی تو وہ ماں کے ساتھ وہ وابستگی تھی جو نعیم کی کمزور ترین کڑی تھی۔ لہٰذا اس کی کے لب و لہجے اور انداز میں مردانگی اور خود اعتمادی کا فقدان تھا۔ وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے بات کرنا نہیں چاہتا، جیسے کے دل و دماغ الگ الگ سمتوں کو جا رہے تھے۔ طاہرہ خاموش تھی۔ وہ سہمی سہمی ہوں، ہاں بھی نہیں کر رہی تھی۔ اس کی خاموشی کے پاؤں اکھاڑ دیتے۔ اس کی باتوں میں طفلانہ پن پیدا ہوگیا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے یہ بتائیں کہ میں نے کیا کیا ہے؟" ــــ طاہرہ نے جھلا کر پوچھا۔ نعیم کے ساتھ تو وہ بے تکلف تھی ہی۔ بلکہ اور قدرے ترش روئی سے بولی ــــ "اس وکالت کی تو میں بھی قائل ہوں۔ میں نے امی جان پر کوئی الزام تو نہیں دھرا۔ پتی ہوں میری خطا کیا ہے اور آپ امی جان کی تعریفیں لے بیٹھے ہیں۔ آپ نے تو بات کو اور زیادہ اُلجھا دیا ہے۔"

طاہرہ کا غصہ جو بڑھا تو اُٹھ کر کمرے میں تیز تیز قدم اٹھاتی چلنے پھرنے لگی۔ اس کے لہجے میں جلال اور رعب تھا۔ اس کے نے اور اُٹھ کر چلنے میں بھی وقار تھا۔ اس کا ظاہری حسن جیسے نکھر آیا تھا اور اس کی آنکھوں میں غصے کا تاثر نور کی طرح چمک رہا تھا، جیسے نعیم کی ذات کی کمزور کڑیاں ٹوٹنے لگیں۔ بجائے اس کے کہ وہ طاہرہ کا نقطۂ نگاہ سمجھتا یا دیکھتا کہ طاہرہ کس زاویے سے حالات کو رہی ہے، وہ سمجھا طاہرہ ناراض ہوگئی ہے۔

"دیکھو طاہرہ!" ــــ نعیم نے قدرے گھبراہٹ سے کہا ــــ "تم تو خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہو۔ امی کی تعریفیں کرنے سے میرا یہ ب ہرگز نہیں کہ تم ان کے مقابلے میں اچھی نہیں ہو۔ بخدا میرے لیے تو تم دونوں ایک جیسی ہو۔ میں کہہ رہا تھا کہ امی آخر بزرگ ان کا دل رکھنا ہی پڑتا ہے اور دیکھو طاہرہ!...."

"میں نے یہ جاننے کے لیے آپ کو بھیجا تھا کہ میری غلطی معلوم کریں اور میں اس کا علاج کروں" ــــ طاہرہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر تُن سے کہا تو نعیم نے دیکھا کہ طاہرہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یہ انوکھی سرخی اور چمک نعیم نے طاہرہ کے اور آنکھوں میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اسے محسوس ہُوا جیسے وہ اس چہرے کا سامنا نہ کر سکے گا۔ طاہرہ بولی ــــ "اور آپ گئے تو اور بلیاں اُٹھا لائے۔"

"ذرا سنو تو، طاہرہ!...."

"کیا خاک سنوں؟" ــــ طاہرہ نے نعیم کے قریب ہو کر کہا ــــ "اتنی دیر سے آپ جو کچھ سنا رہے ہیں وہ تو میں سمجھ نہیں اب اور کیا سنوں!"

نعیم نے برہم ہو کر ماتھے پر ہاتھ مارا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا جس طرح نیا نیا جواری [illegible] بازی ہار کر غموں تلے دب جاتا ہے۔ طاہرہ رت اور زیادہ ناگوار گزری۔ معمولی سی بات کو بگاڑا جا رہا تھا۔ اسے بھی نعیم [illegible] کی طرح ترس آگیا اور اس نے نعیم کو تسلیاں دینے شروع کر دیتے۔ دیکھا کہ نعیم کے آنسو نکل رہے تھے۔ اس نے شکست کا کبھی منہ نہ دیکھا تھا۔ حالات کی اس بے مزگی نے اسے بنیاد دل تک ہلا دیا۔

طاہرہ کا خیال تھا کہ یہ آج کی جھک جھک محض غلط فہمی تھی جو بے تکلفی سے [illegible] چھنے پچھوانے سے ختم ہو جاتے گی لیکن اس ہے کا ردِعمل جو دیکھا تو بہت پریشان ہوئی۔ ایک علاج تو یہ تھا کہ وہ ساس کی سطح پر اُتر آتی۔ اپنا محاذ قائم کرلیتی اور ایک کی دو سناتی

لیکن اس کی ذہنی سطح بلند تھی۔ اس کی فطرت میں صلح جوئی اور انسانی محبت کے عناصر غالب تھے اور ساس کی فطرت اس کے بالکل اُلٹ۔

اسی رات جب نعیم کے باپ نے نعیم کی ماں سے پوچھا۔ "آج طاہرہ کے ساتھ کیا بات ہوگئی ہے؟" تو ماں نے پہلے پہیلیوں کی زبان میں باتیں کیں۔ نعیم کے باپ کو اس انوکھی تمہید سے بھٹکایا اور جب وہ تنگ آ کر غصے سے بھر گیا تو مطلب کی بات پر آئی۔ اس نے وہ وہ قصے کہانیاں جوڑ جوڑ کر اپنے خاوند کو سنائیں کہ ایک بار تو اسے بھی گرما دیا لیکن بوڑھا سنبھل گیا۔ اس نے زمانہ دیکھا تھا۔ اس نے نعیم کی ماں کو سمجھانا بجھانا شروع کر دیا لیکن ماں کا یہ حال جیسے جلتی پر تیل پڑتا جا رہا ہو۔ بوڑھے کو گمان نہ تھا کہ بڑھیا اس ذہنی اور اخلاقی پستی تک بھی پہنچ سکتی ہے۔

طاہرہ کا بیان کچھ اور تھا۔ ماں نے نعیم کو جو کچھ سنایا تھا وہ بالکل ہی اُلٹ تھا اور اب ماں نے نعیم کے باپ کو جو کچھ سنایا اس میں صرف مبالغہ نہیں شرمناک مبالغے شامل تھے۔ باپ نے تین بیانوں میں اس نمایاں فرق کو محسوس کیا اور گہری سانس لے کر گہری سوچ میں کھو گیا۔

شادی کو ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا۔ راولپنڈی میں نجمہ کے گھر والے کمرۂ عروسی میں پھولوں اور اگربتیوں کی بُو ابھی تک پہلی رات کی طرح زندہ اور تر و تازہ تھی۔ فضا میں طاہرہ اور نعیم کی شبِ عروسی کی پُرحجاب سرگوشیاں ابھی تک گونجتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک لفظ ابھی تک وہاں موجود تھا لیکن اب اس کمرے کا یہ حال تھا کہ وہ بو باس، وہ پُرشباب انگڑائیاں، محبت کی دھیمی سرگوشیاں، اندھیرے سکوت میں ہلکی سی سرسراہٹ جو دامن میں عشق و محبت کے فتنے لیے پھرتی تھی، ملول ہو گئی تھی۔ اگربتی تو اب بھی جل رہی تھی لیکن خوشبو نہیں تھی۔ اداس سا دھواں فضا کے تکدر میں تحلیل ہو رہا تھا۔ طاہرہ نیتے پلنگ پر لیٹی تھی جس پر وہ چند راتیں پہلے بیٹھتے شرم کے مارے اپنے آپ میں سکڑ گئی تھی اور آج وہی پلنگ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے تپتے ہوئے تنور پر بیٹھی ہوئی ہو۔

طاہرہ نے اس بے بسی میں سب کو یاد کیا۔ امی ساجدہ اور امی خاتون کو بھی۔ ارشد، عفت اور نجمہ کو بھی لیکن ان یادوں نے بھی سہارا نہ دیا۔ دل خون رو رہا تھا اور اس خون سے کئی کئی خواب پھوٹ رہے تھے۔ نعیم کمرے میں داخل ہوا تو طاہرہ کو تکنے کا گمان ہوا۔ آج رات نعیم کے چہرے کا وہ رنگ ہی نہ تھا جیسے کسی اچھے بھلے کپڑے کا رنگ دھوپ نے اڑا دیا ہو۔

وہ حسبِ معمول طاہرہ کے پاس بیٹھا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ہر رات والی پیار بھری حرکتیں شروع کیں لیکن ایسے جیسے پنج وقتہ عادی نمازی دھیان کہیں اور طرف لگا کر رکوع و سجود کا چکر پورا کرتا جا رہا ہو۔ اس کے ہونٹوں کی لرزش سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اخلاقی جرأت ساتھ نہیں دے رہی۔ وہ جو بات کرتا تھا اس میں لرزہ سا ہوتا تھا اور بعض باتیں تو اس نے ایسی ہنسی سے کیں جس میں کھسیانہ پن اور خفت کا عنصر نمایاں تھا۔

طاہرہ نے چاہا کہ وہ ایک بار پھر آج کی واردات پر بات کرے۔ شاید کوئی سرا پِرل جائے لیکن اس کا سر سوچ سوچ کر چکرانے لگا تھا۔ دکھنے بھی لگا تھا۔ طاہرہ نے نعیم کے انداز میں ایک بیگانگی بھی محسوس کی۔ اسے اونگھ سی آئی تو نعیم نے فدویانہ لہجے میں کہا۔ "اوہ! تمہیں نیند آ رہی ہے؟ سو جاؤ، سو جاؤ۔ دن بھر تم پریشان رہی ہو.... طاہرہ! دفع کرو ان جھمیلوں کو۔ اکٹھے

...ان باتوں میں الجھا ہی جاتے ہیں۔ امی تو بوڑھی ہو گئی ہیں لیکن یہ بتا دوں، طاہرہ!.... اسے دیکھو، طاہرہ بُرا نہ ماننا۔ یہ بتا دوں کہ امی دل کی بُری نہیں.... میرا مطلب یہ نہیں...."

طاہرہ نے نعیم کو کنکھیوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو اگر امی دل کی بُری نہیں تو اس میں بُرا ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ طاہرہ نے کروٹ بدلی اور ایک درد کو پہلو تلے دبا کر سونے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

یہ تھا ساس کا پہلا حملہ — اعصابی جنگ کا آغاز — جو کامیاب رہا۔ طاہرہ کے اعصاب پہلے حملے میں ہی زخمی ہو گئے۔ جنگ تو شروع ہو چکی تھی لیکن کسی کو وجہ کا علم نہ تھا سوائے ماں کے۔ اس روز کے بعد ساس نے اس جنگ کو زندگی کا مشن بنا لیا اور طاہرہ کا مشن یہ تھا کہ اس جنگ کو ختم کیا جائے اور وہ ساس کے آگے جھک جائے۔ لیکن طاہرہ کی فطرت وہ صدف تھی کہ ہر قطرے کو گوہر بنا لیتی تھی مگر اب ہر قطرے کو آنسو بنا کر بہاتے جا رہی تھی۔

رات گذر گئی۔ ایک اور دن طلوع ہوا۔ طاہرہ نے دیکھا کہ صرف اس کا کمرہ ہی ویران نہیں تھا بلکہ گھر بھر کی فضا ویران ہو گئی تھی۔ باپ کے چہرے پر بھی ایک انوکھا سا تاثر تھا جو طاہرہ نے ان چند دنوں میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ماں کی تو جیسے شکل و صورت ہی بدل گئی تھی اور نعیم جہاں اداس اداس سا دکھائی دیتا تھا وہاں اس کی بعض حرکات سرکس کے مسخروں سے ملتی جلتی تھیں۔ طاہرہ نے حسبِ معمول ناشتہ کیا لیکن اس نے صرف پیٹ بھرنے کی کی۔ ناشتے میں وہ لذت ہی نہیں تھی جو کل صبح تک تھی۔

وہ سکول گئی۔ اس کے کندھے ذرا آگے کو جھکے ہوئے تھے جیسے دماغ اور اعصاب پر منوں بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ استانیوں کو وہ بے خیالی میں ہی السلام علیکم اور وعلیکم السلام کہتی رہی۔ اس کا دماغ گھر کے کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔ جانے وہ کتنی دیر اس خود فراموشی کے عالم میں گم رہتی کہ — "زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری" — کی سینکڑوں آوازیں ایک مترنم صدا بن کر اس کی یاس آلود ذات سے ٹکرائیں۔ اسے یوں لگا جیسے اندھیرے میں روشنی کی کئی کرنیں ایک نورانی اجالا بن کر اس کے گرد چمک اُٹھی ہوں اور اسے گرد و پیش کا ذرہ ذرہ نظر آ گیا ہو۔

طاہرہ نے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا۔ سینکڑوں بچے اور بچیاں قطاروں میں کھڑی دعا گا رہی تھیں، سورج کی زرد پیلی کرنیں ان پر نور برسا رہی تھیں۔ طاہرہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن کا بوجھ دھوپ کی پُرلطف تمازت سے بھاپ بن کر اڑ گیا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم جھلکنے لگا اور وہ دعا کے ترنم میں جذب ہو گئی۔ بلاوجہ رکی ہوئی مشین کی طرح اس کا اٹکا ہوا دماغ حرکت میں آ گیا اور اس کے رگ و ریشے میں زندگی کی رُو اور رمق یوں عود کر آئی جیسے جلا ہوا فیوز تبدیل کر دیا گیا ہو۔ طاہرہ اپنی دنیا میں آ گئی لیکن اب اس کے سلجھے ہوئے خیالوں میں ایک "لیکن" بیدار ہو گیا جیسے بخار کے بعد کی درد آلود تھکن اور نقاہت ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ کلاس میں تھی۔ حاضری کے بعد بچوں نے حسبِ معمول "آپا! پہلے ایک چھوٹی سی کہانی" کا تقاضا کیا۔ طاہرہ سکول کے گھسے پٹے سلیبس کی قائل نہیں تھی۔ وہ بچوں کو ایک کہانی سنا کر انہیں موڈ میں لا کر پڑھانا شروع کیا کرتی تھی۔ اس طرح بچے تمام وقت نہایت توجہ سے پڑھتے تھے۔ طاہرہ نے ذہن پر زور دیا۔ اسے ہر روز ایک کہانی گھڑنی پڑتی تھی اور بعض اوقات وہ کسی سنائی ہوئی کہانی کے کردار تبدیل کر کے بچوں کا مطالبہ پورا کر دیا کرتی تھی لیکن آج اسے کوئی کہانی نہیں مل رہی تھی۔ دماغ تھکا ہوا تھا۔ جب اس نے دماغ پر زور دیا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خشک لیموں کو نچوڑ رہی ہو۔ دماغ جیسے کیچڑ میں ہی دھنسا ہوا تھا۔

"اچھی سی کہانی، آپا! بڑی اچھی سی!" — چند ننھی ننھی آوازیں بلند ہوئیں۔

"آج میں تمہیں دو بچوں کی کہانی سناتی ہوں جو بغیر کسی وجہ کے لڑتے رہتے تھے" — طاہرہ رک رک کر کہانی کا تانا بانا بُن رہی تھی "دو بچوں کی لڑائی بلا وجہ" وہ کہانی سناتے ہوئے سوچتی بھی جا رہی تھی کہ بچوں کی لڑائی میں اگر کوئی بیکار سی وجہ پیدا کر لی جائے تو کہانی دلچسپ ہو سکتی ہے لیکن وجہ کیا ہو؟ وہ بولتی جا رہی تھی اور سوچتی بھی جا رہی تھی۔ اس کے ذہن کے پیچھے کوئی چھپا ہوا پردے اٹھاتا اور گراتا جا رہا تھا۔ طاہرہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جو کہانی وہ سنا رہی ہے اس نے کہیں عملی طور پر دیکھی ہو لیکن اس کی وجہ کیا تھی؟ بچوں کی لڑائی شروع کیوں ہوئی تھی؟ شاید وہ کسی چیز پر لڑ رہے تھے۔

طاہرہ کہانی سناتی جا رہی تھی لیکن اس کی روانی متزلزل ہوتی جا رہی تھی۔ کہانی بے ربط ہوتی جا رہی تھی اور طاہرہ لے بجا… اس کے ذہن میں اچانک بجلی سی چمکی اور طاہرہ کو جیسے بہت کچھ نظر آ گیا ہو۔

"دراصل ان کے لڑنے کی وجہ ایک کھلونا تھا" — طاہرہ نے یوں کہا جیسے تانے کا ٹوٹا ہوا ایک تار جڑ گیا ہے — "کھلونا ایک تھا اور بچے دو!"

"کھلونا کیا تھا آپا؟" — ایک بچی نے پوچھا۔

"کھلونا تھا!…. ارے ہاں! چابی والی موٹر تھی"…. طاہرہ کی دماغی قوتیں پوری طرح بیدار ہو کر ساتھ دینے لگیں — "ایک بچہ کہتا تھا کہ موٹر میری ہے اور دوسرا کہتا تھا کہ میری ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی لڑنے والی بات تھی؟ سیدھا سادہ حل یہ تھا کہ پہلے ایک بچہ چابی دے کر موٹر چلا لیتا پھر دوسری طرف سے دوسرا چلا لیتا۔ دونوں آمنے سامنے دور دور بیٹھ کر موٹر ایک دوسرے کی طرف چلا سکتے تھے، دونوں کا دل بھی بہلا رہتا اور لڑائی بھی نہ ہوتی لیکن وہ بیوقوف بچے تھے۔ وہ موٹر چلانے کی بجائے ایک دوسرے سے چھیننے اور ہاتھا پائی میں لگے رہتے تھے۔ آخر ہوا یہ کہ ایک دن دونوں نے کھلونے پر چھینا جھپٹی کی جس سے کھلونا ٹوٹ گیا…."

طاہرہ نے جوں ہی کہا — "کھلونا ٹوٹ گیا" اس کا دل خوف کی گرفت میں آ گیا۔ اس کا دماغ لاشعوری طور پر ایک جھگڑے کا تجزیہ کر رہا تھا جسے طاہرہ "بچوں کی لڑائی" کے عنوان سے بچوں کو سنا رہی تھی۔ کہانی شروع کرنے سے پہلے اسے اس جھگڑے کی بنیاد کا علم نہ تھا اور سنانے کے دوران اس پر اپنی ہی کسی دماغی قوت نے وجہ آشکار کر دی — "دو بچے ایک کھلونے پر لڑتے تھے….. اور کھلونا ٹوٹ گیا"

طاہرہ نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کا دل ڈوب سا گیا اور وہ بے چین ہونے لگی۔ اسے محسوس ہی نہ ہوا کہ وہ چپ ہو گئی اور بچے خاموشی سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں تڑپ اٹھی — "نہیں! یوں نہیں ہوگا۔ کھلونا ٹوٹے گا نہیں…. میں کھلونے سے ہاتھ اٹھا لوں گی۔ اسے سلامت رہنا ہے"

"سنائیے، آپا جان! پھر کیا ہوا؟" — دو تین ملی جلی آوازیں طاہرہ کے کانوں میں جو پڑیں تو وہ چونکی اور کہا — "تو پھر یہ ہوا کہ اچھا بھلا کھلونا ہاتھ سے گیا اور دونوں بچے سر کو پکڑ کر ٹوٹے ہوئے کھلونے پر رونے بیٹھ گئے"

طاہرہ نے کہانی کو یہیں ختم کر دیا۔ سبق پڑھانے کو کتاب جو کھولی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ آج پڑھا نہ سکے گی۔ کتاب کے الفاظ

…ہے تھے۔ بول رہے تھے — "اور کھلونا ٹوٹ گیا…. دو بچے ایک کھلونے پر لڑ رہے تھے" — دو فقرے ایک آواز بن …کے سر سے ذرا اوپر ایک چکر کی صورت تیزی سے گھوم رہے تھے۔ اس نے ایک بچی کو کتاب دے کر کہا — "یہاں سے …تک بورڈ پر لکھو" — اور وہ خود کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"نعیم کی ماں کھلونے پر لڑ رہی ہے۔ اس کے سوا اور وجہ ہو بھی کیا سکتی ہے؟" — طاہرہ کو اطہر کے وہ الفاظ یاد آتے …نعیم ماں باپ کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا ہے۔ ماں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی"

نعیم نے بھی اسے بتایا تھا کہ ماں کس طرح اسے اپنے ساتھ چپکاتے رہنے کی خواہش مند ہے۔ نعیم کے یہ الفاظ طاہرہ …تے — "امی کے متعلق میں تمہیں ایک بات بتا دوں، وہ ذرا سی شکی مزاج ہیں خصوصاً میرے معاملے میں زیادہ شکی ہیں۔ بعض اوقات …ایسی باتیں کر بیٹھتی ہیں جیسے مجھے کوئی اغوا کر کے لیے جا رہا ہے"

طاہرہ کے زرخیز دماغ نے تہ تک پہنچنے میں کوئی فرق نہ چھوڑا۔ کلاس کے بچے شور کرنے لگے تھے لیکن طاہرہ تو جیسے اتنی دور پہنچی …ہوئی تھی جہاں یہ شور اس تک پہنچ ہی نہیں رہا تھا۔ شور بلند ہوتا گیا اور اس کے ساتھ طاہرہ کے ذہن میں کئی ملی جلی آوازیں بلند تر ہوتی گئیں۔ …فقرے گتھم گتھا ہونے لگے۔ پھر یہ فقرے رنگ روپ بدلنے لگے اور کرتے کرتے انہوں نے بچوں کی صورت اختیار کر لی جو ایک …کھلونے پر لڑ رہے تھے — "پھر کھلونا ٹوٹ گیا…. نہیں! یوں نہیں ہوگا!"

کلاس میں بچوں کا شور یکبارگی ختم ہو گیا اور طاہرہ کو جیسے کسی نے بھیانک خواب سے جگا دیا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ کلاس کے …تمام بچے خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ طاہرہ نے فوراً محسوس کر لیا کہ بچے شور کر رہے تھے اور اس کے منہ سے …بے خیالی میں کوئی لفظ اونچا نکل گیا تھا۔ اس نے خفت مٹانے کی خاطر کہا — "اب کوئی اور آگے سے چار فقرے بورڈ پر لکھے" …طاہرہ نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو اس کا ہاتھ پسینے سے بھیگ گیا۔ بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ وہ طاہرہ کی کیفیت اور چہرے کا تاثر سمجھ …نہ پاتے۔

وہ خراماں خراماں کرسی پر آ بیٹھی اور نعیم کے خیال میں کھو گئی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا — "میں ہار مان جاؤں گی کھلونے …کو ٹوٹنے نہیں دوں گی۔ میں امی کا دل بھی ٹوٹنے نہ دوں گی"

اور اچانک ایک مسرت اور اطمینان کی ایک لہر اس کے گرد منڈلا کر اس کے جسم و جان میں سما گئی۔ طاہرہ کو اس انکشاف …سے بھی سکون ہوا کہ نعیم کی ماں کی خفگی کی در پردہ وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے نعیم پر قبضہ کر کے اسے ماں سے الگ کر دیا ہے۔ طاہرہ کو شدت سے محسوس ہوا کہ نعیم کا ہر وقت اس کے کمرے میں گھسے رہنا مناسب نہیں۔ طاہرہ کو یہ بھی یاد آیا کہ دو تین بار امی …نے نعیم کو بلایا تو نعیم نے امی کو ڈانٹ دیا تھا۔

"یہ میری زیادتی تھی۔ امی کو تو غصہ آنا ہی چاہیئے تھا — طاہرہ نے یہ سب کچھ سوچا اور سکون و اطمینان کا گہرا سانس لے …کر اٹھ بیٹھی۔ اس میں روزمرہ والی زندگی عود کر آئی جیسے نیند کا خمار اور بخار کے بعد کی نقاہت کو جھٹک کر معمول کی حالت میں …آ گئی ہو۔

ہے کیا مجال کہ ذرا سی بھی عقل کی بات سن لے۔ چھوٹے بڑے کا ادب لحاظ تو اس میں ہے ہی نہیں۔ امی کہتی ہیں کہ انہوں نے طاہرہ کو صرف یہ کہا تھا کہ ہر کام نوکرانی سے نہیں کرانا چاہیئے تو اسی بات پر ان کے گلے پڑ گئی۔ کہنے لگی، میں نوکرانی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ پھر وہ وہ باتیں کہیں، امی کہتی ہیں، کہ میں خاموشی سے اندر چلی گئی۔ معلوم نہیں، ابا جان!" ——— نعیم نے بے چین ہو کر کہا۔ "کہ دونوں میں کون سچی ہے۔ میں یقین نہیں کر سکتا طاہرہ اس قدر بدتمیز ہو سکتی ہے۔ اس نے جو کچھ مجھے سنایا ہے، وہ امی جان کے بیان کے بالکل الٹ ہے۔ طاہرہ نے مجھے کہا تھا میں امی جان سے پوچھوں وہ اس کی کس غلطی پر خفا ہیں تاکہ ان سے معافی مانگ لی جائے لیکن امی کا غصہ دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے وہ بُری طرح مجروح ہیں۔"

نعیم کا باپ خاموشی سے سُن رہا تھا اور اس کے دماغ میں ایک تصویر سی بنتی جا رہی تھی ——— متحرک تصویر ——— یہ تصویر اس

طاہرہ نے تو دن رات کی اذیت ناک بیقراری میں سے مسئلے کا حل اس طرح نکال لیا تھا جس طرح کوڑے کرکٹ میں سے موتی تلاش کر لیا جاتے لیکن نعیم دفتر میں بھی جسم کے رعشہ کو ساکن کرنے میں محو رہا۔ وہ زیادہ دیر خلا میں ہی گھورتا رہا۔ اس خلا میں اسے دو نقطے نظر آ رہے تھے اور اس کی آنکھیں گھڑی کے پنڈولیم کی طرح دونوں نقطوں کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں نقطے دو اٹل حقیقتوں کی طرح اس کے سامنے اَن مٹ نقوش بن کر رہ گئے تھے۔ اسے کوئی حل سُوجھ رہا تھا نہ ہی وہ کوئی حل سوچ رہا تھا۔ وہ راہ فرار ڈھونڈ رہا تھا۔

چپڑاسی نے اسے دو دفعہ کہا ——— "صاحب! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے" ——— لیکن اس نے تو جیسے سنا ہی نہ تھا۔ چکی کے دو پتھر تیزی سے چل رہے تھے اور نعیم میں اتنی سکت نہیں تھی کہ سر باہر نکال سکے۔ سوچتے سوچتے اس کا سر پھٹنے لگا۔ اس کی سوچ میں پریشان خیالی اور فرار تھا۔ تھک ہار کر اس نے طوفان کو وقت کے حوالے کر دیا کہ خود ہی تھم جائے گا یا "ابا جان سنبھال لیں گے۔" پیشتر اس کے کہ وہ دماغ کو اس ہنگامے سے خالی کرتا وہ پھر ماں اور طاہرہ کی باتوں میں اُلجھ گیا۔

آخر اسے غصہ آنے لگا کس پر؟ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ غصہ تیز ہونے لگا، پھر وہ کُڑھنے لگا۔ جس کا اثر براہ راست دل پر ہُوا جو پہلے ہی کمزور تھا۔ جب غصہ تیز تر ہُوا تو نعیم کو یوں محسوس ہُوا جیسے اس کا دل تیزی سے دھڑکتے دھڑکتے یک لخت رک گیا ہو اور وہ گہری کھائی میں گر پڑا ہو۔ اسے متلی بھی محسوس ہُوئی اور دل کی حرکت بلاشک و شبہ بے قاعدہ ہو گئی تھی۔ سر میں درد کی ٹیس اٹھی حتیٰ کہ سر میں ہتھوڑے پڑنے لگے۔

جب نعیم گھر میں داخل ہُوا۔ طاہرہ گھر آ گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ساس کو کچھ نہیں کہے گی بلکہ ایسا رویہ اختیار کرے گی جس سے ساس کو شکایت کا موقعہ ہی نہیں ملے گا۔ وہ یوں کہ وہ نعیم کو کم از کم دن کے وقت اپنے پاس نہیں بیٹھنے دیا کرے گی اور اسے زیادہ سے زیادہ دیر ماں کے پاس رہنے پر مجبور کرتی رہے گی۔ حالات سے اس طرح کے سمجھوتے کے تحت اس نے سکول سے آ کر ساس کو غیر معمولی خندہ پیشانی سے السلام علیکم کہی تھی جس کا جواب اسے خشک سے ادھورے "وعلیکم" سے ملا تھا۔ وہ بھی زیر لب۔

جب نعیم گھر میں داخل ہُوا تو اس کا چہرہ اُترا ہُوا تھا۔ طاہرہ کی روزمرہ کی مسکراہٹ نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اپنے اعصاب کا بوجھ جھٹک آئی تھی اور اب اس کی مسکراہٹ ہر دکھ سے آزاد تھی۔ ماں بھی صحن میں نکلی اور نعیم کا استقبال مسکرا کر

کیا۔ ماں اور طاہرہ نے بھانپ لیا کہ نعیم کی طبیعت ٹھکانے نہیں۔ دونوں کی مسکراہٹیں غائب ہو گئیں۔ نعیم نے دونوں کو دیکھا تو اس کا چہرہ اور اتر گیا اور اس میں جو ذرا سی ہمت اور حوصلہ تھا وہ بھی نہ رہا۔ اس کی حالت کچھ اس طرح کی ہو گئی جیسے ڈرے یا ڈرے ہوئے بچے کی حالت ماں کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

"کیوں نعیم بیٹا!" ——— ماں نے گھبرا کر پوچھا ——— "کیا بات ہے؟"

"سر پھٹ رہا ہے" ——— نعیم نے سر پکڑ کر کہا اور صحن میں بچھی ہُوئی چارپائی پر ہی لیٹ گیا۔

ماں اور طاہرہ کی حالت غیر ہونے لگی۔ سر تو دکھا ہی کرتے ہیں لیکن نعیم ہلکی سی تکلیف کا کبھی عادی نہ تھا۔ اس کا سر تو جیسے واقعی پھٹ رہا تھا۔ ماں اور طاہرہ نعیم پر ٹوٹ پڑنے کے انداز میں جان نثار کرنے لگیں ——— دو بچے ایک کھلونے پر ٹوٹ پڑے ——— ایک ہاتھ ماں نے سر پر رکھا تو دوسرا طاہرہ نے رکھ دیا۔ طاہرہ بھاگ کر سرہانہ لے آئی تو ماں نے کہا ——— "بیٹا! کمرے میں چل کے لیٹو۔ میں سر دبا دیتی ہُوں" ——— ماں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور طاہرہ سے کہا ——— "جاؤ چائے کے لیے پانی رکھ دو۔"

طاہرہ وہاں سے چلی ہی تھی کہ نعیم اُٹھ بیٹھا اور کہا ——— "طاہرہ! تم رہنے دو۔ آؤ ذرا میرا سر دبا دو کمبخت پھٹ رہا ہے" اور وہ طاہرہ کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جاتے جاتے ماں سے کہا ——— "امی! چائے جلدی بھجوا دینا اور اسپرو کی ایک گولی بھی۔ الماری میں رکھی ہو گی۔"

طاہرہ کو یہ صورت حال پسند نہ آئی۔ اس نے امی سے کہا ——— "امی جان! بیٹھیے! چائے میں پکاتی ہوں، آپ ان کا سر دبا دیں۔"

امی کو آگ لگ چکی تھی۔ وہ غصے میں بڑبڑاتی باورچی خانے میں چلی گئی۔ طاہرہ ماں کا مزاج بھانپ گئی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں گئی تو ماں نے غصے سے کہا ——— "بیگم صاحبہ! جائیے۔ صاحب بلا رہے ہیں۔ ہم تو نوکر ہیں اس گھر میں۔"

طاہرہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ نعیم کی آواز آئی ——— "کہاں چلی گئی ہو، طاہرہ!" اور طاہرہ نعیم کے پاس چلی گئی۔

اُس روز کے بعد ماں کا مزاج درست نہ ہو سکا۔ بگڑتا ہی گیا۔

دس دن اور گزر گئے۔

طاہرہ نے ہر روز کوشش کی کہ نعیم کو کم از کم دن کے وقت اپنے کمرے سے باہر رکھے۔ وہ دو تین بار کسی سہیلی کے ہاں بھی چلی گئی۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر کے نعیم اور ماں کو زیادہ دیر اکٹھا رکھنے کے مواقع پیدا کیے لیکن طاہرہ کے بغیر نعیم کی حالت غول سے بچھڑے ہُوئے پرندے کی سی ہو جاتی تھی۔ ایسے میں اسے ماں کے ساتھ جو ذرہ بھر بات کرنی ہوتی وہ بھی نہ کرتا۔

طاہرہ نے ایک رات تین گھنٹے صرف کر کے نعیم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ماں کا مطالبہ کیا ہے لیکن نعیم کے دماغ میں یہ بات نہ پڑی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے دل کی کمزوری، اخلاقی جرأت کا فقدان، کسی پیچیدگی کو آزادانہ طور پر سمجھ نہ سکنا اور برہم ہو جانا، سر دُکھنا اور سر دبوانے کی ضرورت محسوس کرنا صرف ایک حقیقت کی آئینہ دار ہیں ——— ماں کا لاڈ پیار۔

ماں کا سہارا اور ماں کی گود کی پرسکون حرارت ——— نعیم اپنی ذات میں جو گھنا آونا سایہ لیے پھرتا تھا، اسے بظاہر اس کا علم نہیں تھا۔ وہ اپنی نفسیاتی کمزوریوں سے آگاہ نہ تھا۔ طاہرہ نے اسے ہر پہلو سے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ بھی کہا کہ ماں کا دل توڑنا گناہ ہے اور ماں کے حقوق کو یوں فراموش نہیں کرنا چاہتے۔ نعیم بظاہر سب کچھ مان رہا تھا لیکن اس کی عقل ان باتوں کو قبول نہیں کر رہی تھی۔ اس کی اس لغزش کی سزا طاہرہ بھگت رہی تھی۔

دنوں پر دن اور راتوں پر راتیں گزرتی جا رہی تھیں۔ نعیم کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی نہ اس نے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ طاہرہ کی کوششیں تیز تر ہوتی گئیں اور ماں کا رویہ ناگوار سے ناگوار تر ہوتا چلا گیا۔ حد یہ کہ ماں نے نعیم کے باپ کو طاہرہ کے خلاف بھڑکانے اور نت نئے قصے گھڑنے شروع کر دیئے۔ طاہرہ کے ساتھ اس نے بول چال ہی بند کر دی۔

باپ نے نعیم کو ایک دو بار خبردار کیا کہ گھر میں کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے لیکن نعیم گھبرا جانے، غصے میں آ جانے اور روٹھ کے بیٹھ جانے کے سوا کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اگر طبیعت میں طیش بھی آتی تو ماں کو ڈانٹنے بیٹھ گیا لیکن ماں نے لاڈ پیار سے غصہ ٹھنڈا کر دیا اور طاہرہ کے خلاف گرما دیا۔ جب طاہرہ نے باتیں کیں تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ایک بار طاہرہ نے ہمت کر کے ماں کے اس مسئلے پر گفتگو کرنے کی کوشش کی تو اس نے پہلے روز کی طرح پہیلیوں کی زبان میں باتیں کر کے طاہرہ کو اور الجھن میں ڈال دیا۔

نعیم کی خالہ بھی میدان میں اتر آئی۔ اس کے دل میں اپنا ایک بغض تھا جس کا نزلہ طاہرہ پر ہی گرا۔ خالہ کے خاوند کی بہن کی لڑکی جوان تھی۔ خالہ نے لڑکی کے والدین کی خواہش کے مطابق لڑکی نعیم کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس نے دو تین بار نعیم کی ماں کو اُکسایا تھا کہ لڑکی والوں کے ہاں جا کے بات کرے۔ اس نے لڑکی کی تعریفوں کے پُل بھی باندھے تھے لیکن نعیم کی ماں متزلزل سی ہاں کہہ کر بات ٹال دی تھی۔

خالہ کو اس رشتے کی دلالی میں بڑا فائدہ ہو رہا تھا۔ لڑکی کی ماں خالہ کو خوب کھلاتی پلاتی تھی اور دو تین موقعوں پر اس کی حاجتیں پوری کر چکی تھی۔ سب سے بڑی حاجت یہ تھی کہ خالہ کے خاوند کو کم و بیش دو ہزار روپے کی ضرورت تھی جسے وہ کاروبار میں لگانا چاہتا تھا۔ اس پناہ گزینی کی حالت میں کون تھا جو اسے اس قدر روپیہ دیتا۔ لڑکی کی ماں نے ڈیڑھ ہزار روپے کا بندوبست کر دیا تھا جس کی ادائیگی کی خالہ اور اس کے خاوند میں نہ ہمت تھی نہ مرضی۔ لڑکی کے والدین نعیم کا رشتہ چاہتے تھے جو خالہ کی مدد اور دلالی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ خالہ نے انہیں بتایا تھا کہ نعیم کا رشتہ حاصل کرنا مہم سر کرنے سے کم نہیں۔ وہ لوگ مانتے ہی نہیں۔ جب خالہ نے دیکھا کہ لڑکی کے ماں باپ تو نعیم پر فریفتہ ہو رہے ہیں تو اس نے بلیک میلنگ شروع کر دی۔ کبھی انہیں کہتی کہ وہ مان نہیں رہے ہیں اور کبھی کہتی کہ وہ نعیم کے لیے کسی اور جگہ سے رشتہ کر رہے ہیں۔ یہ جواب سن کر لڑکی کی ماں تو تڑپ اٹھتی۔ خالہ اسے تسلی دے کر کہتی ہے "دیکھو بہن! حیلہ کرتی ہوں۔ کام بہت مشکل ہے" ——— اس کے ساتھ ہی خالہ نے لڑکی کی ماں کو کہہ رکھا تھا ——— "تم خود بات کرنا ورنہ وہ نہ کر دیں گے۔ ایک بار ان کے منہ سے نہ نکل گئی تو وہ پھر وہ اپنی بات سے ہٹنے والے نہیں۔"

چنانچہ انہوں نے نعیم کے ماں باپ سے کبھی اشارۃً بھی بات نہ کی تھی۔ خالہ کی شعبدہ بازی کامیاب تھی۔ دو ایک

تھا ——— "بہن! کاروبار بڑا مندا ہے۔ تمہاری رقم کا غم کھاتے جا رہا ہے۔ دن رات سوچتی رہتی ہوں اتنی رقم کیسے دوں گی۔"

لڑکی کی ماں نے دل کھول کر کہہ دیا تھا ——— "اری گلشن! یہ تو نے کیا بات کہہ دی! ہم کبھی رقم کی بات زبان پر بھی لاتے ہیں؟ اب جو پھر نام لیا تو، تمہاری اپنی دولت ہے جب تک ضرورت ہے استعمال کرو" ——— اور یہ بات دل ہی دل میں کہہ گئی جسے خالہ کے دل نے سن لیا تھا ——— "تم یہ رشتہ کرا دو۔ ڈیڑھ ہزار کا حساب بعد میں ہوتا رہے گا۔"

نعیم چپکے سے راولپنڈی سے دلہن لے آیا تو لڑکی کے ماں باپ کو تو جو کچھ ہونا تھا سو ہوا، خالہ پر بجلی گر گئی۔ ایک تو وہ خاطر مدارتیں بند ہو گئیں جو لڑکی والے کرتے تھے۔ اس کی ہر حاجت جو وہاں سے پوری ہوتی تھی وہ گئی۔ بعض اوقات وہ نمک، مرچ اور پیاز بھی وہاں سے لے آتی تھی اور سب سے بڑی چوٹ یہ کہ اب ڈیڑھ ہزار روپے کی واپسی کی فکر لاحق ہو گئی۔

اُسے ہر وقت خدشہ رہنے لگا کہ تقاضا شروع ہوا کہ ہوا۔ خالہ کی تو زبان گنگ ہو گئی۔ دن رات کا سکھ چین ختم ہو گیا جس دن طاہرہ راولپنڈی سے پشاور پہنچی تھی خالہ نے اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا تھا مگر دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا کہ طاہرہ کے مقابلے میں اس کی نند کی لڑکی کچھ بھی نہیں۔

خالہ سخت حیران و پریشان تھی اور اس سوچ میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی کہ لڑکی والوں کو نعیم کا نعم البدل کہاں سے دے۔ مہاجر سارے پاکستان میں بکھر گئے تھے۔ خالہ نند کے منہ میں دوسری ہڈی دینا چاہتی تھی لیکن بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ ایک دن وہ نعیم کے گھر بیٹھی تھی۔ نعیم دفتر اور طاہرہ سکول گئی ہوئی تھی۔ خالہ نے نعیم کی ماں سے پوچھ لیا ——— "سناؤ، بہن! دولہا دولہن کی کیسی گزر رہی ہے؟"

"گزر کیسے رہی ہے؟" ——— ماں نے دکھے ہوئے لہجے میں کہا ——— "جانے کہاں سے اس آوارہ لڑکی کو پکڑ لایا ہے۔ کالے لیمپ سے، جانے کہاں سے آتی بے حیا اور منہ پھٹ لڑکی ہے نہ چھوٹے کا لحاظ نہ بڑے کا ادب....." اور ماں نے دل کی بھڑاس نکالی۔ جانے اسے احساس تھا یا نہیں کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن اسے ایک گونہ قرار آتا جا رہا تھا جیسے دل میں لگی ہوئی آگ بجھتی جا رہی تھی۔ اسے یوں لذت آ رہی تھی جیسے نعیم اس کی گود میں آ گرا ہو اور وہ پاگلوں کی طرح اس کے بوسے لے رہی ہو۔ ایسے میں اسے طاہرہ چڑیل کی صورت دکھائی دے رہی تھی جو بچے پر جھپٹنے کو تڑپ رہی تھی۔

خالہ کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اسے خیال آیا اگر ساس بہو میں چند دنوں میں ہی یہ دشمنی پیدا ہو گئی ہے تو معاملہ بہت جلدی انجام تک پہنچ سکتا ہے یا پہنچایا جا سکتا ہے۔ نعیم کی ماں نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا ——— "میرا نعیم تو خود پچھتا رہا ہے لیکن لڑکی ایسی ہے کہ اسے ڈھیلا چھوڑتی ہی نہیں۔ ہر وقت اسے کمرے میں لیے بیٹھی رہتی ہے۔"

"سچی بتاؤں بہن!" ——— خالہ نے کہا ——— "میں نے تو پہلے روز ہی لڑکی کا ناک نقشہ دیکھ کر جان لیا تھا کہ لڑکی ایسی ویسی ہے ... تو اسی روز شک ہو گیا تھا کہ لڑکی نقص دار ہے۔ دراصل ہمارا نعیم بھولا بادشاہ ہے۔ راولپنڈی جا کر بدھو بن گیا..... وہ تمہیں گاؤں والے چوہدری کا لڑکا؟ وہ بھی ایسے ہی لاہور سے بیاہ لایا ہے۔ ایک کو! اری بہن! اللہ توبہ! اللہ توبہ!" ——— خالہ نے گالوں پر ہاتھ رکھ کر کہا ——— "ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت دیکھو اس لڑکی کی تو خدا یاد آ جاتا ہے۔ اتنی بدچلن، اتنی بدمعاش

کہ بات کرتے شرم آتی ہے ..... بہن! یہ بغیر ماں باپ کے لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"ہے تو اب اپنی بہو" ــــ ماں نے ناک پونچھ کر کہا ــــ "کہیں تو کیسے کہیں سکول کے بہانے جانے کہاں کہاں جھک مارتی رہتی ہے۔"

خالہ پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ایسی خاموشی جس کے دامن میں طوفان سوتے ہوئے تھے۔ خالہ کو اس خاموشی میں اپنے بگڑے نصیب بنتے دکھائی دینے لگے۔ شیطان نے آن کی آن میں اس کے دماغ میں ایک پرانا ارادہ نئے روپ میں ڈال دیا۔ اس کی فطرت انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ نعیم کے گھر سے اٹھ کر وہ اپنی نند کے ہاں گئی اور اسے نعیم کی ماں کی تمام باتیں اپنے رنگ میں سنائیں اور کہا ــــ "آپا! زیادہ سے زیادہ تین مہینوں میں طلاق ہو جائے گی۔ نعیم بے چارہ بری طرح پچھتا رہا ہے کہ کیا کر بیٹھا ہے۔"

آس امید کے بجھے ہوئے دیئے ایک بار پھر جل اٹھے۔

اس روز کے بعد خالہ نے دوسرے تیسرے روز نعیم کی ماں کے پاس جانا شروع کر دیا۔ ہر بار وہ طاہرہ کو کوئی موضوع بنا کر نعیم کی ماں کو، جو پہلے ہی بھڑکی بیٹھی ہوتی تھی اور بھڑکاتی۔ ماں نے کسر تو پہلے ہی کوئی نہ چھوڑی تھی پھر بھی بعض باتیں کہی نہ جاتی تھیں۔ اب اسے تائید جو ملنی شروع ہوئی تو اس کے حوصلے میں نئی جان اور نئی تازگی آ گئی اور اس نے نعیم کے باپ کے ساتھ طاہرہ کے خلاف ہر قسم کی ناجائز باتیں کرنی شروع کر دیں۔

بڈھے نے آغاز میں تو قدم جمائے رکھے لیکن دن رات کی ایک ہی جھک جھک اور ایک ہی ٹرتال نے اسے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ ماں کے ساتھ اب خالہ بھی شامل ہو گئی۔ دونوں مل کر نعیم کے باپ کو شیشے میں اتارنے لگیں۔

ایک دن خالہ نے اسے کہہ دیا ــــ "بھائیا جی! میں تو تیسری جگہ ہوں۔ بولنے کا کوئی حق نہیں لیکن نعیم میرا بھانجا ہے اور اس کی ماں میری سگی بہن ہے۔ اس کی عزت میری عزت اور اس کی بے عزتی میری بے عزتی ہے۔ ہم بات کریں تو کہتے ہیں عورتیں کم عقل ہوتی ہیں۔ ایسے ہی سہی لیکن مردوں کو بھی تو آنکھیں کھولنی چاہئیں۔ میں نے اپنی بہن کی خاطر زبان کھولی ہے۔ وہ رو رو کر ہلکان ہوتی رہتی ہے اور آپ کے ساتھ پوری بات نہیں کرتی۔ اس کا دکھڑا آپ نہیں سنیں گے تو کون سنے گا؟"

"تو میں کیا کروں؟ مجھے جو کچھ کہو ویسے کرتا ہوں" ــــ باپ نے شکست خوردگی کے لہجے میں کہا ــــ "نعیم کو کہہ چکا ہوں کہ طاہرہ کو زیادہ آزاد نہ ہونے دو۔"

"یہ تو آپ کے گھر کا معاملہ ہے بھائیا جی!" ــــ خالہ نے بظاہر لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ــــ "آپ مناسب سمجھیں کریں۔ میں اتنا کہے دیتی ہوں کہ لڑکی نقص دار ہے اور نعیم کو اس نے بدھو بنا رکھا ہے۔ پہلے وہ محلے بھر کے مردوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ نیک و بد کا خیال رکھتا تھا اور اب ....."

"اور اب کیا مجال ہمیں نعیم کی تنخواہ کا ایک پیسہ بھی کبھی گھر میں نظر آیا ہو" ــــ ماں بیچ میں بولی ــــ "یہی حال اس کی بہو کی تنخواہ کا ہے۔ جانے کہاں خرچ کرتی ہے اور کس کو دے آتی ہے۔"

"یہی بات ہے، بھائیا جی!" ــــ خالہ نے کہا ــــ "آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں اور وہ بھی سکول میں پڑھانے والی

"..... اور یہ سکول تو، بھائیا جی، آپ کے بھائی صاحب بتا رہے تھے، اتنا بدنام ہے کہ وہاں کوئی شریف لڑکی جاتی نہیں۔ کاروں والے اور پیسے والے عیاش لوگ وہاں مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہتے ہیں۔"

بڈھا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ دونوں عورتیں اسے خاموش بیٹھا دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں کہ تیر نشانے پہ لگ رہے ہیں اور وہ وثوق اور خود اعتمادی سے ایک سے ایک نرالی کہے جا رہی تھیں۔

"مجھے تو کہتے بھی شرم آتی ہے، بہن!" ــــ ماں نے باپ کو سناتے ہوئے خالہ سے کہا ــــ "آج تیسرا روز ہے دوپہر تین ساڑھے تین بجے یہ چھوکری سکول سے لوٹتی ہے اور شام پانچ چھ بجے پھر چلی جاتی ہے اور رات دس بجے آتی ہے۔ اس بڈھے کو اس روز سے کہہ رہی ہوں کہ پیچھا کر کے دیکھو وہ جاتی کہاں ہے لیکن یہ ....."

"ارے بھئی!" ــــ بڈھے نے غم و غصے سے لرزتی آواز میں کہا ــــ "میں نے نعیم سے پوچھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یوم والدین کے لیے سکول کی لڑکیاں ڈرامہ تیار کر رہی ہیں، اور ہیڈ مسٹریس نے سارا کام طاہرہ کے سپرد کر رکھا ہے۔ نعیم کہتا تھا ڈرامہ طاہرہ نے لکھا ہے اور وہ ہر شام سکول جا کر لڑکیوں کو مشق کراتی ہے۔"

"اور آپ نے مان لیا" ــــ ماں نے طنزیہ لہجے میں کہا ــــ "جیسا باپ ویسا بیٹا!"

خالہ نے دونوں ہاتھ اس طرح سر کے گرد رکھ لیے جیسے سخت پریشان ہو کر نڈھال ہو گئی ہو۔ وہ اسی حالت میں اٹھی اور خاموشی سے چلی گئی۔

ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ــــ "تم جانو اور تمہارا کام جانے" ــــ اور وہ بھی کمرے سے نکلنے لگی۔ نکلتے نکلتے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز میں کہہ گئی ــــ "تمہیں تو اس دن ہوش آئے گی جس دن لوگ تمہارا منہ کالا کریں گے اور تمہاری طرف انگلیاں اٹھائیں گے" ــــ اور بڈھے کو اذیت ناک الجھن میں ڈال کر چلی گئی۔

طاہرہ نے ہیڈ مسٹریس کو کہا تھا کہ ڈرامہ کسی اور کے سپرد کر دیں۔ اس نے ڈرامہ لکھ دیا تھا اور ہیڈ مسٹریس بضد تھی کہ ریہرسل طاہرہ ہی کرائے۔ طاہرہ نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ یہ ڈرامہ اور کوئی استانی تیار نہ کر سکے گی کیونکہ پلاٹ اور مکالموں میں اس نے اپنی ذات اور اپنے جذبات کو پیش کیا تھا۔

اس نے ایک ایسی "بیٹی" کی داستان لکھی تھی جس نے ماں دیکھی تھی نہ باپ۔ وہ ٹھوکریں کھا کر پلی اور جوان ہوئی۔ جنگ پاکستان میں وطن پر اپنا سینہ قربان کیا۔ چندہ جمع کر کے ایک چھوٹا سا سکول کھولا۔ اس سکول کے جنون میں اسے شادی کا خیال ہی نہ آیا۔ جوانی کی امنگیں اور تپش اس سکول کے لیے وقف کر دیں۔ اس کے عشق و محبت کا مرکز سکول اور سکول میں پڑھتے بچے تھے۔ یہ بچے اس کے ہاتھوں میں داخل ہوتے اور وہ بھی بڑے ہوتے لیکن "بیٹی" ایک ہی ڈگر پر چلتی رہی ــــ سکول نئے سے نئے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا جنون ــــ پھر وہ بغیر ماں باپ کی بیٹی سینکڑوں بچوں کی روحانی ماں بن گئی۔ یہ تھا وہ مقام جہاں پہنچ کر اس نے دنیا و جہاں کی مسرتوں کو پا لیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ستر برس ہو چکی تھی لیکن اس کی روح جوان ہوتی جا رہی تھی۔

"مسز نعیم!" ــــ ہیڈ مسٹریس نے کہا تھا ــــ "اگر آپ چاہیں تو میں مسٹر نعیم کو خط لکھ کر آپ کو ہر شام سکول آنے کی اجازت

ہے دیتی ہوں۔ آپ خود سوچئے صوبہ سرحد کے وزیرِ اعظم کو ڈرامے پر مدعو کیا جا رہا ہے۔ موسیقی کے لیے ایک ماسٹر سے بات طے ہو چکی ہے۔ تمام انتظام مکمل ہو چکے ہیں اگر آپ نے ہدایت کاری نہ کی تو سارا کھیل چوپٹ ہو جائے گا۔"

طاہرہ کے پاس انکار کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ ہیڈ مسٹرس کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس کی ساس بلاوجہ ہی اس کا گھر میں جینا محال کیے رکھتی ہے اور اگر وہ شام کو بھی گھر سے غیر حاضر ہوئی تو نہ جانے وہ کیا کیا طوفان کھڑے کر دے۔

اس نے ہیڈ مسٹرس کی پیش کش قبول کر لی تھی اور نعیم سے کہا تھا — "امی جان کو اچھی طرح سمجھا دیں کہ میں ڈراما تیار کرنے ہر شام سکول جایا کروں گی۔ اگر میں نے ان سے پوچھا تو اجازت تو بعد کی بات ہے وہ میرے ساتھ بات تک نہیں کریں گی"

"میری ... امی کی اجازت کی کیا ضرورت ہے تم بلادھڑک جایا کرو اور"... نعیم نے جذباتی ہو کر طاہرہ کو کندھا سے پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا تھا — "اور خدا کے لیئے طاہرہ! جلدی لوٹ آیا کرنا۔ میں اتنی دیر کی جدائی برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

"آپ اتنا وقت امی کے ساتھ گزارا کریں" — طاہرہ نے اسے نصیحتہً کہا تھا۔ پھر ہر روز جاتے کہہ جاتی تھی — "میری غیر حاضری میں امی کے پاس رہنا۔ یہ موقعہ اچھا ہے۔ ان کا دل بہلا لینا۔"

لیکن نعیم کا یہ حال کہ طاہرہ شام ساڑھے پانچ بجے سکول جانے لگی اور نعیم اس کی واپسی تک کا وقت، کمرے میں گزار تھا یا یوں ہی ٹہلتا، بیٹھتا، اٹھتا اور پھر ٹہلنے لگ جاتا تھا کئی بار ماں نے طاہرہ کے متعلق بات شروع کی وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بات ہی نہ سنی۔ یہی حرکات تھیں نعیم کی جن سے ماں تنور کی طرح جل رہی تھی اور گھر کی فضا اور ماحول کو ایندھن بنا رہی تھی۔

طاہرہ کو معلوم تھا کہ گھر کی فضا میں کس قدر تکدر پھیل چکا ہے۔ ساس جو پہلے اشاروں کی منتظر رہتی تھی، اب اشاروں کی ... بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس کی زبان چلتی رہتی تھی۔ وہ ہر بات طعنے کے لہجے میں کرتی تھی نعیم کے باپ کا مزاج بھی مشکوک اور زشت ہونے لگا تھا نعیم کو ان حالات کا اچھی طرح علم تھا لیکن اس کا ... کچھ اور تھا۔ اس کی نگاہ طاہرہ سے ہٹتی ہی نہیں تھی۔

طاہرہ کی اچھی بھلی زندگی کو گھن لگتا جا رہا تھا۔ وہ بعض اوقات ... پر ایام کے مہروں کو دیکھا کرتی تھی جو پلٹتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسے بعض اوقات اپنے سامنے ... ریگستان دکھائی دیتا تھا لیکن اب وہ سراب کے فریب سے آزاد ہو گئی تھی۔ اس نے ایک نخلستان بنا لیا اور وہ اس میں محو ہو گئی۔ بچوں کو تعلیم دینا اس کا مطمع نظر تھا۔ اس نے اپنے دکھوں کو بھی اسی تگ و دو میں ایک قوت کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ ساس کا خیال تو نہ سمجھ سکی، اس کی سطح سمجھ گئی نعیم کے طفلانہ پن کو جو کبھی کبھی بھوکا پن بن جاتا تھا، سمجھ چکی تھی۔

اس نے ان لڑھکتے پتھروں کو نظرانداز کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن اس نے ساس کی قدر و قیمت اور نعیم کی محبت کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ رات کو تھک کر جب وہ نعیم کے پہلو میں بیٹھتی تھی تو اسے روحانی قرار نصیب ہوتا تھا ... نعیم کے جسم و جان میں تحلیل ہو کر رہ جاتی تھی۔

طاہرہ نے اپنے ماضی کو یادوں کے حوالے کر دیا تھا مگر اب یادوں کو گزرتی ہوئی زندگی کے صبح و شام میں دفن کر دیا۔ اب ... نعیم کا وجود تھا جہاں اس کی روح تھک کر سستاتی تھی۔ اس کا تھکا ہوا جسم بھی نعیم کے ہی جسم کے سوزِ قربت میں سکون پذیر ... تھا۔ گھر سے جاتے اور گھر آتے ساس سسر جس کمرے میں ہوں طاہرہ وہاں جا کر انہیں ادب سے سلام کہتی تھی۔ یہ ... سلام اس کے سینے کی تہوں سے نکلتا تھا۔ اس نے بدمزگیوں سے سمجھوتہ کر کے بدمزگیوں کے دامن میں ہی زندگی کو اپنی راہ پر ... لیا تھا۔ دریا میں بھی وہ اپنے دامن کو بھیگنے سے بچانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔

خالہ کو جب علم ہوا کہ طاہرہ شام کو بھی سکول جاتی ہے تو ابلیس کے کارخانے سے ایک منصوبہ تیار ہو کے نکلا۔ اس نے ... بند کو وثوق سے تسلی دی — "صبر کیے رکھو۔ ڈیڑھ دو ماہ میں رشتہ طے ہو جائے گا۔ لڑکی کے لچھن ظاہر ہونے لگے ہیں..... بڑی بہن! وہ تو ایک بھول تھی جوان لوگوں سے ہو گئی تھی۔ اب کھڑے ہاتھ مل رہے ہیں۔ کل میری بہن نے صاف کہہ دیا ہے کہ میں تو ... بس تھوڑے سے دن اور دیکھ کر بہو کو طلاق دلوا دوں گی نعیم کا باپ بھی رضامند ہو گیا ہے۔"

خالہ اس کے منہ میں ایک ہڈی دے آئی۔

جس سکول میں طاہرہ پڑھاتی تھی وہ ان کے گھر سے دور تھا اور خالہ کے گھر کے قریب۔ رات کو عورتیں ٹہلنے کے لیے ... سکول کے پاس سے گزر کر پریڈ کے میدان تک جایا کرتی تھیں۔ خالہ پہلے کبھی کبھار عورتوں کے ساتھ سیر کو نکلتی تھی۔ اب اس نے ... باقاعدہ ساڑھے آٹھ بجے کے بعد سکول کے قریب سے گزرنا اور ذرا سی دیر وہاں رکنا شروع کر دیا۔ سکول کے ایک کمرے میں سے وائلن، ہارمونیم، بینجو اور طبلے کی آوازیں آتی رہتی تھیں اور بچوں کی مترنم آوازیں بھی گونجا کرتی تھیں۔

ایک دن خالہ چار پانچ عورتوں کے ساتھ نو بجے کے قریب سکول کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ حسبِ عادت رک گئی۔ ... آگے نکل گئیں اور خالہ درخت کی اندھیری اوٹ میں ہو گئی۔ اس نے جو منظر دیکھا اسے دیکھتی ہی رہی اور آنکھیں سکیڑ کر دیکھتی ... خوشیوں کا ایک ایسا بگولہ اس کے سینے سے اٹھا کہ وہ جہانِ دگر میں پہنچ گئی۔ اسے ہر طرف فتح و نصرت کے نغمے ... سنائی دے رہے تھے۔

اس نے دیکھا کہ طاہرہ ایک آدمی کے ساتھ سکول کے پھاٹک میں سے باہر نکل رہی تھی۔ رات ہونے کے باوجود اس ... نے زنگدار چشمہ پہن رکھا تھا۔ سڑک کی بتی کی مدھم اور زرد روشنی میں اس نے طاہرہ کو تو اچھی طرح پہچان لیا لیکن اس آدمی کو نہ پہچان ... اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور سر پر جناح کیپ تھی۔ طاہرہ نے اس آدمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور دونوں ... آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ خالہ نے دیکھا کہ ذرا آگے جا کر طاہرہ نے اس آدمی کا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیا اور ... قریب قریب ہو کر چلنے لگے۔

یہ پشاور کی ایک ویران سڑک تھی جو رات کو بالکل ہی سنسان ہو جایا کرتی تھی۔ سڑک کی بتیاں دور دور تھیں جس سے اندھیرا ... طاہرہ اور اس کا ساتھی اندھیرے میں گم ہو گئے یا کسی اندھیری گلی میں چلے گئے۔ خالہ کو خواب کا دھوکہ ہوا نہ ہی اس ... منظر کو واہمہ سمجھا۔ اسے اس قدر مسرت ہوئی جیسے وہ یہی کچھ دیکھنا چاہتی تھی۔

خالہ کا سینہ یوں پھیل گیا جیسے نند نے اسے ڈیڑھ ہزار روپیہ بخش دیا ہو۔ وہ وہیں سے نعیم کے گھر پہنچی اور نعیم کی ماں کو سارا

حال بمع زیب داستان سنایا۔ ماں نے سنا تو وہ تو جیسے بنیادوں تک ہل گئی۔

"اے گلشن! ذرا پھر سوچ لے" ـــــ ماں نے اپنے آپ کو فریب دینا چاہا، حالانکہ وہ بھی طاہرہ کے خلاف یہی کچھ سننا چاہتی تھی۔ اسے طاہرہ کے خلاف ایسے ہی ٹھوس ثبوت کی ضرورت تھی لیکن اسے اپنی عزت کا خیال آ گیا۔ کہنے لگی ـــ "غلط بھی لگ سکتی ہے۔ شاید تم نے کسی اور کو دیکھا ہو"

"طاہرہ نے فیروزی رنگ کا دوپٹہ لیا تھا نا آج؟" ـــــ خالہ نے ثبوت پیش کرتے ہوئے کہا ـــ "قمیض کی سفید زمین فیروزی پھول ہیں؟ ... شلوار ساٹن یا ہملٹن کی ہے اور سینڈل سفید۔ بھلا مجھے غلطی کیسے لگ سکتی ہے؟ کہو تو اندھیرے میں پہچان لوں"

نعیم کی ماں نے کپڑوں کی تفصیل سُنی تو اسے یقین آ گیا کہ وہ طاہرہ ہی تھی۔ اتنے میں طاہرہ گھر میں داخل ہوئی تو خالہ نے بہن کے کان میں کہا۔ "آج کچھ نہ کہنا۔ کل رات خود چل کے دیکھ لینا۔ یہ ہر رات یہی کرتُوت کرتی ہو گی۔ پھر بھائیا جی کو دکھائیں گے۔ سکتا ہے وہ ہماری زبان پر یقین نہ کریں"

دوسری رات نو سوا نو بجے نعیم کی خالہ اور ماں سکول کے سامنے درخت کی اوٹ میں کھڑی تھیں کہ طاہرہ اسی آدمی کے ساتھ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سکول سے نکلی۔ سکول کا پھاٹک درخت سے اتنی دور تھا کہ اس آدمی کا چہرہ زرد بتی میں پہچانا نہیں تھا۔ وہ تھا بھی انجان چہرہ۔ آنکھوں پر گہرے رنگ کا چشمہ اور سر پر جناح کیپ۔ ہاتھ میں وائلن کا ڈبہ تھا۔

ماں گھر لوٹی تو وہ زمین پر تھی نہ آسمان پر۔ جہاں اسے طاہرہ کے خلاف ایک اور جرم کا ثبوت مِل گیا تھا وہاں اپنے بیٹے کے گھر کے اجڑنے کا بھی دُکھ تھا۔ سمجھ نہ پائی کہ روئے یا مُسکرائے۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ اس نے نعیم کے باپ کو سُنا دیا تھا۔ پھر بھی اسے قرار نہ آیا۔ بوڑھے باپ نے کہا ـــ "میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ نعیم اور طاہرہ سے کچھ نہ کہنا"

اگلی رات نعیم کی ماں، خالہ اور باپ درخت کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی وہی منظر دیکھا۔ باپ عینک اچھی طرح صاف کر کے دیکھا اور کوئی شک ہی نہ رہا کہ وہ طاہرہ تھی۔ اس طرح اس آدمی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اور روز کی طرح ذرا آگے جا کر اس نے اپنا بایاں ہاتھ طاہرہ کے بائیں کندھے پر رکھ دیا اور طاہرہ اس کے اور قریب ہو گئی۔ باپ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ غم و غصّے کے جوش کا یہ عالم کہ اس پر تو جیسے غشی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ اس آدمی کے ٹکڑے کرنا چاہتا تھا اور اس بہُو کے بھی جو اس کے اکلوتے بیٹے کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی۔

وہاں سے گھر آتے تمام راہ نعیم کی خالہ اور ماں باری باری اور کبھی اکٹھی نعیم کے باپ کی رگِ حمیت پھڑکاتی رہیں بڈھے پر ایک خاموشی، طوفان بگر بیاں، طاری رہی جو گھری ہوتی گئی۔ وہ کسی کی باتیں جیسے سُن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تمام راہ خُون دیکھتا رہا ـــــ عزت کا خون عصمت کا خون۔ عزت و عصمت کے ڈاکو کا خون اور خُون ہی خُون ـــــ اس کے ہاتھ کانپنے اور جو ایک آدھ بات کی تو الفاظ بھی لرز رہے تھے۔ اسے تو یہ بھی خیال نہ آیا کہ وہ گھر پہنچ کر اپنے کمرے میں بیٹھ چکا ہے اور سامنے بیٹھا ہُوا ہے۔ نعیم کو اس نے بلایا تھا اور اس کی ماں نے کہا تھا ـــ "نعیم کو میرے پاس بھیج کر تم چلی جانا"

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد نعیم باپ کے کمرے سے نکلا۔ اس کا دل تو جیسے بالکل ہی ڈوب گیا تھا۔ سر چکرا رہا تھا اور متلی کی کیفیت ہی تھی، ساتھ ہی اعصاب زدگی۔ اس کی حالت ہر اس خاوند سے بدتر تھی جو اپنی بیوی پر جان نثار کرے اور بیوی رات کے پرے میں غیر مرد کے ساتھ اندھیری گلی میں گم ہو جاتے۔

وہ باپ کے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا تو اس نے محسوس کیا جیسے وہ گر پڑے گا۔ وہ سر پکڑ کر وہیں رک گیا اور اس کے ہلے۔ اس کی شخصیت کی کمزور کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ گئیں۔ اس نے اپنے آپ کو گہرے سمندر میں ڈوبتا پایا۔ اس آسمان پہ نگاہ ڈالی۔ ستارے ایک چکر کی صورت تیزی سے گھومتے دکھائی دیئے۔ اس نے قے کی حاجت محسوس کی، ہی سر میں شدید درد شروع ہو گیا۔ وہاں سے گھوما اور امی کے کمرے میں چارپائی پر جا گرا۔ دماغ سوچنے سے معذور ہو چکا تھا۔ خیالات اور حالات کی گردش سے تلخیاں دماغ میں یوں گھسی چلی آ رہی تھیں جس طرح شکستہ کشتی میں دریا کا پانی داخل ہوتا ہے۔

ماں نے بھاگ کر اسے سنبھالا۔ اس کے سارے جسم پر رعشہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ رنگ زرد تھا۔ آنکھیں جیسے ٹھہر ہیں اور سانسوں کا تسلسل بے قاعدہ۔ ماں نے نعیم کے باپ کو بلایا۔ اس نے آ کر نعیم کی یہ حالت دیکھی تو اس پر رقت طاری اس کی اپنی جذباتی کیفیت بیٹے سے بہتر نہ تھی لیکن اس نے زمانے کی گرمی سردی دیکھی تھی۔ وہ اس صدمے کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ اسے زندہ درگور کرنے سے کم نہ تھا۔ اس پر نعیم کی ماں کی باتیں، خالہ کے طعنے اور تائید، اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گر رہی تھیں۔ وہ نعیم کے سرہانے بیٹھ کر اسے تسلیاں دینے لگا۔

کچھ ان تسلیوں سے اور کچھ ماں کے اس ہاتھ سے جو پیار کا گداز لیے اس کے بال سہلا رہا تھا نعیم کی حالت سنبھلنے لگی۔ اسے سہارا جو ملا تو اس نے معذرت طلب نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔ نعیم کے باپ نے جب دیکھا کہ نعیم اپنے آپ میں آ تا جا رہا ہے تو اس نے بیچ بیچ کر اور الفاظ تول تول کر نعیم کو اس مسئلے کا عملی حل بتانا شروع کیا اور تان اس فقرے پر توڑی ـــ "ذرا حوصلہ لڑکیاں اور بہت ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ اب ایک ہی حل ہے۔ طلاق۔ میں ابھی زندہ ہوں، بیٹا!"

نعیم پر تو جیسے بم آ پڑا ہو۔ دھماکے کی چکا چوند میں اسے اطہر کی دوستی اور سیمہ کا خلوص دکھائی دیا۔ راولپنڈی میں گزارے ہُوئے دنوں کا ایک ایک لمحہ اسے ایک سانس میں نظر آ گیا۔ راولپنڈی میں گزاری ہُوئی شبِ عروسی اور ایسی ہی پہلی رات جو انہوں نے رومانی تھی۔ طاہرہ کا حسن اور طاہرہ کا لمس۔ اس کی باوقار شخصیت اور اس کے پیار کا روحانی قرار۔

نعیم کو ایک ثانیے میں بہت کچھ یاد آ گیا اور اس نے سہمی ہُوئی نگاہوں سے باپ کو دیکھا، پھر ماں کو دیکھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے اور ابھی آنکھ کھُل جائے گی۔ اتنے میں ماں بول پڑی۔ باپ نے تو سنبھل کر بات کی تھی اور طلاق دی تھی لیکن ماں نے طلاق سے بات شروع کی اور بات ابھی ختم بھی نہ ہُوئی تھی کہ نعیم پر پھر وہی دل ڈوبنے کا دورہ پڑ گیا۔ نعیم پر سا ایک خوف طاری ہو گیا اور ماں کو بھی اور باپ کو بھی شک سے دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ ماں نے سہارا دیا تو وہ سے غصے میں بولا ـــ "چھوڑ دو امی! اپنے کمرے میں جا رہا ہُوں" ـــــ اور وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

طاہرہ تھکی ہُوئی تھی اور لیٹ گئی تھی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ جنگل میں آگ لگ چکی ہے اور شعلے اس کی کٹیا کے قریب پہنچ

چکے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں ڈرامے کے ایک منظر پر نظرثانی کر رہی تھی کہ دروازے کا کواڑ دھماکے سے کھل کر دیوار کے ساتھ جا
اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ نعیم کواڑ کا سہارا لیے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی حالت نشے میں چور شرابی
کی سی تھی۔

طاہرہ اچھل کر پلنگ سے اٹھی اور دروازہ بند کر کے نعیم کو تھام لیا۔ اس لمحے سے پہلے نعیم نے جانے کیا سوچا تھا جو طاہرہ
کے قریب پہنچتے ہی ذہن سے نکل گیا۔ اس نے چاہا کہ طاہرہ کی گرفت سے نکل جائے لیکن طاہرہ اسے بستر میں لٹا کر اس کے
ساتھ لگ کر نیم دراز ہو چکی تھی اور اس کا نرم و گداز ہاتھ اس کی پیشانی سہلا رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" ــــ طاہرہ نے پیار اور ہمدردی سے لبریز گھبراہٹ سے پوچھا ــــ "طبیعت خراب ہے؟"

"کچھ نہیں!" ــــ نعیم کی آواز اس طرح نکلی جیسے وہ گہری کھائی سے بولا ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھایا کہ طاہرہ کا ہاتھ اپنی پیشانی سے
ہٹا دے۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا تو طاہرہ کا ہاتھ رک گیا۔ نعیم نے اس کا ہاتھ پیشانی سے اٹھایا تو طاہرہ نے اپنا ہاتھ نعیم کے
ہاتھ کے حوالے کر دیا۔ دونوں ہاتھ دو تین لمحے ہوا میں معلق رہے اور نعیم نے بے ساختگی سے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھا
پھر اپنی آنکھوں پر رکھا اور اس پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔

طاہرہ نے فوراً محسوس کر لیا کہ نعیم رو رہا ہے۔ اس کی یہ حالت طاہرہ کے لیے حیران کن نہیں تھی۔ اسے اچھی طرح علم تھا
کہ نعیم کا دل کمزور اور بے حد حساس ہے اور گھر کے حالات بے حد پراگندہ۔ اس نے سوچا کہ نعیم آج اتنی دیر ماں کے پاس رہا ہے
ضرور کوئی نیا فتنہ جگایا گیا ہوگا۔ اس نے سوچنے یا نعیم سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اسے دکھ ہوا تو صرف نعیم کی طبیعت
کی خرابی کا۔

وہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نعیم کی صحت پر یہ پراگندگی اثر کرنے لگی ہے اور نعیم اکثر دل چھوڑ بیٹھتا تھا۔ اس نے کئی بار
نعیم کو کڑھتے بھی دیکھا تھا۔ نعیم کی یہ حالت طاہرہ کے لیے تشویشناک تھی۔ نعیم کے بھرے بھرے خوبصورت چہرے پر غم کے
بادل چھانے لگے تھے اور وہ الجھنے لگا تھا۔ آج کی رات تو اس کی حالت زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی۔ یہ حالت طاہرہ نے پہلے
کبھی نہیں دیکھی تھی۔ نعیم ابھی خاموش تھا اور اس کی آنکھیں طاہرہ اور اپنے ہاتھ کی اوٹ میں خون رو رہی تھیں۔ طاہرہ پر رقت طاری
ہو گئی اور اس نے سینے میں جلن سی محسوس کی۔

"طاہرہ!" ــــ نعیم نے ہاتھ ہٹا کر آہستگی سے کہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو دونوں کناروں سے بہے جا رہے
تھے۔ روندھی ہوئی آواز میں بولا ــــ "سچ کہو، طاہرہ! تمہیں مجھ سے محبت ہے یا مجھے فریب دے رہی ہو..... خدا کے لیے
طاہرہ! میں شاید....." اور اس کی آواز پھر دب گئی۔

طاہرہ نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اس کی ایک ایک بات نعیم کے دل میں اترتی جا رہی
تھی۔ نعیم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ایک رگ میں سے خون نکل رہا ہے اور دوسری رگ میں سے تر و تازہ خون ڈالا جا رہا
ہے۔ اس کی گئی گزری مرجھاتی ہوئی زندگی ہری بھری ہوتی جا رہی تھی۔ اسی دوران اسے ماں اور باپ کی چند منٹ پیشتر کی باتیں یاد آ
گئیں اور نعیم کی حالت اس کشتی کی سی ہو گئی جس میں سوراخ ہو گئے ہوں۔

وہ خیالوں اور باتوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ایک طرف طاہرہ کی باتیں اور اس
کی تپش اس کی ہاری ہوئی کمزور شخصیت کو جلا دے رہی تھی۔ دوسری طرف اسے تھوڑی دیر بعد ایسی خلش محسوس
ہوتی کہ وہ اس کمرے سے، اس گھر سے اور اس دنیا سے ہی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس کی اندرونی دنیا میں ایک آواز گونج
رہی ـــ "یہ سب بہتان ہے۔ طاہرہ میری ہے" ــــ اور دو تین ملی جلی آوازیں اس اکیلی آواز کے تعاقب میں یوں بھاگ
رہی تھیں جیسے دو تین بلیاں ایک چوہے کا پیچھا کر رہی ہوں۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ طاہرہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے نعیم کی آنکھیں بند دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ وہ
سو گیا ہے لیکن نعیم کا انگ انگ جاگ رہا تھا۔ آنکھیں آنسو بہا بہا کر تھک گئی تھیں اور ذرا سستانے کو بند ہو گئی تھیں۔ نعیم نے
طاہرہ کو سوتے دیکھا تو اٹھ بیٹھا اور طاہرہ کو دیکھنے لگا۔ دو متضاد خیالات دو پتھروں کی طرح اس کے ذہن میں ٹکرا رہے تھے اور
ان کے تصادم کی آواز کے ساتھ اسے طاہرہ دو روپ میں نظر آتی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا، کچھ سوچتا رہا اور اس کا دل پھر ڈوبنے لگ گیا۔
وہ لیٹ گیا۔ اس نے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ طاہرہ کی اس قدر باتوں کے جواب میں اس نے زیادہ باتیں نہیں کی تھیں اور نہ
اس پر ظاہر ہونے دیا کہ اس کے ماں باپ اور خالہ اسے ایک غیر مرد کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں جاتے دیکھ آتے
ہیں اور اس کے خلاف طلاق کا فیصلہ دیا جا چکا ہے۔

دوسرے دن نعیم بارہ بجے دفتر سے واپس آ گیا۔ اس کی طبیعت ٹھکانے نہیں تھی۔ گزشتہ رات کی جذباتی افراتفری اور
شب بیداری کا اثر زائل نہیں ہوا تھا۔ وہ صرف دل ڈوبنے اور گھبراہٹ کی شکایت کر رہا تھا۔ طاہرہ نے صبح سویرے
نمایاں طور پر محسوس کر لیا تھا کہ رات کوئی خاص واردات ہوئی ہے۔ ساس اور سسر کی نگاہوں اور حرکات میں قہر اور عتاب جھلک
رہا تھا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی طاہرہ کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ جواب میں دونوں نے منہ پھیر لیے تھے۔ صرف نوکرانی
نے طاہرہ کے ساتھ ہنس کر بات کی تھی۔

طاہرہ ساڑھے تین بجے کے قریب گھر آئی تو نعیم قدرے بہتر تھا۔ ماں نے اسے چین نہیں لینے دیا تھا۔ اس کا سر دباتی
اور دماغ چاٹتی رہی تھی۔ اس کے دل سے طاہرہ کی محبت کو دھکیل کر اپنا پیار جگاتی رہی تھی۔ اسے طلاق کا عملی پہلو سمجھاتی
رہی تھی۔ طاہرہ حسبِ معمول شام کو ریہرسل کے لیے سکول چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے نعیم کو سلام کیا تو نعیم نے ہر روز کی طرح
کہا ـــ "خدا کے لیے جلدی لوٹ آنا میں یہ تین گھنٹے کیسے گزاروں گا" یا یہ کہ "جی چاہتا ہے کہ ترا ڈرامہ چوپٹ کر دوں"
لیکن آج اس نے بجھے ہوئے دل سے زیرِ لب کہا ـــ "جاؤ!"

نعیم کا یوں بے رخی سے جواب دینا طاہرہ کے لیے غیر معمولی واقعہ تھا۔ اسے سکول جانا تھا وہ چلی گئی لیکن چلتے ہوئے اس نے
اس کی چال ڈھال میں بھی ایک ناگوار سی تبدیلی محسوس کی۔ دل و دماغ اور اعصاب پر ایک گرفت اور گھٹن محسوس کی۔ اس نے راستے میں
سوچا کہ وہ ڈرامے کو ادھورا ہی چھوڑ دے اور ہیڈ مسٹریس کو صاف کہہ دے کہ میں بہت مجبور ہوں، یہ ڈرامہ مجھے لے ڈوبے
گا۔ اسے احساس تھا کہ جب سے وہ ڈرامے کے لیے سکول جانے لگی تھی، ساس نے گھر کے ڈرامے میں نت نئے

سوانگ بھرنے شروع کر دیتے تھے۔ یہ احساس بہت تلخ تھا لیکن طاہرہ نے سکول کے ڈرامے کے متعلق سوچا تو اسے یہ بھی محسوس ہُوا کہ یہ ڈرامہ ادھورا رہ گیا تو وہ بھی شاید زندہ نہ رہ سکے گی۔

اس ڈرامے کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک منظر میں اس کے جذبات اور عزائم کا رنگ نکھرا ہُوا تھا۔ یہ ڈرامہ اس کی اپنی ذات کا اظہار تھا اور اس اظہار میں وہ روحانی قرار پا رہی تھی۔ اسے وہ ہر قیمت پر سٹیج کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ جس قدر ڈوبتی میں گھرتی جا رہی ہے اس کی ہدایت کاری میں اسی قدر چمک اور زندگی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ بعض اوقات ہیڈ مسٹریس جب طاہرہ کو ریہرسل کراتے دیکھتی اور مرکزی کردار ادا کرنے والی لڑکی کے منہ سے مکالمے سنتی تو وہ جھوم اٹھتی تھی۔

رات سوا نو بج رہے تھے کہ نعیم سکول کی پھاٹک سے تھوڑی دور درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور سڑکوں کی بتیاں جل رہی تھیں چند منٹ بعد طاہرہ اسی آدمی کے ساتھ سکول کے پھاٹک سے باہر نکلی۔ بتی کی زرد اور مدھم روشنی میں نعیم نے طاہرہ کو تو اچھی طرح پہچان لیا لیکن اس آدمی کے نقش و نگار کو اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ طاہرہ کو تو وہ اندھیرے میں بھی پہچان سکتا تھا۔ اس آدمی نے ہر روز کی طرح رنگدار چشمہ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں وائلن تھی۔ اس کا ہاتھ طاہرہ کے ہاتھ میں تھا اور ذرا آگے جا کر اس آدمی نے اپنا بایاں ہاتھ طاہرہ کے بائیں کندھے پر اس طرح رکھ لیا جیسے بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ لیا ہو۔ طاہرہ اس کے اور قریب ہو گئی۔

وہ دونوں تو اندھیرے میں پہنچ چکے تھے لیکن نعیم کی آنکھوں کے سامنے پہلے ہی اندھیرا چھا چکا تھا۔ اس کا دل بیٹھ گیا جیسے کسی آہنی شکنجے میں جکڑ لیا گیا ہو۔ غصے کا یہ عالم کہ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ مٹھیاں بند ہو گئیں اور دانت بجنے لگے۔ اس نے سڑک پر نگاہ دوڑائی، سنسان سڑک کی اِکا دُکا بتیاں جیسے ناچ رہی تھیں نعیم کی داخلی دنیا میں مہیب دھماکے شروع ہو گئے جن کی گرج اور ہیبت ناک گونج نے اسے ہلا کے رکھ دیا۔ اس نے خیالوں میں جانے کسے گھونسہ مارا اور وہ چونک اٹھا۔ بتی کی روشنی میں اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ ہاتھ سے خون بہ رہا تھا۔ اس نے درخت کو گھونسہ مار دیا تھا۔

اس کے دل و دماغ میں ایک ارادہ بیدار ہُوا۔ وہ پیچھے سے جا کر اس آدمی کی گردن دبوچ کر اسے ختم کر دینے کو آگے بڑھا۔ دو قدم چلا اور رک گیا۔ کیوں رک گیا؟ اسے معلوم نہ تھا۔ وہ چل پڑا۔ اب اس نے سوچا کہ انہیں موقعہ پر پکڑ کر طاہرہ کو وہیں طلاق دے دے گا۔ وہ پھر رک گیا اور سر جھکا لیا۔ اسے محسوس ہُوا جیسے وہ طاہرہ کا سامنا نہ کر سکے گا۔ وہ اپنی شکست کا سامنا نہ کر سکے گا۔ وہ اپنی محبت کا خون کرنے سے گھبرا رہا تھا لیکن اس کی محبت کا خون تو اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔

نعیم نے سوچا، بہت کچھ سوچا۔ سینہ تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اعصاب سوکھی ٹہنیوں کی طرح کڑک کڑک کر ٹوٹ رہے تھے۔ اخلاقی جرأت پہلے ہی دم توڑ چکی تھی۔ سہارا ال نہیں رہا تھا۔ اسے پہلی بار محسوس ہُوا اور شدت سے محسوس ہُوا کہ وہ بہت کمزور ہے۔ اس قدر کمزور کہ وہ اس صورتِ حال کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اس کی زبان کہہ ہی نہیں سکے گی کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہُوں۔

نعیم کو اپنی بیچارگی اور کمزوری کا احساس جو ہُوا تو اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ گزشتہ رات کی طرح اسے پھر متلی سی محسوس ہُوئی اور سر جو پہلے ہی چکرا رہا تھا۔ دکھنے لگا۔ اندرونی اور بیرونی فضائیں آپس میں ٹکرانے لگیں اور بجلیاں کوندنے لگیں۔ ان

...ن نے نعیم کے دل میں ایک خوفناک ارادہ بیدار کر دیا۔ اسے اپنے چاروں طرف خون نظر آنے لگا اور نعیم اس ارادے کے ...اس طرح لپٹ گیا جیسے سیلاب میں لکڑی کا ایک تختہ اس کے ہاتھ آ گیا ہو —— ایک سہارا —— موت —— خُون —— ...کی موت؟ کس کا خُون؟ یہ نعیم کو بھی معلوم نہ تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کا جسم جل رہا تھا۔ طاہرہ گھر پہنچ چکی تھی اور کمرے میں نعیم کا انتظار کر رہی تھی۔ نہ اس نے کسی سے ...تھا کہ نعیم کہاں ہے نہ اسے کسی نے بتایا تھا۔ نہ ہی گھر میں کسی کو معلوم تھا۔

نعیم گھر پہنچا تو ماں کے کمرے میں گیا۔ اس کا لاشعور اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ماں نے اس کی حالت دیکھی تو اس کا کلیجہ ...دھک کرنے لگا نعیم چارپائی پر لیٹ گیا۔ ماں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو پیشانی تپ رہی تھی۔ باپ کو بلایا۔ اس نے ...بض لگایا تو بخار ایک سو دو سے تجاوز کر رہا تھا۔ باپ نے حال پوچھا تو نعیم نے سر ہلا دیا، بات نہ کر سکا اور اس کے آنسو جاری ...لئے اس نے ہاتھ کے اشارے سے ماں کو چارپائی پر اپنے قریب بیٹھنے کو کہا اور سر پر ہاتھ رکھا۔ ماں نے سر دبانا شروع ...ماں باپ پریشان ہوتے جا رہے تھے اور نعیم کے سینے اور دماغ میں جو آگ سُلگ رہی تھی اس کے شعلے اسے جلاتے ...ہے تھے۔ اس کا سب کچھ جل رہا تھا اور وہ ان شعلوں سے بھاگ رہا تھا۔ خیالوں میں بھاگتا ہی جا رہا تھا۔ اعصابی کشمکش نے ...دل جیسے کچل کر ختم ہی کر دیا تھا۔ نعیم زور زور سے سرہانے پر سر مارنے لگا اور باپ اس قدر گھبرایا کہ بھاگ کر ڈاکٹر کو بلا لایا۔

طاہرہ کو علم ہی نہ تھا کہ گھر میں قیامت آئی ہے۔ جب ڈاکٹر گھر میں داخل ہُوا تو اتفاق سے طاہرہ صحن میں کھڑی تھی۔ ڈاکٹر کے پیچھے وہ ساس کے کمرے میں داخل ہُوتی۔ نعیم کو اس حالت میں دیکھا تو سب کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہُوتے نعیم پر ...ری پڑی۔ ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک طرف کیا تو طاہرہ اس طرح بولنے لگی جیسے اس کمرے ...ں نعیم اور ڈاکٹر ہے ساس اور سسر کو وہ بالکل ہی بھول گئی تھی۔

"کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟" —— اس نے گھبراتے ہوتے لہجے میں پوچھا —— "انہیں کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو کبھی ان کی ...نہیں ہُوتی تھی۔"

"گھبرائیے نہیں! گھبرائیے نہیں!" —— ڈاکٹر نے تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا —— "بخار تیز ہو گیا ہے۔ سب ٹھیک ...ہو جائے گا۔"

نعیم کی آنکھیں بند تھیں جب اس کے کانوں میں طاہرہ کی آواز پڑی تو اس نے ذرا سی آنکھ کھولی۔ طاہرہ کو اپنے اُوپر جھکا ...اس کی گھبراہٹ کی باتیں بھی سنیں۔ ڈاکٹر نے طاہرہ کو ایک طرف کر کے سٹیتھوسکوپ دل پر رکھی تو ڈاکٹر نے نبض اور دل میں ...ربلی دیکھی جیسے مریض کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہو۔ جسم ایک بار پھر کانپنے لگا۔ طاہرہ نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک ...ر ہو رہا تھا۔ نعیم کی ماں اور باپ طاہرہ کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ نعیم کی اس حالت کی ...رف طاہرہ ہے۔ وہ ڈاکٹر کے جانے کا انتظار کر رہے تھے اور دل میں غصے کو جمع کیے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر نے طاہرہ کی طرف دیکھا اور ذرا جھجک کر سوالیہ انداز میں کہا —— "آپ؟"

"میں مسز نعیم ہُوں" —— طاہرہ نے اپنا تعارف کرایا۔

"آپ ذرا باہر تشریف لائیں" —— ڈاکٹر طاہرہ کو صحن میں لے گیا اور پوچھا —— "آپ نے کہا تھا کہ اس سے کبھی ان کی یہ حالت نہیں ہوئی تھی۔"

"جی ہاں!" —— طاہرہ نے جواب دیا —— "اتنا ضرور ہے کہ ان کا دل بہت کمزور ہے اور طبیعت ضرورت سے کہیں حساس ہے۔ ذرا سی تکلیف کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور نہ ہی کوئی ایسی ویسی بات برداشت کرتے ہیں۔"

"ہوں!" —— ڈاکٹر نے گہری سوچ سے بیدار ہوتے ہوئے کہا —— "دیکھئے مسز نعیم! میں ابھی زیادہ تفصیل میں جانا چاہتا۔ فی الحال آپ سے دو چار باتیں کروں گا۔ مسٹر نعیم کو دل کا عارضہ شروع ہو چکا ہے اور دل واقعی کمزور ہے۔ دل کی حرکت تشویشناک حد تک بے قاعدہ ہے۔ عارضہ آج کا نہیں پرانا معلوم ہوتا ہے اور آج بخار کی وجہ سے یا کسی صدمے کی وجہ سے یک لخت بیدار ہو گیا ہے۔ مریض حساس بھی ہے اور یقیناً جذباتی بھی.... جی ہاں!.... آپ کے ساتھ قدرتی طور پر مریض کی روحانی وابستگی ہے لیکن جذباتی وابستگی بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ آپ مریض کے کمرے میں آئیں تو مریض کے دل کی حرکت میں تبدیلی آئی اس نے مجھے چونکا کر دیا تھا.... دیکھئے مسز نعیم! برا نہ مانیے گا۔ ڈاکٹروں کو ایسی باتیں کہنا ہی پڑتی ہیں۔ آپ مسٹر نعیم کے ساتھ صرف پیار و محبت کیجئے اور انہیں بہلاتے رکھیے اور خدا کے لیے جسمانی ملاپ سے پرہیز کیجئے۔ جس قدر ہو سکتا ہے پرہیز کیجئے۔"

"بہت اچھا ڈاکٹر صاحب!" —— طاہرہ نے سر جھکا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کے آنسو نکل رہے تھے۔ بولی —— "حالت کیسی ہے؟ خطرے سے باہر ہیں وہ یا؟...."

"اب تو میں سنبھال لوں گا" —— ڈاکٹر نے کہا —— "ابھی میں صرف درجہ حرارت کم کرنے کی دوا دے رہا ہوں۔ کل باقاعدہ علاج، غالباً انجکشن، شروع کروں گا۔ دل کی تقویت بے حد لازمی ہے۔ آپ اس بات کا خیال رکھیے کہ مریض کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات نہ کی جائے جس سے انہیں صدمہ پہنچے یا غصہ آئے۔ مریض کے اعصاب بھی زخمی معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی بڑی بیہودہ چیز ہوتی ہے، مسز نعیم!"

"آپ یہ بات نعیم کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو بھی سمجھا دیجئے" —— طاہرہ نے موقع غنیمت جان کر کہا —— "ہدایت کا زیادہ تعلق انہی کے ساتھ ہے۔"

ڈاکٹر نے نعیم کے باپ کو چند ایک ہدایات دیں اور ملازمہ کو دوائی کے لیے ساتھ لے گیا۔ ڈاکٹر کے نکلنے کی دیر تھی کہ نعیم کی ماں طاہرہ پر برس پڑی۔ بجائے اس کے کہ اسے صاف بات بتا کر جواب طلبی کرتی۔ اشاروں اشاروں میں اسے بد چلن، بدمعاش اور طوائف تک کہہ گئی۔ نعیم کے باپ نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے چپ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن نعیم کے سرہانے بیٹھی غبار نکالے جا رہی تھی اور طاہرہ تو اس طرح چپ ہو گئی تھی جیسے اس میں جان ہی نہیں رہی۔ وہ مٹی کا بت بن گئی تھی۔

نعیم کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ اس نے ایک بار مری ہوئی آواز میں ماں سے کہا —— "چپ ہو جاؤ امی! چپ!" لیکن ماں کی زبان کا تو جیسے لگام ٹوٹ گیا تھا۔

"مجھے جوتیاں مار لیں" —— طاہرہ بصد مشکل بولی —— "لیکن خدا کے لیے ان کی صحت کا خیال کریں، ڈاکٹر کہہ گیا ہے۔"

"اری چل! آئی ہے بڑی ان کی صحت کا خیال رکھنے والی۔ بدمعاش!"

وہ جانے کیا کچھ کہتی رہی۔ طاہرہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

طاہرہ کمرے میں جا کر بیٹھی۔ اٹھی۔ پھر بیٹھ گئی اور ذرا سی دیر بعد کمرے میں ٹہلنے لگی۔ آخر تھک ہار کر لیٹ گئی۔ ساس کی ہر روز کی ٹوک جھک کی تو وہ عادی بن چکی تھی لیکن آج کی طومار کی توقع نہیں تھی۔ غم اور غصہ سمندر کی موجوں کی طرح امڈا چلا آ رہا تھا اور طاہرہ کی تمام امیدیں ڈوب رہی تھیں۔ آنسو تھمتے نہ تھے۔ آنسوؤں کے دھندلکے میں اسے اپنی زندگی کے ایام، جو گزر گئے تھے اور جو گزر رہے تھے، ہارے ہوئے سپاہیوں کی طرح لہولہان اور لڑکھڑاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

اس کے سامنے اس کی زندگی کتاب کی طرح کھل گئی۔ پھر تیز ہوا جس نے کھلی ہوئی کتاب کے تمام ورق تیزی سے الٹ دیئے۔ طاہرہ نے ایک ایک ورق دیکھا۔ کہانیاں جو پرانی ہو گئی تھیں، کہانیاں جو بیت رہی تھیں، اچھی بھی، بری بھی۔ ایک ایک انسان جو اس کی راہ میں آیا اور اس کا ہمسفر ہوا اسے دکھائی دیا۔ خیالوں میں وہ دم بھر کے لیے سب کے ساتھ دو دو قدم چلی۔ یادوں نے اسے فریب دیئے۔ جس ماضی کو وہ آج کے عزائم کے پاؤں تلے روند چکی تھی وہ جوں کا توں، جیتا جاگتا اس کے سامنے کھڑا ہوا جیسے وہ باتیں کل کی باتیں تھیں۔ جلال آباد کے پرہنگامہ شب و روز جیسے یہ گلی کی نکڑ پر ہی تو کھڑے ہوں۔ ارشد، عفت اور نجمہ جیسے صحن میں بیٹھی ہنس کھیل رہی ہوں اور اسے اس محفل سے نوچ کر زنداں میں بند کر دیا گیا ہو۔

تصورات کی دنیا میں اس نے سب کی آوازیں سنیں جن آوازوں کو وہ اگل چکی تھی۔ انہیں اس نے اپنی ہستی میں جاگزیں پایا۔ آوازیں زندہ تھیں، ارشد کے پیدا کردہ جس خلا کو اس نے نعیم سے پر کیا تھا وہ ابھی تک خلا ہی تھا، خالی، مہیب اور بھیانک۔ اطہر بھائی اور نجمہ آپا جنہوں نے اسے راولپنڈی کے ریلوے سٹیشن پر رو رو کر الوداع کہی تھی، اسے دکھائی دیتے۔ کمرۂ عروسی اور نعیم طاہرہ بھی تھی کہ اس نے جلال آباد اور "آشا بھون" کو کمرۂ عروسی میں جلتی ہوئی اگربتیوں کے خوشبودار دھوئیں میں اڑا دیا ہے لیکن وہ جو گزر گئے تھے اور زمانہ جو بیت گیا تھا۔ ایک گونج بن کر آج کی رات کمرے میں بھٹک رہا تھا —— گونج بن کر۔ ایک سرگونج۔

یہ یادیں، نعیم کی یہ حالت، ساس کی باتیں اور دن بھر کی تھکان چیختا ہوا طوفان بن گئی اور طاہرہ ایک تنکا۔ راہ فرار کوئی نہ تھی۔ اس نے اپنے آپ کو حالات کی روش کے حوالے کر دیا اور دل میں اس ارادے کو پختہ کر لیا کہ اپنی ڈگر سے نہیں ہٹے گی۔ یہ احتجاج تھا، ضد تھی یا انتقام، طاہرہ اس سے بے نیاز تھی۔ اسے اپنی ڈگر، اپنی راہ سے انس تھا۔ اس کی راہ کیا تھی؟ —— سکول، سکول کے بچے بچیاں۔ اس نے دو تین بار سوچا تھا کہ ڈرامے سے دستبردار ہو جاتے کیونکہ نعیم کی ماں کو اس کا ہر شام باہر جانا اچھا نہ لگتا تھا اور آج تو ماں نے صاف کہہ دیا تھا —— "ہم نے دیکھ لیا ہے تو ہماری نظروں کے سامنے کیا ڈرامہ کھیل رہی ہے۔ بدچلن!" لیکن آج رات اس نے فیصلہ کر لیا کہ ڈرامے کو پورا کر کے رہے گی۔ ایک نہیں ہزار طوفان آئیں۔ وہ زندگی کی چنگاری بجھنے نہ دے گی۔

طاہرہ نے اپنے آپ کو وقت کے حوالے بھی کر دیا اور ساس کے مقابلے میں اپنی روش سے نہ ہٹنے کا ارادہ بلکہ فیصلہ کر لیا۔ ایسے میں اسے جلال آباد اور لاہور کے درمیان بہتا اور غراتا ہوا وہ دریا یاد آ گیا جس کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے

سیلاب کو اس نے سینے اور بازوؤں کے زور سے عبور کر لیا تھا۔ تھک کر وہ اپنے جسم کو لہروں کے حوالے کر دیتی تھی اور لہروں پر ہی ذرا سا ستا کر پھر لہروں سے سینہ سپر ہو جاتی تھی اور اس نے کنارہ پا لیا تھا۔ آج کی رات بھی اس نے تیر نکلنے کا ارادہ کر کے اپنے آپ کو لہروں کے حوالے کر دیا۔

دوسرے دن خالہ جی بیچ میں رکھ لی حالت دیکھی۔ نعیم کا حال دیکھا۔ نعیم کی ماں کی باتیں اور رات کی تفصیلات سنیں۔ نعیم کے ں دکھوں سے لبریز خاموشی دیکھی۔ دکھاوے کے آنسو بہاتے اور ہوا کا رخ موافق دیکھ کر نعیم کی ماں اور باپ کو خوب اکسایا ذرا پھونک مارنے کی دیر تھی۔ پھر نعیم کے سرہانے جا بیٹھی اور بڑے ہی پیار بھرے لہجے میں طاہرہ کے خلاف زہر شروع کیا۔

"رہنے دو، گلشن بہن" — نعیم کی ماں نے کہا — "ڈاکٹر نے منع کیا ہے اس کے سامنے ایسی ویسی باتیں نہ کرنا۔"

تیسرے روز نعیم اچھا بھلا ہو کر چلنے پھرنے لگا۔ بخار دوسرے ہی روز اتر گیا تھا، لیکن دل کی حرکت کی بے قاعدگی ہنے کی کیفیت اور اعصابی پژمردگی بدستور رہی۔ ڈاکٹر نے اسے باقاعدہ انجکشن شروع کر دیئے اور ہدایت کی کہ ممکن ہو ں کے کمرے میں نہ سویا کرے۔

یہ دو تین روز نعیم دفتر نہ گیا۔ ماں کے کمرے میں ہی رہا۔ طاہرہ حسب معمول سکول جاتی اور ہر شام ریہرسل کے لیے بھی جاتی سے ہمت ہی نہ ہوتی کہ ساس کے کمرے میں جا کر نعیم کو ذرا دیکھ لیتی۔ نوکرانی سے اس کا حال پوچھ کر دل کو سہارا دے لی۔

چوتھی رات نعیم طاہرہ کے کمرے میں گیا تو طاہرہ کو جیسے خواب کا دھوکا ہوا ہو۔ اس نے لپک کر دروازہ بند کر دیا اور کے ساتھ لپٹ گئی۔

"ڈاکٹر نے تمہارے کمرے میں سونے سے منع کیا ہے" — نعیم نے بے رخی سے کہا — "میں ایک کتاب آیا ہوں۔"

"ذرا بیٹھیے تو سہی" — طاہرہ نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا — "مجھے بھی ڈاکٹر نے یہی کچھ کہا ہے لیکن پاس بیٹھنے تو منع نہیں کیا۔"

"جانتا ہوں، طاہرہ! سب کچھ جانتا ہوں" — نعیم نے طاہرہ کے بازوؤں سے نکل کر الماری کھولتے ہوئے کہا — کے اور فریب میں کوئی کب تک جئے۔ ڈاکٹر کو کیا معلوم مجھے کیا روگ ہے۔"

"آخر بات کیا ہے؟" — طاہرہ نے سٹ پٹا کر پوچھا — "یوں لگتا ہے جیسے میں نے آپ کو زہر دے دیا ہے

جس کے ابھی ۔۔۔ آپ بیمار ہو گئے ہیں۔"

"ایک مرض نا کہانی اور ہے" ۔۔۔ نعیم نے تلخ سی مسکراہٹ سے کہا اور آہ لے کر کمرے سے نکل گیا۔

طاہرہ دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ اس لیے نہیں کہ دل بجھ گیا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اس کی دھڑکن کو اور تیز کرنا چاہتی تھی۔ تیز لہریں قیامت خیز شور بپا کرتی اُٹھ رہی تھیں۔ طاہرہ ان کو روندنے پر آمادہ ہو گئی۔ سینے میں آگ لگ گئی تھی اور وہ اسی آگ کی گرمی سے استقلال اور حوصلے کو سینک رہی تھی مبادا یہ ٹھنڈے پڑ جائیں۔

نعیم کی ماں اور خالہ نے اس کے باپ کو تیار کر لیا کہ نعیم کی صحت اچھی ہو جاتے تو طلاق لکھوا کر اور طاہرہ کو زیور دے کر پنڈی بھیج دیا جاتے۔ نعیم کی صحت بظاہر اچھی بھلی تھی۔ ماں نے دو ایک بار بات چھیڑنی چاہی تو نعیم نے طبیعت کو ناسا پاتے ہوئے اکتاہٹ کا اظہار کیا اور ماں خاموش ہو گئی۔

نعیم کے چہرے مہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے کوئی دکھ تکلیف نہیں۔ بھولا بھالا معصوم سا چہرہ، شباب سے منور، آنکھوں اور ہونٹوں کے کونوں میں رومان بسے ہوتے تھے۔ وہی بھرا بھرا سڈول جسم اور وہی جچی تلی چال لیکن اندرونی دنیا میں جو بگولے اُٹھ رہے تھے وہ کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ اسے ہر وقت اور ہر لمحہ وہ منظر دکھائی دیتا تھا۔ ایک آدمی کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں اسے اپنی محبت اور امیدوں سے بھرپور امنگوں کا جنازہ جاتا دکھائی دیتا تھا۔ انتقام کی آگ اس کے قلب و دماغ کو بھون رہی تھی۔ اسے خیالوں کی دنیا میں خون بہتا نظر آیا لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ یہ خون اس کا اپنا ہے، طاہرہ کا یا اُس آدمی کا جو طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اندھیرے میں روپوش ہو گیا تھا۔

پورے سات روز اس نے طاہرہ سے بات نہ کی، نہ اس کی موجودگی میں اس کے کمرے میں گیا۔ طاہرہ نے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا۔ ملازمہ کھانا کمرے میں لے جاتی تھی اور طاہرہ ملازمہ سے نعیم کی صحت کی تفصیلات یوں پوچھا کرتی جیسے منگیتر ایک دوسرے کا حال سات پردوں میں چھپ کر پوچھا کرتے ہیں۔ رات کی تنہائیوں میں وہ نعیم کی صحت کے لیے دعائیں کرتی رہتی تھی۔ حالات کا دھارا جوں جوں اس کے خلاف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسی قدر انہماک سے ڈرامے میں جذب ہوتی جا رہی تھی جو اسے سکول میں سٹیج کرنا تھا۔

اس دوران طاہرہ کی طرف نجمہ کے خطوط آتے رہے اور طاہرہ باقاعدگی سے جواب دیتی رہی۔ تھوڑے عرصے سے اس نے نجمہ کو اپنے گھر کی حالت اور ساس کی ذہنیت کی تفصیلات لکھنی شروع کر دی تھیں جنہیں پڑھ کر نجمہ کو بہت دکھ ہوا۔ وہ اسے ہر خط میں حوصلہ اور تسلیاں لکھا کرتی تھی جن سے طاہرہ کے ارادوں کو اور زیادہ تقویت ملتی تھی۔ طاہرہ ہر خط میں عفت اور ارشد کا حال پوچھا کرتی تھی لیکن نجمہ کو ان کا کچھ علم نہ تھا۔ نجمہ نے کئی بار پشاور آنے کا لکھا تھا اور طاہرہ کو پنڈی بلایا تھا لیکن لکھ دیا تھا کہ وہ پشاور نہ آتے نہ وہ پنڈی آتے گی ۔۔۔ "فضا ابھی شریفوں کے قابل نہیں ہوئی" ۔۔۔ کچھ ایسی ہی وجہ تھی کہ ان کے درمیان خاموشی طاری رہی۔

جوں جوں ڈرامے کے سٹیج کرنے کی رات قریب آتی جا رہی تھی، طاہرہ کو تو جیسے گرد و پیش بھولتا جا رہا تھا۔ ایسی ہی آئیں کہ وہ ریہرسل سے واپس آئی، کھانا کھایا اور نعیم کا حال پوچھے سُنے بغیر ہی سو گئی۔ وہ ڈرامے کو زندہ جاوید شاہکار بنانا اور اس کا ایک ایک لفظ سکول کی ہر بچی اور ہر بچے کے ذہن پر نقش کر دینا چاہتی تھی۔ ڈرامے کی وساطت سے وہ "بیٹی" کا کردار نو نہالوں کی ننھی ننھی ہستیوں میں سمو دینے کا ارادہ بلکہ جنون لیے ہوتے تھی۔

اور جوں جوں ڈرامے کی رات قریب آتی جا رہی تھی نعیم کے دماغ میں ایک اور ڈرامے کا ریہرسل مکمل ہوتا جا رہا تھا۔ ایک خونچکاں ڈرامہ، اس کا دل بدستور کمزور تھا۔ وہ تو بچپن سے ہی کمزور چلا آ رہا تھا لیکن اپنی محبت کے کشت و خون نے اس کے ارادوں کو مضبوط بنا دیا تھا۔ بعض اوقات وہ دل ہی دل میں اپنے ڈرامے کا ریہرسل کرتا تھا تو گھبرا کر سُکڑ جاتا تھا۔ ایسے میں وہ اپنے سامنے اس منظر کو لے آتا تھا ۔۔۔ طاہرہ کے کندھے پر ایک آدمی کا بازو اور سامنے گھُپ اندھیرا ۔۔۔ یہ منظر نعیم کے حوصلے کو زندہ رکھتا تھا۔ وہ گم سم اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ ماں اور باپ کے ساتھ بھی کم ہی بولتا تھا۔ ہر وقت اپنے آپ میں اُلجھا رہتا تھا۔

طاہرہ کے ڈرامے میں چار روز باقی تھے اور نعیم نے اپنے ڈرامے کا ریہرسل مکمل کر لیا تھا۔ وہ ایک رات پہلے طاہرہ اور اس آدمی کا پیچھا کر کے دیکھ آیا تھا کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔ وہ سکول سے نکل کر ڈیڑھ دو فرلانگ آگے جاتے تھے۔ وہاں سے دائیں طرف ایک گلی میں جا کر بائیں کو مڑ جاتے اور دس بارہ گھر آگے جا کر ایک مکان میں داخل ہو جاتے تھے۔ یہ گلی کا آخری مکان تھا۔ اس سے دائیں طرف ایک گلی آملتی تھی۔ نعیم نے اس گلی کا بھی جائزہ لیا تھا۔ یہ گلی ذرا سا گھوم پھر کر سڑک سے جا ملتی تھی۔

دوسری رات نعیم نو بجے کے قریب درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ ساون کی خنک ہوائیں چل رہی تھیں اور اس کی قمیض پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھ انچ لمبے پھل کا کھلا چاقو تھا اور یہ ہاتھ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کانپ اٹھتا تھا۔ نعیم ہاتھ کے لرزے کو ساکن کرنے کے لیے چاقو کو مضبوطی سے پکڑ لیتا تھا۔ اس کی ہستی میں جانے کون چھپا بیٹھا تھا جو اسے خبردار کر رہا تھا ۔۔۔ "تم خون تو نہ کر سکو گے۔ کہیں اپنے آپ کو چاقو نہ مار لینا۔۔۔۔ لوٹ جاؤ، نعیم! پھانسی چڑھ جاؤ گے۔ یہی چاقو تمہیں کاٹ دے گا" ۔۔۔ اور نعیم ان آوازوں کو دبا رہا تھا۔ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ کبھی اسے یوں لگتا جیسے سر سے پاؤں تک اس کے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں وہ ان ٹکڑوں کو جوڑ لیتا اور چاقو کو مضبوطی سے پکڑ لیتا۔

ایک بار تو اس نے چاقو درخت میں مار دیا جیسے اپنے اندر چھپے ہوتے آدمی کو جو اسے اس خوفناک ارادے سے روک رہا تھا قتل کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس نے چاقو کی نوک درخت سے نکالی ہی تھی کہ طاہرہ اور اس کا روزمرہ کا ساتھی سڑک کی بتی کی زرد پیلی سی روشنی میں نمودار ہوتے۔ وہ ہر رات کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ نعیم درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔

جب وہ سڑک کے اندھیرے حصے میں پہنچے تو نعیم خاصا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے ہو لیا۔ اس نے فلیٹ شوز پہنے تھے۔ تاکہ آہٹ پا دبی رہے۔ اسی اندھیرے میں ہی دل کی آگ بجھانے کی خاطر اس نے قدم تیز کر لیے۔ چاقو ہاتھ میں اچھال کر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ اب بزدل اور شرمیلا نعیم نہیں خونی اور قاتل خاوند تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا لیکن سامنے سے آدمی آ رہے تھے۔ نعیم سنبھل گیا اور ٹہلنے کے انداز سے چلنے لگا۔ جوں ہی اس کی چال سست ہوئی اس کے ارادے

بھی مُسبدتی ہو گئے۔ نعیم بجھ سا گیا جیسے اب تیز بھی نہ چل سکے گا۔ طاہرہ کا چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔ طاہرہ مُسکرا رہی تھی چاقو اس کی گرفت سے سرکنے لگا۔

دونوں آدمی طاہرہ اور اس کے ساتھی کو دیکھتے چلے آ رہے تھے اور جب وہ نعیم کے قریب سے گزرے تو ایک نے پیچھے گھوم کر دیکھا اور کہا — "مزا آیا نا سیر کا۔ کیا بازو گردن کے گرد ڈالے لیے جا رہا ہے۔"

"سالے نے کسی کی بہو بیٹی یا بیوی اڑائی ہو گی" — دوسرا بولا — "اپنی ہوتی تو یوں اندھیری سڑکوں پر نہ لیے پھرتا کسی مردار خاوند کی بیوی ہو گی۔"

دونوں نے مل کر قہقہہ لگایا۔

نعیم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان پھبتیوں نے اس کی بجھتی آگ پر تیل چھڑک دیا۔ چاقو پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ طاہرہ کا چہرہ غائب ہو گیا۔ نعیم کا دل اچھل کر باہر آنے لگا۔ وہ ایسی رفتار سے چل پڑا جیسے بھاگ اٹھا ہو۔ طاہرہ اور اس کا ساتھی گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ جب نعیم گلی میں داخل ہوا تو سامنے سے چار عورتیں آ رہی تھیں جو آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ نعیم نے سوچا کہ ان عورتوں کے گزر جانے کا انتظار کیا تو شکار مکان میں داخل ہو چکا ہو گا۔ ابھی ڈیڑھ دو سو گز آگے جانا تھا۔ وہ وہاں سے واپس ہو گیا اور سرپٹ بھاگ کر سڑک کی طرف سے دوسری گلی میں داخل ہو گیا۔

یہ گلی سنسان پڑی تھی۔ نعیم اس آدمی کے مکان کے سامنے اس دوسری گلی میں ایک اور مکان کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اسے طاہرہ اور اس کے ساتھی کی باتیں سنائی دینے لگی تھیں۔ نعیم نے چاقو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کیفیت جو قتل سے پہلے قاتل پر طاری ہوتی ہے۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ جہاں وہ کھڑا ہے اس کے بالکل اوپر بتی جل رہی ہے جس میں نظر آ رہا ہے۔ اس آدمی کا مکان بھی اس روشنی میں نظر آ رہا تھا۔

اسے بتی کا خیال آ ہی گیا اور یہ بھی کہ روشنی میں چاقو کا وار کر کے اور نظر بچا کر بھاگنا آسان نہیں لیکن اب سکیم پر نظرثانی کا وقت نہیں تھا۔ اسے طاہرہ اور اس کے ساتھی کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دینے لگی تھی۔ اس نے دیوار کی اوٹ سے ایک آنکھ ذرا آگے کر کے دیکھا۔ اس کا شکار مکان کے دروازے سے پانچ چھ قدم دور رہ گیا تھا۔ اس نے گلی میں پیچھے اور آگے دیکھا۔ گلی سنسان تھی اور بھاگنے کے لیے موزوں۔

نعیم نے دل ہی دل میں ریہرسل کیا تھا کہ وہ ان پر لپکے گا اور چاقو کا ایک وار اس آدمی کے عین دل پر کرے گا۔ دوسرا وار ... کے دل پر اور دوسری گلی سے بھاگ جائے گا۔ ایک ایک وار کافی تھا۔ یہ چاقو اس نے دَرے کے ایک پٹھان سے پانچ روپے ... پر لیا تھا۔ پٹھان نے اسے بتایا تھا کہ اس کی نوک زہر میں بجھی ہوئی ہے۔

جب طاہرہ اور اس کا ساتھی دروازے سے دو قدم دور رہ گئے تو نعیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ گہرا سانس لیا۔ دوسرے ثانیے آنکھیں کھول کر شکار پر جھپٹنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس آدمی کے مکان کا دروازہ کھُلا اور دو عورتیں باہر نکلیں۔ نعیم نے رک جانا چاہا لیکن وہ سامنے آ چکا تھا۔ سر پر جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں وہ چھُپ نہیں سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ طاہرہ نے اسے دیکھ لیا ہے اور رک بھی گئی ہے۔ نعیم نے اب بھاگنا بیکار سمجھا۔ اس میں اور اس کے ... صرف چار قدم کا فاصلہ تھا۔ نعیم یوں رک گیا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ وہ خون جو اس کی آنکھوں میں ... تھا جسم کے اندر ہی کہیں جذب ہو گیا۔ قاتل اور خونی خاوند کمزور دل اور شرمیلا نعیم بن گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے۔ ... روشنی طاہرہ اور اس کے ساتھی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"آپ؟" — طاہرہ نے وہیں کھڑے کھڑے تعجب سے کہا۔

"کون؟" — اس آدمی نے طاہرہ کے ساتھ ہی رک کر پوچھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک طاہرہ کے کندھے پر تھا۔ دوسرے ہاتھ ... تھی۔ آنکھوں پر گہرے رنگ کا چشمہ اور سر پر جناح کیپ، داڑھی اور مونچھیں بالکل صاف تھیں۔

"میرے شوہر ہیں .... نعیم صاحب!" — طاہرہ نے اپنے ساتھی کو بتایا۔

نعیم وہیں رکا رہا۔ ہاتھ پیچھے کیے ہوئے تھے۔ وہ پسینے میں ڈوبتے ہوئے جسم کے رعشہ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اوہ! اتفاق سے ملاقات ہو گئی" — طاہرہ کے ساتھی نے کہا اور ہاتھ طاہرہ کے کندھے سے اٹھا کر دائیں اس ہاتھ ... اور دایاں ہاتھ یوں آگے کر دیا جیسے نعیم اس سے ایک قدم دور کھڑا ہو اور وہ اس سے ہاتھ ملا لے گا۔ بولا — "لائیے ہاتھ تو ملا لیجیے۔"

نعیم بغیر جواب دیئے آگے بڑھا۔ اس آدمی کا ہاتھ ابھی تک آگے بڑھا ہوا نعیم کے ہاتھ کا انتظار کر رہا تھا۔

"آگے آئیں نا!" — طاہرہ نے نعیم کو شگفتہ لہجے میں کہا — "وہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ ان سے ملیں" — طاہرہ نے کہا — "یہ ہمارے نابینا موسیقار ہیں۔ ماسٹر کرامت حسین۔ میں انہیں ہر روز گھر چھوڑنے ... ہوں۔"

نعیم کے دماغ میں ایک چکر اُلٹے رخ چل پڑا اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے قریب ہو کر دیکھا کہ جو چہرہ سکول ... بتی کی زرد اور مدہم روشنی میں جوان نظر آتا تھا۔ وہ بڑھاپے کی باریک باریک جھریوں سے بھرپور تھا۔ اس نے آگے ہو ... ہاتھ تھاما اور دبا کر مصافحہ کیا۔

"آ جاؤ، میرے بچو!" — اندھے موسیقار نے کہا — "چلو، طاہرہ بیٹی! انہیں اندر لاؤ۔ آج اپنی بیٹی کے ہاتھ کی چائے ... لیے۔"

نعیم کو محسوس ہوا جیسے وہ چاقو اپنے دل میں گھونپ لے گا۔ ایک ہی وار کافی ہو گا۔ اس خوفناک احساس کے ساتھ ہی ... چاقو والا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ طاہرہ دروازے کا تالا کھول کر موسیقار کا ہاتھ تھامے دروازے میں داخل ہو رہی ... پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے جلدی سے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

کمرے میں طاہرہ نے بتی جلائی۔ تینوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ نعیم نے دیکھا کہ موسیقار کا چہرہ اپنے اُوپر کم و بیش ... کے گہرے آثار لیے ہوئے تھا۔ جب اس نے ٹوپی اُتاری تو دیکھا کہ سر کا ایک بھی بال سیاہ نہیں تھا۔

"تم بیٹی چائے بناؤ" — موسیقار نے طاہرہ سے کہا — "نعیم بیٹا! میں مشرقی پنجاب میں سن سنتالیس میں اندھا ہو گیا ..." اس نے سیاہ چشمہ اُتار دیا۔ اس کی دونوں آنکھیں بیٹھی ہوئی تھیں، جیسے جل گئی ہوں — اس نے کہا — "بیٹا طاہرہ نے

ڈرامہ خوب لکھا ہے۔"

"یہاں آپ اکیلے رہتے ہیں؟"۔۔۔ نعیم نے جیسے خواب میں پوچھا ہو۔

"اکیلے کہاں بیٹے!"۔۔۔ موسیقار نے سکون آمیز ہنسی ہنس کر کہا۔۔۔ "ابھی طاہرہ بیٹی چلی جائے گی تو شاگرد جمع ہو جائیں گے اور یہاں چہل پہل ہو جائے گی گھر کا کام کاج، کھانا پکانا، سب کچھ وہی کرتے ہیں عجب خوبصورت زندگی ہے نعیم بیٹا!"

"آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"۔۔۔ طاہرہ چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں آئی اور نعیم سے پوچھا۔

"ایک دوست سے ملنے آیا تھا"۔۔۔ نعیم نے ذرا جھجک کر جواب دیا۔

نعیم اور طاہرہ جب موسیقار کے گھر سے نکلنے لگے تو موسیقار نے پیار بھری آواز میں کہا۔۔۔ "نعیم بیٹا! طاہری بیٹی کو شادی کے بعد بھی یہاں ضرور لایا کرنا۔ میری دکھیاری زندگی کا سہارا یہی ساز اور نغمے ہیں یا یہ بچے ہیں جو سیکھنے آتے ہیں۔ طاہرہ بچی نے تو مجھے زندگی دے دی ہے۔۔۔ اچھا بچو! جاؤ۔ خوب محبت اور پیار سے رہو۔ خدا تمہیں دنیا بھر کی خوشیاں مبارک کرے۔ آمین۔ میری بچی تمہارا ذکر کرتی ہے کہتی ہے میرے نعیم صاحب بڑے اچھے ہیں۔۔۔ طاہرہ بیٹی تو مجھ اندھے کی لاٹھی بن گئی ہے۔ میری بھی بچی تھی۔ اتنی ہی بڑی تھی۔۔۔ ہاں، وہ بھی ایسی ہی تھی"۔۔۔ اس کی آواز رندھیا گئی۔ اس نے گھونٹ سا نگل کر کہا۔۔۔ "وہاں تو ہزار بچیاں قوم کی آزادی پر قربان ہو گئی ہیں۔۔۔ جاؤ بچو، جاؤ۔"

نعیم اور طاہرہ دروازے میں کھڑے تھے نعیم کا ہاتھ طاہرہ کے ہاتھ کا گداز محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھ رہا تھا اور اچھل رہا تھا۔ دل کی حرکت بے قاعدہ ہوئی جا رہی تھی۔ اسے خوشی کا یہ صدمہ بھی ویسا ہی ہولناک معلوم ہو رہا تھا جیسے غم کا دھچکا۔ اس کے ساتھ خفت کا عنصر بھی شامل تھا۔ اسے طاہرہ بالکل ہی بدلے اور نکھرے ہوئے روپ میں دکھائی دے رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے طاہرہ گہرے کنوئیں میں گر گئی تھی اور صحیح سلامت نکل کر اس کے پاس پہنچ گئی ہو۔

نعیم کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ مسرت کے اس دھچکے سے روئے یا ہنسے۔ اس کا دل بے ساختگی سے چیخنے اور گانے کو مچل رہا تھا اور اس کی آنکھیں آنسو بہانا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے آپ سے بے قابو ہوا جا رہا تھا اور جذبات کے ہاتھوں اسی طرح بے بس جس طرح اس رات ہوا تھا جب اس نے طاہرہ کو ایک غیر مرد کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندھیرے میں گم ہوتے دیکھا تھا۔

نعیم اور طاہرہ گھر کو جا رہے تھے۔ طاہرہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے شاید طبیعت کا حال بھی پوچھا تھا۔ اس نے یہ بھی پوچھا تھا۔۔۔ "آپ ابھی تک ناراض ہیں؟"۔۔۔ وہ ہنسی بھی تھی۔ اس نے بہت کچھ پوچھا تھا اور ڈرامے کے متعلق بھی اس نے چند ایک باتیں کی تھیں اور نعیم اسے بے خیالی میں جواب دیتا رہا تھا نعیم ایک جدوجہد میں مصروف تھا۔ اپنے خلاف برسرپیکار۔ اس کا وجود کمزور سے درخت کی طرح تیز و تند آندھی سے لرز رہا تھا اور پاؤں اکھڑ رہے تھے۔ یہ آندھی تیز بھی تھی اور خنک بھی خنکی بھی نعیم کے تھکے ہارے کچلے ہوئے اعصاب سکون پذیر ہو رہے تھے۔ اس کے جذبات و احساسات میں افراتفری بپا تھی۔ اسے گمان ہو رہا تھا کہ وہ مسرت سے مغلوب ہو کر چیخ اٹھے گا یا اس کے آنسو نکلیں گے یا وہ بے اختیار طاہرہ کے

جائے گا۔ وہ طاہرہ کو بازوؤں پر اٹھا کر گھر تک لے جانا چاہتا تھا۔ وہ خیالوں میں طاہرہ کی طرف لپکا بھی تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو اس طرح ضبط کیا تھا جیسے تیز موٹر کے سامنے کسی کے آ جانے سے بریکیں لگائی جاتی ہیں۔

وہ سڑک کے اس حصے سے گزر رہے تھے جو کسی حد تک سنسان تھا اور جہاں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ طاہرہ رک گئی اور اس سے پوچھا۔ "تانگہ لے لیں؟ آپ اتنی دور تک پیدل چلتے تھک جائیں گے۔"

نعیم رک گیا۔ ادھر ادھر دیکھا جیسے کسی تانگے کو دیکھ رہا ہو۔ دور دور تک نہ تانگہ تھا نہ کوئی انسان نعیم نے بے ساختگی سے طاہرہ کے دونوں کندھوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اسے سینے کے ساتھ لگا کر اس قدر زور سے بھینچا کہ اس کے اپنے آنسو نکل آئے اور رقت کا یہ عالم کہ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ آواز حلق میں دب گئی تھی۔

"ارے سڑک ہے! کچھ تو خیال کریں"۔۔۔ طاہرہ نے اس کے بازوؤں کی گرفت میں تڑپتے ہوئے کہا۔

"پیدل چلیں گے"۔۔۔ نعیم نے کہا۔۔۔ "میں تو اب اچھا بھلا ہوں۔"

اور اس نے طاہرہ کے بائیں کندھے پر بایاں ہاتھ اسی طرح رکھ لیا جس طرح اندھا موسیقار رکھا کرتا تھا نعیم نے طاہرہ کو نئے نعیم کو پا لیا تھا۔ دونوں یوں چلے جا رہے تھے جیسے کسی حسین و خوش رنگ خیالی دنیا میں چلے جا رہے ہوں اور انہیں پتہ بھی نہ ہوا کہ گھر آ گیا تھا۔

نعیم جوں ہی گھر میں داخل ہوا اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ خوشی کی یہ خبر ماں اور باپ کو کس طرح سنائے۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی آ گیا کہ وہ اتنی جلدی یقین نہیں کریں گے نعیم کا گھر وہ مقام تھا جہاں اس کا دل پھر بھی لرزنے لگا۔ جب دونوں داخل ہوئے تو نعیم کی ماں صحن میں نکل آئی۔ باپ بھی آواز سن کر نکل آیا۔ جب ماں اور باپ نے دونوں کو اکٹھے آتے دیکھا اور ان کے چہروں پر کھلی ہوئی مسکراہٹ دیکھی تو باپ تو اپنی جگہ قائم رہا، ماں کے چہرے کا تغیر بتا رہا تھا کہ بجلی گری ہے اور بس جل گیا ہے۔

طاہرہ نے کئی روز کے بعد اپنے مخصوص بے ساختہ لہجے میں "اسلام علیکم" کہا جس کا جواب صرف باپ نے ذرا سے ہونٹ ہلا کر دیا۔ ماں جہاں کھڑی تھی وہیں پتھر ہو گئی۔ طاہرہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ کیا طوفان اٹھا تھا اور آج کیا انقلاب آیا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ نعیم کی اس اچانک بیماری میں کیا راز تھا، وہ ناراض کیوں ہو گیا تھا اور آج یہ طوفان کیونکر تھم گیا ہے وہ نہیں جانتی تھی کہ نعیم کہاں چلا گیا تھا؟ اس کے قریب ہوتے ہوئے اس سے اتنی دور کیوں ہو گیا تھا اور آج وہ کیسے لوٹ آیا ہے۔

طاہرہ کے ذہن میں یہ سوال بیدار نہ ہوئے کیونکہ اسے کچھ بھی تو معلوم نہ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں گئی اور نعیم باپ کے کمرے میں جا بیٹھا۔ ماں بھی پیچھے پیچھے چلی گئی نعیم نے دروازے کی طرف دیکھا کہ کہیں طاہرہ بھی نہ آ جائے۔ اس نے ماں اور باپ کو بتایا کہ اس نے کس طرح طاہرہ کا پیچھا کیا تھا اور جس آدمی کو وہ جانے کیا کچھ سمجھ رہے تھے۔ وہ اندھا موسیقار نکلا جو عمر کے لحاظ سے طاہرہ کے باپ سے بھی بڑا ہے اور وہ طاہرہ کو "طاہرہ بیٹی" کہتا ہے۔ نعیم نے والدین کو ساری باتیں سنا کر طاہرہ کی اس قدر تعریف کی کہ اس کی ماں کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

باپ آخر مرد تھا۔ وہ نعیم کی ماں اور خالہ کی تخریبی سرگرمیوں کی رَو میں بہ گیا تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے کانوں میں کچھ باتیں پڑتی رہتی تھیں۔ طاہرہ کی طرف سے خاموشی تھی جسے اس نے مجرمانہ خاموشی سمجھ لیا تھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں طاہرہ کو ایک غیر مرد کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ شک کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے جو دیکھا اس سے سنی سنائی کی تصدیق ہوگئی۔

اور آج جب نعیم نے اسے صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس کے اعصاب سے منوں بوجھ اُتر گیا۔ اس کی مرجھائی ہوئی روح ایک بار پھر شگفتہ ہوگئی۔ بوڑھا ہلکا پھلکا ہوگیا لیکن ماں نے اسے ایک جوابی حملہ سمجھا اور وہ مقابلے میں ڈٹ گئی۔ پہلے تو وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ جب نعیم خاموش ہوگیا اور باپ نے سکون اور اطمینان کی گہری سانس لی تو ماں کی خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اُفق سے گرد و غبار کے بادل اٹھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں تُندی پیدا ہوئی۔ پھر آندھی اور ہر طرف گرد ہی گرد اُڑنے لگی۔ ماں نے نعیم کی بات کو ہر پہلو سے جھٹلایا لیکن باپ بیٹا دونوں اس کے پیچھے پڑ گئے۔ ماں کے پاؤں ایک بار تو اکھڑ ہی گئے تھے لیکن اس نے دیکھا کہ پہلے بیٹا ہاتھ سے نکلا اب بیٹے کا باپ بھی ہاتھ سے جا رہا ہے تو اپنی اصلی سطح پر آگئی اور بولی ۔۔۔ "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ لڑکی ہر داؤ جانتی ہے، سب کو بدھو بنا لے گی۔ تم رکھو اسے گھر میں اور لوگوں سے مُنہ پر کالک ملواتے رہو۔ اس گھر میں وہ جادو رہے گی یا میں رہوں گی۔ میں اتنی بے غیرت نہیں۔" ۔۔۔ اور وہ اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

"دیکھو بیٹا!" ۔۔۔ باپ نے نعیم کو بزرگانہ خود اعتمادی سے کہا ۔۔۔ "تم خود سمجھدار ہو اور عقل والے ہو۔ خود سوچ سمجھ لو اگر تم نے یقین کر لیا ہے کہ یہ محض غلط فہمی تھی تو مجھے بھی اطمینان ہے۔ باقی رہا ماں کا قصہ۔ تو یہ قصہ پرانا ہے بیٹا! یہ بوڑھی ہوگئی ہے اور یہ ساس ہے۔ اس کان سنو اس کان نکال دو۔ ہم بڈھے کل پرسوں اس دنیا سے اٹھ جائیں گے۔ زندہ تمہیں اور تمہاری بیوی کو رہنا ہے سکون سے زندہ رہو۔"

"ابا جان! یہ خالہ کہاں سے ٹپک پڑی ہے" ۔۔۔ نعیم نے کہا ۔۔۔ "معلوم ہوتا ہے اسے ہمارے گھر کے ساتھ کوئی خاص دلچسپی ہے۔ اس سے پہلے تو اس کی صورت بھی نہ دیکھی تھی کبھی۔"

"ارے وہ تو پکی فسادی عورت ہے بھئی!" ۔۔۔ باپ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا ۔۔۔ "یاد نہیں تمہیں؟ اپنے وہاں جالندھر میں اس نے کیا گُل کھلائے تھے؟ رحیم بخش اور فقیرے میں ڈانگ سوٹا کس نے چلوایا تھا؟ ان کی اتنی اور مثالی دوستی کس نے کاٹ کھائی تھی؟ اس تمہاری خالہ گلشن نے۔ کیوں؟ صرف قدرن کے رشتے پر، حالانکہ اس کا اس کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ تعلق تھا تو صرف یہ کہ وہ ایک گھر سے کھاتی تھی، رحیم بخش نے اسے قدرن کے رشتے خاطر دو جوڑے کپڑے بھی دیتے تھے، اور اس کمبخت گلشن نے ایسی چال چلی تھی کہ دو پرانے دوستوں کو آپس میں لڑا کر ان سر کھلوائے اور رشتہ تیسرا آدمی لے گیا۔ یہ تو اس کا پرانا پیشہ ہے نعیم! میں اب اسے یہاں آنے سے روک دوں گا۔ کیا اس کا خاوند، دونوں بلیک میلر ہیں۔ اس روز پتہ چلا ہے کہ تمہاری ماں کو کہتی رہی ہے کہ طاہرہ کو طلاق دے دو اور کریم دادا کی لڑکی کا رشتہ دوسرے ہی دن دلوا دوں گی۔ وہ دلالی کر رہی ہے۔"

"کریم دادا کی لڑکی؟"

"ہاں!" ۔۔۔ باپ نے کہا ۔۔۔ "جو اتنی مشکوک لڑکی ہے کہ آج تک ان کے ہاں رشتہ مانگنے کوئی نہیں گیا اور نہ ہی کوئی اس رشتے کو قبول کرے گا۔"

وہ رات نعیم اور طاہرہ کی ایک اور شبِ عروسی تھی۔ طاہرہ نے نعیم سے بہت کچھ پوچھا بہت کریدا لیکن نعیم نے اسے ۔۔۔ منظر کی بات اس کے خلاف الزام، ماں، خالہ اور اس کی سرگرمیاں اور تعاقب، چاقو اور خوفناک ارادہ نہ بتایا۔ یہ سب باتیں ۔۔۔ لے دل میں جوڑ رکھ لیں تو اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس نے اپنے سینے اور اعصاب پر ایک سِل رکھ لی ہو۔ اس کے ضمیر پر گناہ اور بڑا وزنی پتھر آپڑا۔ وہ طاہرہ سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن معافی کیسے مانگتا اور کس لغزش کی معذرت کرتا؟ طاہرہ کو لغزش کا علم نہ تھا اور وہ طاہرہ کو اپنی لغزش بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ معافی اور معذرت اس کے دل و دماغ پر بوجھ بنتی جا رہی اور یہ بوجھ ایک جُرم کا بوجھ بن کر اس کے ضمیر پر گر رہا تھا۔ بہتر تھا کہ وہ اسے طاہرہ کے سامنے اگل دیتا اور قلب و دماغ کو ہلکا ۔۔۔ لیکن وہ اس احساسِ جرم کا سامنا کرتے سے گھبرا رہا تھا۔

اس راز کو اب وہ اپنے آپ سے بھی چھپا رہا تھا مگر یہ راز نہایت سرعت سے ایک زہر بنتا گیا اور اس کے ریشے ریشے ۔۔۔ سرایت کرتا رہا۔ یہ خفت اور پچھتاوے کی انتہا تھی۔ اندھا موسیقار اور اس کے ایک ایک لفظ میں بچوں کا پیار اس کے خیالوں ۔۔۔ نقش بن گیا تھا ۔۔۔ "نعیم بیٹا! طاہرہ بیٹی! نعیم بیٹا! طاہرہ بیٹی! ... میری ایک بچی تھی جو طاہرہ کی طرح تھی ... طاہرہ بچی ہر روز کہتی ہے میرے نعیم صاحب بڑے اچھے ہیں ..."

یہ الفاظ نعیم کے ذہن میں گونجنے لگے۔ اس کے ساتھ دو تین اور آوازیں ۔۔۔ "اس چاقو کی نوک زہر میں بجھی ہوئی ہے صرف ۔۔۔ وار کافی ہے ... تم نے کہا تھا کہ طاہرہ تمہیں دھوکا دے رہی ہے تم نے طاہرہ کو قتل کرنا چاہا تھا۔ یہ طاہرہ جو اندھے کی لاٹھی ۔۔۔ تم نے اسے بدچلن کہا تھا ... تم نے نعیم! تم نے! تم نے جس کے ذرا سے دکھ پر طاہرہ جان نثار کرتی ہے ... طاہرہ ۔۔۔ نعیم بیٹا! ... جھک جاؤ اس کے سامنے ... طاہرہ بچی ہر روز کہتی ہے میرے نعیم صاحب بڑے اچھے ہیں ... طاہرہ ۔۔۔ دل پر ایک وار کر کے بھاگ جاؤں گا ... اس چاقو کی نوک ..."

نعیم نے کئی بار سر کو جھٹکا دیا کہ ان خیالات اور خلش کو جھٹک کر طاہرہ کی آغوش میں چھپ جاتے اور اس نے کئی بار ایسے ۔۔۔ بھی جیسے ڈرا ہوا بچہ کرتا ہے۔ طاہرہ کو نعیم کی انہی بچوں کی سی حرکات سے پیار تھا۔ نعیم کی یہی کمزوریاں طاہرہ کو بہت پیاری ۔۔۔ تھیں۔ شاید اسی لیے کہ اسے ماں کا احساس ملتا تھا اور اس پیار میں ایک تقدس ہوتا تھا یا برتری کی جھلک ہوتی تھی کیونکہ نعیم ۔۔۔ کے سامنے بچہ بن جایا کرتا مگر اب وہ نعیم کی اندرونی کیفیت سے واقف نہیں تھی۔ نعیم اپنے اندرونی طوفان سے گھبرا کر طاہرہ ۔۔۔ محبت میں پناہ گزین ہوتا تھا اور طاہرہ اس کے جواب میں اس طرح محبت کرتی تھی جیسے اس کا بال بال نعیم کو چوم رہا ہو۔ طاہرہ کا یہ والہانہ ۔۔۔ محبت نعیم کے مجرم ضمیر کا مُنہ چڑاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی معافی مانگنے کی شدید خواہش اور ان سب کا ایک دوسرے سے ۔۔۔ تصادم، تصادم کے دھماکے اور قیامت خیز شور نعیم کے دل، روح اور اعصاب کو کچلنے لگا۔

اس اندرونی افراتفری اور ہنگاموں کے ساتھ پھٹتا ہوا آتش فشاں پہاڑ ۔۔۔ نعیم کی ماں ۔۔۔ جس نے دیکھا کہ اب طاہرہ ۔۔۔ پہلے سے زیادہ نعیم پر قابض ہوگئی ہے تو وہ بیہودہ پن پر اُتر آئی۔ نعیم کے لاشعور میں ماں کا پیار رچا ہوا تھا لیکن شعوری طور پر وہ ماں سے ۔۔۔ نفرت کرنے لگا تھا۔ ماں کی ایک ایک بات سے اسے گھن آنے لگی تھی اور وہ ماں کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ماں سے دور

بھی ہٹ رہا تھا اور کوئی قوت اسے ماں کی طرف گھسیٹ بھی رہی تھی۔ باپ اور طاہرہ کا روحانی اور اخلاقی سہارا نہ ہوتا تو وہ ماں کا یا اپنا گلا گھونٹ لیتا۔

لاڈ و پیار سے بگڑا ہُوا ماں کا اکلوتا بیٹا اظہارِ نیت کے طور طریقوں سے ناواقف تھا۔ اس کی شخصیت خفت اور احساسِ جرم کے گھومتے پتھروں کے درمیان پس رہی تھی اور وہ اس مقام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا جہاں نفسیاتی جسمانی امراض کی صُورت اختیار کر لیتی ہیں۔

ہنگامہ تو اُس روز ہُوا جب خالہ تین چار روز بعد ان کے گھر آئی۔ اسے معلُوم نہ تھا کہ خُدا نے نعیم اور طاہرہ کو پھر ایک ہے اور باپ نے دونوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ وہ اس طرح گھر میں داخل ہُوئی اور ایسے لہجے میں ماں کے ساتھ باتیں شروع کیں جیسے اس گھر کی کرتا دھرتا وہی ہو اور یہاں اسی کا حُکم چلتا ہو۔ باپ کمرے میں بیٹھا سن رہا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ نعیم اور طاہرہ اپنے کمرے میں تھے۔ خالہ باتیں کر رہی تھی کہ نعیم کا باپ کمرے سے نکلا۔

"سُنو گلشن!" ــــ باپ نے صحن میں آ کر کہا "تم نے جالندھر والی کرتُوت یہاں بھی شروع کر دی ہے۔ چڑیل سات گھر چھوڑ کر کرتی ہے اور ایک کو بخش دیتی ہے، لیکن تم وہ چڑیل ہو جو ساتوں کو نگل جاتی ہو۔"

"کیا ہُوا بھائیا جی؟" ــــ اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی کہ اپنی سگی بہن کے گھر کو ویران کر رہی ہو؟" ــــ باپ نے گرجدار آواز میں کہا۔ "جا نکل یہاں سے۔ پھر یہاں قدم رکھا تو حلیہ بگاڑ کے رکھ دوں گا۔"

"بھائیا جی! ہوش کی بات کرو" ــــ گلشن نے ایسے لہجے میں کہا جو تحکمانہ بھی تھا اور التجا آمیز بھی ــ "گھر آپ کا۔ کیا! میں تو آپ کے بھلے کی بات کر رہی تھی۔"

"ہمارا بھلا اسی میں ہے خالہ کہ یہاں نہ آیا کرو" ــــ نعیم نے اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا۔

"شرم کرو، بے غیرتو! غیرت کرو" ــ نعیم کی ماں اپنی بہن کی طرف سے میدان میں اُتر آئی ــ "اپنی اس بدمعاشی پر پردہ ڈالنے کے لیے میری بہن کو گھر سے نکال رہے ہو؟"

اور ماں نے وہ اودھم مچایا کہ نعیم کا باپ پہلے تو گرجتا رہا، پھر سر جُھکا کر اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن کمرے میں جانے سے پہلے وہ خالہ کو گھر سے نکال چکا تھا۔ خالہ گھر سے اس طرح نکلی جیسے ابھی کلہاڑی لے کے آ جائے گی اور سب کو قتل کر دے گی۔ اس کے جانے کے بعد ماں کے منہ میں جو آیا اس نے کہا۔ نہ خاوند کا ادب نہ بہو بیٹے کا لحاظ۔ سب اپنے اپنے کمروں میں دبک گئے۔

خالہ تو اس گھر سے نکل گئی لیکن جو فتنہ پیدا کر گئی تھی وہ نہ نکلا۔ دوسری صبح ماں نے ایک اور حرکت کی۔ اس نے نوکرانی کو گالیاں دیں اور کہا ــ "خبردار جو اس باورچی خانے میں آئی تو۔ جا جس کے لیے رکھا ہُوا ہے سمجھے کسی نے اُسی کے پاس کام کر۔"

نعیم اور اس کے باپ کو پھر جھک جھک کرنی پڑی۔ ماں نے کہا ــــ "یہ نوکرانی نہیں دلال ہے۔ تیری بہو کی دلالی کرتی

باپ کی غیرت کہاں تک برداشت کرتی۔ وہ تو جیسے اندھا ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور تھپڑ نعیم کی ماں کے منہ پر مارا اور بڑھیا دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اس کی کنپٹی سے خون نکل آیا۔ نعیم نے ماں کو اس حال میں دیکھا تو وہ سب کچھ بھول گیا۔ طاہرہ کو بھی بھول گیا۔ اسے معاً جالندھر سے بھاگنے کے وہ مناظر یاد آ گئے کہ نیچے اپنی قتل کی ہوئی ماؤں کی لاشوں پر گرتے تھے اور ماؤں کی برچھیاں انہیں بھی وہیں ختم کر رہی تھیں۔ چشم زدن میں نعیم کو وہ تمام مناظر دکھائی دینے اور ان ہی بچوں کی طرح جب اُس نے ماں کو دیوار کے ساتھ ٹکرا کر گرتے دیکھا تو وہ گرد و پیش کو بھول کر ایک ہی جست میں ماں پر جا جُھکا اور اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔

نعیم کے آنسو نکل آئے۔ ماں پر خاموشی طاری تھی اور سانس پھولا ہُوا۔ خاموشی بھی ایسی کہ جیسے بے ہوش ہو گئی ہو۔ طاہرہ بھی پہنچ گئی۔ باپ اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ نعیم بے تابی سے "امّی! امّی! امّی!" کہتا جا رہا تھا اور بچوں کی طرح ماں سے لپٹ رہا تھا۔ طاہرہ نے ساس کی کنپٹی سے خون صاف کیا، پٹی باندھی اور اس دن نہ نعیم دفتر گیا نہ طاہرہ سکول گئی۔ گھر کی فضا میں کشیدگی، اداسی اور بے چینی پھیلی ہُوئی تھی۔

دوسری صُبح طلُوع ہُوئی۔ گھر کے سب افراد حسبِ معمُول جاگے۔ نعیم کی ماں اپنا ٹرنک صحن میں رکھ کر اعلان کر رہی تھی ــــ "سنبھالو تمہارا گھر۔ اپنی گزر یہاں مُشکل ہے" ــــ اور اُس نے وہ سب کچھ کہا جو اس قسم کی عورت، اس قسم کی فضا اور اس قسم کے موقعہ پر کہہ سکتی ہے۔

سب سے پہلے طاہرہ جا کر اس سے بغل گیر ہو گئی اور بچّوں کی طرح ملتجی لہجے میں معافی مانگی جس کے جواب میں ماں نے طاہرہ کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگی اور طاہرہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ماں کو پتہ نہ تھا کہ جس کو اُس نے دھکا دیا ہے یہ وہ لڑکی ہے جس نے سکھوں کی پے بہ پے برچھیوں کا مقابلہ کر کے برچھی سے کئی سکھوں کو ختم کیا ہے۔ دریا کی ٹھاٹھیں مارتی ہُوئی موجوں سے وہ سینہ سپر ہُوئی ہے اور اگر اس میں وہ رگ پھر بیدار ہو جائے تو ساس کی گردن مروڑ کر رکھ دے لیکن یہاں صُورت کچھ اور تھی۔ طاہرہ تو دھکے سے دیوار کے ساتھ جا لگی اور گر پڑی لیکن اس کا اخلاق اور اُوپر اُٹھ گیا۔ اس کے کردار کی بلندی اور زیادہ ہو گئی۔

نعیم کی نگاہ میں اب ماں کے دو رُوپ ہو گئے تھے۔ ایک ماں جس کے بغیر اس کی زندگی اداس ہو جاتی تھی یہ وہ ماں تھی جسے ہلکے سے سر درد پر بھی یاد آتی تھی۔ دوسرا رُوپ ایک ایسی عورت کا تھا جس سے نعیم کو نفرت تھی کیونکہ یہ عورت اس کی محبوب بیوی کے خلاف برسرِ پیکار تھی۔ اس عورت کو وہ قتل کر دینا چاہتا تھا اور ماں کی گود میں سر رکھ دینا چاہتا تھا۔ محبت اور نفرت پہلو بہ پہلو چل رہے تھے جس طرح چکی کے پتھر چلتے ہیں نعیم کے قلب و دماغ پس رہے تھے۔ لاشعُور اور شعور میں ہیبت ناک کشمکش تھی۔

جب گھر کے حالات نے یہ شدت اختیار کی تو نعیم کے دِل پر گہرا اثر ہُوا جو روز بروز گہرا ہی ہوتا گیا۔ ڈاکٹر اسے ہر تیسرے روز انجکشن دے رہا تھا۔ اس کے خون کا بھی معائنہ کر چکا تھا لیکن دل کی حالت بہتر ہونے کی بجائے خراب ہوتی جا رہی تھی۔ خون کا دباؤ بعض اوقات تیز ہو جاتا اور بعض اوقات معمُول سے بھی نیچے گر جاتا تھا۔ وہ بظاہر اچھا بھلا تھا لیکن اس کے اندر اور باہر جو

کشت و خون ہو رہا تھا وہ جالندھر سے ہجرت کے وقت سے کم نہ تھا۔

نعیم کی زندگی میں وہ لمحات بھی آتے کہ اس نے خودکشی پر بھی غور کیا۔

وہ رات آئی جو آزادی کی یادیں مناتی جا رہی تھی۔ پشاور شہر کی منڈیریں جگمگا رہی تھیں۔ چراغاں کا یہ عالم جیسے پشاور میں را آتی ہی نہیں تھی۔ لٹے پٹے، اُجڑے ہوئے مہاجرین نے رات کے جگمگاتے ستاروں کو یقین دلا دیا تھا کہ ہم زندہ ہیں ہم آباد ہیں۔ ستارے ڈگمگا گئے تھے۔ لوگوں نے جیسے آسمان سے ستارے نوچ کر منڈیروں پر سجا لیے تھے۔ شہر م رونق تھی۔ لوگ کونوں کھدروں سے نکل کر بازاروں میں ہجوم بازی کرتے ہوئے تھے۔ ہوٹلوں کے ریڈیو اور گراموفونوں نے م ہوتوں کو بھی جھنجوڑ کر جگا دیا تھا۔ ہر دوکان پر رونق تھی۔ ہر گلی میں رونق تھی۔ ہر چہرے پر رونق تھی اور پشاور کے ایک سکول میں زندگی آگئی تھی۔ درختوں میں بھی رنگ برنگی قمقمے روشن تھے۔

سکول کے سامنے کا حصہ دلہن کے چہرے سے کیا کم ہوگا۔ سکول کی اینٹیں بھی مُسکرا رہی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس سرحد کا وزیر تعلیم، ڈپٹی کمشنر اور دیگر افسران بھاگ دوڑ رہے تھے اور سکول کے ہال میں طاہرہ پسینے سے شرابور ہو رہی تھی تھا پھر بھی وہ ایک ایک چیز کو چھو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ ڈرامے میں حصہ لینے والے بچے اور بچیاں کچھ گھبرائی ہوئی تھیں اور خو تھیں۔ ڈرامے کی خصوصی کردار، دو نوجوان لڑکیاں الگ بیٹھی مکالمے دہرا رہی تھیں، ساز جم چکے تھے اور اندھا موسیقار سر آخری ہدایات دے رہا تھا۔ وقت سُرعت سے گزر رہا تھا۔ رات تیزی سے پھسلتی اور سرکتی جا رہی تھی۔

ہال بھر چکا تھا۔ صوبہ سرحد کا وزیراعلیٰ، وزیر تعلیم اور ان کے حاشیہ بردار اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے نعیم اور اس کا سکول کی طرف سے ڈرامے میں مدعو تھے۔ ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے اعلان ہُوا ——"طاہرہ نعیم کی پیش کش ڈرامہ پیش کیا جاتا ہے۔" پردہ اُٹھا اور نغموں کے ترنم سے ہال کی فضا پر وجد طاری ہوگیا۔ ننھے ننھے بچوں کا ترانہ جیسے کئی فر گنگناتے کہکشاں پہ گزرتے جا رہے تھے۔ آسمانوں کے گیت آسمانوں پر ہی اچھے لگتے ہیں لیکن جب ننھے منھے کھلے غنچوں نے قومی گیت زمین پر اتر کے سنایا تو کائنات کا ذرہ ذرہ وجد میں آگیا۔

پردہ گرا۔ پردہ پھر اُٹھا اور ڈرامہ شروع ہوگیا۔ پھر پردہ گرتا رہا اور اُٹھتا رہا اور تماشائی ہوش و حواس گم کیے بیٹھے ر کو ہوش آیا تو تالی بجا دی ورنہ سینکڑوں تھے کہ ہال میں جیسے دھر دیئے گئے تھے۔ ان کے سامنے "بیٹی" کا کردار ایک پو کی طرح اُبھرا، بڑھا۔ بڑھتا گیا۔ پودے کی شاخیں نکلتی گئیں، کونپلیں پھوٹتی گئیں۔ پودا اونچا ہوتا گیا، کلیاں، پھول اور غنچے کھلے طوفان آئے آندھیاں چلیں، بجلیاں چمکیں، گریں، گرتی رہیں اور پودا درخت بنتا گیا۔ ہر شاخ پہ آشیانہ، ہر شاخ پہ پھول ا کی ٹھنڈی چھاؤں میں بچے کھیلتے تھے، جھولا جھولتے تھے۔ کئی خزائیں آئیں مگر درخت کے پتے ہرے ہی رہے جھڑ ڈرامے کے ایک خونچکاں منظر کے دوران راوی پس منظر میں بول رہا تھا (جو طاہرہ کی آواز تھی) ——"اور آگ کے شع گھر کو لپیٹ میں لے لیا۔ دو بچے شعلوں کی تپش سے گھبرا کر بھاگے تو دروازے کے جلتے ہوئے کواڑ نے دونوں اوپر گر کر انہیں گود میں لیا اور انہیں خدا کے سپرد کر دیا" —— راوی کی آواز کے ساتھ اندھے موسیقار کی وائلن نے پس منظر

لے جو بجاتی تو نعیم نے رُومال اپنے مُنہ میں دبا لیا۔ اس کے سینے سے ایک ہُوک چیخ بن کر نکلنا چاہتی تھی جیسے نعیم یا مگر چند عورتیں اپنی سسکیاں اور ہچکیاں نہ روک سکیں۔ تماشائیوں میں مہاجرین بھی تھے جنہوں نے پاکستان کے نام پر کرائے اور گھر جلواتے تھے اور ان میں پٹھان بھی تھے جنہوں نے ایک سو سال جنگِ آزادی لڑی اور پاکستان حاصل ان کے بچے توپوں اور بموں سے اڑ گئے تھے۔

طاہرہ کا بھی گھر جلا تھا، اندھے موسیقار کا بھی گھر جلا تھا —— اور نعیم کو یوں محسوس ہُوا جیسے یہ نغمہ بھی آگ کے شعلوں رہا ہو۔ ہال کا سناٹا اور گہرا ہوگیا۔

ڈرامہ ختم ہونے کے بعد وزیراعلیٰ نے طاہرہ کو سونے کا تمغہ اور دو سو روپے انعام دیا اور دو سو روپیہ ان بچوں اور لڑکیوں ں نے ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔

"مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ لڑکی اس قدر ذہین ہے" —— نعیم کے باپ نے باہر آکر کہا۔

"ابا جان!" —— نعیم نے کہا ——"یہ اس کی اپنی داستان ہے۔"

"ٹھہر جاؤ" —— باپ نے کہا ——"طاہرہ کو ساتھ لیتے چلیں۔"

"نہیں ہم چلتے ہیں" —— نعیم نے کہا ——"وہ اس نابینے استاد کو گھر چھوڑ کے آئے گی۔"

"ہاں ہاں! اُسے ضرور جانا چاہیئے" —— باپ نے کہا اور وہ دونوں گھر آگئے۔

اس دن سے طاہرہ نے سسر کے دل میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا اور سسر نے اس کے لیے دل میں بہت سی جگہ دی۔ گھر کے حالات اب تیزی سے بدلنے لگے تھے نعیم کی ماں ہر تیسرے چوتھے روز ٹرنک صحن میں رکھ کر صحن کے کھڑی ہو جاتی اور اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا اعلان کرتی تھی۔ آئے دن وہ نوکرانی کو نکل جانے کا حکم دیتی تھے پانچویں روز طاہرہ کو کسی بہانے گالیاں دے لیتی تھی لیکن نہ ماں گھر سے نکلی نہ نوکرانی برخاست ہُوئی، اور نہ طاہرہ نے کراس کے سامنے مُنہ کھولا۔ اس کے شب و روز کا چین اور سکون ختم ہوگیا۔ نعیم کے دل کی حالت ان حالات کے اثر سے بدتر ہوگئی اور نعیم کا باپ کُڑھ کُڑھ کر تیزی سے بوڑھا ہونے لگا۔ اب طاہرہ نے چھُپ چھُپ کر رونا بھی شروع لیکن اس نے اپنی زبانی ساس کے خلاف شکایت کبھی نہ کی۔

"طاہرہ" —— نعیم نے اسے کئی بار کہا تھا ——"یوں زندگی گزارنی محال ہے۔ میں نے ایک مکان کا بندوبست کر لیا ہے الگ تھلگ زندگی بسر کریں گے اور آرام و چین سے رہیں گے۔"

لیکن طاہرہ نے ہر بار جواب دیا ——"یہ بات ہمیں زیب نہیں دیتی۔ ماں آخر ماں ہے۔ ان کا درجہ ان کی باتوں سے کم ہو جاتا۔ وہ بوڑھی ہوگئی ہیں۔ وہ آپ کو چاہتی ہیں۔ اگر آپ ان کی نظر سے اوجھل ہو گئے تو انہیں وہ دکھ ہوگا جو انہیں اس نہیں ہونا چاہیئے۔"

باپ نے بھی ایک دن نعیم اور طاہرہ کو ان کے کمرے میں بیٹھے ہوئے کہا ——"دیکھو بچو! تمہاری ماں تو سودائی ہوگئی ہے

تم اپنا ٹھکانہ کرو۔ نعیم! تم کوشش کرو اور علیحدہ مکان لے لو۔ تمہاری اس عمر میں یہ بے مزگیاں بہت ہی قبل از وقت ہیں۔ ہم بڈھے ہو چکے ہیں۔ آپس میں نبھالیں گے۔ تم دونوں گزارا کرو۔ میری طرف سے اجازت ہے بلکہ میری نصیحت بھی یہی ہے۔"

طاہرہ نے سسر کو بھی وہی جواب دیا جو نعیم کو دے چکی تھی۔ باپ کے آنسو نکل آتے۔

ڈیڑھ برس کا مہیب عرصہ ان ہولناکیوں میں گزر گیا اور ان اٹھارہ مہینوں میں نعیم کے دل کی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ ڈاکٹر نے اسے آب و ہوا اور جگہ کی تبدیلی کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر کو یہ تو معلوم نہ تھا کہ نعیم کی ماں نے گھر کی جو حالت بنا رکھی ہے وہ نعیم کے دل کو تیزی سے کھاتے جا رہی ہے۔ وہ یہی کچھ سمجھ سکا کہ مرض کی ذمہ دار مریض کی جذباتیت ہے۔ اس کی طبیعت میں اعتدال نہیں اور طبیعت میں گھٹن اور کڑھن بھی ہے۔ مریض کا طرزِ اظہار صحت مند نہیں تھا۔ نعیم نے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ قبول نہ کیا۔

آج طاہرہ کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔ اس کے سامنے نجمہ کا طویل خط کھلا ہوا تھا۔ خط کے پہلے دو تین فقرے پڑھتے ہی طاہرہ کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں نے پردہ ڈال دیا تھا۔ لکھا تھا:

پیاری طاہرہ سلامت رہو!

پورے ایک سال پانچ ماہ بعد لاہور گئی تھی۔ اتفاق سے ارشد کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔ دل نہیں چاہتا کہ تمہیں خبر سناؤں۔ رہا بھی نہیں جاتا۔ یوں تو یہ خبر ڈیڑھ سال پرانی ہو گئی ہے لیکن ہم دونوں کے لیے نئی ہے۔ عفّت کا بچہ ڈیڑھ برس کا ہو گیا ہے اور عفت کو فوت ہوئے ڈیڑھ برس گزر گیا ہے۔ عفت بچے کی پیدائش کے فوراً بعد بچے کو دیکھے بغیر مر گئی تھی۔ ارشد نے بچے کا نام طاہر پرویز رکھا ہے۔ بڑا ہی پیارا بچہ ہے....

اس سے آگے الفاظ اس طرح طاہرہ کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے جس طرح جلال آباد کی گلیوں میں لاشیں تڑپتی تھیں

....ارشد تمہاری تلاش میں تڑپ رہا ہے اور ابھی تک امّید لگائے بیٹھا ہے کہ تم واپس آجاؤ گی۔ میں نے اسے مصلحتاً نہیں بتایا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ جس امید پر زندہ ہے وہ امید زندہ رہنی چاہیئے۔ ارشد بیچارہ بچے کو دن رات سینے سے لگائے رہتا ہے۔ رات اسے اپنے پاس سُلاتا ہے اور اُسے 'طاہری، طاہری' کہہ کر بلاتا ہے....

طاہرہ آنسو پونچھتی تھی تو اسے دو فقرے نظر آجاتے تھے۔ اب وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھی۔ اس نے خط کو پڑھے بغیر میز پر رکھ دیا اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر بے تحاشا روئی۔ اس قدر آنسو بہہ جانے کے باوجود نہ آنسوؤں میں کمی آئی نہ غم نے۔ پھر خط کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن آہستہ آہستہ اور ڈرتے ڈرتے جیسے وہ خط نہیں سویا ہوا سانپ تھا۔

....ارشد کو سب نے شادی کے لیے مجبور کیا ہے۔ میں نے بھی بہت مجبور کیا۔ قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ایک ہی جواب دیتا ہے — 'طاہرہ واپس آجائے گی۔ یہ بچہ اسی کے حوالے کروں گا، ورنہ زندگی اسی بچے کے ساتھ کٹے گی۔' ارشد نے مجھے بتایا تھا کہ عفت نے مرنے سے ایک دن پہلے وصیت کی تھی کہ طاہرہ کے سوا میرا بچہ کسی کو نہ دینا۔ اگر تمہیں میری محبت کا پاس ہے تو طاہرہ کے سوا کسی دوسری لڑکی کے ساتھ شادی نہ کرنا۔ ارشد عفّت کی وصیت اور تمہاری محبت کو نہیں بھولتا۔ وہ روتا بہت ہے....

طاہرہ نے خط کو سینے کے ساتھ لگا لیا اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔ کوئی ایک گھنٹہ صرف کر کے اس نے پورا خط پڑھا۔ خط اس کے ہاتھ پڑا تھا اور طاہرہ نے اُٹھ کر سوٹ کیس میں سے ارشد اور عفّت کی تصویریں اور امّی ساجدہ کی تصویر نکال کر خط کے ساتھ ی کو اپنے سامنے پھیلا کر وہ یادِ ایامِ گذشتہ میں کھو گئی۔ آنسو بہے جا رہے تھے۔ اسے محسوس ہی نہ ہوا کہ نعیم کمرے میں اس کے سر پر کھڑا ہے۔ نعیم نے ارشد کی تصویر پہلی بار دیکھی تھی۔ طاہرہ نے اوپر دیکھا اور نعیم کو دیکھ کر چونک اُٹھی۔

لیا ہے؟" — نعیم نے دکھی ہوئی مسکراہٹ سے پوچھا۔

ہرے جرم کی نمائش!" — طاہرہ نے آہ لے کر کہا اور کہنیاں میز پر ٹیک کر سر ہاتھوں پر رکھ لیا اور بولی — "میرے جذبات استان جو جرم بن گئی تھی۔"

یم دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور باری باری ساری تصویروں کو دیکھنے لگا۔ ساجدہ کی تصویر کو غور سے دیکھ کر بولا — "یہ تمہاری تصویر ہے۔ مسکراہٹ بڑی جانفزا ہے۔"

ہری تصویر نہیں" — طاہرہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا — "یہ میری امی کی تصویر ہے جسے میں نے دیکھا .. دوسری طرف پڑھیں۔"

یم نے تصویر اُلٹا کر اس پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی اور طاہرہ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ طاہرہ نے اسے ساری داستان ں نے ارشد کی محبت کا ذکر بلا جھجک کیا۔ پھر اس قربانی کا حال بھی سنایا جو اس نے عفت کی خاطر دی تھی۔

شد کو تم اب بھی چاہتی ہو؟" — نعیم نے مُسکرا کر پوچھا۔

ن بھائی کو چاہتی ہی نہیں اس پر جان نثار کرتی ہے" — طاہرہ نے جواب دیا — "اگر میری محبت ایسی ویسی ہوتی تو دوسری لڑکی کے حوالے کیوں کر دیتی؟"

اہرہ نے جب دو گھنٹے لگا کر داستان سنائی تو اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا لیکن مسلسل باتیں کرتے کرتے اس کا دماغ ور اس نے اپنا سر نعیم کے کندھے پر پھینک دیا۔ نعیم کی انگلیاں اس کے ریشمی بالوں میں رینگنے لگیں۔

اِن نرم وگداز ہاتھوں کی انگلیوں کا لمس ایسا کیف آور تھا کہ ارشد پر خمار کی کیفیت طاری تھی اور وہ آنکھیں بند کیے جا
کون سی دنیا میں جا پہنچا تھا۔ اس نے ذرا سی آنکھ کھولی۔ طاہر پرویز اس کے سینے پر پیٹ کے بل لیٹا دونوں ہاتھوں سے اُس
بالوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ارشد نے بے خودی کے عالم میں دونوں بازو بچّے کے گرد لپیٹ دیتے اور اس قدر زور
کہ بچّہ بلبلا اٹھا۔ پھر اس کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر بوسہ جڑ دیا تو بچّے کو تڑپا کر رکھ دیا۔ بچّے کو اتنا قریب رکھ کر ارشد کو یوں
جیسے اس نے ہنستے کھیلتے ماضی کو دل کے ساتھ چپکا لیا ہو اور گزرے دنوں کا ایک ایک لمحہ اُس کے دل کے ساتھ دھڑ

بچّہ دو برس کا ہو گیا تھا۔ عفّت کو مرے دو سال ہو گئے تھے۔ طاہرہ کو غائب ہوتے دو سال چند مہینے ہو گ
اور ارشد اور نجمہ کی آخری مُلاقات کو چھ مہینے گزر گئے تھے لیکن ارشد کی نگاہ میں عفّت، طاہرہ اور نجمہ یُوں رچی بسی ہوئی تھ
وہ پکنک پر گئی ہوئی ہیں اور بچھڑے پھر لوٹ آئیں گی لیکن بچھڑے پھر کوئی بھی نہ لوٹی تھی۔ دن طلوع ہوتے رہے تاریکیوں میں ڈ
ہوتے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی بچھڑے پھر نہ لوٹی لیکن ارشد نے اُمید کو تاریکی میں نہ ڈوبنے دیا۔

جب ارشد، اس کے ابا جان اور اس کا بھائی یوسف، اکٹھے دفتر سے واپس آتے تو طاہر پرویز برآمدے میں
انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف بھاگ اٹھتا — "ابا جان! بابا جی! چچا جان!" — ارشد وہیں کھڑا بازو پھیلا کر پاؤں پر بیٹھ جاتا
اس کی طرف بھاگتا تھا جیسے اسے رُکنے کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا۔ اسی رفتار سے ارشد کی چھاتی سے جا ٹکراتا اور ارشد ا
میں دبوچ کر اس کے نرم و ملائم اور سُرخ و سپید گالوں پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا۔ سارے دن کی تھکان اسی میں دُور ہو جاتی
دنیا ہی بھول جاتی تھی۔ وہ اسی میں عفّت کو پا لیتا اور طاہرہ کو بھی۔

طاہر پرویز اب باتیں بھی کرنے لگا تھا۔ ارشد کے بعض سوالوں کا جواب بھی دے لیا کرتا تھا۔ اسے ارشد
سوال زبانی یاد ہو گئے تھے۔

"طاہری! طاہرہ امّی کے پاس جاؤ گے؟"
"کہاں ہے طاہرہ امّی؟"
"پاکستان میں!"
"پاکستان کدِل ہے؟"

"جہاں تمہاری طاہرہ امّی رہتی ہے!"
"طاہرہ امّی کدِل رہتی ہے؟"
"جہاں پاکستان ہے!"
"جدِل پاکستان ہے اُدل طاہرہ امّی ہے۔ جدِل طاہرہ امّی ہے اُدل پاکستان ہے۔"
"ابّو جان!" — ایک دن طاہر پرویز نے ارشد سے پُوچھا — "پاکستان طاہرہ امّی کا ہے؟"
"ہاں بیٹا!" — ارشد نے بچّے کو اپنے ساتھ لٹاتے ہوئے جوش سے کہا — "آج سمجھے تم طاہری بیٹے! پاکستان تیری
طاہرہ امّی کا ہے۔ یہ پاکستان اسی نے بنایا تھا میرے بیٹے! یہ پاکستان ہے ہی اسی کا۔ تیری طاہرہ امّی نے اس کے لیے خون بہایا
ہے۔ اپنا بھی اور پاکستان کے دشمنوں کا بھی ہے" — اس کی آواز رقت میں دب گئی۔ اس نے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز
سے کہا — "اور آج پاکستان نے طاہرہ کو نگل لیا ہے۔"
ارشد کا بازو جو بچّے کے گرد لپٹا ہوا تھا ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے جوش پر اوس پڑ گئی۔ وہ یوں چُپ ہو گیا جیسے کمرے کی فضا میں اس نے
پُراسرار سی سرسراہٹ سُنی ہو یا اسے کوئی چیز نظر آئی ہو۔ وہ جذبات کی لہروں میں بہ نکلا۔ اس کی آنکھوں میں سپنے انگڑائیاں لینے لگے
اور وہ اداس ہو گیا۔ دو چار لمحوں بعد بچّے سے مُخاطب ہو کر بولا — "تیری طاہرہ امّی نے پاکستان کو بسایا تھا اور میرا دل اجاڑ کر چلی گئی ہے
بیٹا! تیری طاہرہ امّی تیرے ابّو جان کو چند خواب دے کر ایک حقیقت بن کر غائب ہو گئی ہے۔ میرے ننھے منے بچّے!....
ارشد بچّے کے سر کو آہستہ آہستہ سہلا رہا تھا اور بچّے پر غنودگی طاری ہو رہی تھی.... "تیری معصومیت کی قسم! طاہری تجھ سے زیادہ معصوم
ہے۔ تیری ان نیم وا سرمئی آنکھوں میں مجھے طاہرہ کی مسکراہٹیں نظر آتی ہیں۔ تیرے ان گالوں کے گداز میں مجھے طاہرہ کا لمس محسوس ہوتا
ہے۔ تیرے موتیوں جیسے دانتوں میں مجھے طاہرہ کی مترنم سی ہنسی سنائی دیتی ہے۔"
بچّہ خوابوں کی دنیا میں پہنچ چکا تھا اور ارشد تصوروں کی دُنیا میں بھٹک رہا تھا۔
ارشد تیسرے چوتھے روز طاہر پرویز کو عفّت کی قبر پر لے جاتا تھا۔ خود فاتحہ پڑھتا اور بچّے کے ہاتھ بھی دعا کے لیے اٹھا دیتا تھا
بچّہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا لیتا اور گم سُم سوالیہ نگاہوں سے ارشد کو دیکھتا رہتا تھا۔ وہ ارشد سے بہت ساری باتیں
پوچھنا چاہتا تھا لیکن اسے پتہ نہ چلتا تھا کہ کیسے پوچھے اور کن الفاظ میں پوچھے.... وہ پوچھنا چاہتا تھا — "ابو جان! آپ یہ کیوں کہتے
ہیں عفّت! طاہرہ ابھی تک نہیں آئی.... عفّت! تیرا بچّہ میرے جلتے ہوئے سینے کی ٹھنڈک ہے.... عفّت! خدا تیری لحد کو ٹھنڈا کرے
تُو نے مجھے یہ بچّہ جو دے دیا ہے جو میرے زخموں کا مرہم ہے.... بتاؤ نا عفّت! طاہرہ کہاں ہے؟.... مجھے تیرے آخری الفاظ یاد ہیں
عفّت! میں تیرا بچّہ طاہرہ کے سوا کسی کو نہیں دُوں گا.... رات تُو نے اپنے بچّے کو چوما تھا عفّت؟ میں نے کمرے میں لطیف سی خنکی
محسوس کی تھی۔ میں نے بچّے کے گالوں پر نمی دیکھی تھی۔ ایک تو میرا آنسو تھا اور ایک تیرے بوسے کا نمناک نشان..... آیا کرو عفّت! یہ
بچّہ تمہارا ہے دیکھو تو ذرا تمہارے لیے دعائے مغفرت کر رہا ہے۔"
اس جذباتیت میں ارشد طاہر پرویز کی موجودگی بھول جایا کرتا تھا۔ اسے خیال ہی نہ رہتا تھا کہ بچّہ سراپا تجسس بنا اسے دیکھ رہا ہے
اور پوچھنا چاہتا ہے: "ابّو جان! آپ کس کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں؟" — ارشد بچّے کو کیوں کر سمجھاتا کہ یہی باتیں اس کی مہجور زندگی کا

سہارا ہیں۔ انہی باتوں میں بے قراری ہے اور اسی بے قراری میں قرار ہے۔ بچّہ پوچھ سکا نہ ارشد اُسے بتا سکا۔

ایک دن ارشد نے عفت کی قبر پر طاہر پرویز سے کہا "طاہری بیٹا! یوں ہاتھ اٹھاؤ جیسے روز اٹھاتے ہو.... یوں۔ شاباش بیٹے!" — ارشد اس کے پاس پاؤں پر بیٹھ گیا اور بولا "اب دعا کرو! کہو! اللہ! یا اللہ! میری یہ امّی جو سو رہی ہے اسے فرشتوں کے پروں کی ہوا دینا کہو بیٹا! یا اللہ! میری اس سوئی امّی پر اپنی رحمت کا سایہ رکھنا"

طاہر پرویز ہاتھ اٹھائے قبر کو گھور رہا تھا اور اس کے دماغ میں سوالوں کا انبار لگتا جا رہا تھا "کہو بیٹا!" — ارشد نے اس کے ننھے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا — "یا اللہ! میری اس سوئی ہوئی امی کی روح کو تسکین دینے کی خاطر میری طاہرہ امی کو واپس بلا دے"

بچّے کے ننھے سے دماغ میں سوال اس طرح بھر گئے تھے جس طرح بند کمرے میں دھواں بھر جاتا ہے اور آنکھوں کو لگتا ہے۔ بچہ اکتا گیا اور روندھی ہوئی آواز میں کہنے لگا — "ابّو جان! گھر چلو! امّی کے پاس"

ارشد بچّے کو اٹھائے خراماں خراماں قبرستان سے گزر رہا تھا۔ ماحول کی یاس آلود خاموشی نے اس کی اچھی بھلی شخصیت کو غموں کی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ عفّت کی قبر اس کے قریب تھی لیکن عفّت بہت دُور تھی۔ طاہرہ کا انتظار تھا لیکن معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے۔ بچّہ اس کے سینے کے ساتھ لگا رہتا تھا تو عفت اور طاہرہ اسے اپنے قریب کھڑی نظر آتی تھیں لیکن وہ ان کے جسموں کو چھو سکتا تھا۔ اس قُربت میں جو دُوری تھی وہ اس کی عمر کی لکیر سے بھی زیادہ لمبی تھی اور اس دوری میں جو تلخیاں تھیں اُنہوں نے ارشد کو دو اڑھائی برس پہلے والا ارشد رہنے ہی نہ دیا تھا۔

"ابا جان! طاہرہ آجائے گی۔ آپ مجھے شادی کے لیے مجبور نہ کریں"

"امّی جان! اس ہر روز کی رٹ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ طاہرہ واپس آجائے گی"

"بھابھی! خُدا کے لیے مجھے سکون سے جینے دو، طاہرہ آجائے گی"

"افسوس ہے، بھائی جان! آپ اتنی سی بات نہیں سمجھے۔ آخر طاہرہ جائے گی کہاں۔ اسے آنا ہی ہے اور اسی گھر میں آنا ہے"

"آشا بھون" میں ارشد کے یہ الفاظ گونجتے اور بھٹکتے ہی رہتے تھے۔

قبرستان کے دُکھ بھرے سکوت میں سے گزرتے ہوئے ارشد نے گھوم کر دیکھا اور زیرِ لب کہا — "خُدا حافظ، عفت! دُعا کرنا طاہرہ لوٹ آئے" — اس مزاجی کیفیت میں ارشد وہ ارشد رہتا ہی نہ تھا جو جلال آباد کی گلیوں میں جلوس کے لیے مردوں اور عورتوں کو جمع کرنے کے لیے ہانپتا کانپتا اور بھاگتا دوڑتا رہتا تھا۔ وہ ارشد جسے اپنے پسینے کی بُو روحانی تر و تازگی دیتی تھی، جذبات میں اُلجھ کر وہ جانے کون سے ارشد کا رُوپ دھار لیتا تھا۔ وہ خیالوں کی پُر پیچ راہوں سے گزر رہا تھا۔ قبرستان پیچھے رہ گیا تھا۔ طاہر پرویز کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"ابّو جان! یہ بھی امّی ہے؟"

"کون سی بیٹا؟"

"وہ جو سوئی ہوئی ہے؟"

"ہاں بیٹا! وہ تیری امّی ہے"

"طاہرہ امّی بھی امّی ہے؟"

"ہاں بیٹا!"

"دو شیلی امّی بھی امّی ہے؟"

"کون سی دوسری؟"

"جو گھر میں ہے؟"

ہاں، بیٹا! وہ بھی تیری امّی ہے"

"اخاہ! اصلی امّی چھالی امّیاں ہو گئیں"

اور ارشد نے بچّے کے گال کو اپنے گال کے ساتھ لگا لیا۔

"ابّو جان! یہ امّی اٹھے گی نہیں؟"

"نہیں، بیٹا! وہ اب نہیں اٹھے گی... عفت اب نہیں اُٹھے گی"

"کیوں ابّو جان؟"

"وہ بیمار ہے بیٹا!" — ارشد نے جواب دیا اور بچّے کا دماغ ایک اور سوال کے لیے الفاظ تلاش کرنے میں مصروف ہو ارشد نے بچّے کے گال کو اپنے گال سے سہلاتے ہوئے کہا — "بیٹا! تیری یہ امّی اب نہیں اُٹھے گی مٹّی کے ڈھیر کے نیچے نے اس کے سارے دُکھ دبا دیے ہیں۔ وہ غموں کا ڈھیر ہے بیٹا! وہ ان غموں کو ساتھ لیے خُدا کی پناہ میں پہنچ گئی ہے۔ ہم نے کے علیل اور ملول جسم کو خدا کے سپرد کر دیا ہے۔ ہم بے رحم ہیں، بیٹا!" — اور ارشد کے آنسو نکل آئے۔ پھر وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

راوی کا دریا چڑھ چڑھ کر اُترا اور اُتر اُتر کر چڑھا۔ کنارے بہتے رہے اور ریت جمع کر کے کنارے کھڑے ہوتے ے۔ سویرے آئے، سویرے چلے گئے۔ راتیں آتی رہیں، راتیں جاتی رہیں۔ سرسوں کے پھول کھلتے رہے اور جھڑتے رہے ہلنے کے لیے "آشا بھون" کے لان میں موتیا اُگا، کھلا، مُرجھایا پھر کھل اُٹھا۔ کوٹھی کی منڈیر پر جھکے ہوئے درخت کے پتے جھڑ ی کے برآمدے میں یوں سسک سسک کی آواز سے ایک ایک کر کے گرتے رہتے جیسے کوئی دکھیاری بازوؤں میں چہرہ چھپا ہی ہو۔ پتے گرے پھر ہرے ہوئے۔ آم کے پیڑ میں بُور پڑا۔ کچھ گرا، کچھ پکا اور آم کا پیڑ پھر ویران ہو گیا۔ سویرے آئے اور ئیں۔ راتیں آئیں اور سویرے چلے گئے۔

ڈوبتے چڑھتے سورج نے تین برس گزار دیے — طاہر پرویز کی آج پانچویں سالگرہ تھی اور عفت کی وفات کی پانچویں برسی۔ نچویں بار آہیں اور مسکراہٹیں شانہ بشانہ "آشا بھون" میں آئی تھیں۔

"میرے بچّے! تیری قسمت میں تو سالگرہ کی خوشی لکھی ہی نہیں گئی" — ارشد نے آج پانچویں مرتبہ طاہر پرویز کو کہا۔ وہ ہر سال کہا کرتا تھا "تیری پیدائش کی خوشی مناؤں یا تیری امّی کا ماتم کروں" — ارشد نے اپنے آپ سے کہا — "گزر جانے دے

یہ دن بھی بیٹا! یہ دن میری زندگی کا طویل ترین دن ہے۔"

ہر سالگرہ کی طرح طاہر پرویز کی یہ پانچویں سالگرہ بھی اس طرح منائی گئی کہ اسے نئے کپڑے پہنا کر ارشد اسے عفت کی قبر پر لے گیا اور فاتحہ پڑھ کر کہا ——"لو عفت! آج تیرا طاہر پورے پانچ برس کا ہو گیا۔ دیکھ تجھے سلام کہتا ہے۔"

"السلام وعلیکم، امی جان!" —— طاہر پرویز نے بے ساختگی سے کہا اور ارشد نے رومال منہ میں لے کر دانتوں میں دبا لیا۔ اس نے سینے سے اٹھی ہوئی ایک چیخ کو روک لیا تھا۔

دن کا پچھلا پہر تھا کہ نجمہ اچانک آ گئی۔ وہ لاہور اپنے رشتہ داروں کے ہاں دو روز سے آئی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آج کا دن طاہر پرویز کی پیدائش کا دن ہے۔ وہ بچے کے لیے دو سوٹ، دو جوڑے بوٹ اور دو فلیٹ ہیٹ لائی تھی۔ ان پانچ برسوں میں نجمہ دوسری بار آج یہاں آئی تھی۔ ارشد اپنے کمرے میں تھا۔ نجمہ پہلے ارشد کی امی کے پاس گئی۔ بھابی بھی بھاگی ہوئی آ گئی۔ نجمہ نے طاہر پرویز کو گود میں لے کر اس طرح بھینچا اور پیار کیا جیسے ماں کو برسوں بعد گمشدہ بچہ مل گیا ہو۔ وہ اس بچے کے اتنے پیار سے خد و خال میں ایک حزینہ کہانی پڑھ رہی تھی۔ وہ بے تابی سے روتی ہی رہی۔ یہی حال ارشد کی امی اور بھابی کا تھا۔

"خدا کے لیے نجمہ! طاہرہ کو کہیں سے تلاش کر کے لے آؤ" —— ارشد کی امی نے ہاتھ جوڑ کر نجمہ سے کہا —— "ارشد اپنی زندگی تباہ کر رہا ہے۔ آج پورے پانچ برس گزر گئے ہیں۔ سارا خاندان شادی کے لیے کہہ چکا ہے لیکن وہ طاہرہ کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔ پہلے دو چار باتیں کرتا تھا، اب ایک ہی جواب دے کر چپ ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے طاہرہ واپس آ جائے گی۔ یا یہ کہے گا کہ عفت کا بچہ کسی اور کو نہیں دوں گا۔ نجمہ بیٹی! تم ہی اسے مناؤ۔ تمہیں اس نے بہن بنایا ہے۔ شاید تمہاری بات مان جائے۔ رشتے ایک سے ایک بڑھ کر مل رہے ہیں۔"

"ایک رشتہ تو ایسا مل رہا ہے جو جہیز میں کار بھی دیں گے" —— بھابی نے کہا ——"میں نے لڑکی دیکھی ہے۔ ہر پہلو سے ارشد کے لائق ہے۔"

"میں اسے کہوں گی ضرور" —— نجمہ نے جواب دیا ——"میں آج طاہر پرویز کی سالگرہ کی مبارک باد دینے اور ارشد کو شادی کے لیے مجبور کرنے آئی ہوں.... وہ ہے کہاں؟"

"ہے کہاں؟" —— امی نے کہا ——"نجمہ بیٹی! اس کا کیا پوچھتی ہو۔ کمرے میں طاہر ہی کے ساتھ بند رہتا ہے یا اس کے ساتھ باغیچے میں کھیلتا رہتا ہے۔ اب بھی کمرے میں ہو گا" —— امی کے آنسو نکل آئے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولی ——"بیٹی! مجھے تو اس بیٹے کا روگ کھائے جاتا ہے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ماجرا کیا ہے ورنہ ہم اس کا بیاہ طاہرہ سے ہی کر دیتے۔"

"خیر، امی جان!" —— نجمہ نے کہا ——"جانے دیں اس ماجرے کو۔ اسے بھول جائیں۔ وہ تو گئی گزری باتیں ہیں۔ طاہرہ اب نہیں آئے گی۔ ذرا سوچیں وہ ساڑھے پانچ برس سے لاپتہ ہے۔ آج اس کی عمر چھبیس ستائیس برس ہو گئی ہو گی۔ یہ جوانی اور یہ عقل! ابھی تک غیر شادی شدہ ہو گی؟ کوئی اور لڑکی ہوتی تو کئی باتیں ممکن ہو سکتی تھیں لیکن طاہرہ کا ذکر آتا ہے تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ کی زندگی کبھی قبول نہیں کرے گی۔ اس میں جو خودداری، وقار اور خاندانی اخلاق ہے وہ اسے بھٹکنے نہیں دے گا۔ اس نے مستورات کی طرح اپنا راستہ بنا لیا ہو گا۔ مجھے تو اس کی ذرہ بھر فکر نہیں۔"

دیہن!" —— بھابی نے گہری دلچسپی سے کہا ——"سچی بات ہے کہ ہمیں طاہرہ کی بہت فکر ہے۔ وہ وقت ہی کچھ ایسا تھا کہ غلط فہمی ہ سب اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ خدا کو کچھ ایسا ہی منظور تھا۔ اب مرنے والی کو بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہی دعا ہے خدا اس کی گور کو مذاکرے.... نجمہ بہن! اب طاہرہ ہم میں نہیں ہے تو یوں لگتا ہے جیسے سگی بہن مر گئی ہے۔ ارشد تو ارشد ہے، بخدا مجھے جب بھی یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بے چاری کیا کہتی ہو گی کس گھر میں جا بسی تھی۔"

بھابی کے اس اقبالِ جرم نے نجمہ کو جہاں ایک گونہ اطمینان دیا وہاں اسے ایک دکھ بھی ہوا ——"کاش! حالات یوں طاہرہ خلاف نہ ہو جاتے!"

نجمہ تھوڑی دیر بعد ارشد کے کمرے میں گئی۔ ارشد کمرے میں کرسی پر بیٹھا میز پر جھکا ہوا تھا۔ نجمہ نے دروازہ کھولا تو ارشد نے بے خیالی کے انداز میں اس طرف دیکھا۔ پہلے تو اسے واہمہ کا دھوکا ہوا لیکن نجمہ کی اداس مسکراہٹ نے اس کے رگ و ریشے کو بیدار کر دیا۔ ارشد آہستہ آہستہ اٹھا اور نجمہ آہستہ آہستہ بڑھی۔ دونوں کے سینے ایک دوسرے کے دکھ کو جانتے تھے۔ دونوں کے دل ایک ہی درد سے دھڑک رہے تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ آنسوؤں کے دھند لکے میں دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے اس دھند میں انہیں محسوس ہی نہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے ہیں۔ چند لمحوں بعد نجمہ کا ہاتھ ارشد کے سر کو تھپکا رہا تھا اور ارشد نجمہ کے کندھے پر سستا رہا تھا۔ دو بہن بھائی آنسوؤں کی زبانی دکھ سکھ بانٹ رہے تھے۔

نجمہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور ارشد کرسی پر بیٹھا ٹانگیں پلنگ پر رکھے ہوئے تھا۔ انہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ انہیں باتیں کرتے دو گھنٹے گزر گئے ہیں۔ نوکر جو چائے رکھ گیا تھا وہ کچھ پی لی گئی باقی ٹھنڈی ہو گئی۔ نجمہ نے ان دوران باتوں میں ارشد کے دل کو طاہرہ سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ جان گئی کہ یہ دل جو کبھی وقت موم تھا اب پتھر بن چکا ہے۔ نجمہ نے دو تین بار یہ بھی چاہا بے اختیار ہو کر چاہا کہ ارشد کو بتا دے کہ طاہرہ پشاور میں ہے اور اس کی شادی ہوئے پانچ برس ہونے کو آئے ہیں لیکن اس نے ارشد کے چہرے پر جو رونق ہے وہ طاہرہ کے انتظار سے ہے۔ وہ ایک امید پر زندہ ہے۔ وہ ایک چھاؤں میں بیٹھا ہوا ہے کے اردگرد تپتی ہوئی دھوپ ہے۔ اسے سائے میں ہی بیٹھے رہنے دیا جائے۔ اندھے کی لاٹھی نہ چھینی جائے ورنہ خطرہ وہ گر کر ہڈی پسلی توڑ لے گا۔

اسے طاہر پرویز کا بھی خیال تھا۔ ارشد بچے کو جس چاؤ سے پال رہا تھا۔ وہ صرف طاہرہ کے خیال کی شگفتگی تھی۔ نجمہ نے سوچا ارشد کی وارفتگی بچے کی زندگی پر اثر انداز نہ ہو۔ بچہ بھی تو باپ کی مسکراہٹوں پر زندہ تھا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ مسکراہٹیں ہی دم توڑ دیں۔ کہیں ایسا ارشد اپنے آپ میں گم ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کچھ بھی نہ ہو۔

نجمہ ارشد کے کردار کی پختگی سے بھی آگاہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ارشد خوابوں کی دنیا میں رہنے والا انسان نہیں۔ اس کی حقیقت پسند سے وہ واقف تھی۔ نجمہ کو یہ بھی توقع تھی کہ ارشد اس حقیقت کو بھی قبول کر لے گا اور ہضم کر جائے گا کہ طاہرہ نے شادی کر لی ہے خطرات تھے نجمہ ان سے ہراساں تھی۔

اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے بہت کچھ ہو جائے۔ یہ احساس کسی حد تک غالب تھا۔ ارشد آخر انسان تھا۔ مسلسل پانچ برس سے خاموش سی زندگی گزار رہا تھا لیکن اس سکوت میں جو ہنگامے، جو افراتفری اور جو تلاطم نہاں تھے نجمہ ان سے بے خبر نہیں تھی۔ وہ

بھی بہیم چوٹوں سے ٹوٹ جاتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ارشد کے اعصاب پر طاہرہ کی شادی کی خبر آخری چوٹ ثابت ہو۔

"وہ یقیناً کراچی میں ہو گی" — ارشد نے کہا — "ان کی تبدیلی لاہور نہیں ہوئی۔"

"میں تو اب یہ صورت یقینی سمجھتی ہوں کہ اس نے شادی کر لی ہو گی" — نجمہ نے ذرا سا سنبھل کر کہا۔

"یہ غیر یقینی ہے۔ ناممکن" — ارشد نے کرسی پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا — "یہ کہو کہ طاہرہ مر گئی ہے۔ میں یہ صورت قبول کر لوں گا لیکن یہ کہ اس نے کہیں شادی کر لی ہو گی؟ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔ نجمہ آپا! جن دِلوں کو خدا نے روزِ ازل سے جوڑ دیا، چند برسوں کی جدائی سے ٹوٹ نہیں سکتے۔"

"میرے پیارے بھائی!" — نجمہ نے اس کے ہاتھ تھام کر ملتجی لہجے میں کہا — "جوانی کو یوں تباہ نہ کرو۔ زندگی کو یوں دیکھ..."

"میری زندگی کا اب کیا ہے آپا!" — ارشد نے جواب دیا — "میرے سامنے اب طاہر پرویز کی زندگی ہے۔ میرے سامنے عفت مرحومہ کی روح ہے۔ میں اس بچے کو طاہرہ کے سوا کسی کے حوالے نہیں کروں گا۔ تم دوسری شادی کا نام لے کر مجھے ہرگز کہ میں اس جگر کے ٹکڑے کو سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں؟ عفت کی روح اور طاہرہ کا خیال مجھے جینے نہ دیں گے۔ یہ غنچہ سوتیلی ماں کے ہاتھوں میں مرجھا جائے گا۔ آپا.... طاہرہ۔ صرف طاہرہ۔ طاہرہ نہیں تو میں تو زندہ ہوں۔"

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا جب نجمہ "آشا بھون" سے نکلی۔ ارشد اور طاہر پرویز اسے پھاٹک تک چھوڑنے گئے۔ بھابی نے برآمدے میں الوداع کہی۔

"آپا! دعا بھی کرنا اور کوشش بھی کرنا کہ طاہرہ واپس آجائے۔"

"خدا اسے واپس لائے میرے بھائی!" — نجمہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا — "وہ نہ آئے تو خدا تجھے اس حالت سے..."

"اتنی بڑی اور ایسی تلخ حقیقت کو میں کب تک چھپائے رکھوں گی" — نجمہ نے سوچا — "اس راز پر میں کب تک ڈالے رکھوں گی" — اس نے آہ بھری اور تانگے میں سوار ہو گئی۔

تانگہ چل پڑا۔ ارشد گھوڑے کی ٹپ ٹپ بہت دیر تک سنتا رہا۔ وہ گھوڑے کے سُموں کی آواز میں نجمہ، عفت اور... کے پاؤں کی آہٹ سُن رہا تھا۔ اسے تینوں نظر آرہی تھیں۔ دُور جاتی ہوئیں — دُور، بہت دُور — وہ خیالوں میں اس راہ... رہا جس پر طاہرہ چلی گئی تھی اور جس پر طاہرہ لوٹ کے آئے گی لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ یہ راہ اب طاہرہ کے نقشِ پا کو ڈھونڈ... یہ راہ اس کے خیالوں میں نقش ہو گئی تھی۔ اُبھری ہوئی ایک لکیر کی طرح مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ راہ ہے کہاں؟ کہاں ہوتی اور کس منزل پہ جا ختم ہوتی ہے۔ یہ خیالوں، سوچوں اور امیدوں کا راستہ تھا جس پر ارشد اپنے بچے کو ساتھ لیے چلا جا رہا تھا۔ طاہر پرویز کی پانچویں سالگرہ شام کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

طاہرہ کی شادی کی پانچویں سالگرہ جاڑے کی چاندنی کی طرح کبھی کی گزر گئی تھی۔ طاہرہ کو بمشکل یاد تھا کہ اس نے پانچ برس... شبِ عروسی منائی تھی، وہ ایک سنہری رات ان سینکڑوں تیرہ و تار راتوں کے پردوں میں چھپ گئی تھی جو اس نے سسرال میں... تین برس پہلے کا نجمہ کا وہ خط اسے ابھی تک یاد تھا جس میں اس نے اسے ڈیڑھ برس پہلے یعنی آج سے پانچ برس پرانی خبر...

ارشد کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور عفت مر گئی ہے۔ یہ غم اس کے ان دکھوں میں اضافہ تھا جن کا ڈھیر ساس اس کے اردگرد لگاتی جا رہی تھی۔

ازدواجی زندگی کے یہ پانچ برس اس کی سرگرم عمل اور پُر استقلال زندگی کے تاریک سال تھے۔ اس نے کیسے کیسے حالات کا مقابلہ نہ کیا تھا لیکن ساس نے اس کی راہ میں جو رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں وہ ہٹاتے ہٹاتے طاہرہ کی کمر ٹوٹ رہی تھی اور اب یہ رکاوٹیں اس کے دماغ پر ڈھیر کی طرح جمع ہونے لگی تھیں۔ اس کے پڑھائے ہوئے بچے ہائی سکولوں میں پہنچ گئے تھے۔ ان غنچوں کو کھلا ہوا دیکھ کر طاہرہ کو رُوحانی قرار ملتا تھا۔ یہی نونہال اس کی جدوجہد کا حاصل تھے۔

ان میں کئی لڑکے اور لڑکیاں اسے آکر ملتے تھے اور طاہرہ اپنی اس رُوحانی اولاد کو دیکھ کر دنیا بھر کے غم بھول جایا کرتی تھی۔ ہیڈ مسٹریس نے اب اسے پانچویں جماعت دے دی تھی۔ ان پانچ برسوں میں طاہرہ نے بے شمار کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ یوں تو وہ پرائیویٹ میٹرک تھی لیکن علمیت کے لحاظ سے بہت آگے تھی۔ مطالعہ نے اس کی چند ایک پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھار دیا اور اس کے لیے نئی دنیا کے دروازے کھول دیئے تھے۔ جماعت کو پڑھانے کا انداز وہی تھا جو اس نے پہلے روز اختیار کیا تھا۔ سلیبس کی وہ پابند نہیں رہتی تھی۔ ننھے بچوں کے ننھے ننھے سینوں میں اس نے چنگاریاں بھر دی تھیں جو اب بڑی جماعتوں میں جا کر سُلگنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کی کلاس سے نکلے ہوئے بچے انگارے بن گئے تھے۔ طاہرہ نے ان بچوں کو بال و پر دے کر ستاروں کی گزرگاہوں کی طرف چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک جنون تھا جس پر طاہرہ زندہ تھی ورنہ ساس نے اس کا گلا کبھی کا گھونٹ دیا ہوتا۔

ان لمبے لمبے برسوں میں گھر میں کیا کیا طوفان نہ آئے۔ طاہرہ کے پاؤں اُکھڑ اُکھڑ گئے۔ وہ روئی۔ وہ دل ہی دل میں چیخی۔ اس نے کئی راتوں کے پچھلے پہر گڑگڑا کر خدا کے حضور دعا بھی کی — "یا خدا! اس عورت کو ہدایت کی روشنی دکھا، یا مجھے وہ ہمت و حوصلہ دے کہ میں اس راہ پر ثابت قدم رہوں۔ میری راہ غلط ہے تو مجھے راہ دکھا۔ آمین۔"

ہر نماز کے بعد بھی وہ یہی دعا مانگتی تھی اور اب ایک برس سے اس کی دعاؤں کا رخ ہی بدل گیا تھا۔ اس کی دعائیں سمٹ سمٹا کر ایک ہی دعا میں سما گئی تھیں — "یا میرے خدا! میرے نعیم کو صحت دے۔ یا اللہ! میری زندگی میرے نعیم کو دے دے۔ میرا نعیم بہت دکھی ہے، میرے خدا! میری صحت اسے دے دے۔ آمین۔ ثم آمین۔"

سکول میں تو طاہرہ دنیا کو بھول جاتی تھی۔ جوں ہی وہ کلاس میں بچوں کے شور و غل میں قدم رکھتی تھی، اس کے سینے سے دکھ اور غم نکل جاتے تھے جیسے وہ روحانی اذیت جو وہ گھر سے اٹھا لاتی ہے۔ سکول کی حدود سے باہر رہ گئی ہو، لیکن سکول سے نکلتے ہی اس کے اعصاب پر نعیم کی بگڑی ہوئی صحت سوار ہو جاتی اور وہ تانگے کے گھوڑے کی رفتار سے بھی تیز بھاگ کر گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ تانگے میں بیٹھتے ہی اب اس نے تانگے والے کو "جلدی چلنا ہے بھائی" لاشعوری طور پر کہنا شروع کر دیا تھا۔

گذشتہ ایک برس سے طاہرہ کی سرگرمیوں اور بے تابیوں کا مرکز سکول کے بچوں کے علاوہ نعیم کی صحت بن گئی تھی۔ بچوں کو تو وہ صحت مند ذہن سے تعلیم دے کر ان کی رُوحوں کو نکھار رہی تھی لیکن نعیم کے لیے وہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس کے لیے اس کے آنسو، شب بیداریاں، نماز کے بعد کی دعا، رات کے پچھلے پہر کے نالے اور صبح کی آہیں جانے کون سے آسمان میں گم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے اپنی ذات کے دروازے سکول کے بچوں اور نعیم کے سوا ہر انسان اور ہر خیال کے لیے بند کر دیئے تھے۔ صرف نجمہ تھی جس کے خطوط اس کے

مونس و غمخوار تھے۔

طاہرہ کے سینے میں جب غبار بھرتا تھا تو نجمہ کو طویل خط لکھ کر سینہ ہلکا کر لیتی تھی لیکن دو تین مہینوں سے اس نے نجمہ کو خط بھی نہ لکھا تھا۔ آخری خط میں چند ایک اُکھڑے اُکھڑے فقرے لکھ کر آخر میں لکھا تھا ــــ "نعیم صاحب تشویشناک حد تک بیمار ہیں۔ دل کا عارضہ انہیں لے بیٹھا ہے۔ ڈاکٹروں نے تسلیاں تو دی ہیں لیکن ان کا لب و لہجہ مایوسی سے خالی نہیں ہوتا۔ آپا! دعا کرو، خدا میری زندگی آفات سے نجات دلائے آمین۔"

اس خط کا جواب اسے ملا تھا بھر خاموشی چھا گئی تھی۔

اسے نجمہ کا ایک طویل خط ملا جس میں اس نے لکھی کہ وہ لاہور گئی تھی۔ ارشد سے ملی تھی اور طاہر پرویز اب پانچ برس کا ہو گیا ہے۔ نجمہ نے وہاں کی تفصیلات لکھی تھیں۔ ارشد کی ایک ایک بات لکھی تھی لیکن طاہرہ اب یہ خط پڑھ کے روتی نہیں۔ اس نے جلدی جلدی خط پڑھ کر سوٹ کیس میں دوسرے خطوں کے ساتھ رکھ دیا۔ اسے اب ہوش تھی نہ فرصت کہ دوسروں کے لیے رونے۔ تارے ٹوٹ چلے تھے انہیں اس نے اب ذہن سے اتار دیا تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ یہ نامرادیاں اس کی ہستی کے کسی گوشے میں جمع ہو گئی ہیں جو کسی بھی وقت گھات سے نکل کر اسے زخمی کر سکتی ہیں۔

وہ واردات تو پرانی ہو گئی تھی نعیم کے باپ نے اس کی ماں کو تھپڑ مارا تھا لیکن اس واردات کا اثر اور ردِ عمل روز بروز شدید ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ایک واردات آئے دن ایک نئی واردات کو جنم دیتی رہی تھی اور ابھی تک دے رہی تھی۔ ساس کی نگاہوں کا آٹا گوندھتے ہوتے ہلنا بھی جرم بن گیا تھا۔ نوکرانی کی شامت آتی رہتی تھی۔ نعیم کی ماں اسے بلاناغہ ہر روز کوستی اور ایسے فقرے کرتی تھی جن کا نوکرانی کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ ہوتا تھا۔ نوکرانی جانتی تھی کہ اسے سامنے رکھ کر یہ طعنے طاہرہ کو دیئے جا رہے ہیں۔ وہ بھی خوب سمجھتی تھی۔ اس گھر سے خیر و برکت کے فرشتے رخصت ہو گئے تھے۔

نعیم کی خالہ کو تو نعیم کے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا لیکن خالہ کا سایہ اس گھر سے نہ نکلا۔ وہ گزشتہ تین ساڑھے تین سال سے اس گلی میں سے بھی نہیں گزری تھی لیکن نعیم کی ماں اسے دوسرے چوتھے روز مل آتی اور کوئی نئی بات، کوئی نئی چال لے آتی تھی۔ خالہ جس لڑکی کا رشتہ نعیم کے ساتھ کرانا چاہتی تھی وہ ایک ادھیڑ عمر پٹواری سے بیاہی جا چکی تھی اور خالہ نے روپے ڈیڑھ ہزار کا قرضہ بھی اُتار دیا تھا لیکن جس بے عزتی سے اسے نعیم کے گھر سے نکالا گیا تھا، اس کے انتقام کا خیال اسے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ڈیڑھ ہزار کا قرضہ جو واپس دینا پڑا تو اس کی نگاہ میں اس کی ذمہ دار بھی طاہرہ تھی۔ خالہ تو طاہرہ کو برباد کر دینا چاہتی تھی لیکن اس کا بس نہ چلتا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا ــــ نعیم کی ماں ــــ جسے وہ بے جگری سے استعمال کر رہی تھی۔ یہ ماں وہ ہتھیار تھا جو دن رات چلتا رہتا تھا۔

طاہرہ کے پاس جو ہتھیار تھا اس کی ضرب زیادہ کاری تھی۔ طاہرہ نے ساس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ کچھ یکسر لاتعلق ہو جاتی تھی جیسے وہ سن ہی نہیں رہی اور ساس تڑپ اٹھتی تھی لیکن یوں نظر انداز کرنے اور لاتعلق ہو جانے سے طاہرہ اس کے سینے سے بچی نہ رہتی تھی۔ اس کے سینے میں آگ لگی رہتی تھی مگر طاہرہ اس آگ کو بھی کام میں لے آتی تھی۔

اس آگ کی تپش سے اس نے تین اور ڈرامے لکھے تھے جو آزادی کی تین راتوں کو سکول میں کھیلے گئے تھے۔ ان ڈراموں نے کالج کے لڑکوں کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ اُنہوں نے کالج کے فنڈ سے اور کچھ چندہ جمع کر کے تین سو روپیہ طاہرہ کو دے کر اس سے ڈرامہ لکھوایا تھا جو اُنہوں نے قائدِ اعظم کے یوم پیدائش پر کھیلا تھا۔ طاہرہ تین سو روپے قبول نہیں کر رہی تھی لیکن لڑکوں اور پرنسپل کے اصرار پر اس نے معاوضہ قبول کر لیا تھا جو اس نے نعیم کو بتا کر ڈاک خانے میں جمع کرا دیا تھا۔ محلے کی ایک غریب سی بچی کو جسے پڑھنے کا شوق تھا طاہرہ نے اپنے سکول میں داخل کرا دیا تھا۔ یہ سکول کنونیٹ کی طرز پر چلایا جا رہا تھا۔ اس لیے فیس زیادہ تھی۔ بچی کے والدین اتنے غریب تھے کہ وہ اسے عام سکول میں بھی بٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ طاہرہ نے انہیں کہا تھا کہ وہ جب تک زندہ ہے اس بچی کی تعلیم کی ذمہ دار رہے گی۔

چند ہی مہینوں بعد مُسلم گرلز ہائی سکول والوں نے ایک ڈرامہ طاہرہ سے لکھوایا تھا اور اسے کہا تھا کہ اگر وہ اس ڈرامے کی ہدایتکاری کرے تو وہ پانچ سو روپیہ معاوضہ دیں گے۔ طاہرہ کو پانچ سو کا تو لالچ نہ تھا۔ اسے لڑکیوں کے ساتھ دلچسپی تھی۔ وہ آئندہ نسل کی ماؤں کے ذہنوں میں ایک چنگاری ڈالنا چاہتی تھی جس کے لیے یہ موقعہ خوب تھا چنانچہ اس نے یہ پیش کش قبول کر لی تھی۔ تین مہینے اسے بہت محنت کرنی پڑی تھی۔ اس کا مقصد پُورا ہو گیا تھا۔ اس سکول کی کئی ایک لڑکیاں اس کی مرید بن گئی تھیں اور طاہرہ نے ان کے خام کردار کو اپنے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے یہ پانچ سو روپے اس بچی کی تعلیم کے لیے وقف کر دیئے تھے۔

ساس جو آگ طاہرہ کو لگاتی تھی اسے طاہرہ بجھاتی نہیں تھی بلکہ اس کی تپش کو تعمیری رنگ دے کر اسی سے لڑکیوں اور سکول کے کارکنوں کی روحوں کو گرم رکھتی تھی۔ نعیم کا ردِ عمل بہت مختلف تھا۔ اس کی شخصیت خام تھی۔ اس کا دل جو شروع ہی سے کمزور چلا آ رہا تھا نعیم کی ماں سے ٹوٹ گیا اور وہ دل کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کو جس دن اس کے باپ نے تھپڑ مارا تھا اس دن سے اس کا دل دکھنے لگا تھا۔ اس کی جذباتیت جسمانی مرض بن گئی تھی۔ وہ ماں کو چاہتا تھا۔ اسے طاہرہ سے بھی محبت تھی اور جب ماں طاہرہ کا قافیہ تنگ کرتی تو نعیم ماں سے نفرت کرنے لگتا تھا۔ ایسے میں اس کی شخصیت کے دو ٹکڑے ہو جاتے تھے اور ذہن میں ہولناک کش مکش شروع ہو جاتی۔ اس کے علاوہ برسوں پہلے طاہرہ کا تعاقب، اسے قتل کرنے کا ارادہ اور انکشاف اس کے اعصابی نظام پر آسیب بن کر سوار ہو گیا تھا۔ احساسِ جرم بچھو کی طرح اسے اندر ہی اندر ڈستا رہتا تھا۔ وہ اس خفت کو کسی لمحہ مٹا نہ سکا۔

جس گھر میں پانچ برس پہلے مسرتیں اور باہمی پیار و محبت کا دور دورہ تھا وہاں اب اُلو بولتے تھے۔ وہ گھر جو صرف تین انسانوں سے بھرا بھرا لگتا تھا طاہرہ اور نوکرانی کے اضافے کے باوجود خالی خالی اور ویران نظر آتا تھا۔ ہر سو قلتیں اور اُداسیاں سرسراتی سنائی دیتی تھیں۔ نعیم کے لیے تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ طاہرہ نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی تھی اور اسے کئی بار کہا تھا کہ ان بدمزگیوں کو نظر انداز کرتا رہے لیکن نعیم کی داخلی اور خارجی دنیا میں سمجھوتہ ہوتا ہی نہیں تھا۔

اب تین برسوں سے طاہرہ کا ایک اور جُرم سامنے آنے لگا تھا۔ وہ یہ کہ طاہرہ کے ہاں بچہ نہیں ہوتا۔ خالہ نے اس کے جرم کا پروپیگنڈہ محلے میں کیا تھا کہ طاہرہ کو ایک پیر کی بددعا ہے۔ اسے کبھی بچہ نہ ہو گا اور اگر کسی حاملہ عورت پر اس کا سایہ پڑ گیا تو حمل گر جائے گا۔ طاہرہ کو اس پروپیگنڈے کا علم نہ تھا۔

کوئی ڈیڑھ پونے دو برس کا ذکر ہے کہ وہ پڑوس میں ایک گھر گئی۔ وہاں نئی دلہن آئی ہوئی تھی۔ طاہرہ اس سے پہلے بھی اس کے ہاں گئی تھی اور دلہن اس کے ہاں آتی رہتی تھی۔ اُس روز طاہرہ وہاں گئی تو دلہن کی ساس نے دلہن سے کہا ــــ "جاری اندر جا کے لیٹ جا۔

اور طاہرہ کو بے رخی سے کہا —"جاؤ طاہرہ! اس کی طبیعت اچھی نہیں"— طاہرہ نے یہ بے رخی محسوس کی تھی لیکن اسے دجہ [illegible] ہو سکا۔ وہ زخمی پرندے کی طرح گھر لوٹ آئی تھی۔

دوسرے ہی دن دلہن ساس کی نظر بچا کر طاہرہ کے پاس آئی اور اسے بتا دیا تھا کہ اس کی ساس اسے طاہرہ کے سائے سے بچانا چاہتی تھی۔ دلہن نئی روشنی کی لڑکی تھی، وہ طاہرہ کی سہیلی بن گئی تھی۔ پھر اسی کی زبانی طاہرہ کو معلوم ہوا تھا کہ محلے بھر میں اس کے خلاف یہ بات پھیل چکی ہے کہ طاہرہ کو ایک پیر کی بددعا ہے کیونکہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ پکڑی گئی تھی۔ طاہرہ نے مسکرا کر اس چوٹ کو بھی اپنے سینے میں جذب کر لیا۔

نعیم کی ماں کو تو خوب علم تھا کہ اس فتنے کا منبع کہاں ہے لیکن ایک رات انجان سی بن کر وہ نعیم سے کہنے لگی —"بیٹا! محلے میں یہ مشہور ہو گئی ہے کہ..." اور ماں نے ایک کہانی گھڑ کے نعیم کو سنا ڈالی۔ پھر نعیم کے باپ کو جا سنائی۔

باپ تو اب اس کی کسی بات پر یقین کرتا ہی نہ تھا لیکن نعیم کے علیل دل پر کاری ضرب لگی اور دل تیزی سے علیل ہونے لگا۔ اس بات کو مانے تو دل ڈوبتا تھا نہ مانے تو یہ غم اسے دبا لیتا تھا کہ طاہرہ اب محلے میں بھی بدنام ہو گئی ہے۔ گرد و پیش کا ذرہ ذرہ مشکوک، مشتبہ اور دشمن دکھائی دینے لگا۔

نعیم نے زیادہ کڑھنا شروع کر دیا۔ دل کا عارضہ تیز ہونے لگا اور ایک سال پیشتر سے وہ چارپائی پر پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں سختی سے کہہ دیا تھا کہ مریض کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کی جائے جس سے اس کا دل دکھے یا طبیعت میں ذرا سا بھی ہیجان پیدا ہو —"بیوی سے دور رہنے"— کی ہدایت تو اسے تین سال گزرے ملی تھی، یہی وجہ تھی کہ طاہرہ نے بچے کو جنم نہیں دیا تھا۔ جذباتی قرب نے جسمانی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ طاہرہ بہت کوشش کرتی تھی کہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق نعیم کو ناگوار باتوں سے دور رکھے لیکن اس ماں جو اس قدر قریب تھی۔ اسے کون دور رکھتا؟

نعیم کے مرض کا یہ حال کہ بعض اوقات اچھا بھلا ہو جاتا اور دفتر بھی چلا جاتا تھا اور جب بیماری کا دورہ پڑتا تو کئی کئی دن چارپائی سے اٹھ نہ سکتا تھا اگر اٹھتا تھا تو دل کی دھڑکن اس طرح بیٹھ جاتی جیسے دوسرے ہی لمحے حرکت بند ہو جائے گی۔ جب وہ اچھا بھلا ہوتا تو کا دباؤ معمول سے زیادہ تیز ہو جاتا تھا۔

طاہرہ اپنے طور پر تو ڈاکٹروں کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی اور نعیم سے بھی ہر طرح کا پرہیز کروا رہی تھی لیکن جو زہر نعیم کے اندر سے اٹھ اٹھ چپکے چپکے اس کے دل کو کھا رہا تھا اس کا علم طاہرہ کو نہیں تھا۔ اس کے مرض کا ایک ہی علاج تھا کہ اس کے گھر کی فضا اور ماحول اس طرح کا ہو جاتے جس طرح عروسی کی شب کو تھا۔ باپ بھی خوش، ماں بھی خوش، وہ خود مسرور اور طاہرہ کی خوشی کا تو ٹھکانہ ہی نہ تھا لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ طاہرہ کی دعائیں اور نعیم کے آنسو جو وہ رضائی میں منہ چھپا کر بہایا کرتا تھا وقت اور زمانے کو پیچھے نہ کھینچ سکے نعیم کا مرض اسے ساتھ ڈوب رہا تھا اور اس کی ماں کی ماستا اسے ڈبوتی جا رہی تھی۔

اور ایک اور ناخوشگوار واقعہ ہو گیا۔

نعیم کی ماں کو ٹائیفائڈ ہو گیا۔ بخار سے وہ جل بھن رہی تھی۔ علاج شروع ہو چکا تھا لیکن بخار کم ہوتا ہی نہ تھا۔ طاہرہ نے پندرہ دن

کی چھٹی لے لی اور ساس کے سرہانے جا بیٹھی لیکن ساس نے پہلے تو منہ رضائی میں چھپا لیا، جب دیکھا کہ طاہرہ ابھی تک نہیں اٹھی تو اس کی طرف پیٹھ کر لی پھر بھی طاہرہ نہ اٹھی تو ساس نحیف آواز میں بولی —"نوکرانی کو بھیج دو۔ تم جاؤ"

"مجھے بتائیں نا!"— طاہرہ نے لجاجت سے کہا —"نوکرانی سے کیا کروانا ہے۔ وہ کیا تیمارداری کرے گی"

"اری کہاں مر گئی ہو تم"— ساس نے طاہرہ کو جواب دیئے بغیر مریل آواز میں نوکرانی کو آواز دی۔ اس کی آواز اس قدر نحیف تھی کہ کمرے سے باہر جا ہی نہیں سکتی تھی۔

"امی جان!"— طاہرہ نے کہا —"میں نے صرف آپ کے لیے پندرہ دن کی چھٹی لی ہے۔ مجھے بتائیں۔ میں صرف آپ کی خدمت..."

"اری جا دفع ہو میاں سے"— ساس نے اپنا مخصوص حربہ استعمال کیا۔ اس کا خون بخار سے تو پہلے ہی کھول رہا تھا جب غصہ آیا تو خون ابل اٹھا اور حرارت اور تیز ہو گئی جس کا اثر سیدھا دماغ پر ہوا۔ وہ واہی تباہی بکنے لگی —"آئی ہے خدمت کرنے والی۔ تو نے ہی تو جادو کیے ہیں مجھ پر۔ تیری کالی زبان نے ہی مجھے گرایا ہے۔ میرے بچے پر بھی تو نے ہی جادو کر رکھے ہیں۔ میں نے تجھے اپنی آنکھوں دیوان صاحب کے مزار پر جاتے دیکھا ہے"

"کون سے دیوان صاحب، امی جان؟"— طاہرہ نے چوٹ کو اپنے آپ میں جذب کرتے ہوئے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

"انجان بنتی ہے اب چڑیل! وہ دیوان صاحب جسے سارا جالندھر جانتا ہے"

"لیکن یہ تو پشاور ہے امی جان!"

"چل جھوٹی! مکارن! یہ جالندھر ہی تو ہے"

طاہرہ سمجھ گئی کہ بڑھیا کا دماغ چل گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا بے ہوش ہو گئی۔ ادھر نعیم چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ ادھر اس کی ماں کا یہ حال۔ طاہرہ دن رات دونوں کی تیمارداری میں مصروف رہنے لگی۔ آدھی آدھی رات کو بھی اس نے ساس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی واہی تباہی اور گالیاں سنیں۔

ایک دن نعیم کے باپ نے طاہرہ سے کہا —"بیٹی تم اس کے قریب نہ جایا کرو۔ جنگلی عورت ہے اور اب تو بخار نے اس کا دماغ بالکل ہی بیکار کر دیا ہے۔ تم اس سے دور رہا کرو۔ ہو سکتا ہے ابھی سے اس کا بخار ہلکا ہو جاتے"

طاہرہ مسلسل چار روز ساس کے کمرے میں نہ گئی جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ بڑھیا کا بخار کم ہو گیا۔

آٹھویں روز وہ نقاہت سے ادھ موئی ہو چکی تھی۔ طاہرہ نے دیکھا کہ وہ کمرے سے نکلنے کے لیے دروازے کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا جیسے قبر سے مردہ نکل آیا ہو۔ ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سفید ہو چکی تھیں۔ وہ کواڑ کو پکڑے کھڑی کانپ رہی تھی اور قدم آگے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ قدم اٹھتا نہ تھا۔ صحن میں دھوپ میں چارپائی بچھی تھی۔ ساس شاید اس چارپائی تک آنا چاہتی تھی۔

طاہرہ اپنے کمرے میں بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اس نے بے اختیار چاہا کہ اٹھ کر اسے سہارا دے اور چارپائی تک لے آئے لیکن اسے ساس کے ردعمل کا خیال آ گیا۔ وہ خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ ساس کو اس کمزوری میں قدم اٹھانے کی کوشش میں جس قدر دقت ہو

رہی تھی، اس سے کہیں زیادہ اذیت طاہرہ کی روح کو ہو رہی تھی لیکن مجبور تھی جیسے اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں۔

اسے خیال آیا کہ آج شاید بخار نہیں آیا، کہیں ایسا نہ ہو کہ غصے میں اس کا درجۂ حرارت چڑھ جائے۔ طاہرہ بیٹھی رہی۔ اس نے ایک بار پھر ساس کو دیکھا جو ابھی تک کواڑ کا سہارا لیے کھڑی آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑھیا کا جسم زور سے لرزا اور دھڑام سے اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔ نوکرانی گھر نہیں تھی۔ نعیم کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ باپ باہر گیا ہوا تھا۔

طاہرہ نے پندرہ بیس قدم کا فاصلہ جیسے ایک ہی جست میں طے کر لیا ہو۔ وہ سب کچھ بھول کر چیل کی طرح جھپٹی اور ساس کو اٹھالا۔ ساس بے ہوش ہو چکی تھی۔ نعیم نے اس کے گرنے کی آواز سن لی تھی اور طاہرہ کو بھاگتے جو دیکھا تو وہ اٹھ کر اپنے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ اس کے جسم میں بھی اب اتنی سکت نہیں تھی کہ کسی کو جا کر سہارا دے۔

وہ دیکھتا رہا کہ طاہرہ اس کی ماں کو بازوؤں پر سنبھالتے ہوئے صحن میں کھچی ہوئی چارپائی کی طرف لا رہی تھی۔ چارپائی تک ابھی تین چار قدم کا فاصلہ باقی تھا کہ بڑھیا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ جونہی اس کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے گردن گھمائی جب دیکھا کہ طاہرہ اسے سہارا دے کر لا رہی ہے تو بڑھیا کے جسم کی بچی کھچی طاقت زبان میں آگئی اور وہ لرزتی کانپتی آواز میں طاہرہ پر برس پڑی

”ہٹ جا چھوڑ دے مجھے۔ خبردار جو میرے جسم کو ہاتھ لگایا تو....“ بڑھیا کی آواز بھی ہکلا گئی تھی لیکن وہ بولے جا رہی تھی.... ”کالی والی چڑیل۔ ہٹ دور ہو....“ اس نے طاہرہ کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے زور لگانا شروع کر دیا لیکن طاہرہ اسے بازوؤں میں لیے چارپائی کی طرف لا رہی تھی۔ بڑھیا بولے جا رہی تھی.... ”میری جان لینا چاہتی ہو ڈائن؟ خبردار اب جو مجھے دھکا دیا تو....“

نعیم دروازے میں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا اور اس کا دل جو اس دن ذرا سنبھلا ہوا تھا ڈوبنے لگا اور دل پر درد کی ٹیس بھی اٹھی۔ یہ اس مرض کی خطرناک ترین صورت تھی۔

طاہرہ اور ساس نے نعیم کو نہ دیکھا۔ بڑھیا بدستور تڑپ رہی تھی اور طاہرہ اسے اٹھا کر چارپائی تک لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اسے چارپائی تک لے ہی آئی اور بٹھا دیا۔

طاہرہ جذبات اور اپنے اخلاق کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہوئی کہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی ساس کے سامنے زمین پر دوزانو بیٹھ گئی اور بازو ساس کے گھٹنوں پر رکھ کر گڑگڑا اٹھی۔ ”خدا کے لیے مجھے یوں نہ دھتکاریں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ میری ماں مر گئی ہے۔ آپ ہی میری ماں ہیں۔ مجھے یوں بددعائیں نہ دیں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔ خدا آپ کو لمبی زندگی دے۔ خدا آپ کے بیٹے کو لمبی عمر دے۔ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیں۔“

طاہرہ کی وارفتگی کا یہ عالم کہ اس نے سر ساس کی گود میں پھینک دیا جسے ساس نے اس طرح ایک طرف دھکیل دیا جس طرح لڑھکا دیا جاتا ہے۔

”میں خوب جانتی ہوں تیری مکاری کو“ ساس نے کہا اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ طاہرہ بھاگ کر سرہانہ اٹھا لائی اور بڑھیا کے بڑبڑانے اور مزاحمت کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کا سر اٹھا کر سرہانہ نیچے رکھ دیا۔ پھر اس پر کمبل ڈال دیا۔

نعیم کے لیے یہ جھٹکا ضرب کاری سے کم نہ تھا۔ اس کے آنسو نکل آئے۔ غصہ بھی آیا اور اس کے احساسات اس کے دل پر اثرانداز ہوتے۔ جب طاہرہ کمرے میں گئی تو دیکھا کہ نعیم پلنگ پر نیم بے ہوشی کی حالت میں اس طرح پڑا ہے کہ ٹانگیں نیچے لٹک

رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں جن میں آنسو چمک رہے تھے۔ طاہرہ نے گھبرا کر نعیم کو بلایا تو نعیم نے ذرا سی حرکت کی لیکن بول نہ سکا۔ طاہرہ نے اس کی ٹانگیں پلنگ پر کیں۔ پیشانی پر ہاتھ رکھا تو بخار کا شک ہوتا تھا۔ نبض دیکھی تو بالکل ہی بے قاعدہ تھی۔ نعیم کو دو چار آوازیں دیں تو وہ سرگوشی میں کچھ بولا۔ پھر ہاتھ کا اشارہ کیا لیکن طاہرہ سمجھ نہ سکی۔

نعیم کی حالت کی تبدیلی وہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ گذشتہ تین مہینوں سے اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور آنکھیں بھی بے نور ہوتی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے کئی بار کہا تھا اگر کسی وقت ذرا سا بھی شک گزرے کہ مریض پر غشی طاری ہے یا طاری ہونے والی ہے تو فوراً اطلاع کی جائے۔

طاہرہ دوڑتی باہر نکل گئی۔

ڈاکٹر آیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ڈاکٹر طاہرہ کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ جب طاہرہ واپس آئی تو اس کا سر یوں جھکا ہوا تھا جیسے ہارا ہوا سپاہی میدان جنگ سے واپس آتا ہے۔ وہ کمرے میں آئی تو دیکھا کہ نعیم یا تو بے ہوش تھا یا گہری نیند سو رہا تھا۔ طاہرہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ آنسو رکتے ہی نہیں تھے۔ کمرے کی ہر ایک چیز ایک چکر میں گھوم رہی تھی۔ طاہرہ کو ان پانچ سالوں میں پہلی بار افسوس اور پچھتاوا ہوا کہ اس نے نعیم اور اس کے باپ کا کہا نہ مانا اور نعیم کو علیحدہ مکان کا انتظام نہ کرنے دیا۔

طاہرہ کو توقع تھی کہ نعیم ماں کے قریب رہے گا تو ماں کا دل اس کے پیار میں لگا رہے گا۔ اس کے علاوہ ساس کی خدمت بھی کرنا چاہتی تھی لیکن اسے آج محسوس ہوا کہ اس نے خطرناک غلطی کی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی جگہ اور آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کہا تھا۔ وہ پنڈی نجمہ کے ہاں ہی چلے جاتے۔ طاہرہ کو یوں لگا جیسے نعیم کو اس حالت تک اس نے خود پہنچایا ہے۔ اسی نے اسے اس روح کش ماحول میں رہنے پر مجبور کیا تھا۔

ڈاکٹر کے آج کے رویے نے تو طاہرہ کے بال و پر نوچ ڈالے تھے۔ اس کی ساری امیدیں اس طرح چکنا چور ہو گئیں جیسے کانچ کی چوڑی پر پتھر گر پڑا ہو۔ آج ڈاکٹر نے کہا تھا ”مریض کو اب چارپائی سے اٹھنے نہ دینا۔ جسم کم سے کم حرکت کرے۔“

ایک وہ وقت کہ ڈاکٹر نے آب و ہوا کی تبدیلی کا مشورہ دیا تھا اور ایک یہ وقت کہ اس نے چارپائی سے ہلنا بھی بند کر دیا۔ ان دو وقتوں میں پورے تین سال کا عرصہ حائل تھا۔ جب طاہرہ کو ان تین طویل برسوں کا خیال آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک اندھیرے مہیب غار کے منہ میں کھڑے پایا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے غار کے اندھیرے میں جھانکنے سے گھبرا رہی ہو۔ آنسوؤں کی دھند میں اسے بہت ساری باتیں یاد آئیں لیکن اس نے سر جھٹک دیا۔ وہ اب ماضی کو یاد کرنے سے گھبراتی تھی جیسے آسیب زدہ مکان میں جھانکنے سے دل پر ہول طاری ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر آ کر طاہرہ نے ایسی بے لبسی محسوس کی جو اس کی قوت سے باہر تھی۔ اس کے سامنے اب یہی قوت تھی جو اس کی ڈوبتی کشتی کو پار لگا سکتی تھی۔ طاہرہ اس قوت کے سامنے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دوزانو ہو کر رویا کرتی تھی۔

طاہرہ کی عمر چھبیس ستائیس برس ہو چکی تھی لیکن ان پانچ برسوں کے کٹھن عرصے نے اسے کملا کے رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر جو رونق تھی وہ اس کی روح کا پرتو تھا یا اس کے نقش و نگار ہی دل کش تھے ورنہ وہ عمر سے زیادہ بڑی دکھائی دیتی تھی۔ کچھ عرصے سے وہ تین تین چار چار دن کنگھی بھی نہیں کرتی تھی۔ بعض اوقات کپڑے بدلے بغیر سکول چلی جاتی تھی۔ ساس کے فتور نے اور نعیم کی بیماری نے اس کا حال حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا۔ وہ کئی کئی راتیں سو بھی نہ سکتی تھی۔ نعیم کی تیمارداری کے علاوہ وہ کچھ دیر خدا سے ہمکلام رہتی اور نعیم اور ساس کی صحت کے

لیے دعائیں کرتی رہتی تھی۔ اس کی دعاؤں میں یہ فقرہ ہمیشہ شامل ہوتا تھا — "یا خدا! نعیم کی ماں کو بتا دے کہ وہ اپنے اکلوتے بچّے کو کھا رہی ہے۔"

اس دن کے بعد نعیم چارپائی سے نہ اُٹھا۔ اس کی ماں کا بخار ختم ہو چکا تھا اور وہ دن بدن صحت یاب ہوتی جا رہی تھی۔ اسی رفتار سے اس کی زبان میں تیزی آتی جا رہی تھی اور نعیم کی حالت اس سے زیادہ تیز رفتاری سے بگڑ رہی تھی۔ جوں جوں نعیم کا رشتہ زندگی سے ٹوٹتا جا رہا تھا اس کی ماں کی فتنہ پردازیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ نعیم کے کانوں میں کئی بار ماں کے یہ الفاظ پڑے — "اس کلموئی نے میرے بچّے پر جادو کیے ہوئے ہیں.... یہ ڈائن اب دُوسرا مرد ڈھونڈ رہی ہے" — اس کی ماں نے یہ فقرے کئی بار کہے تھے۔ کبھی طاہرہ کی موجودگی میں کبھی اس کی غیر حاضری میں۔

نعیم کے دل میں یہ الفاظ زہریلے تیروں کی طرح اتر گئے تھے اور اب نعیم کا دل سوجنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے باپ نے ڈاکٹر سے مشورہ لیا کہ نعیم کو ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے لیکن ڈاکٹر نے منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ ہسپتال کا ماحول اس قسم کے مریض کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ اس مرض میں مریض کی نفسیات کا بہت دخل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کو معلوم نہ تھا کہ گھر کی فضا ہسپتال سے زیادہ اذیّت رساں ہے۔ وہاں مریض کراہتے ہیں، یہاں چڑیلیں چیختی ہیں۔ ڈاکٹر نے نعیم کے باپ کو ایک بار پھر تاکید کی کہ مریض کے لیے اب صرف اور صرف حوصلہ مند اور روح افزا باتوں کی ضرورت ہے۔ دوائی کا اپنا اثر ہے گردوپیش کا اپنا اثر ہے۔ باپ کے دکھے ہوئے دل کو یہ تلخ احساس کھائے جا رہا تھا کہ نعیم کی ماں نعیم کو اپنے ہاتھوں قبر میں دھکیل رہی تھی لیکن باپ پر تو جیسے خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ بڑھاپا بیٹے کے روگ کو دیکھ نہ سکتا تھا اور ماں پر اس کا قابو نہ تھا۔

ایک صبح جب نعیم رات بھر سو نہ سکا اور طاہرہ رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی اسے تسلّیاں دیتی رہی اور روتی رہی تھی، باپ ان کے کمرے میں آیا۔ نعیم کی ذرا آنکھ لگ گئی تھی اور طاہرہ کُرسی پر سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھی کہ باپ نے اس طرح مری ہُوئی آواز میں نعیم کا حال پوچھا جیسے پوچھنے سے گھبرا رہا ہو، حال وہ دیکھ ہی رہا تھا۔ طاہرہ نے اُوپر دیکھا اور نعیم کا باپ طاہرہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر چپ چاپ کُرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں ایسا سکوت طاری تھا کہ طاہرہ باپ کے دل کی دھڑکن بھی سن رہی تھی۔

"ڈاکٹر کہتا ہے اس کے سامنے ایسی ویسی بات نہ کی جائے" — باپ نے دکھے ہوئے لہجے میں دبی دبی آواز میں کہا — "اُسے کیا معلوم کہ یہاں ایسی ویسی باتوں کے سوا کچھ رہا ہی نہیں.... سُنو بیٹی!" — باپ نے طاہرہ کو اشارہ کیا تو طاہرہ کُرسی گھسیٹ کر اس کے قریب ہو گئی۔ باپ نے کہا — "نعیم کا تو یہ حال ہو گیا ہے۔ تم اس کی ماں کی بک بک کو دل میں نہ رکھنا اور اپنے آپ کو روگ نہ لگا لینا تم دونوں میرا سہارا ہو۔"

"ابّا جان!" — طاہرہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا — "میں تو درگزر کرتی رہتی ہوں لیکن ان کی خاطر کچھ کرنا پڑے گا۔ رات آپ نے سُنا تھا امّی جان کیا کہہ رہی تھیں؟ وہ تو اپنا سینہ ٹھنڈا کر کے چلی گئیں اور یہ رات بھر تڑپتے رہے۔ ابھی ابھی آنکھ لگی ہے ان کی۔ ہم دونوں پوری رات جاگتے رہے ہیں۔ رات انہیں امّی جان سُنا رہی تھیں کہ محلّے کی عورتیں کہتی ہیں کہ طاہرہ نے اپنے خاوند پر جادو کیے ہوئے ہیں۔"

"سب سُنتا رہتا ہُوں بیٹی! سب سنتا رہتا ہُوں" — باپ نے کہا اور باہر چلا گیا۔

طاہرہ نے پھر سر جُھکا لیا اور گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ ساس کے کمرے سے ساس کی اُونچی اُونچی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"تو کیا میں نے اپنے بچّے کو بیمار کیا ہے؟ جس بچے کو میں نے مخمل پر سُلایا اور رات رات بھر گود میں لیے پھری ہوں اسے ماں نے بیمار کیا ہے؟"

"خُدا کے لیے آہستہ بات کرو اور میری بات سمجھنے کی کوشش کرو" — یہ نعیم کے باپ کی آواز تھی — "اپنے بچّے کی خاطر نہ بولو۔ وہ سو رہا ہے۔"

"میں دیکھ رہی تھی کہ وہ چڑیل تمہیں پاس بٹھا کر پٹّی پڑھا رہی تھی" — ماں کی آواز اور بلند ہو گئی۔

وہ اپنے خاوند کی تو سننا ہی نہ چاہتی تھی۔ جو مُنہ میں آیا بکتی جا رہی تھی۔ ایک تو وہ پہلے ہی جلی ہُوئی تھی۔ پچیس دن کے ٹائیفائڈ نے بالکل لوری کر دی تھی۔

"بکواس بند کر!" — باپ نے گرج کر کہا — "تُو نے میرے اکیلے بیٹے کی جان لے کر دم لیا ہے۔"

ماں کہاں تھی دبنے والی۔ اُس نے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور چیخنے چلّانے لگی۔ وہ صحن میں آ کھڑی ہُوئی اور جوش و خروش سے باہر آئی۔ طاہرہ کو چکر آنے لگے۔ اُس نے بہت کچھ برداشت کر لیا تھا لیکن یہ منظر اس سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ ایک تو اس کا جسم شب بیداری اور نعیم کی صحت کے غم نے نڈھال کر رکھا تھا۔ دوسرے یہ فکر کہ نعیم کی آنکھ ابھی ابھی لگی ہے وہ جاگ نہ اُٹھے۔ کمرے کا دروازہ بند کرنے کو اُٹھی تھی کہ نعیم نے کراہ کر کروٹ بدلی اور بیماری کی ماری ہوئی آواز میں بولا — "یا خدا! یا اللہ! یہ کیا ہو گیا ہے؟ طاہرہ! ابا جان! امّی جان! خدا کے لیے مجھے مرنے تو آرام سے دو۔ ارے خدا کے لیے۔"

"امّی! میرے سر میں جُوتے مار لو لیکن اپنے اس مریض بچے کا تو کچھ خیال کرو" — طاہرہ آج پہلی بار غم و غصے کے لہجے میں بولی — "رات بھر جاگ اور تڑپ تڑپ کر اب اس کی آنکھ لگی تھی اور تم نے اسے جگا دیا ہے۔ اری تم ماں ہو یا ڈائن ہو۔ کیوں نہیں اس کا کلیجہ نکال کھا جاتی!"

طاہرہ نے پانچ برس میں پہلی بار ساس کو "تم" کہا جس سے ان کے جذبات کے اشتعال کا اندازہ ہوتا تھا۔ آج وہ نعیم کی صحت کی خاطر ساس سے فیصلہ کن جھڑپ لینے پر آ گئی تھی لیکن اس اشتعال میں وہ خود بھی بھول گئی تھی کہ وہ نعیم کے دماغ پر چیخ رہی ہے اور ان کا مہلک اثر اس کے دل پر ہو رہا ہے۔ ساس طاہرہ کی طرف لپکی۔ ٹائیفائڈ کی نقاہت ختم ہو چکی تھی۔

"اری چل بدکار کہیں کی! مجھے ڈائن کہتی ہے" — ماں نے طاہرہ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا۔ اِدھر سے نعیم کا باپ نعیم کی ماں کی طرف دوڑا۔

"خبردار جو میرے قریب آئی تو" — طاہرہ نے آستین چڑھا کر کہا — "جُوتے مار مار کر سر گنجا کر دوں گی کمبخت! پانچ برس سے میں نے آنکھ نہیں اُٹھائی اور تو سر چڑھ گئی۔ میں اس خاوند کی خاطر تیرا خون کر دوں گی" — اس نے دانت پیس کر کہا — "تیرا خون پی جاؤں گی۔"

نعیم کا باپ بڑھیا کو پکڑ کر دوسرے کمرے کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ طاہرہ صحن میں آگئی تھی۔ طاہرہ کی حالت اس مرغی جیسی تھی جس کے بچے پر چیل نے جھپٹا مارا ہو۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس ساس کو نعیم کے قریب کبھی نہیں آنے دے گی لیکن وہ ہولناک غلطی کر رہی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ نعیم پلنگ سے اُٹھ آیا ہے اور کواڑ کا سہارا لیے کھڑا ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس نے باپ کو دیکھ لیا تھا کہ وہ اس کی ماں کو گھسیٹ رہا ہے۔ طاہرہ کھڑی ساس کو سانس لیے بغیر سنا رہی تھی اور ساس فحش کلامی پر اتر آئی تھی نعیم سُوجے ہوئے دل پر یہ چوٹیں لے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد باپ نے ماں کو کمرے میں دھکیل کر باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر طاہرہ کو پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اپنے کمرے میں جانے کو کہہ رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ نعیم دروازے میں گرا پڑا ہے۔ باپ اور طاہرہ ایک ہی چھلانگ میں نعیم پر ٹوٹ پڑے اور اسے اُٹھا کر پلنگ پر جا ڈالا۔ طاہرہ جیسی کیسی حالت میں تھی۔ ننگے پاؤں ڈاکٹر کی طرف بھاگی۔

نعیم کی یہ حالت تھی کہ مُنہ ذرا سا کھل گیا تھا اور حلق سے کھڑ کھڑ کرتی اکھڑی ہوئی سانسیں آ جا رہی تھیں۔ آنکھیں نیم وا ایک مقام پر ٹھہر گئی تھیں۔ باپ نے پانی کی چند بوندیں حلق میں ٹپکائیں جنہیں نعیم نے نگل لیا وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ باپ نے اسے دو تین مرتبہ ہلایا تو نعیم نے آنکھیں کھولیں، پھر بند کر لیں۔ موت و حیات کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ نوکرانی ننگے سر کھڑی کانپ رہی تھی اور یا اللہ تو ہی ہے۔ یا اللہ تو ہی ہے" کا ورد کیے جا رہی تھی، اور باپ غمزدہ خود اعتمادی سے نعیم کے سرہانے بیٹھا اکلوتے بچے کو دیکھ رہا تھا

اُدھر ماں کمرے میں بند دروازے کو دونوں ہاتھوں سے اس قدر زور سے ہلا اور چلا رہی تھی کہ سارا مکان ہلتا محسوس ہوتا تھا۔ باپ نعیم کے جسم کے ہلکے ہلکے ارتعاش سے محسوس کر رہا تھا کہ یہ شور شرابا نعیم پر بری طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ باپ نے جا کر دروازہ کھول دیا اور نعیم کی ماں کو بازو سے پکڑ کر یہ کہتا ہوا نعیم کے پاس لایا — "یہ دیکھ اپنے بچے کا حال۔ اس کی ذمہ دار تو ہے صرف تو۔"

ماں نعیم پر گر پڑی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی — "ارے اس چڑیل کو خدا غرق کرے گا۔ ارے اس جادوگرنی نے میرے بچے پر جادو کر دیے ہیں۔ کہاں گئی وہ کلموتی۔"

وہ نعیم پر پڑی اس کے کانوں میں چیخ رہی تھی کہ باپ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر زور سے اُٹھایا اور دھکیل کے کمرے سے باہر نکال دیا۔

ڈاکٹر نے آ کر مریض کی حالت دیکھی نعیم کے دل پر سٹیتھو سکوپ رکھی۔ ڈاکٹر کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی کھل گئیں۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سٹیتھو سکوپ لپیٹ کر اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا۔ کمرے میں موت کا سکوت تھا۔ نوکرانی، طاہرہ اور باپ کی پھٹی پھٹی نگاہیں ڈاکٹر پر لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے بیگ کھولا مگر اس انداز سے جیسے وہ کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے نعیم کو ایک انجکشن لگایا اور سامان بیگ میں بند کر کے خاموشی سے چل پڑا۔ طاہرہ اور باپ حیران و مضطرب اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے وہ ڈاکٹر کی غیر معمولی خاموشی سے اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ ڈر کے مارے کچھ پوچھ ہی نہیں رہے تھے۔

ڈاکٹر چلا تو باپ اور طاہرہ اس کے پیچھے چل پڑے۔ ڈاکٹر نے حویلی کے دروازے میں سے نکلتے گھوم کر دیکھا اور کہا — "میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ اس سے مریض سکون سے ....." اور وہ چپ ہو گیا۔

"سکون سے سو جائے گا، ڈاکٹر صاحب؟" طاہرہ کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں ہاں! سو جاتے گا" — ڈاکٹر نے یوں جواب دیا جیسے طاہرہ نے اس کا فقرہ پُورا کر کے اس پر احسان کیا ہو۔

نعیم دن بھر سکون سے آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ ذرا سا ہلتا تھا۔ پھر ساکت و جامد ہو جاتا تھا۔ طاہرہ نے دو چار بار کھلانے پلانے کا اس نے ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے انکار کر دیا۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ طاہرہ نعیم کے سرہانے سے اٹھی۔ اس نے سکون کی نیند سوتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی لیٹ گئی۔ وہ کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔ لیٹتے ہی بے خبری کی نیند سو گئی۔

سحر کا وقت تھا۔ طاہرہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی جیسے سوتے میں کوئی اس کے سینے پر بیٹھ گیا ہو یا کسی نے اس کے سینے پر وزنی سل رکھ دی ہو۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سارا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ وہ بستر میں بیٹھی اندھیرے میں چاروں طرف سہمی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ دل کی گھبراہٹ زیادہ ہوتی جا رہی تھی اور سینے میں ایک گھٹن کو وہ شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ وہ دوسری کروٹ پر لیٹ گئی لیکن اُس پر ایسا ہول طاری ہوتا جا رہا تھا کہ چین آتا ہی نہیں تھا۔ کمرے میں گُھپ اندھیرا تھا۔

اُس نے آیۃ الکرسی پڑھی اور کروٹ بدل لی لیکن دم بدستور گھٹ رہا تھا اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اکتا کر اُٹھ بیٹھی اور لیمپ جلا دیا۔ نیند تو غائب ہو چکی تھی۔ وہ نعیم پر جا جھکی۔ اسے اطمینان ہُوا کہ ایک عرصے کے بعد نعیم گہری نیند سویا ہے۔ اُس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے یوں لگا جیسے برف کے تودے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ رضائی نعیم کی ناک تک پڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں نیم وا تھیں۔ طاہرہ نے رضائی کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ نعیم کا مُنہ ذرا سا کھلا ہُوا تھا۔ چہرے پر سفیدی مائل زردی چھائی ہُوئی تھی۔ یوں تو اس کا چہرہ زرد ہو چکا تھا لیکن اس طرح کا زرد نہ تھا۔ طاہرہ نے آہستہ آہستہ ہاتھ سرکا کر نعیم کے دل پر رکھا۔ وہاں خاموشی تھی۔ طاہرہ نے گھبرا کر نبضیں دیکھیں نبضیں بھی خاموش تھیں۔ دونوں بازو اکڑے ہُوئے تھے۔

"نعیم صاحب!" — طاہرہ نے آہستہ سے کہا۔

"خاموشی!"

"نعیم صاحب!" — اس نے ذرا زور سے کہا اور نعیم کے دل پر ہاتھ رکھا۔

"گہرا سکوت، ہونٹ ساکت۔"

"نعیم!" — طاہرہ نے نعیم کو جھنجھوڑ کر زور سے کہا اور پھر ایک چیخ تھی کہ طاہرہ کے سینے سے نکلی اور کمرہ لرز اٹھا — "میرے ..... ابا جان!"

طاہرہ پاگلوں کی طرح نعیم کے باپ کے کمرے کی طرف دوڑی۔

نعیم کی حرکتِ قلب رات سوتے میں بند ہو گئی تھی۔

وہی پلنگ تھا، وہی رضائی، وہی سرہانہ تھا۔ وہی کمرہ اور وہی فرنیچر تھا۔ وہی چھت جس کے نیچے طاہرہ کی پُر شباب اُمنگوں نے زندگی پائی تھی اور آج وہی کمرہ تھا جس نے اس کی امنگوں کو چُوس لیا تھا۔ نعیم کی وہ عطر بیز اور گرم سانسیں جنہوں نے طاہرہ کے سینے میں بھرے رومانوں کو مشتعل کر دیا تھا۔ آج خاموش تھیں جس مضطرب نے طاہرہ کے تارِ حیات کو چھیڑ کر اس کی کائنات کو مسحور کر دیا تھا آج اس سے نغمۂ درد کی دھیمی سی صدا بھی نہیں نکلتی تھی۔ تار ٹوٹ گئے۔ نغمے اُجڑ گئے، دل ٹوٹ گئے، تصوّروں کے محل ویران ہو گئے۔ طاہرہ کی دنیا سے یُوں گزر گیا جیسے ایک پرندہ شاخ پر بیٹھا، چہچہایا اور اُڑ گیا۔

پانچ برس کا وہ سپاٹ عرصہ۔ وہ ہولناک مدت کہ طاہرہ اور نعیم نے سوائے آغاز کی چند ایک راتوں کے سکون اور چین کا سانس نہ لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پلک جھپکتے گزر گیا ہو۔ نعیم کے سرد اور رُوح سے بیزار جسم کے پاس گُم سُم بیٹھے طاہرہ کو کچھ بھی یاد نہ آیا۔ بچپن نہ لڑکپن نہ جوانی۔ ارشد نہ عفت نہ نجمہ۔ جلال آباد نہ رلفیوجی کیمپ "آشا بھون" نہ پنڈی میں منائی ہُوئی شبِ عروسی۔ اسے تو یوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے وہ آج کے روپ میں پیدا ہُوئی تھی —— بیوہ —— اور تمام عمر بیوہ ہی رہی۔

نعیم کی میّت اس کے سامنے پڑی ہُوئی تھی اور طاہرہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ اسے رونا چاہیئے۔ چیخنا چاہیئے یا بال نوچنے چاہئیں۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ سینے میں وہی گھٹن تھی جو اس نے سوتے میں محسوس کی تھی اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ وہ گھٹن اب اس کا گلا بھی گھونٹ رہی تھی۔

دنیا میں کبھی کی سحر طلوع ہو چکی تھی لیکن طاہرہ کے گھر میں ابھی شب تار تھی —— طویل شب۔ بہت طویل کبھی نہ ختم ہونیوالی رات۔ یوں تو طاہرہ ملتی جلتی تھی لیکن اسے گرد و پیش کا ہوش نہ تھا۔ نعیم کا بے جان جسم اس کے سامنے پڑا تھا اور وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے ہوش نہیں تھا کہ صحن اور کمرے میں عورتوں کا جمِ غفیر جمع ہے۔ طاہرہ نے سنا ہی نہ تھا کہ اس کی ساس بَین کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی —— "میرے لال کے بھاگ پنڈی میں جا پھُوٹے"۔

طاہرہ کو علم ہی نہ تھا کہ عورتیں سرگوشیوں میں کہہ رہی تھیں —— "پیر کی بددعائی ہوئی ہے۔ یہ کوئی جھُوٹ تو نہیں۔ اس نے خاوند پر جادُو کرایا ہُوا تھا"۔

طاہرہ کو خیال ہی نہ تھا کہ اس کی ساس اور خالہ کا پروپیگنڈہ نعیم کی میّت کے گرد سیاہ دھوئیں کی طرح اُٹھتا اور پھیلتا جا رہا تھا ور اسے یہ بھی محسوس نہ ہُوا کہ نعیم کی میّت کو نہلا کر جنازہ باہر نکالا جا چکا ہے۔ اسے ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ کوٹھے پر چند عورتوں کے نرغے میں کھڑی تھی اور ایک جنازہ دور شیشم کے درختوں کی اوٹ میں چلا جا رہا تھا۔

طاہرہ کی اُمیدیں اور اُمنگیں شیشم کے درختوں کی اوٹ میں چھپ گئیں اور لوگوں نے ان پر مٹی ڈال دی۔

ستان میل رات کے سکوت کو چیرتی، سرحد کی وادیوں میں سے پیچ و خم کھاتی، چاندنی میں سیاہ دھواں اُگلتی بہت تیزی لڑی کی طرف آ رہی تھی۔ پشاور پیچھے ہٹتا ہٹتا بہت دور پیچھے رہ گیا تھا اور اس کی روشنیاں کبھی کی نظروں سے اوجھل ہو نشہرہ سے اٹک تک دریا کا پانی چاندنی کی چوڑی لکیر کی طرح گاڑی کے ساتھ ساتھ رینگتا آ رہا تھا اور طاہرہ کی نگاہیں اس ما تھیں۔ زنانہ انٹر کلاس کے ڈبے میں چار اور عورتیں لیٹی اونگھ رہی تھیں۔ طاہرہ گھٹنوں کو بازوؤں کے گھیرے میں لیے ڑکی کے ساتھ لگی بیٹھی پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر کھڑکی کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اس کے بیٹھنے کے ے ہار تھی، ایک شکست، ایسی شکست جس نے پھر اُٹھنے کی جیسے ہمت ہی چوس لی ہو۔

بھرا بھرا جوان چہرہ جس کے روئیں روئیں سے مسکراہٹیں پھوٹتی تھیں غم و اندوہ کی بکھری ہُوئی تصویر بنا ہُوا تھا۔ چمکتی ہُوئی ھیں جن میں سحر انگڑائیاں لیتے تھے، بُجھی بُجھی سی تھیں اور یہ آنکھیں سپید چاندنی میں یوں بھٹک رہی تھیں جیسے کھوئی ہوئی ا کر رہی ہُوں۔ اس کا دل آزردہ محبت کا سہارا لیے معمُول کی رفتار سے دھڑک رہا تھا اور گاڑی کے پہیّوں کی ٹھک ٹھکا ٹھک میں اسے زندگی کے لمحات پلٹتے اور چرچراتے سنائی دے رہے تھے۔ وہ لوہے کے پہیّوں نا پٹڑی کی پُر ہنگامہ رگڑ میں بیتے ہُوئے دِنوں کے قصے اور گزری ہُوئی زندگی کی ہما ہمی سُن رہی تھی۔

ہیئے شدّت سے چرچراتے۔ ایسی چیخیں جو طاہرہ کے دل کی خاموش چیخوں کی طرح درد آلود تھیں۔ گاڑی گولڑہ کے نکل آئی تھی اور نیم دائرے میں موڑ کاٹ رہی تھی۔ طاہرہ انجن کے ساتھ والے ڈبے میں بیٹھی ہوتی تھی۔ اسے موڑ ری ڈبہ نظر آیا اور اس کے پیچھے چاندنی میں چمکتی ہُوئی ریل کی پٹڑی جو دائرے کی صُورت گھومتی جا رہی تھی، دو متوازی ج سرمئی پس منظر میں اور زیادہ شفاف نظر آ رہی تھی۔

ہرہ کے ذہن میں ایسی ہی دو لکیریں اُبھر آئیں۔ ایسی ہی چاندنی اور ایسی ہی رات۔ اسے پیار بھری سرگوشیاں منائی اس کی نظروں کے سامنے سے راولپنڈی اور گولڑہ کے درمیان پھیلے ہوتے پہاڑ غائب ہو گئے اور ان کی یع میدان نے لے لی جس میں دور تک ریل کی چمکتی ہوئی پٹڑی دو سیدھی لکیروں کی طرح اُفق تک چلی گئی تھی۔ پٹڑی کے رخت۔ سامنے والٹن رلفیوجی کیمپ کی خاموش بارکیں۔ بارکوں میں سوتے ہوئے ہنگامے۔ بے بس اور لاچار کا ہجُوم اور سب پر چاندنی نے لطیف پردہ ڈال رکھا تھا۔

طاہرہ انٹر کے ڈبے میں بیٹھی، سر کھڑکی کے ساتھ لگائے، گولڑہ سے راولپنڈی تک پھیلے ہوئے ہریالے سلسلے کے دامن میں، چاندنی کی سرمگیں روشنی میں اس سہانے تصوّرات کی تفصیلات چن رہی تھی، ایک ایک کر کے اور انہیں اس جوڑتی جا رہی تھی جیسے بکھرے ہوئے موتی چن چن کر پرو رہی ہو۔

اس تصوّر میں سے ایک سریلی اور بڑی پرسوز آواز ابھرنے لگی۔

الف اَج وی رات سہاگ والی بھلکے کی جاناں کیہڑا رنگ ہوسی

ریل گاڑی کی آواز تھم گئی۔ رات کے سکوت پر، چاندنی پر وجد طاری ہو گیا۔ یہ آواز تھی تو برسوں پرانے تصوّر کی گرم کی محسوس لہروں کی طرح طاہرہ کے گرد منڈلانے لگی۔ اس کے آنسو بہ نکلے۔ اس کی سہاگ رات کو رات کی تیرگی نے ڈس لیا

یہ مترنم آواز اس رات کی تھی جب طاہرہ لٹی پٹی والٹن ریفیوجی کیمپ میں آئی تھی۔ اس وقت اسے لٹنے اور بے گھر ہونے غم نہیں تھا۔ وہ خوش تھی کہ اس نے پاکستان حاصل کر لیا ہے۔ اس سے بڑھ کر سہاگ رات حسین نہیں ہو سکتی تھی مگر آج ا جب اس کی سہاگ رات لٹ گئی تو وہ ہارے ہوئے زخمی سپاہی کی طرح یادوں میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔

اس کے ذہن میں وہی پرسوز بول اٹھ رہے تھے جو اس نے ریفیوجی کیمپ سے کچھ دور رات کو ریلوے لائن کے قریب ارشد کے پاس نیم دراز ہو کے سنے تھے۔ کوئی دکھیارہ مہاجر گا رہا تھا:

میلے فیر محمدا قسمتاں دے، کِتھے شمع تے کِتھے پتنگ ہوسی

ایک چیخ سنائی دی۔ وہ شمع ہمیشہ کے لیے بجھ گئی تھی جس پر طاہرہ پروانے کی مانند فدا ہوئی تھی۔ چیخ پھر سنائی دی جسے طاہرہ اپنے دل کی چیخ سمجھی لیکن یہ انجن کی وسل تھی۔

انجن کی کرخت وسل نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا اور ساتھ ایک دھکا جس سے اس کا سر گاڑی سے ٹکرا گیا۔ پروئے ہوئے موتی بکھر گئے۔ یاد اور تصور انٹر کلاس کے ڈبے میں غائب ہو گئے۔ طاہرہ نے گھبرا کر باہر جھانکا۔ گاڑی راولپنڈی کے سٹیشن کے باہر والے سگنل کے پاس رکی ہوئی تھی۔ سگنل گرا نہیں تھا۔

طاہرہ نے دیکھا کہ راولپنڈی شہر اور مضافات کی بتیاں دور دور تک زرد پیلے ستاروں کی طرح چاندنی میں جھلملا رہی تھیں۔ یہ بتیاں میلوں تک اس طرح بکھری ہوئی تھیں جس طرح طاہرہ کے تصورات اور خیالات بکھر گئے تھے۔ گاڑی کیا رکی ایک جھٹکے جیسے دنیا کا نظام ہی رک گیا ہو۔ جیسے وقت و زمانہ سگنل کی سرخ بتی کے نیچے آ کر ٹھہر گیا ہو۔ طاہرہ نے آہ لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ راولپنڈی شہر کی ہلکی ہلکی خوشبو اسے محسوس ہونے لگی۔ چھ برس سے دور رہنے کے باوجود پنڈی کی بو اسے یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ کل شام یہاں سے پشاور گئی تھی، لیکن یہ کل بہت طویل تھی، بہت لمبی، پانچ چھ برسوں پہ پھیلی ہوئی۔ اس میں اس نے مسرتیں بھی سونگھیں، دکھ بھی سونگھے۔ کس قدر اپنائیت تھی اس بو میں۔ طاہرہ کو کمرۂ عروسی میں جلتی ہوئی اگربتیوں اور رات کی رانی کے پھولوں کی بو یاد آ گئی۔ وہ ایک بار پھر رنگین تصوروں میں کھو چلی تھی کہ انجن چیخ اٹھا۔ موتی پھر بکھر گئے۔ طاہرہ نے کھڑکی میں سے جھک کر دیکھا۔ سگنل ابھی گرا نہیں تھا۔ وہ سر گاڑی کے ساتھ لگا کر نڈھال سی ہو گئی۔

طاہرہ کے ذہن میں دو الوداعیاں آ گئیں۔

میری اچھی طاہرہ! خدا تجھے یہ خوشیاں مبارک کرے۔ تیری ہر شب شبِ عروسی کی طرح حسین اور رنگ رنگیلی ہو جا، ی بہن خدا حافظ!

یہ نجمہ کی آواز تھی۔ چھ برس پرانی آواز، لیکن یہ آواز آج بھی ویسی ہی تھی۔ وہی شگفتگی، وہی محبت اور وہی چاؤ۔ نجمہ نے اسے ے رخصت کرتے کہا تھا ــــ "نعیم کے شوق میں ہمیں بھول نہ جانا۔ نئی شادی کے چوچلے دنیا ہی بھلا دیتے ہیں۔"

طاہرہ نے نجمہ سے بغل گیر ہو کر اسے بہت زور سے بھینچا تھا اور نجمہ نے اس کے سر کو چوم لیا تھا۔ پھر اطہر نے بھی اس چوما تھا۔ پھر اطہر نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا اور طاہرہ نے اس کے گھٹنے چھو لیے تھے۔

رکی ہوئی گاڑی کا انجن سائیں سوں، سائیں سوں کر رہا تھا اور طاہرہ کا ڈبہ انجن کا ارتعاش محسوس کر رہا تھا۔ نجمہ کی آواز دبتی دبتی ور طاہرہ کے ذہن میں ایک اور الوداعی کا منظر آ گیا۔

میری بیٹی! میں سینے پر پتھر رکھ کر تمہیں کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ ہارے ہوئے باپ کے دل کا حال تم نہیں سمجھ سکتیں عیم کا نعم البدل بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ نعیم نہ سہی اس کی بیوی ہی سہی۔ نعیم میرا سہارا تھا جو خدا نے چھین لیا۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر جہاں خادہاں ایک گونہ اطمینان بھی ہوتا تھا کہ طاہرہ ہے تو نعیم بھی ہے۔ میں تمہارے روپ میں اپنے مرے ہوئے بچے کی دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔" یہ نعیم مرحوم کے باپ کی آواز تھی۔ اسی شام کا ہی تو ذکر ہے۔

ایک نجمہ کی آواز جو چھ برس پرانی ہو گئی تھی اور ایک سسر کی آواز جو چند گھنٹے پہلے کی آواز تھی۔ یہ دونوں آوازیں کس قدر قریب یں۔ طاہرہ کے ذہن میں دونوں آوازیں خلط ملط ہو رہی تھیں اور وہ بے چین ہوئی جا رہی تھی۔

"نعیم کے مرنے کا دکھ میں نے صرف اس صورت میں برداشت کیا تھا کہ تم میری آنکھوں کے سامنے ہو۔ تم ہو تو نعیم بھی لیکن بیٹی! نعیم کی ماں نے گھر کا جو ماحول بنا رکھا ہے اس میں زہر ہے جس سے میں تمہیں بھی مارنا نہیں چاہتا۔ تم ابھی بچی ہو۔ تمہاری ابھی بچی ہے میری بیٹی! نعیم مر گیا ہے۔ تم زندہ رہو۔ میں بڈھا ہوں نعیم کو دیکھ کر جی رہا تھا۔ تم آئی تھیں تو میری زندگی بڑھ گئی تھی اب جینے کی تمنا ہے نہ امید۔ اگر گھر کے حالات اچھے رہتے تو میں تمہیں کبھی نہ جانے دیتا لیکن نعیم کی ماں نے صرف تمہارا ہی جینا بھی محال کر رکھا ہے۔ میں اب زیادہ دن جی نہ سکوں گا۔ جاؤ بیٹی! اپنی زندگی بناؤ۔ نئی راہیں تلاش کرو۔ تمہارے جیسی کردار کی لڑکیاں بھٹکا نہیں کرتیں۔ بھول جاؤ ان غموں کو۔ اپنی زندگی رونے میں برباد نہ کرنا۔ تمہیں ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔"

کا باپ زار زار رو رہا تھا اور طاہرہ کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔

انٹر کے ڈبے میں لیٹی ہوئی طاہرہ کی ہمسفر عورتیں اٹھ بیٹھیں۔ وہ بے چین ہو رہی تھیں کہ گاڑی چلتی کیوں نہیں۔ طاہرہ کو کوئی جلدی ی۔ اس کی نظر میں تو زمانہ ہی رک گیا تھا۔ ایک لمحہ بھی آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ طاہرہ کے لیے یہ رکاؤ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے با نجمہ اور نعیم کے باپ کی آوازیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ دو الوداعیاں!

"تمہاری ازدواجی زندگی کا آغاز کس قدر حسین ہے۔ خدا اس حسن کو ہمیشہ قائم رکھے۔"

"تمہاری ایک ازدواجی زندگی ختم ہو چکی ہے بیٹی! یہ نہ سمجھنا کہ زندگی ہی ختم ہو گئی ہے۔"

"نعیم کی آغوش کی پرلطف تپش میں پنڈی کو نہ بھول جانا۔ جلدی لوٹ آنا۔ پھر میں بھی پشاور آؤں گی اور تمہیں بستا رستا دیکھوں گی۔"

"بیٹی! نعیم قبر میں سو گیا ہے۔ آرام اور سکون کی نیند۔ وہ دنیا کی تلخیوں سے دُور چلا گیا ہے۔ مرحوم کے غم میں ہلکان نہ ہونا۔ کبھی فُرصت ہو تو اِدھر آجایا کرنا۔ نعیم کا بوڑھا باپ ان راہوں کو دیکھتا رہے گا جن پر تم آئی تھیں اور آج جا رہی ہو۔"

آوازیں بلند ہونے لگیں اور طاہرہ بے قرار۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"میکے راولپنڈی ہوں گے اور سُسرال پشاور، میں تمہاری سہیلی بھی ہُوں، بہن بھی اور ماں بھی۔"

"کاش! تم نعیم کی بہن ہوتیں۔ طاہرہ بیٹی! تمہارے جانے کے بعد نعیم بہت یاد آئے گا۔"

"تم تو طاہرہ میرا گھر ویران کر چلی ہو۔ ساری رونق تمہارے ساتھ تمہاری ڈولی میں جا رہی ہے۔"

"اب تو بیٹی! اس دن کو یاد کر کے دل بہلایا کروں گا جس دن تمہارا ڈولا آیا تھا۔"

"کن یری طاہرہ! تمہارا اتم ... اب کسی کو نہیں دوں گی۔ ان میں تم نے شبِ عروسی منائی ہے۔ اب تم ہی آکر اس میں چند دا رہا کرو گی۔"

"اب تمہارے کمرے کو میں باہر سے تالا لگا دوں گا۔ نہ اسے کھولوں گا نہ دیکھوں گا۔ اسی دھوکے میں زندگی کے باقی دن گزار دوں گا کہ تم اور نعیم اندر بیٹھے باتیں کر رہے ہو۔"

ایک دھچکا اور طاہرہ پھر چونک اٹھی۔ اس نے باہر دیکھا۔ سگنل کا کھمبا اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ پھر ایک دھچکا اور اس کے ساتھ ہی قیامت خیز شور، ہٹو بچو، ٹرنکوں اور گٹھڑیوں کا طوفان، بچوں اور عورتوں کا غل غپاڑہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے انٹر کا چھوٹا سا ڈبہ عورتوں اور بچوں سے بھر گیا۔ گاڑی راولپنڈی کے سٹیشن پر رُکی ہُوئی تھی۔

طاہرہ قلی سے اپنا ٹرنک اور سوٹ کیس اٹھوا کر پلیٹ فارم پر اتر آئی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ راولپنڈی کے پلیٹ فارم کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ ہچکیاں لے لے کر رو پڑے گی۔ اسے وہ وقت یاد آگیا جب وہ لاہور سے راولپنڈی آئی تھی، وہ وقت جب وہ نعیم کے ساتھ دلہن بن کر پشاور کے لیے روانہ ہُوئی تھی۔ یہی پلیٹ فارم تھا۔ لوگوں کا ہنگامہ اور رونق یہی تھی لیکن اس ہنگامے میں کس قدر لطف اور زندگی تھی اور آج کی رات جیسے سینکڑوں لاشیں گاڑی سے نکالی اور گاڑی میں پھینکی جا رہی ہوں۔

طاہرہ پلیٹ فارم پر رکنا چاہتی تھی۔ کیوں؟ اسے معلوم نہ تھا۔ وہ بھاگ کر باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ کیوں؟ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ اچھا ہُوا کہ قلی بوجھ تلے بھاگ رہا تھا اور طاہرہ کو اس کے تعاقب میں بہت تیز چلنا پڑا، ورنہ وہ وہیں کھڑے کھڑے خیالوں میں بھٹک جاتی۔

اطہر اور نجمہ کو طاہرہ کے آنے کی صرف اسی قدر اطلاع تھی کہ وہ کسی روز آجائے گی۔ نعیم کی وفات کے دوسرے روز طاہرہ نے نجمہ کو ایک طویل خط میں نعیم کی موت کی اطلاع دی تھی۔ خط کیا تھا ایک دردبھری داستان تھی۔ یہ خط نجمہ نے اسی طرح پڑھا تھا جس طرح طاہرہ نے نجمہ کا وہ خط پڑھا تھا جس میں اس نے لاہور سے آکر عفت کی موت کی خبر اور ارشد کی جذباتی حالت کی تفصیلات لکھی تھیں۔ نعیم کا والد اطہر کا اچھا خاصا دوست تھا لیکن نعیم کی موت نے تو اس پر سکتہ طاری کر دیا تھا اور اسے ہاتھوں کسی کو نعیم کے مرنے کی اطلاع دینے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ دوسرے رشتہ داروں نے اِدھر اُدھر خطوط لکھے تھے۔

اطہر اور نجمہ خط ملنے کے دوسرے دن پشاور گئے تھے۔ نعیم کو قبر میں وہ چوتھا دن تھا۔ ان چار دنوں میں نعیم کی ماں۔ طاہرہ کا ایک ایک لمحہ اور سانس اس طرح تلخیوں سے بھر دیا تھا کہ طاہرہ نعیم کا صدمہ تو بھول ہی گئی تھی۔ محلے برادری کی عورتوں کے منے وہ پاگلوں کی طرح طاہرہ کو گالیاں دینے لگتی تھی۔ اس نے ایسی ایسی باتیں کہی تھیں کہ طاہرہ کے لیے سوائے بھاگ جانے کے کوئی راہِ نجات تھی ہی نہیں۔ محلّے میں تو پہلے ہی مشہور ہو چکا تھا کہ طاہرہ نے خاوند پر جادو کیے ہُوئے تھے۔ اسی جادو کے سے اس کی ساس بیمار ہوئی تھی اور اسی کے اثر سے اس کا خاوند مرا ہے۔

"میری بہنو! ظلم دیکھو ــــــ ڈاکٹروں کو آخر دم تک پتہ ہی نہیں چلا۔ پتہ چلتا بھی کیسے؟ کالے علم کا کسی کو پتہ چلا ہے کبھی؟ ڈائن تُو نے دوسرا خصم کرنا تھا تو صاف بتا دیتی۔ ہم تجھے طلاق دے دیتے۔"

اور یہ موضوع صرف ساس کی زبان پر نہیں محلّے کی ہر عورت کی زبان پر تھا۔ سوائے محلّے کی ان نوجوان لڑکیوں کے جو طاہرہ کے پاس آکر بیٹھا کرتی تھیں۔ اس نئی پود نے اپنے طور پر کوشش کی تھی کہ طاہرہ کے خلاف اس پروپیگنڈے کے خلاف پروپیگنڈا کریں لیکن چیلوں کے سامنے چڑیوں کی کیا مجال تھی۔ جس نے بات کی اس کا طاہرہ کے ساتھ ملنا جلنا بند کر دیا گیا۔ طاہرہ کے ہاں بچہ نہ ہونا بھی تو سِحر شرار کے اثر کی دلیل تھی۔ طاہرہ کا سایہ بھی منحوس سمجھا جاتا تھا۔ محلّے والیوں نے بہو بیٹیوں کو اس کے قریب جانے سے سخت منع کر رکھا تھا۔

اس ماحول میں طاہرہ رہتی تو کیسے رہتی؟ نعیم کا باپ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ نعیم کا جنازہ نکلنے کے فوراً بعد طوفان پورے جوش سے اُٹھ آیا تھا۔ چار دنوں میں ہی طاہرہ خشک تنکوں کی طرح ان بگولوں کی نذر ہو گئی تھی۔ جب اطہر اور نجمہ پشاور پہنچے تھے طاہرہ نے انہیں چھ برسوں کے قصے سنائے تھے لیکن جو قصے عورتوں نے نجمہ کو سنائے تھے نجمہ کانوں پر ہاتھ رکھتی تھی۔ طاہرہ باتیں تو وہ آنسوؤں کی روانی میں سُنتی رہی تھی لیکن جب اُس نے عورتوں کی باتیں سنیں جو تمام کی تمام طاہرہ کے خلاف تھیں تو وہ طاہرہ کے کمرے میں آئی اور غصّے میں بولی تھی۔

"ہے طاہرہ! کیا چھ برس تم نے ان چڑیلوں میں گزارے ہیں؟ اری تم زندہ کس طرح رہی ہو؟" ــــــ نجمہ اسے کوسے جا رہی تھی۔ ان کوسنے میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہُوئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی ــــــ "اری تیری غیرت کہاں مر گئی تھی۔ نعیم فرشتہ تو نہیں تھا کہ اس کی خاطر ان بے عزّت لوگوں میں پڑی رہی ہو۔ راولپنڈی کیوں نہیں چلی آئی؟ ہم کیا مر گئے تھے؟"

"آپا! میں خطوں میں سب کچھ لکھتی رہی ہُوں۔"

"خطوں میں تو تم لکھتی رہی ہو لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ ان کالی بلاؤں کی زبانیں اس قدر کالی ہیں۔ میں تو یہاں چند گھنٹوں میں جل کر راکھ ہو گئی ہوں اور تم نے یہاں چھ برس گزار دیئے ہیں۔ میں مر تو نہیں گئی تھی۔ میں تو سمجھی تھی یُوں تو ہر گھر میں ہوتا ہے یہاں بھی وہی کچھ ہوگا لیکن یہاں تو معلوم ہوتا ہے محلّے کا محلّہ ناچنے گانے والیوں کا ہے۔"

"اسی لیے تو میں نے آپ کو چھ برس یہاں آنے نہیں دیا تھا۔"

"بس ختم ہُوا یہ قصّہ!" ــــــ نجمہ نے کہا تھا ــــــ "اپنا سامان باندھ اور ہمارے ساتھ چل۔ آج ہی خبردار جو اپنی ایک بھی چیز چھوڑی تو۔ میں تمہارے بھائی جان کو کہتی ہوں اور تمہیں آج ہی لیے چلتے ہیں۔ ارے اس قدر بے حیائی؟ مردود عورتوں نے کیا کیا کہانیاں جوڑ رکھی ہیں۔ خدا تیری اس ساس کو دنیا میں دوزخ دکھائے۔"

"آپا! میں یہاں رہوں گی نہیں!" —— طاہرہ نے کہا تھا —— "جس کی خاطر میں نے یہ دکھ جھیلے ہیں وہ مر گیا ہے۔ اب کس
خاطر اس کالے دیس میں رہوں گی۔ صرف ابا جان کا خیال آتا ہے۔ ان سے بات کر لینی ضروری ہے۔"

اور جب اطہر اور نجمہ نے نعیم کے باپ کے ساتھ غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا تھا —— "آپ نے اسے لاوا
لڑکی سمجھ کر اس کے لیے یہ گھر جہنم بنا تے رکھا ہے" —— تو بوڑھے باپ کے آنسو اس طرح بہ نکلے تھے جیسے کبھی تھمیں گے نہیں
نے رو رو کر انہیں بتایا تھا کہ وہ کس طرح نعیم اور طاہرہ کی زندگی کو نعیم کی ماں کے آسیب سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔

اس نے انہیں ساری باتیں سنا کر کہا تھا —— "میں تو اپنے ہاتھوں طاہرہ کو الوداع کروں گا۔ میں اس بچّی کو اس گھر میں نہیں ر
دوں گا۔ اطہر صاحب! میرے گھر سے خیر و برکت اُٹھ گئی ہے۔ یہ روگ میرا ہے۔ اس کمبخت بڑھیا کی زبان نے اور اس کی سگی
کرتوت نے میرا اکلوتا بچہ مجھ سے چھین لیا ہے اور بہو بھی جو میرے بچّے سے زیادہ پیاری ہے.... نجمہ بیٹی! بوڑھے باپ کی آوا
نے حلق میں دبالی تھی اور چند لمحے خاموش رہ کر بولا تھا —— "نعیم کا صدمہ تو میں برداشت نہ کر سکوں گا اور خدا مجھے یہ صدمہ برداشت کر
کے لیے زندہ نہ ہی رکھے۔ دل اُٹھ گیا ہے۔ چند دن اور طاہرہ بیٹی کو میری آنکھوں کے سامنے رہنے دو نعیم کے ساتھ ہی اس
جھلک بھی مجھ سے نہ چھینو۔ کچھ دن طاہرہ کو دیکھتا رہوں گا اور دل ذرا ٹھکانے آجاتے گا۔ پھر میں خود ہی طاہرہ کو گاڑی پر بٹھا دوں گا
طرح میں ذرا سکون سے مر سکوں گا۔ مجھے اب زندہ رہنا نہیں۔"

اطہر اور نجمہ ایک رات قیام کر کے دوسری صبح راولپنڈی چلے آتے تھے۔ ان کے آنے کے دس روز بعد طاہرہ نعیم
باپ کی اجازت سے اسے ہچکیوں میں روتا، نعیم کو مٹی میں سوتا اور ساس کو اس کی اپنی ہی جلائی ہوئی آگ میں جلتا بھنتا چھوڑ کر گا
پر سوار ہو گئی تھی۔

پشاور کو خیر باد کہنے کے ایک روز پہلے طاہرہ نے دو ڈراموں کی آمدنی کا جو روپیہ ڈاک خانے میں اس غریب لڑکی کے لیے
کرایا تھا نکلوا لیا تھا اور لڑکی کے والدین کو پچاس روپے دے کر کہا تھا کہ وہ پنڈی سے ان کے نام ہر ماہ پچیس روپے لڑکی کی تعل
کے لیے بھیجتی رہے گی۔ اس نے پہلے تو سوچا تھا کہ سارا روپیہ انہیں دے دے لیکن اسے خیال آگیا تھا کہ بے چارے
غریب لوگ ہیں کہیں اس قدر رقم دیکھ کر ادھر اُدھر خرچ نہ کر دیں اور بچی کی تعلیم ختم نہ ہو جاتے۔ اس نے انہیں لمبے لیکچر د
سمجھایا تھا کہ لڑکی کی تعلیم کس قدر ضروری ہے اور ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ بچی کے نام کا پیسہ کسی اور طرف خرچ نہیں کریں گے
طاہرہ نے انہیں کہا تھا کہ بچّی کی فیس، کتابوں اور کپڑوں وغیرہ کے اخراجات انہی پچیس روپوں میں سے پورے کریں۔
یہ معاملہ طے کرنے کے طاہرہ کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ ساس کی پیدا کردہ ساری روحانی تلخیاں اور نعیم کی موت کا دکھ
گئی تھی۔ اس کے بعد وہ نعیم کی قبر پر گئی تھی اور جب وہ تین گھنٹے قبر کے پاس بیٹھے رہنے، دل کی باتیں نعیم کو سنانے اور اس سے
اجازت لینے کے بعد گھر آکر اس نے آئینہ دیکھا تھا تو اس کے ہونٹوں، ٹھوڑی اور ناک پر مٹی لگی ہوئی تھی اور اسے خیال آیا کہ
قبر کو چومتی رہی تھی۔

اطہر اور نجمہ گہری نیند سے چونکے۔ اطہر نے کہا —— "شاید دروازے پر دستک ہوئی ہے میں دیکھتا ہوں۔"

وہ اُٹھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ نجمہ نے اچھل کر بیٹھتے ہوئے کہا —— "یہ طاہرہ ہوگی۔ پاکستان میل کا وقت
ہی جاتیے۔"

اور دو تین منٹ بعد طاہرہ نجمہ کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔

اطہر نے قلی کو رخصت کیا اور سامان اندر رکھا۔ باقی رات نجمہ اور طاہرہ جاگتی رہیں۔ چھ برسوں کے قصے چند گھنٹوں میں کہاں ختم
صبح کی اذان ہو رہی تھی جب اطہر کی آنکھ کھلی، دیکھا کہ دونوں میٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے اپنے مخصوص شگفتہ لہجے میں کہا ——
پڑجانا ہے کہ سوتی ہی نہیں ہو چڑیلو!"

توبہ، بھائی جان! توبہ آپ سے" —— طاہرہ کی شگفتگی بھی ذرا عود کر آئی۔ ویران سی ہنسی ہنس کر بولی —— "پشاور میں دن میں ڈیڑھ
چڑیل کا لفظ سنا کرتی تھی۔ آپ نے بھی صبح صبح وہی لقب دے دیا۔ بخدا آپا! میں تو اپنا صحیح نام بھولتی جا رہی تھی۔"

بھول جاؤ، بہن! اب سب کچھ بھول جاؤ" —— اطہر نے سگے بھائیوں کی طرح کہا —— "اب تم پشاور نہیں جاؤ گی، جہاں تک
نا تھا وہ ختم ہو چکا۔ اسے اب دل پر بوجھ نہ بننے دو تم تو حقیقت میں لڑکی ہو، زندگی بڑی وسیع ہے جانے کیا کیا رنگ دکھاتے
انشاء اللہ کوئی رنگ اس قدر پھیکا نہیں ہو گا جس قدر تم دیکھ آئی ہو۔ میں تمہارے خط پڑھتا رہا ہوں، تم حالات تو تفصیلاً لکھتی رہی
نے ان کی اس شدت کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا جو ہم ایک دن اور رات میں دیکھ آتے ہیں، ورنہ طاہرہ بہن! میں تمہیں ایک
ال رہنے نہ دیتا...... خیر.... جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اپنے آپ کو سنبھال لو اور اپنی صحت کا خیال رکھو۔ وہ پشاور تھا یہ پنڈی
ہ گھر پرایا تھا یہ اپنا ہے۔"

تمہارا کمرہ جوں کا توں پڑا ہے" —— نجمہ نے طاہرہ سے کہا —— "چل کے دیکھ لو۔"

نہ آپا! —— طاہرہ کا مزاج جو ابھی ابھی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا، پھر غم کے بوجھ تلے دب گیا اور اس کے آنسو نکل آتے۔ بولی ——
کمرے میں نہیں رہوں گی.... نہیں آپا! وہاں اب...." اور طاہرہ نے سر گھٹنوں میں دے لیا۔ وہ اس طرح سسک رہی تھی جیسے
درخت کے پتے ویران گھر میں ایک ایک کر کے گرتے ہیں۔ نجمہ اسے تسلّی دینا چاہتی تھی لیکن اس کے صبر و تحمل کے
گئے۔

تھوڑی دیر بعد اطہر پھر کمرے میں آیا اور دونوں کو روتے ہوتے پایا۔

نجمہ تم نری احمق ہو" —— اس نے پیار بھرے غصّے سے کہا۔ پھر طاہرہ سے مخاطب ہوا —— "طاہرہ!" —— طاہرہ نے
سر کو اٹھایا تو اطہر پر بھی رقّت طاری ہو گئی۔ وہ اسے کہنے لگا تھا کہ نہ روؤ لیکن اسے یوں لگا جیسے وہ کہنے لگا ہو —— "طاہرہ
جی بھر کے روؤ۔ نعیم کی یاد کو آنسوؤں میں بہا دو" —— لیکن اطہر آخر مرد تھا۔ اس نے آگے ہو کر طاہرہ کی ٹھوڑی کو تھام کر اس
سر اٹھایا اور اپنے روتے ہوتے دل کو سنبھال کر کہا —— "تم تو بڑے حوصلے والی لڑکی تھی طاہرہ! بھائی کے گھر میں آ
ہو تم ہنسو، اب میں روؤں گا۔ رونے کے لیے تیرا بھائی جو ہے۔ بھائیوں کے گھر بہنیں رویا نہیں کرتیں۔"

ساس کے گھر میں گزرے ہوتے ان لمبے لمبے برسوں نے طاہرہ کو جیسے یقین دلایا تھا کہ وہ روتی ہے تو روتی رہے،
غمخوار نہیں۔ وہ اس عرصے میں تنہائی میں رو رو کر خود ہی چپ ہو جایا کرتی تھی۔ اپنے آپ کو تسلّی دے لیتی تھی نعیم سے بھی

آنسو چھپانے کی کوشش کرتی تھی لیکن پنڈی آتے ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کے غمخوار موجود ہیں۔ غمخوار بھی ایسے کہ اس کا کوئی آنسو بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ اطہر اور نجمہ کا یہ رویہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ پھر بھی اسے عجیب و غریب لگ رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ دھوپ میں گری پڑی تھی کہ کسی نے اسے اٹھا کر چھاؤں میں ڈال دیا ہو۔

رات گزر گئی۔

پھر کئی راتیں گزر گئیں۔

راتیں آتی تھیں اور طاہرہ اور نجمہ کی باتیں سن کر سحر کے اُجالے میں سو جاتی تھیں۔ ان چھ برسوں میں نجمہ کے دو بچے تھے۔ اب ایک تین برس کا تھا اور دوسرا ڈیڑھ برس کا۔ بڑے پیارے کھلونے سے بچے تھے وہ طاہرہ کے ساتھ اس ہو گئے کہ دن بھر خالہ خالہ کرتے اس کے ساتھ چپکے رہتے تھے۔ ایک دن طاہرہ نے نجمہ کو ہنس کر کہا ۔۔۔ "آپا! انہیں کہو کہا کریں، اس لفظ سے مجھے نفرت ہے۔ یہ مجھے خالہ کہتے ہیں تو مجھے پشاور والی خالہ یاد آجاتی ہے" ۔۔۔ لیکن بچے ا ہی کہتے رہے۔

اطہر اور نجمہ نے طاہرہ کو ایسے طریقے سے مصروف رکھا کہ اس کے چہرے پر رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ کبھی ٹوپی سیر کو لے جاتے کبھی نور پور اور سید پور کے ہرے بھرے خوشنما خطّے میں لے جا کر دن بھر وہیں گزارتے۔ ایک دن مری کی سیر کرا لاتے۔ گھر میں زیادہ دیر ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی تھیں۔ انہی دنوں نجمہ اور اطہر نے پشاور اور نعیم کا ذکر ہی نہ آنے دیا۔ بچوں کا بہت خوشگوار ثابت ہوا۔ پھر محلے کی لڑکیاں بھی ایک ایک کر کے جمع ہونے لگیں اور گھر میں نوجوان لڑکیوں کی محفلیں جمنے لگیں۔

طاہرہ کے دل و دماغ سے پشاور والا محلہ اترنے لگا لیکن آہستہ آہستہ۔ بعض اوقات وہ یوں سہم سی جاتی جیسے اسے نظر آ گئی ہو یا اس نے نعیم کا جنازہ دیکھ لیا ہو۔ ایک خدشہ سا اس کے دل میں بیٹھا رہتا جو کبھی کبھی اُبھر آتا تھا۔ نجمہ کے سلوک اور برتاؤ نے یہ خدشہ نکالنا شروع کر دیا۔ نعیم کی یاد تھی جو اسے تنہائیوں میں سو سو آنسو رلاتی تھی۔ نجمہ اسے تنہا کم ہی رہنے دیتی تھی۔

چند دن اور گزرے تو طاہرہ کے اترے ہوئے چہرے سے یاس کی پرچھائیاں ڈھل گئیں اور اس کا ہر نقش نکھر آیا۔ مسکراہٹ میں بھی جان آ گئی۔ آنکھوں میں وہی شوخی اور بالوں میں وہی چمک عود کر آئی۔ کندھے جو رنج و آلام کے بوجھ سے ذرا آگے جھک آتے تھے، پھر سیدھے ہو گئے اور مرمریں گردن ایک بار پھر تن گئی۔ جسم میں وہی زندگی اور شادی سے پہلے کا چنچل پن اور شگفتہ مزاجی یوں جاگ اُٹھی جیسے ذرا سی دیر کو سو گئی تھی اور تازہ دم ہو کر اُٹھ بیٹھی ہو۔

وہ بات بات پر ہنسنے لگی۔ اطہر کے ساتھ مذاق، لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، بچوں کے ساتھ کھیل کود اور نجمہ کا تو وہ ناک میں دم کیے رکھتی تھی۔ نجمہ کو طاہرہ کی یہ حرکتیں بہت پیاری لگتی تھیں۔ اس کے علاوہ نجمہ کو ایک سکون یہ بھی ہوا کہ اس کا بڑا لڑکا طاہرہ کے پاس سونے لگا تھا اور دن رات اس سے الگ ہوتا ہی نہیں تھا۔

طاہرہ کے پاس کوئی روتا آئے تو ہنستا جاتا تھا۔ مگر کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ طاہرہ بیوگی کے دکھ کو نعیم کی یاد کو، چھ سالہ ازدواجی زندگی کو اور نعیم کے تڑپ تڑپ اور ترس ترس کر مرنے کی تلخیوں کو ہنسی اور مسکراہٹوں میں اسی طرح دفن کرنے کی کوششوں میں لگی تھی جس طرح لوگوں نے اس کی امنگوں اور رومانی امیدوں کو نعیم کے ساتھ قبر میں دبا دیا تھا۔

وہ جب قہقہہ لگا کر ہنستی تھی تو یہ ایک کوشش ہوتی تھی اُس غم کو دبانے کی جو اس کے سینے سے اُٹھتا تھا۔ وہ دل کی سسکیوں کو دبانے کی خاطر قہقہہ لگا کر ہنستی تھی۔ یہ سسکیاں اب وہ خود بھی نہ سننا چاہتی تھی۔ اس کی ذات کے پردوں میں ایک عورت روتی رہتی اور کہتی رہتی تھی ۔۔۔ "طاہرہ! تم اب بیوہ ہو گئی ہو ۔۔۔ طاہرہ! خاوند کہاں ہے؟ ۔۔۔ وہ پہلی رات کہاں کھو گئی طاہرہ؟ وہ دیکھو! وہ معطّر کمرہ تو تمہارے سامنے ہے۔ اس کے رہنے والے کہاں چلے گئے؟ دل کے شیشے میں دیکھو طاہرہ! اب اس میں کیا نظر آتا ہے؟ شیشہ ٹوٹ گیا ہے ۔۔۔ نعیم کہاں ہے؟ ۔۔۔ گاڑیاں تو اب بھی پشاور جاتی ہیں! وہ سنتی ہو کیا ہے؟ انجن وسل دے رہا ہے! اس روز اس وسل میں خوشیاں تھیں۔ آج دل دوز چیخیں ہیں"۔

اور ایسی ہی آوازیں طاہرہ کی داخلی دُنیا میں سرگوشیاں کرتی رہتی تھیں۔ آوازیں ایک عورت کی تھیں جسے طاہرہ نے ایک رات تنہائی میں پہچان لیا تھا۔ اچھا ہوا کہ اس نے پہچان لیا۔ اس عورت کی شکل و صورت تو طاہرہ سے ملتی جلتی تھی لیکن یہ روح سے بیزار تھی۔ طاہرہ نے اب اس عورت کو جھٹکنا شروع کر دیا تھا۔ سینے میں جب یہ سسکتی تھی تو طاہرہ نجمہ یا کسی لڑکی کو چھیڑ کر بھاگ اٹھتی تھی، گتھم گتھا ہوتی تھی، پھر طرح طرح کی شرارتیں کرتی تھی۔ چیخ چیخ کر ہنستی تھی اور یوں اس کی ہستی کے پردوں میں سے اٹھتی آوازیں پردوں کے عقب ہی میں دب جاتی تھیں۔

شب و روز کی کوششوں سے اور اپنے آپ کو کامیابی سے فریب دینے سے طاہرہ نے اپنے اوپر قابو پا لیا اور زندگی کے دیگر حقائق و مسائل کے مقابلے میں اترنے، نئی راہیں تلاش کرنے اور سرگرم عمل طبیعت کو نئے میدان میں اتارنے کے لیے تیار کر لیا۔ وہ بظاہر ازدواجی زندگی کی دلچسپیوں اور بکھیڑوں کو بھولتی جا رہی تھی بلکہ بھول چکی تھی لیکن نجمہ کے ساتھ باتیں کرتے وقت وہ کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی طرح یہ فقرہ ضرور ہی کہہ اٹھتی تھی ۔۔۔ "آپا! نہیں ایک بار نعیم نے یوں کیا کہ ۔۔۔ ایک بار نعیم اور میں اکٹھے پلنگ پر بیٹھے تھے کہ ۔۔۔" اور وہ نعیم کی ایک آدھ بات کو ہر موضوع میں چسپاں کر ہی لیا کرتی تھی۔ ہنس کر، مسکرا کر اور دل کے درد کو دل میں دبا کر۔ اور یوں طاہرہ نے ایک عظیم غم کو اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی بیوگی کی سپاٹ زندگی کو مسکراہٹوں کی حسین اور دل کش تہوں میں چھپا لیا یا سُلا لیا۔

اطہر اور نجمہ نے طاہرہ کے مُستقبل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے ایک پروگرام تیار کیا تھا۔ وہ اسی انتظار میں تھے کہ طاہرہ اپنے آپ میں لوٹ آئے تو اس ساز کو چھیڑیں۔ میاں بیوی کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ڈیڑھ ماہ بعد نجمہ اور طاہرہ کمرے میں بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھیں۔ طاہرہ کی مزاجی کیفیت معمول پر تھی۔ اطہر اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے نجمہ کے ساتھ طے کیا تھا کہ وہ آج رات ان کی باتوں میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔

نجمہ نے بات سکول کے موضوع سے شروع کی۔ بولی ۔۔۔ "ہیڈ مسٹریس آج پھر ناراض ہو رہی تھی کہ طاہرہ صرف ایک بار آئی اس کے بعد آئی ہی نہیں ۔۔۔ وہ اب تمہیں چوتھی جماعت میں لگانا چاہتی ہے۔ بہتر ہے کل ہی چل کے کلاس کا چارج لے لو۔ استانی کو وہ پانچویں جماعت دے رہی ہے"۔

"بہت اچھا" ۔۔۔ طاہرہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا ۔۔۔ "کل ساتھ لے چلنا۔ یہ ڈیڑھ مہینہ خواہ مخواہ ضائع ہوا"۔

پھر سکول اور استانیوں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں جو پہلے بھی ہو چکی تھیں لیکن تفصیلاً نہیں ہوئی تھیں۔ طاہرہ نے نجمہ سے پوچھا کہ سٹاف میں کوئی ردوبدل ہُوا ہے کہ نہیں۔ نجمہ نے ایک کارٹون نما استانی کا ذکر کیا جسے نہ جانے کس طرح رکھ لیا گیا تھا۔ وہ جماعت کو پڑھاتے وقت نسوار منہ میں ڈال کر فرش پر تھوکتی رہتی تھی اور تو کسی نے اس حرکت کو نہ دیکھا، کلاس کے بچوں نے شکایت کر ڈالی کہ نئی استانی بڑی گندی ہے۔ کالا کالا تھوکتی رہتی ہے۔

اس سکول کے بچے اچھے گھرانوں کے تھے تعلیم کے ساتھ تربیت پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ چوتھی جماعت تک لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ پانچویں جماعت سے لڑکوں کی کلاسیں الگ اور لڑکیوں کی الگ ہو جاتی تھیں۔ ایک کو ماسٹر اور ایک کو استانیاں پڑھاتی تھیں۔ سکول کے ہر پہلو میں سلیقہ اور تنظیم تھی۔ کیا پڑھنے اور کیا کھیل کود میں سکول کی حدود میں کسی قسم کی بدتمیزی کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ ایسے سکول میں نسوار اور تھوک کیسے گوارا کیا جاتا۔ چنانچہ اس اُستانی کو نکال دیا گیا تھا۔

"ماسٹروں میں ایک خوشگوار اور دلچسپ اضافہ ہُوا ہے" ۔۔۔ نجمہ نے طاہرہ کو بتایا ۔۔۔ "وہ ہے جوزی بابا۔ پانچویں جماعت کو فارسی اور تاریخ جغرافیہ پڑھاتا ہے۔ کوئی ایک برس ہُوا، وہ پاجامہ، اچکن اور جناح کیپ پہنے سکول کے پھاٹک میں داخل ہُوا تھا۔ میں اور وہ استانی ہے ناں! مس مسرت جہاں، پھاٹک کے قریب کھڑی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ ہم دونوں کے پیریڈ خالی تھے۔۔۔"

"اری آپا! میں اس روز سکول گئی تھی تو مسرت نظر نہیں آئی تھی۔ وہ کیسی ہے؟ شادی کر لی ہوگی اُس نے؟"

"نہیں آپا" ۔۔۔ نجمہ نے جواب دیا ۔۔۔ "کہتی ہے شادی نہیں کروں گی۔ بڑے بڑے اونچے گھروں سے رشتے آتے ہیں لیکن وہ کسی کو قبول نہیں کرتی۔"

"کسی خاص جگہ مرضی ہوگی؟"

"کہتی ہے یہ بات بھی نہیں۔ خیر۔ تو ہم دونوں کھڑی باتیں کر رہی تھیں کہ یہ بڈھا آیا۔ دو اڑھائی انچ سفید داڑھی اور چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ پچاس ساٹھ برس کی عمر کا ہوگا۔ سیدھا کھڑا ابھرا ابھرا جسم۔ ہاتھوں، بازوؤں اور کندھوں کو دیکھو تو جوانوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ سکول کی طرف دیکھتا پھاٹک میں داخل ہُوا تو مسکرا کر کہا ۔۔۔ 'السلام علیکم' ہم نے وعلیکم السلام کہا تو کہنے لگا، آپ اس سکول میں پڑھتی ہیں؟ پڑھاتی ہیں یا کسی سے ملنے آئی ہیں؟۔۔۔

"میں نے کہا کہ ہم استانیاں ہیں۔ اس کے ہاتھ میں موٹی سی چھڑی تھی، گول دستے والی۔ وہ بڑے باوقار طریقے سے چھڑی کو ہاتھ میں پکڑے کولہے کے ساتھ ٹکا کر ذرا سا ٹیڑھا ہو گیا اور چھڑی کا سہارا لے کر کہنے لگا، میں نے اس سکول کی بہت تعریف سُنی ہے اور سکول کے نظام اور طریقہ تعلیم کے متعلق ضروری معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ کیا مجھے یہاں ماسٹر لگا لیں گے؟

"ہمارا جواب سننے سے پہلے ہی کہنے لگا، نوکری تو مجھے کسی بھی سکول میں مل سکتی ہے۔ راولپنڈی میں بیسیوں سکول ہیں لیکن مجھے ان کے پراگندہ ماحول اور غلط طریقہ تعلیم سے بڑی نفرت ہے۔ مجھے صاف ستھرے بچے چاہئیں۔ یوں تو میں ریلی میں آٹھویں اور نویں جماعت کو فارسی، اُردو اور جنرل نالج پڑھایا کرتا تھا لیکن اب میں چھوٹے بچوں کو پڑھانا چاہتا ہوں۔۔۔

"میں نے پوچھا، کیوں؟ تو بولا ۔۔۔ "مجھے پودے نہیں چاہئیں، مجھے پنیری چاہیے۔ جسے میں جہاں چاہوں اکھاڑ کے

لا سکوں اور اسے اپنے خون سے سینچ کر پودا بناؤں۔۔۔ مجھے بچوں سے پیار ہے!۔۔۔

"میں نے مسرت کی طرف اور مسرت نے میری طرف دیکھا جیسے ہم نے ایک دوسری کو کہا ہو کہ کوئی سنکی فلاسفر یا نیم پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے اسے دور سے ہیڈ مسٹریس کا کمرہ دکھایا تو اس نے جھک کر پُر تکلف سلام کیا اور دفتر کی طرف چلا گیا۔۔۔

"چند دنوں بعد پتہ چلا کہ سکول کے بورڈ نے اسے لڑکوں کی پانچویں جماعت دے دی ہے۔ میں نے سوچا کہ تو سکول میں اس قسم کے ماسٹر بھی آنے لگے۔ وہ حال حلیے سے تو اچھا خاصا معزز آدمی معلوم ہوتا ہے لیکن ڈیل ڈول عام سکولوں کے مولویوں جیسی ہے۔ میں نے سوچا وہ اس سکول میں کیا پڑھائے گا۔ اسے تو یہاں کے پروگرام اور سلیبس کا بھی پتہ نہ چل سکے گا لیکن چند دنوں میں ہی سکول کے ہر بچے کی زبان پر جوزی بابا، جوزی بابا تھا۔ بالکل اس طرح جس طرح تمہاری کلاس کے بچے طاہرہ آپا، طاہرہ آپا کرتے رہتے تھے۔۔۔

"کرتے کرتے وہ سکول میں 'عجیب و غریب شخصیت' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ہر اُستانی اس کی ملنساری اور خوش مزاجی کی تعریف کرنے لگی۔ جوزی بابا کا یہ حال کہ تفریح کے وقت بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ایک دن دیکھا کہ بابا جوزی میدان میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھوڑا بنے گھوم رہے ہیں۔ دو بچے ان پر سوار ہیں اور دس بارہ بچے تالیاں بجا رہے ہیں۔ باری باری سب نے سواری کی اور بابا کے پاجامے کو دیکھا تو گھٹنوں سے پھٹا ہُوا تھا۔ اچکن کا ستیاناس کر لیا تھا۔۔۔

"جماعت میں جب پڑھاتا ہے تو کیا مجال کوئی بچہ بلا ضرورت منہ سے آواز نکال جائے۔ ایسا ڈسپلن کہ اونچی سانس بھی سنائی نہیں دیتی۔ پڑھانے کا انداز بھی ایسا کہ بچے مسحور ہو کر سبق میں جذب ہو جاتے ہیں۔ چھٹی کے وقت بچوں کا جلوس بابا کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ شخص ذرہ بھر ان بچوں سے اُکتاتا نہیں۔ لڑکیوں سے تو وہ بہت محبت کرتا ہے۔ تفریح کے وقت اس طرف بھی آنکلتا ہے اور پہلی دوسری جماعت کی بچیوں کو جمع کر کے انہیں طرح طرح کی کہانیاں سنانے بیٹھ جاتا ہے۔ میدان میں ہی دو بچیوں کو گود میں لے کر بیٹھ جاتا ہے گا اور باقی کو اپنے قریب بٹھا کر خرگوش اور لومڑی کے قصے شروع کر دے گا۔"

"واقعی عجیب آدمی ہے" ۔۔۔ طاہرہ نے کہا ۔۔۔ "ماسٹروں اور استانیوں کا رویہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اُستاد اور شاگرد میں کوئی فرق ہی نہیں رکھنا چاہیے۔"

"لیکن یہ شخص تو حد کرتا ہے طاہرہ!" ۔۔۔ نجمہ نے مزے لے لے کر سنایا ۔۔۔ "تم بھی کلاس کے بچوں سے پیار کیا کرتی تھیں لیکن اس شخص کی تو حد ہی نہیں۔ ایک روز میں نے دیکھا۔ تفریح کے وقت ایک بچی، غالباً پہلی جماعت کی تھی کھڑی رو رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور ربن کھلا ہُوا۔ اُدھر سے جوزی بابا چلے آ رہے تھے جب بچی کو دیکھا تو اس طرح بھاگا اور بچی کو گود میں اٹھا لیا جیسے وہ اس کی اپنی بچی ہو۔ اسے بہلایا، نل پہ جا کر اس کا منہ دھویا اور اس کا ربن کھول کر جیب سے چھوٹی سی کنگھی نکالی۔ اس کے بال سنوارے اور اس کا ربن باندھ دیا۔ بابا رہ رہ کر بچی کو چوم رہا تھا اور تفریح کا تمام وقت اسے گود ہی میں اٹھائے اٹھائے پھرتا رہا۔۔۔

"اسے کلاس میں چھوڑ کر آ رہا تھا کہ راستے میں مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ بابا! یہ بچی آپ کی ہے؟ حیران ہو کر بولا، نہیں تو۔ ماں باپ کی ہوگی۔ کیوں؟۔۔۔

میں نے کہا — "آپ نے پیار تو اپنے بچوں کی طرح کیا تھا؟" — بابا ہنس پڑا اور بولا — "یہ سب بچیاں میری ہیں...."

وہ کچھ سنجیدہ ہوگیا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا تھا۔ ہلکی سی آہ لے کر کہنے لگا — "مس صاحبہ! یوں تو مجھے ہر بچے سے پیار ہے لیکن بچیوں کا تو میں دیوانہ ہوں۔ ان بچیوں کو بڑے ہو کر جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھانی ہیں جانے ان کے بھاگ کیسے ہیں۔ اکثر اچھے نہیں ہوتے۔ آج ماں باپ کے سر پر ہیں تو کل خاوند اور سسرال کے رحم و کرم پر چلی جائیں گی۔ لڑکیوں کی قسمت میں ہنسنا کم اور رونا زیادہ لکھا ہوتا ہے۔ خاوند کسی کسی کا اچھا ہوتا ہے۔ یہ پیار ڈھونڈتی ہیں اور وہ پیار کرتے نہیں۔ معاف رکھنا مس صاحبہ! میں نے لمبی کہانی شروع کر دی ہے۔ بچیوں کی یہی عمر ہوتی ہے کہ انہیں زندگی بھر کا پیار دے دیا جاتے۔ میرا بس چلے تو ان تمام بچیوں کو بڑا ہونے ہی نہ دوں اور سب کو اپنی شفقت کے سائے میں رکھ لوں۔ بڈھے بابا کے پاس ہے ہی کیا؟ اپنے کو تو نہ ماں نصیب ہوئی نہ بہن، نہ بیوی نہ بچی۔ میں تو مس صاحبہ! دل کی پیاس بجھانے سکول آتا ہوں۔ میرے دل و دماغ نے مل کر پیار کی بنیادوں پر تعلیم دینے کا طریقہ ایجاد کر لیا ہے...."

"طاہرہ! اس روز میں اسے گھر بھی لائی تھی۔ بے چارہ دل میں کوئی دکھ لیے پھرتا ہے لیکن اپنے متعلق بتاتا کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میں بریلی سے ہجرت کر کے آیا ہوں۔ دنیا میں تنہا آیا تھا۔ تنہا ہی رہا اور تنہا ہی رہوں گا۔"

"رہتا کہاں ہے؟"

"سکول والوں نے اسے کوارٹر دے رکھا ہے۔"

"ارے؟ سکول والوں نے کوارٹر بھی بنا لیے ہیں؟"

"ہاں آپا" — نجمہ نے جواب دیا — "اب تو سکول کا ہوسٹل بھی بن گیا ہے جس میں پچاس ساٹھ لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ رہتے ہیں۔ ہوسٹل کے ساتھ چھ کوارٹر بنا دیئے گئے ہیں۔ تین استانیوں کے لیے اور تین ماسٹروں کے لیے۔ ایک میں جوزی بابا رہتا ہے۔ اس کا کھانا وغیرہ ہوسٹل میں ہی پکتا ہے۔ مجھے تو وہ اتنا اچھا لگتا ہے کہ میں نے اسے کہا تھا کہ ہمارے گھر میں رہے لیکن وہ کہتا ہے کہ تنہائی زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے اس کے خویش و اقارب فسادات میں شہید ہو گئے ہوں گے جن میں بچے بھی ہوں گے" — طاہرہ نے قیاس آرائی کی — "اس خلش کی تسکین کے لیے اس نے سکول کے بچوں سے پیار پیدا کر لیا ہے نہ جانے کتنے بچوں کا باپ دادا ہوگا۔ پشاور میں ایک اندھے موسیقار کو میں نے اسی کیفیت میں دیکھا تھا۔"

"بات کچھ ایسی ہی ہے" — نجمہ نے تائید کی — "اپنی آنکھوں کے سامنے بچوں کا قتل و خون.... اللہ بچائے، یا اللہ تو بے نیاز ہے۔" — نجمہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا — "بے چارہ بوڑھا آدمی، اس عمر میں جانے کتنی جانیں اپنی آنکھوں کے سامنے گلیوں میں تڑپتا چھوڑ آیا ہوگا لیکن وہ کہتا تھا مجھے بریلی سے آئے صرف ایک مہینہ ہوا ہے۔"

"غلط کہتا ہے" — طاہرہ نے کہا — "وہ ان کہانیوں کو دہرانا نہیں چاہتا، یاد نہیں کرنا چاہتا۔ خیر جانے دو جوزی بابا کو اسے کل ملیں گے۔ مجھے ایسی ہستیاں بڑی اچھی لگتی ہیں۔ سکول کی کوئی اور بات سناؤ۔"

"سکول کی باتیں تو ہو چکیں۔ ڈیڑھ مہینے سے ہو رہی ہیں" — نجمہ نے کہا — "جوزی بابا نے خواہ مخواہ بات لمبی کر دی ہے۔ طاہرہ! کام کی بات سنو لیکن کیا سناؤں۔ میں تو اب بات بھی کرتے ڈرتی ہوں۔ پہلے جو کچھ تم بھگت آئی ہو، دیکھا جائے تو اس ذمہ دار میں ہی ہوں۔ اندھا دھند تمہیں تنور میں دھکیل دیا تھا.... ہاں تو، طاہرہ! میں نے یہ بات اس لیے ابھی تک نہیں ہلائی کہ تمہارا دل ٹھکانے نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ بات قبل از وقت تھی۔ ابھی تو نعیم کو اللہ مغفرت کرے، بے چارے کی گور خشک نہیں ہوئی۔"

طاہرہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور مزاجی کیفیت میں بھی نمایاں تبدیلی آنے لگی۔

نجمہ کہہ رہی تھی.... "تم نے ارشد کے سارے خطوط پڑھ لیے ہیں جو وہ تمہاری غیر حاضری میں میری طرف لکھتا رہا ہے۔ اس کے آخری خط سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس کی جذباتی کیفیت وہی ہے جو برسوں پہلے تھی۔ وہ تمہارے انتظار میں ہے اور جوانی کو دیمک لگاتے ہوئے ہے۔ اس کا بچہ طاہر پرویز بھی اب طاہرہ امی کو تلاش کر رہا ہے۔ باپ بیٹا تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر عفت مر گئی ادھر نعیم مر گیا۔ معلوم ہوتا ہے قدرت نے تمہارے دل روز ازل سے ملا دیئے تھے اور موت کے ہاتھوں تمہارے ملاپ کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ میں تو بخدا چند دن ہوئے ارشد کو خط لکھنے لگی تھی کہ طاہرہ کو لے جاؤ لیکن تمہارے بھائی جان سے بات کی تو وہ کہنے لگے تم سے پوچھ لیا جائے۔ کیوں نہ تم اپنے ہاتھ سے خط لکھ دو۔ وہ آ جائے تو دو زندگیاں پھر سے مسکرا اٹھیں۔"

طاہرہ کا سر جھک گیا تھا اور وہ گہری سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔ پندرہ روز ہو گئے تھے کہ نجمہ نے اسے ارشد کے خطوط دیئے تھے جنہیں پڑھتے اس نے ارشد کو اپنے قریب محسوس کیا تھا لیکن اسے معاً نعیم اور اس کی ماں کا خیال آ گیا تھا اور اس نے بوجھل دل سے خطوط پڑھ کر نجمہ کو لوٹا دیئے تھے۔ ارشد اس کے خیالوں میں سمایا رہا تھا لیکن شادی کے خیال سے اس نے دل میں دعا کی تھی کہ خدا کرے، ارشد سامنے نہ آئے۔ وہ جو زنجیریں پشاور توڑ آئی تھی یا جنہیں قدرت نے توڑ دیا تھا ان میں دوبارہ گرفتار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سکول کے بچوں کے لیے وقف کر دینے کا عزم کیے ہوئے تھی۔

"کیوں؟ خاموش کیوں ہو گئی ہو؟" — نجمہ نے پوچھا — "کہو تو میں خط لکھ دیتی ہوں۔"

"نہیں آپا!" — طاہرہ نے دکھ بھری سنجیدگی سے کہا — "نہ لکھو۔ ان باتوں پر اب مٹی ڈال دو۔ جیسے نعیم مر گیا ہے۔ میں سمجھوں سب مر گئے ہیں۔ مجھے ارشد، عفت اور طاہر پرویز کی یاد نہ دلاؤ۔ میں نے بڑی ہی جد و جہد اور بڑے ہی استقلال سے فراموش کیا تھا۔ مجھے اب آزاد رہنے دو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں ارشد کس حال میں ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تمام عمر یاد نہیں کرے گا لیکن وہ زندہ تو ہے۔ مجھے اسی بات کی خوشی اور اطمینان ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اگر نعیم شادی نہ کرتا تو وہ زندہ رہتا۔ مجھے امید ہے ارشد مجھے بھول جائے گا اور اپنے بیٹے کے لیے زندہ رہے گا۔ میں چاہتی ہوں وہ شادی کرے، نہ میرے ساتھ نہ کسی اور کے ساتھ، ورنہ ارشد وہ ارشد نہیں رہے گا۔ اس نے بھی شادی کر کے دیکھ لیا ہے، میں نے بھی شادی کر کے دیکھ لیا ہے۔"

"لیکن تمہاری اور ارشد کی شادی تو ان دونوں شادیوں سے مختلف ہوگی طاہرہ!" ـــــ نجمہ نے دلیل دیتے ہوئے ـــــ "وہاں عفت تھی، یہاں نعیم کی ماں ویسی نکلی۔ تمہارے اور ارشد کے درمیان تو ایسی کوئی بات پیدا ہونے کا خ ہی نہیں ہے۔"

"آپا! آپ ارشد کی ماں اور بھابی کو بھول گئی ہیں؟" ـــــ طاہرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا ـــــ "یوں تو چھ سال سے زیا گذر چکا ہے لیکن خدا کی قسم ان کی باتیں ابھی تک میرے کانوں میں اس طرح گونج رہی ہیں جیسے آج صبح ہی انہوں نے یہ با کہی ہیں۔ ان کی نیت اور اخلاقی بلندی کو تو ہم دونوں پرکھ چکی ہیں، میری ساس سے وہ کسی پہلو کم نہیں۔ یہ تو اللہ کا شکر آپ یہاں موجود تھیں ورنہ میں تو لاہور میں ہی کڑھ کڑھ کر مر جاتی۔"

"طاہرہ وہ زمانہ اور تھا اور وہ حالات ہی اور تھے" ـــــ نجمہ نے کہا ـــــ "اس وقت عفت کا وجود سارے فتنے کی تھا۔ اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی ہے۔ اللہ جانتا ہے میں لاہور ارشد کے گھر گئی تو اس کی امی اور بھابی نے رو رو کر تمہیں یا تھا۔ بھابی نے تو یہاں تک کہا تھا کہ طاہرہ کیا یاد کرے گی کیسے لوگوں کے گھر جا پھنسی تھی۔ وہ کہتی تھی ارشد کو تو چھوڑ دو ہمیں تا کا بہت فکر ہے کہیں خراب ہی نہ ہوتی پھرے۔ وہ تو طاہرہ! آنکھیں پھاڑ کر تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔"

"صرف اس لیے کہ یہ ان کے بیٹے کی زندگی اور خوشی کا مسئلہ ہے" ـــــ طاہرہ نے تیز ہو کر کہا ـــــ "اگر ارشد آج ان مرضی کے مطابق شادی کر لے تو طاہرہ ان کے گھر کے سامنے پیاسی مر جاتے تو وہ پانی نہ پوچھیں۔ آپا! میرے ساتھ بھ انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یاد نہیں آپ کو عفت مرحومہ کی ذرا سی زبان ہلی تھی تو انہوں نے مجھ سے اتنا بھی نہ پوچھا تھا کہ لڑکی کیوں اس طرح کہتی ہے؟ لیکن عفت ان کی بہو تھی نا اس لیے مجھے بیگانہ سمجھ کر ایک سانس میں مجھے طوائف تک کہہ دیا دکھ تو یہ ہے کہ انہوں نے میری اور ارشد کی روحانی محبت کو پراگندہ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔"

"تو اس کا ایک ہی علاج ہے" ـــــ نجمہ نے ذرا سوچ کر کہا ـــــ "کہ ارشد کو پہلے اس بات پر آمادہ کیا جاتے کہ وہ ما باپ سے الگ ہو جاتے۔ وہ یقیناً ایسا ہی کرے گا بلکہ اس کے ابا جان اور بھائی یوسف اسے خود ہی الگ کر دیں گ"

"لیکن وہ اس کی ماں اور بھابی کا گلا تو نہ گھونٹ سکیں گے" ـــــ طاہرہ نے جواب دیا ـــــ "ہم ان کی دسترس سے تو نہیں جا سکیں گے۔ وہاں بھی وہی الزام تراشیاں شروع ہو جائیں گی کہ میں نے ان کے بیٹے کو ان سے الگ کر دیا ہے پشاور میں بھی سار طوفان کی وجہ میری ساس کا یہی وہم تھا کہ میں نے اس کے بیٹے پر قبضہ کر لیا ہے، پھر اس وہم سے وہ وہ زہر یلے تیر کہ نعیم ماں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ آپا! میں نے ایسی باتیں کبھی نہیں سوچی تھیں۔ میں تو ہر طرح کے انسان ساتھ نباہ کر سکتی ہوں لیکن اس ایک شادی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ انسانی فطرت بڑی وسیع اور گہری ہے۔ اس کوئی حد نہیں۔ خدا جانے اس میں کیا کیا اگتا رہتا اور اس میں کیا کیا سما جاتا ہے۔ آپا اس کتاب کو اب بند کر دو۔ یہ ڈرامہ اب ختم سمجھو۔ آج ارشد طاہر پرویز کو گود میں لے کر ہنس تو لیتا ہے۔ شادی کے بعد اس کی ہنسی بھی ختم ہو جاتے گی اور طاہر پرو کی ہلکی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جاتے گا اور اگر بچے کو معمولی سا نزلہ بھی ہو گیا تو یہ عورتیں کہا کریں گی کہ سوتیلی ماں بچے کا خیال رکھتی۔ خدا کے لیے آپا! ارشد کو زندہ رہنے دو۔ اس کے بچے کو ہنسنے کھیلنے دو۔ ارشد مجھے یاد کرتا ہے اور میں اسے

رح یاد کرتی ہوں جس طرح نعیم کو۔ اس کیفیت میں جو لذت ہے وہ قربت میں نہیں، ورنہ وہ بھی مر جائے گا، میں بھی مر جاؤں گی رسخا طاہر کچلا جاتے گا۔ ارشد کی ماں اور بھابی اگر ارشد کے لیے پریشان ہیں تو انہیں پریشان ہی رہنے دو۔ وہ پچھتا رہی ہیں تو ہیں پچھتانے دو۔ وہ اپنی زبان کے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہیں۔ ارشد میرے انتظار میں زندہ ہے اور اپنے بچے پر جان ار کر رہا ہے۔ اسی دھن میں وہ بچے کو اچھی تعلیم و تربیت دے رہا ہے۔ میں ارشد اور نعیم کی یاد میں زندہ رہوں گی اور سکول لے بچوں میں مگن رہوں گی آپا! ہم دونوں کو زندہ رہنے دو۔ اب سکول کے بچوں کی تعلیم و تربیت میری زندگی کا مشن بلکہ جنون بن یا ہے۔ خدا کے لیے آپا!" ـــــ طاہرہ نے ہاتھ جوڑ کر ملتجی انداز میں کہا ـــــ "کہیں ارشد کو میرے یہاں آنے کی اطلاع نہ ے دینا۔"

"اگر ارشد بغیر اطلاع آ گیا تو؟" ـــــ نجمہ نے پوچھا۔

"اگر ارشد بغیر اطلاع آ گیا تو...!" طاہرہ نے زیرِ لب کہا اور گہری سوچ میں کھو گئی۔ سوچ گہری ہوتی گئی۔ نجمہ بھی اموش ہو گئی۔

نجمہ کو توقع تھی کہ ارشد کا نام لینے کی دیر ہو گی اور طاہرہ ارشد کو فوراً لکھ دے گی یا ضد کر کے جلدی لکھوا دے گی لیکن ماں رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ طاہرہ جو کچھ کہا کرتی ہے، اس کے پیچھے ایک عزم ہوتا ہے۔ طاہرہ کے کردار اور شخصیت سے تو وہ خود بھی متاثر تھی۔ اس کے علاوہ نجمہ کو یہ خدشہ بھی تھا کہ طاہرہ کا جو حال اس کی ساس نے بنا دیا ہے کچھ اسی قسم کا حال شد کی ماں اور بھابی بھی بنا سکتی ہیں۔ اسے ان دونوں عورتوں کا وہ رویہ بھولا نہیں تھا جو انہوں نے عفت کی باتوں میں آ کر تیار کیا تھا۔

طاہرہ اپنی سوچ میں سر جھکاتے ہوئے تھی اور نجمہ اپنے خیالوں میں الجھ گئی۔ اسے طاہرہ کی پہلی شادی کا انجام پریشان رہا تھا۔ اسے اپنے آپ میں شرمساری بھی محسوس ہو رہی تھی کہ یہ شادی اس نے اپنے ہاتھوں طے کروائی تھی۔ گناہگار تو نعیم ماں تھی لیکن نجمہ اپنے آپ کو بھی مجرم سمجھ رہی تھی کیونکہ اس نے نعیم کے لواحقین کو دیکھے بھالے بغیر طاہرہ کو کنوئیں میں پھینک دیا تھا اور اب وہ پھر اسی قسم کے جرم کے ارتکاب کو تیار ہو رہی تھی۔

اس نے طاہرہ کی دلیلوں کے علاوہ اس حقیقت پر بھی غور کیا کہ ارشد کی ماں نعیم کی ماں جیسا سلوک کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ طاہرہ ایک موتی ہے جس کی چمک کو کوڑے کرکٹ میں نہیں چھپانا چاہیے۔ اس نے خدشہ سوس کیا کہ یہ قندیل بجھ ہی نہ جاتے کہیں ایسا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے ایسے ہی ہو۔ نجمہ کو اپنے ارادوں کی تکمیل کے بعد ایک خطرہ کھائی دے رہا تھا جس پر اس نے پہلے زیادہ غور نہیں کیا تھا لیکن طاہرہ نے اس خطرے کی تفصیلات سنا کر نجمہ کو گہری سوچ ں ڈال دیا۔

طاہرہ نے یوں تو فیصلہ کر لیا تھا کہ اب شادی نہیں کرے گی حالانکہ اس کے سامنے ارشد اور صرف ارشد تھا جس ک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی ـــــ "لیکن ارشد بغیر اطلاع آ گیا تو؟" ـــــ نجمہ کا یہ فقرہ اس کے ذہن میں پیچیدگیاں اور شواری پیدا کرنے لگا ـــــ اس نے جھوٹ کہا تھا کہ وہ ارشد اور عفت کو بھول چکی ہے۔ اس نے بھولنے کی کوشش ضرور

کی تھی مگر جو سفر اُنہوں نے اکٹھے طے کیا تھا اس سفر کو اور ہمسفروں کو مسافر ساری عمر نہیں بھول سکتے۔ لمحے مسرت کے ہوں یا ملال کے، ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ طاہرہ کو ارشد اور عفت یاد آتے تھے تو اس کے حلق میں گولا سا اٹک جاتا تھا پھر ایسے ضرور ہوتا تھا کہ ارشد کا چہرہ نعیم کا چہرہ بن جاتا تھا۔ طاہرہ کے حلق میں اٹکا ہوا گولا دل پر جا پڑتا اور اس کے آنسو بہنے لگتے تھے' سسکیاں نکل جاتی تھیں۔

"کیا میں ارشد کے سامنے بھی شادی سے انکار کر سکوں گی؟" ——— طاہرہ نے اس سوال پر غور کیا تو اس نے اپنے سامنے ایک مہم محسوس کی ——— "شاید ایسا ممکن نہ ہو۔"

وہ کچھ دیر اسی کشمکش و پیچ میں پڑی رہی۔ نجمہ نے آہ لی تو طاہرہ چونک اُٹھی اور بولی ——— "آپا نیند آ رہی ہے۔ صبح سکول بھی جانا ہے سو جائیں۔ مجھے ذرا سوچنے دو۔"

"ارشد کے ساتھ شادی کے متعلق؟"

"نہیں! یہ تو طے سمجھئے کہ میں شادی نہیں کروں گی" ——— طاہرہ نے اٹھتے ہوئے کہا ——— "میں ارشد کے بغیر اطلاع چلے آنے کے متعلق سوچ رہی ہوں کہ یہ صورت کس طرح روکی جا سکتی ہے یا اس صورت کا سامنا کس طرح کیا جا سکتا ہے.... جائیں اپنے کمرے میں" ——— طاہرہ نے سنجیدہ سی شگفتگی سے کہا ——— "جلدی جائیں۔ اطہر بھائی جان کو بستر ویران ویران سا لگ رہا ہو گا۔"

نجمہ نے لپک کر اسے دبوچ لیا اور اس کی پیشانی پر طویل بوسہ دے کر کہا ——— "بڑی پیاری بہن ہو طاہرہ! لیکن ارشد بھی تو میرا بھائی ہے۔ اس کا میں کیا کروں۔"

"جائیں جہنم میں سارے دیکھا جائے گا" ——— طاہرہ نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "آپ کا ایک بھائی تو دیکھ لیا اب دوسرا رہ گیا ہے۔"

نجمہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"عجیب لڑکی ہے" ——— اطہر نے نجمہ کی زبانی طاہرہ کی دلیلیں، باتیں، جذبات اور احساسات سُن کر بے ساختگی سے کہا اور جھوم اُٹھا ——— "زندہ باد" ——— اور بولا ——— "نجمہ! یہ باتیں غور طلب ہیں۔ طاہرہ کا فیصلہ بجا ہے اور قابلِ قدر۔"

"لیکن سوچیں تو" ——— نجمہ نے کہا ——— "ذرا اس پہلو پر بھی غور کریں کہ ارشد کی عمر تیس بتیس ہے۔ وہ بھرپور جوانی کی عمر میں ہے ادھر طاہرہ کو دیکھئے۔ اٹھائیس برس کی ہے اور ابھی کنواری لگتی ہے۔ کیا طاہرہ کے فیصلے سے دو جوانیاں تباہ نہ ہو جائیں گی؟ یہ وہی ندی کے کناروں والی بات ہوتی کہ ایک دوسرے سے کتنے قریب اور ملنے سے کس قدر مجبور۔ میں تو خدا کی قسم سوچتی ہوں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ دو جانیں تلف ہو رہی ہیں۔"

"یہ غلط ہے" ——— اطہر نے کہا ——— "محبت ایک عجیب جنون ہے۔ میرا مطلب فلمی قسم کی محبت سے نہیں میرا مطلب اس والہانہ اور بے لوث محبت سے ہے جو ارشد اور طاہرہ کے درمیان ہے۔ طاہرہ نے بالکل درست کہا ہے کہ ارشد میرے انتظار کی دھن میں اپنے بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں مگن رہے گا اور میں ارشد کی محبت اور نعیم کی یاد کے جنون

ل کے بچوں میں محو رہوں گی.... دیکھو نجمہ! طاہرہ کے اس جنون کو شادی کے بکھیڑوں میں نہ دھکیلو۔ جہاں تک اس کی جوانی ہے وہ تباہ نہیں ہو گی، بلکہ اس میں سے کئی جوانیاں پھوٹیں گی۔ اس جنون اور جوانی کو وہ اب سکول کے بچوں کے لیے ل کرے گی۔ یہ ایک عجیب و غریب نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ نجمہ! طاہرہ جس مقام پر پہنچ چکی ہے۔ وہ عام انسان ہوں سے بہت دُور ہے، بہت اونچا۔ یہ محرومی کا احساس بڑے کام کا احساس ہوتا ہے۔ اسے تعمیری کاموں میں ال کرنے کے لیے طاہرہ جیسے کردار کی ہی ضرورت ہوتی ہے اور جیسا کہ تم نے مجھے ارشد کی شخصیت کے متعلق بتایا یں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس کی ذات میں بھی واقعی خود اعتمادی اور طاہرہ والی صلاحیتیں ہیں تو وہ بھی تباہ نہیں ہو گا بلکہ تباہ ے والوں کو تباہی سے بچاتے گا۔ وہ بھٹکے گا نہیں۔ ذرا غور کرو نجمہ! چھ سال اس عرصے میں ارشد دنیا کو ہی بھول چکا ہوتا۔"

"عجیب فلسفہ ہے جسے میں اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہتی" ——— نجمہ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ میرے اپنے جذبات بھی کچھ ایسے ہی ہیں" ——— اطہر نے کہا ——— ہاں معاملہ جذبات کا نہیں، دو حقیقتوں کا ہے۔ ہاں! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارشد اور طاہرہ جیسی شخصیتیں ازدواجیت کے یں ایک ہو کر پہاڑوں سے ٹکرا جائیں لیکن دوسرے عناصر کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ تخریبی عناصر کی نامعلوم سی عض اوقات عزائم کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ یہ خطرہ مول ہی نہ لیا جائے۔ بالکل نہیں۔"

"تو اس موضوع کو ختم سمجھا جائے؟" ——— نجمہ نے پوچھا۔

"بالکل ختم" ——— اطہر نے فیصلۃً کہا۔

"اور اگر ارشد کبھی اچانک آ گیا تو؟" ——— نجمہ نے پوچھا ——— "یا ہمارے لاہور والے رشتہ داروں میں سے کسی نے طاہرہ دیکھ لیا اور ارشد کو جا بتایا تو وہ اڑ کر یہاں پہنچے گا۔ پھر کیا ہو گا؟"

"پھر ہم ارشد اور طاہرہ کو تنہا چھوڑ دیں گے" ——— اطہر نے ذرا سوچ کر کہا ——— "وہ دونوں اپنی زندگی کے متعلق بہتر سوچ سکیں گے۔"

اطہراور نجمہ نے آپس میں باتیں کر کے سینے ہلکے کر لیے اور وہ گہری نیند سو گئے لیکن طاہرہ نہ سو سکی۔ نجمہ کا بچہ اُس کے
میں بچپن کی معصوم نیند سویا ہُوا تھا اور طاہرہ کی نیند ہی کہیں جا کے سو گئی تھی۔ یہ تو اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے
لیکن نجمہ کا یہ سوال —— "ارشد بغیر اطلاع آ گیا تو؟" —— اس کے سامنے ایک چٹان بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ طاہرہ نے خیالوں
اپنی قوتِ ارادی کو پرکھا۔ اپنی خودی کو جانچا لیکن تصور میں ارشد آیا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا عزم جذبات کے بگولوں کی
میں آ گیا ہو۔ اس کی قوتِ ارادی جواب دے گئی۔ اس نے ارشد کے تصور کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے ا
ذات کی سسکی سُنائی دی —— "نہیں نہیں۔ ارشد بغیر اطلاع آ گیا تو میں اس کی خواہش اور خوابوں کا خون نہیں کر سکوں گی۔"

اس نے لیٹے لیٹے اپنے آپ کو حوصلہ دیا لیکن ارشد کا خیال اس کے ذہن اور اعصاب پر قابض ہوتا گیا۔ وہ بار بار
جھٹک رہی تھی لیکن بے سُود۔ وہ اٹھ بیٹھی اور جیسے بے خیالی میں سوٹ کیس میں سے ارشد کی تصویر نکالی۔ پھر کرسی پر بیٹھ
تصویر کو میز پر رکھا۔ یہ تصویر اس نے عرصے بعد دیکھی تھی۔ پہلی نظر میں ہی اس کے جسم نے جھرجھری لی۔ اس نے یہ بھی چاہا کہ
کو آنکھوں سے اوجھل کر دے لیکن دل کہ رہا تھا —— "دیکھ لو۔ ذرا سی دیر دیکھ لو۔ دیکھ لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔"

طاہرہ تصویر کے خدوخال میں کھو گئی اور اپنے آپ کو بھلا بیٹھی۔ وہ ذہنی الجھن سے اکتا گئی تھی۔ ذہن تھک کر ارشد
گداز تصوّر میں سستانے لگا۔ طاہرہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ اس کی ذات جیسے ارشد کی ذات میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ تصو
نے سوئے ہُوئے احساسات جگا دیئے تھے۔ جسے وہ سمجھتی تھی بجھا بیٹھی ہے وہ آگ پھر جل اٹھی۔ چھوڑی ہوئی منزل جُوں
تُوں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ارشد کی ہر بات کل کی بات کی طرح تازہ ہو گئی۔ وہ اس کی ہر بات اُگل چکی تھی لیکن ارشد کی
اور یاد اس کے لاشعور کے وسیع پیٹ میں محفوظ تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ذہنِ لاشعور وہ پیٹ ہے جس میں ہر چیز اور ہر خیال
دم تک محفوظ رہتا ہے، ہضم نہیں ہوتا۔

جذبات اور صرف جذبات کی لہریں اُٹھ آئیں اور طاہرہ ہچکولے کھانے لگی۔ اس کے سامنے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں
ہُوئی تصویر میں حرکت ہُوئی اور تصویر بڑی ہونے لگی، پھیلنے لگی اور تصویر پُورے قد میں آ کر مُسکرا دی۔

"طاہرہ اب آ جاؤ۔ مَیں نے جوانی کے طویل سال تمہارے انتظار میں گزار دیئے ہیں۔"

"بھول جاؤ ارشد! اب طاہرہ کو بھول جاؤ۔"

رے کے سکوت میں سرگوشیاں تیرنے لگیں۔

"طاہرہ! میرا طاہر پرویز تمہیں بلا رہا ہے۔"

پرویز سے کہ دو ارشد! طاہرہ امی بھی مر گئی ہے۔ وہ نہیں آ سکے گی۔"

ں۔ طاہرہ! تم زندہ ہو۔ میں جانتا ہوں تم زندہ ہو۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں زندہ ہوں۔"

میرے ارشد! لوگوں نے طاہرہ پر مٹی ڈال دی ہے۔ وہ طاہرہ مر گئی ہے جو تمہاری تھی۔"

اپنی طاہرہ! وہ چاندنی راتیں نہ بھولو۔ یاد ہے تمہیں، تم نے مجھے کیا کہا تھا؟"

یاد دلاؤ مجھے وہ باتیں ارشد! وہ خواب کی باتیں تھیں۔ میں نے ان چاندنی راتوں کو یادوں کے حوالے کر دیا تھا اور
یم کی قبر میں دفن کر آئی ہُوں۔"

رث۔ طاہرہ! تم نے جھوٹ تو کبھی نہ بولا تھا؟"

یں ارشد! میرے قریب نہ آؤ۔ میں اب ایک جھوٹ کے سہارے زندہ رہنا چاہتی ہُوں۔"

رگوشیاں بلند ہونے لگیں۔

ت آؤ میرے قریب۔ ارشد! مجھے آزاد رہنے دو۔"

رہ نے تصور میں دیکھا کہ ارشد نے باہیں پھیلا دی ہیں اور طاہرہ کھچی ہُوئی باہوں کے گھیرے میں چلی جا رہی ہے۔

ں ارشد! مجھے بخش دو۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے اب آزاد رہنے دو۔"

رہ نے اپنے پاؤں اُکھڑنے نہ دیئے تصویر اداس ہو گئی کمرے کا سکُوت گہرا ہو گیا۔ طاہرہ تصویر کی آنکھوں میں
ے بیٹھی رہی۔ جذبات کی لہریں اونچی ہو ہو کر گر رہی تھیں اور طاہرہ گڑگڑا اُٹھ رہی تھی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔

شد! تیری آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔ تجھے میرے آنسوؤں کی قسم، اب ہم ایک دوسرے
ریں گے۔ کہو منظور ہے۔ کہ دو ارشد! منظور ہے۔ دیکھو تمہاری طاہرہ تم سے التجا کر رہی ہے۔ کہ دو میں تمہاری
ناؤں گا۔"

رں نہ آؤں؟

ں تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ میں بیوہ بھی ہو چکی ہُوں۔ میرا سایہ بھاری ہے۔ میں چڑیل ہُوں، منحوس ہُوں۔ طاہر پرویز
مائے سے بچا کے رکھو، ارشد!"

ں! طاہرہ تم پاگل ہو۔ تم بیوہ نہیں ہو۔"

رہ نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ ریلوے سٹیشن پر انجن نے زور سے وِسل دی تو طاہرہ نے یُوں کمرے میں دیکھا
! ارشد درد سے چیخ اُٹھا ہو۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ خارجی دنیا کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑنے لگیں۔
ے سٹیشن پر مال گاڑی کے شنٹ کرتے ہُوئے ڈبے ایک دُوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ بجلی گھر کے انجن
ردم، بوم کی آوازیں رات کے سکوت میں تیر رہی تھیں۔ اکے دُکے تانگے کے گھوڑے کی ٹپ ٹپا، ٹپ بھی

سنائی دے رہی تھی۔ ان مختلف آوازوں میں موسیقیت تھی۔ تمام آوازوں کی سُر اور تال ایک ہی تھی جیسے قدرت نے انہیں نغمے اور ایک تال پر منظم کر دیا ہو لیکن آج یہ نغمے اداس تھے۔ سُر تال میں یاسیت تھی۔ طاہرہ تڑپ اٹھی ــــ "نہیں ابا! نہیں کروں گی۔"

اُس نے تصویر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ساتھ ہی اس نے تصویر کو ایک طرف کر دینے کا ارادہ کیا لیکن نظریں اور اس کے ارادے تصویر کی مُسکراتی نگاہوں میں گرفتار ہو گئے۔ پھر وہی کیفیت۔ پھر وہی جذبات اور طاہرہ ان میں "ارشد آؤ عہد کر لیں کہ ہم دُور دُور رہیں گے ورنہ تم بھی مر جاؤ گے میں بھی مر جاؤں گی۔ تم طاہر پرویز کے لیے زندہ رہو کیوں منظور ہے نا؟ سنو! ارشد! خدا کے لیے میرے سامنے نہ آنا۔"

جانے وہ کیا کہنے لگی تھی کہ انجن نے پھر وسل دی لیکن طاہرہ اب محسوس دنیا سے بہت دور پہنچ چکی تھی۔ رات گزر رہی تھی۔ پشاور سے آتی ہوئی پاکستان میل کبھی کی جا چکی تھی۔ طاہرہ پر نیم خوابی کی حالت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

"درختوں کے پتے ہرے ہو گئے ہیں۔ درختوں کو بُور لگ گیا ہے۔ شاخوں میں گھونسلے آباد ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ آؤ ہم دُور دُور بیٹھ کر دیکھتے رہیں۔ دیکھنا یہ پتے جھڑ جائیں گے یہ گھونسلے اجڑ جائیں گے۔ رُت آئے گی، رت جائے گی پھر آئے گی کے لیے۔ گھونسلوں کو پھر آباد کرنے کے لیے۔ ارشد آؤ عہد کر لیں کہ ہم دور دور سے فطرت کا یہ تماشہ دیکھتے رہیں گے اور ایک دوسرے کے قریب نہیں آئیں گے۔ زندگی گزر ہی جاتی ہے۔ آؤ! دوسروں کے لیے جئیں، الگ الگ رہ کر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہو جائیں تو تم نعیم کی طرح گھونسلہ اُجاڑ کر گہری نیند سو جاؤ۔ طاہر پرویز کی ننھی سی زندگی اجڑ جائے گی، ارشد! اس کی معصومیت برباد ہم دونوں کو کوئی مل بیٹھنے نہ دے گا۔ دو دلوں کو کسی نے ملنے نہیں دیا کبھی، ارشد! یہ درخت کے پتے تو بہر حال جھڑ جاتے اور پھر ہرے ہو جاتے ہیں۔"

نیند کے خمار نے، ارشد کی یاد نے، ارشد سے شادی نہ کرنے کے فیصلے نے اور ارشد کے اچانک سامنے آ جانے کے خوف نے طاہرہ کو اپنے فطری رنگ سے بہت دُور، بہت دُور پہنچا دیا تھا۔ وہ ارشد سے دور رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ارشد کی تصویر کو نظروں سے اوجھل کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اسی تصویر میں کیچڑ کی طرح دھنستی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس قدر جذباتی تو کم ہی ہوتی لیکن ایک ادھیڑ پن نے اس کے ذہن کے ایک اور گوشے کا نقاب اُٹھا دیا تھا اور وہ جذبات کے جہان میں پہنچ چکی تھی جہاں اور جذبات گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

اس نے تصویر کو الٹا کر دیا اور تھک ہار کر سر میز پر پھینک دیا۔ اس نے تھکی ہوئی خوابناک آواز میں کہا ــــ "اب شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

رات رینگتی جا رہی تھی۔ ستارے ٹمٹما کر تھک گئے تھے اور اونگھ رہے تھے۔ نجمہ کا ننھا تیسری بار کروٹ بدل چکا تھا۔ ننھے چھوٹے بھائی کے رونے کی آواز نجمہ کے کمرے سے آتی تھی اور وہ دودھ پی کر کبھی کا سو چکا تھا اور طاہرہ سر کو میز پر رکھے کے نظام سے ہی تعلق توڑے ہوئے تھی۔ راولپنڈی شہر پر سکوت طاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس سکوت میں گونجدار دھماکے۔ ارتعاش پیدا کر دیا۔ انجن کے دھکیلے ہوئے مال گاڑی کے ڈبے سائیڈنگ میں کھڑے ڈبوں سے ٹکراتے۔ طاہرہ کا شعور رہو گیا۔

اس نے بغیر سر اٹھائے آنکھیں کھولیں، پلکیں ہولے ہولے اُوپر اٹھیں۔ طاہرہ نے دیکھا کہ جس تصویر کو اس نے الٹا رکھ دیا تھا وہ سیدھی پڑی تھی اور طاہرہ کے ہونٹ تصویر سے چپاں تھے۔ اسے یاد نہ آیا کہ کس وقت اس نے تصویر کو سیدھا کر لیا تھا اور کیونکر سیدھی ہو گئی تھی اور وہ کتنی دیر سے اس پر ہونٹ رکھے ہوئے تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے سر اوپر اُٹھانا چاہا لیکن اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دبا رکھا ہو اور وہ سر اٹھا نہ سکے گی۔ اس کے ہونٹ جیسے تصویر کے ساتھ چپک گئے تھے۔ طاہرہ نے اپنے آپ میں ایک رُومانی سی کی کیفیت محسوس کی۔ وہ اسی حالت پڑی رہی۔ اچانک اس کا شعور مکمل طور پر بیدار ہو گیا۔ سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ وہ رات بھر آپ سے یا تصویر کے ساتھ باتیں کرتی رہی ہے۔ اسے خفت سی محسوس ہونے لگی اور اسے پسینہ آ گیا۔ اس نے جھٹکے سے آپ کو اُٹھا لیا۔ اسے کسی حد تک غصہ بھی آنے لگا تھا جیسے وہ اس قوت کے مقابلے میں کھڑی ہو گئی ہو جس نے اسے لیا تھا۔ دوسرے لمحے اُس نے اپنے آپ کو فرش پر دو زانو پایا۔ قبلہ رُو۔ ہاتھ دعا کو اٹھے ہوئے اور اسے اپنی آواز سنائی دینے لگی۔

"یا خُدا! یا میرے اللہ! مجھے نجات دے۔ یا خُدا!..." اس کی آواز اس طرح بلند ہو گئی جیسے خُدا اس کے سامنے محسوس کے روپ میں کھڑا اس کی دُعا سنجیدگی سے سن رہا ہو ــــ "یا خُدا" ــــ طاہرہ نے دانت بھینچ کر کہا اور یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کیا کہے اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کے سینے سے نکلا ــــ "یا خدا" ــــ اور اس کی آواز بھرا گئی۔

اس کے اعصاب نڈھال ہو چکے تھے۔ سر میں گرانی اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پلنگ قریب ہی تھا۔ وہ فرش پر بیٹھے بیٹھے پلنگ کی طرف جھکی اور سر پلنگ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مسجد سے مؤذن کی آواز گونجی اور راولپنڈی کے سکوت میں مقدس ارتعاش پیدا ہو گیا۔ مرغ کبھی کے اذانیں دے رہے تھے۔ طاہرہ نے اپنے کندھوں پر دو ہاتھوں کا لطیف سا بوجھ محسوس کیا۔ اُس نے اس گرفت نما بوجھ کو نظر انداز کر دیا۔ اس نے سوچا یہ رات کی بات کی طرح واہمہ ہے لیکن یہ دونوں ہاتھ اسے جھنجھوڑ رہے تھے اور طاہرہ کے آنسو بہ رہے تھے۔

"طاہرہ! طاہرہ!" ــــ اس کے کانوں میں نجمہ کی آواز پڑی اس نے سر اُٹھایا اور آہستہ آہستہ اُٹھی۔ اس نے دیکھا کہ نجمہ اس کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ طاہرہ تیزی سے گھومی اور نجمہ سے بغلگیر ہو کر چہرہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔

"آپا! خُدا کے لیے ارشد کو میری اطلاع نہ دینا۔ اللہ تیرے بچوں کو زندگی دے آپا! مجھے ارشد سے بچانے رکھنا وہ سامنے آیا تو میں انکار نہ کر سکوں گی۔"

نجمہ نے اسے تسلی دی کہ اس کی مرضی کے مطابق ہی ہو گا لیکن طاہرہ روئے جا رہی تھی اور بار بار التجا کر رہی تھی ــــ "نہیں آپا! مدد کرو قسم کھاؤ آپ ارشد کو میرا پتہ نہیں چلنے دیں گی۔"

اور اس نے نجمہ سے نہ جانے کتنی ہی قسمیں لے لیں۔ طاہرہ کو قدرے سکون ہُوا۔ وہ لیٹ گئی اور گھنٹہ بھر سو لیا۔

نجمہ نے جب اطہر سے طاہرہ کی اس حالت کا ذکر کیا تو اس نے بھی نجمہ سے کہا ــــ "اب اس بات کو چھیڑنا ہی بیکار ہے

طاہرہ ان ازدواجی ضروریات اور خواہشات سے بہت آگے نکل گئی ہے۔"

"چلیے یہ طے ہوا کہ ہم ارشد کو طاہرہ کا علم نہیں ہونے دیں گے" — نجمہ نے کہا — "لیکن میں یہ بتا دیتی ہوں کہ اتفاق سے کبھی ارشد اور طاہرہ کا آمنا سامنا ہو گیا تو طاہرہ کی موجودہ کیفیت ایک سیکنڈ میں غائب ہو جائے گی اور وہ ارشد کے سامنے جھک جائے گی اگر نہ جھکی تو ارشد اسے منا لے گا۔"

"وہ دیکھا جائے گا" — اطہر نے کہا — "لیکن ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ طاہرہ کو اس سے چھپائے رکھیں۔"

طاہرہ بمشکل ایک گھنٹہ سوئی تھی کہ نجمہ نے اُسے ناشتے کے لیے جگا لیا۔ ناشتے کے بعد وہ تیار ہو کر نجمہ کے ساتھ سکول چلی گئی۔ اس سے پہلے وہ ایک بار سکول گئی تھی اور ہیڈ مسٹریس اور اُستانیوں نے اس کا استقبال بڑے جوش اور مسرت سے کیا تھا۔ آج پھر یہی حال تھا۔ ایک استانی چھوڑتی تو دوسری دبوچ لیتی تھی۔

ابھی سکول کھلنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ بڑی جماعتوں کے لڑکے اور لڑکیاں ابھی ابھی سکول میں آ رہے تھے۔ ان میں بہت سے طاہرہ کے پرانے شاگرد تھے جنہوں نے اس سے تیسری جماعت میں پڑھا تھا۔ اب وہ دسویں میں پہنچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے طاہرہ کو دیکھ لیا تو آن کی آن میں "طاہرہ آپا آئی ہے" کی خبر تمام لڑکیوں اور لڑکوں تک پہنچ گئی۔ چھ سات برس گزر جانے کے باوجود وہ تیسری جماعت کا وہ زمانہ نہ بھولے تھے۔ ان کے دلوں میں طاہرہ کا پیار پہلے روز کی طرح زندہ تھا۔ انہیں یاد تھا جب پشاور چلی گئی تھی تو وہ کتنے دن اُداس رہے تھے۔ دوسری استانی کے ساتھ ان کا دل لگتا ہی نہ تھا۔ ان سب کو ابھی تک وہ کہانیاں بھی یاد تھیں جو طاہرہ انہیں سنایا کرتی تھی۔

سکول کی گھنٹی بج رہی تھی۔ بچے کلاسوں میں جا رہے تھے اور کچھ لڑکے اور لڑکیاں طاہرہ کے گرد جمع ہو رہی تھیں۔ "آپا، السلام علیکم" "آپا! آداب عرض" کی آوازیں طاہرہ کے گرد بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ طاہرہ نے سب کو دیکھا۔ پھر باری باری دیکھا۔

"اوہ! یہ تم ہو اجمل؟..... ارے تم تو اتنے سے تھے اُس وقت؟..... روحی؟ جیتی رہو بیٹی، تم تو گڑیا سی تھیں۔ بات بات پر رو پڑتی تھیں" — اس طرح طاہرہ نے ہر ایک کا نام پوچھا، ہر ایک سے پیار کیا۔ ذرا ذرا سے بچے آج جوانی میں قدم رکھ چکے تھے۔

لڑکیاں بڑی شوخ تھیں۔ ایک بول اٹھی — "آپا! شادی مبارک ہو۔ آپ تو ایسی بھاگیں کہ سکول کا راستہ ہی یاد نہ رہا۔ ایسی شادی بھی کیا؟"

طاہرہ کے دل میں جیسے کسی نے خنجر اتار دیا ہو۔ وہ اداس ہو گئی، مگر اسے یاد آ گیا کہ وہ بچوں میں کھڑی ہے۔ ایک ثانیے میں سنبھل گئی اور شگفتہ لہجے میں بولی — "اری! یہ تمہیں کس نے بتایا تھا کہ میں نے شادی کی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ارادہ ہے دیکھو، اب پھر سکول میں آ گئی ہوں۔"

"مٹھائی کی خاطر آپا جھوٹ بول رہی ہیں" — ایک لڑکی نے شوخی سے کہا۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے دلوں میں ایک بار پھر طاہرہ کا سویا ہوا پیار اور جلال جاگ اُٹھا۔ ان کی خوشی کا اندازہ اس بات سے

ہوتا تھا کہ انہوں نے کھڑے کھڑے طاہرہ کے اعزاز میں ایک پک نک کا پروگرام بنا لیا۔

اور جب سکول کھلا تو طاہرہ ہیڈ مسٹریس کے کمرے میں بیٹھی تھی۔

"طاہرہ! چھ برس کے تجربے سے آپ بہت ہوشیار ہو چکی ہوں گی" — ہیڈ مسٹریس طاہرہ سے کہہ رہی تھی — "اب تو آپ پانچویں چھٹی جماعت لے سکتی ہیں۔"

"لے تو سکتی ہوں" — طاہرہ نے ذرا سوچ کر کہا — "لیکن مجھے تیسری یا چوتھی میں ہی رکھیے۔ بچوں کو پڑھانے میں مجھے زیادہ لذت آتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے تجربہ چھوٹی جماعت کے بچوں کا ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی" — ہیڈ مسٹریس نے کہا — "میں آپ کو چوتھی جماعت دے دیتی ہوں۔ آپ چاہیں تو آج ہی چارج لے لیں، چاہیں تو کل سے شروع کر دیں۔ جیسے آپ کی مرضی۔"

طاہرہ نے اُسی روز چوتھی جماعت کا چارج لے لیا۔

جب تعارف کے لیے کلاس کے کمرے میں داخل ہوئی تو پہلی اُستانی جو چالیس پینتالیس کے پیٹے میں تھی بولی — "سنو بچو! یہ ہیں مس طاہرہ، تمہاری نئی اُستانی۔"

کلاس کے بچوں کو طاہرہ کی شکل و صورت دیکھ کر مسرت ہوئی۔ طاہرہ کی شخصیت اور خدوخال میں انہیں جاذبیت محسوس ہوئی۔ ان مسکراتی ہوئی آنکھوں اور زیر لب تبسم میں انہیں ماں کا پیار جھلکتا دکھائی دے رہا تھا۔

طاہرہ کھل کر مسکرائی اور ایک نگاہ میں سب بچوں کو دیکھ لیا۔ اس کے رگ و ریشے میں ایک جانی پہچانی رو دوڑ گئی۔ اسے اپنا سینہ پھیلتا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے آپ میں پُرلطف سی تپش محسوس کی۔ ایک قرار، ایک سکون، جیسے تھکے ماندے مسافر نے منزل کو پا لیا ہو۔ پرانی استانی اسے حاضری کا رجسٹر اور سلیبس دکھا رہی تھی جسے طاہرہ نے رسمی طور پر دیکھا۔

طاہرہ کا یہ دن ملنے ملانے میں گزر رہا تھا۔ اتنے میں تفریح کی گھنٹی بجی تو وہ سٹاف روم میں چلی گئی۔ نجمہ نے اسے کہا — "آؤ طاہرہ! تمہیں جوزی بابا دکھائیں" — وہ اسے کھیل کے میدان میں لے گئی۔

تمام اُستانیاں اور اُستاد چائے اور گپوں میں مصروف تھے لیکن جوزی بابا کی تفریح کھیل کے میدان میں ہوتی تھی۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ بچے کھیل رہے ہوں اور جوزی بابا ان میں موجود نہ ہو۔ طاہرہ نے دور سے ہی پہچان کہ وہ چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی والا تنومند بڈھا جوزی بابا ہی ہو سکتا ہے جو دو بچیوں کو کندھے پر اٹھائے ہاتھی کی چال سے چل رہا ہے اور پندرہ بیس بچے اس کے پیچھے چیخ رہے ہیں — "اب میری باری! اب میری باری!" — اور بابا سب کو باری باری کندھوں پر بٹھا کر سواری کرا رہا تھا اور انہیں ناز دے رہا تھا کہ وہ ہاتھی کی سواری کر رہے ہیں۔

"عجیب انسان ہے" — نجمہ نے طاہرہ سے کہا — "دیکھو تو کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔"

لیکن طاہرہ بابا کے کھیل میں محو تھی۔ اس نے دیکھا کہ بچے اسے گھوڑا بنانے پر ضد کر رہے ہیں اور وہ گھوڑا بن گیا تھا۔

نجمہ اور طاہرہ اسے دیکھتی رہیں۔ نجمہ تو ہنستی رہی لیکن طاہرہ خاموشی سے دل ہی دل میں بابا کے پیار بھرے ایثار کی داد دیتی رہی۔ بچوں کے معاملے میں طاہرہ کا اپنا رویہ بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن بابا تو حدیں پھلاند گیا تھا۔ اس نے دیکھا وہ بچوں میں مگن تھا۔ اس نے

دونوں ہاتھ کانوں سے ذرا اوپر سر پر رکھ کر خرگوش کے کان بنائے اور ناک اور ہونٹوں کو لرزہ دے کر لینے لگا — "یوں ہوتا ہے خرگوش" — اور بچے ہنس ہنس کر پاگل ہوتے جا رہے تھے — "اچھا تو خرگوش تھا بڑا ہوشیار..." بابا نے لپک کر ایک بچی کو گود میں بٹھا لیا اور کہانی جاری رکھی۔

"آپا السلام علیکم" — چوتھی جماعت کے ایک بچے نے طاہرہ کو پہچان کر سلام کیا اور بابا سے کہا — "بابا وہ ہماری نئی استانی کھڑی ہیں"

جوزی بابا نے اُدھر دیکھا تو ہنس کر کہا — "آئیے مس نجمہ صاحبہ! کیا کروں، بچے ضد کرتے ہیں۔ اپنا تو یہی شغل ہے آئیے یہاں بیٹھ جائیے۔ اور..."

بابا بولتے بولتے رک گیا اور اس کی نگاہیں طاہرہ پر جم گئیں۔ کہانی کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ بابا کی بات اُدھوری رہ گئی۔ بچے کہانی سننے کو بے چین ہو رہے تھے لیکن بابا آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا۔ گود میں اٹھائی ہوئی بچی کو اس نے کندھے کے ساتھ لگا لیا۔ اور اٹھ کر اس طرح ہولے ہولے نجمہ اور طاہرہ کی طرف چل پڑا جیسے طاہرہ نے اس پر جادو کر دیا ہو اور وہ اس کی قوت کے زور سے بے بس ہو کر چل رہا ہو۔ وہ گہری اور حیرت زدہ نظروں سے دیکھتا ان کے قریب جا رکا اور نجمہ کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"جوزی بابا" — نجمہ نے تعارف کرایا — "یہ ہیں مس طاہرہ پروین! ہمارے سکول کی نئی اُستانی۔ آج ہی انہوں نے چوتھی جماعت کا چارج لیا ہے۔ ان سے میں نے آپ کا غائبانہ تعارف کرایا ہوا ہے"

"آداب عرض مس طاہرہ! میں دیکھ رہا تھا کہ چہرہ بالکل نیا ہے۔ آپ کو دیکھ کر بیحد مسترت ہوئی۔ اب تو آپ ہر روز ملا کریں گی... بڑی خوشی کی بات ہے..." بابا نے بچوں سے کہا — "جاؤ بچو! اب تم کھیلو۔ میں ذرا ان سے باتیں کر لوں کل پھر گھوڑا گھوڑا کھیلیں گے" — اور وہ طاہرہ سے مخاطب ہوا۔

"بچے بھی عجیب پیاری مخلوق ہے مس طاہرہ! یہ بچے میری زندگی ہیں" وہ طاہرہ کی طرف دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ کہ رہا تھا — "چھٹی کے وقت یہ بچے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں تو میرا دل بجھ سا جاتا ہے" — وہ دکھی سی مسکراہٹ مسکرایا اور خاموش ہو گیا۔

"نجمہ آپا نے آپ کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے" — طاہرہ نے مسکرا کر کہا — "مجھے خود بچوں کے ساتھ اسی قسم کا اُنس ہے"

"مجھے یہ لڑکیاں زیادہ پیاری لگتی ہیں" — بابا نے کہا — "یہ ننھے ننھے مسکراتے ہوئے غنچے، یہ ذرا ذرا سی کونپلیں" — بابا تو جیسے وجد میں آ گیا ہو۔

"سنا ہے آپ بریلی کے مہاجر ہیں؟" — طاہرہ نے کہا۔

"ہاں مس طاہرہ!" — بابا نے ایسے لہجے میں کہا جس پر درد کا عنصر غالب تھا — "میں نے بھی سنا ہے کہ بریلی کا مہاجر ہوں ویسے اپنا ہوش رہتا کم ہے۔ اکثر اپنے آپ سے باہر رہتا ہوں۔ میرے متعلق بیشتر باتیں مجھے دوسروں سے معلوم ہوتی ہیں بعض استاد مجھے کہتے ہیں میں بچوں کے نیچے گھوڑا بن کر کپڑے برباد کر لیتا ہوں لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا"

نجمہ نے جوزی بابا کے ساتھ کبھی کھل کر بات نہیں کی تھی۔ جب بھی موقعہ ملا رسمی سی دو چار باتیں ہوئیں، حالانکہ وہ اسے ایک بار گھر بھی لے گئی تھی پھر بھی دونوں کے درمیان ایک گونہ اجنبیت برقرار رہی تھی۔ نجمہ نے بہت کوشش کی تھی کہ بابا کے دل کا غبار نکال سکے۔ اسے اتنا احساس ضرور تھا کہ بابا دکھا ہوا انسان ہے اور وہ بریلی میں سارے خاندان کو جن میں بچے بھی ہوں گے ضائع کر آیا ہے۔ اسے خیال تھا کہ بابا اب تنہا ہے اور ایک تلخ سی تشنگی اور محرومی سے دوچار ہے۔ نجمہ نے چاہا تھا کہ اسے گھر میں رکھ کر اس کی خدمت کرے اور اس کی باقی زندگی کو اس تلخی سے بچا لے۔ نجمہ کے جذبات اور پیش کش کے باوجود وہ نجمہ کے ساتھ مکمل طور پر کھل نہ سکا تھا۔ نجمہ اس میں گہری دلچسپی لیتی تھی۔

آج جب طاہرہ کو بابا نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا تو نجمہ نے ان نگاہوں میں ایک داستان پڑھ لی۔ اسے خیال آیا کہ طاہرہ کو دیکھ کر بابا کے دل میں کسی بہو بیٹی کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ اُسے پشاور والے اندھے موسیقار کا وہ قصہ بھی یاد آ گیا جو اسے طاہرہ نے سنایا تھا کہ کس طرح وہ اس کے ساتھ پیار کیا کرتا تھا حقیقت تو اپنی جگہ تھی جسے نجمہ جانتی تھی کہ طاہرہ کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ جس نے دیکھا آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا۔ بابا پر بھی غالباً اسی سحر نے اثر کیا تھا لیکن نجمہ کو یہ شک بھی ہوا کہ بابا نے طاہرہ کے روپ میں اپنے خاندان کی کسی لڑکی کو دیکھ لیا ہے اور اس کا دل چاہ رہا ہے کہ اسے چھو کر یا سونگھ کر دیکھے کہ یہ وہی تو نہیں جو بریلی میں شہید ہو گئی تھی!

طاہرہ نے بھی بابا کی یہ کیفیت دیکھی تو اسے پشاور والا اندھا موسیقار یاد آ گیا اور اس کے یہ الفاظ — "میری بھی ایک بچی تھی جو طاہرہ بیٹی کی طرح باتیں کیا کرتی تھی" — طاہرہ کو یاد آ گئے۔

اس کے دل میں بابا کی ہمدردی کی لہریں اٹھ آئیں نجمہ نے اسے بابا کے متعلق بہت کچھ بتایا تھا لیکن وہ اس کا تصور مکمل طور پر باندھ نہیں سکی تھی۔ اب اس نے بابا کو دیکھا۔ اس کی باتیں سنیں تو اس کے دل میں ہمدردی کے ساتھ پیار بھی پیدا ہو گیا۔

اگر بابا اتنی یا اس طرح کی باتیں نہ کرتا تو شاید طاہرہ بھی اسے "عجیب و غریب شخصیت" کہہ کر ٹال دیتی لیکن اس کی باتوں میں جو بیتا درد، محرومی اور احساسِ تنہائی تھا جسے وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں داد اور محرومی کا احساس ہو۔ اس نے فوراً یقین کر لیا کہ بابا بریلی میں سارا خاندان کٹوا آیا ہے اور وہ خاندان کے ایک ایک بچے کو ان بچوں میں تلاش کر رہا ہے۔

طاہرہ کو ایک گونہ اطمینان ہوا کہ بابا نے تشنگی بجھانے کا کس قدر بلند اور صحت مند ذریعہ پیدا کر لیا ہے۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ پانچویں درجے کی جو پہلی جماعت اس نے پڑھا کے چھٹی میں بھیجی ہے، اس کے سو فی صد لڑکے پاس ہونے کے علاوہ اوسط نمبر جو انہوں نے حاصل کیے تھے ۸۰ فیصد تھے۔ بچوں کے متعلق بابا اور طاہرہ کی یہ حس مشترک تھی۔

طاہرہ کو افسوس ہوا جب اس کے کانوں میں تفریح کے خاتمے کی گھنٹی کی آواز پڑی۔ وہ بابا کے دل میں داخل ہو کر اس کی داستانِ حیات پڑھنا چاہتی تھی۔

بابا نے اسے کہا — "آداب عرض، مس طاہرہ! پھر ضرور ملیئے گا"

طاہرہ نے چونک کر اور بے اختیار ہو کر کہا — "بابا! میں بھی اس دنیا میں تنہا ہوں"

بابا مسکرا کر چل دیا۔ نجمہ اور طاہرہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔

"معلوم ہوتا ہے اس کی عمر پچاس سال نہیں"۔۔۔ طاہرہ نے اس کے قدموں میں جوانی کی چال دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "دیکھو تو ذرا کس طرح اکڑ اکڑ کر اور باوقار طریقے سے چلتا ہے۔ گردن بھی سیدھی اور کندھے بھی تنے ہوئے۔"

"بے چارے کو دکھوں نے بوڑھا کر دیا ہے"۔۔۔ نجمہ نے کہا۔۔۔ "اور بال قبل از وقت سفید ہو گئے ہیں۔ ویسے جسمانی لحاظ سے بوڑھا نہیں۔ اسے بابا صرف اس لیے کہتے ہیں کہ اس نے سکول میں اپنا نام جوزی بابا لکھوایا ہے۔ دوسری وجہ اس کے سفید بال ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے اس کی عمر آگے نکل گئی ہے اور یہ پیچھے رہ گیا ہے"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔۔۔ "اگر بابا اس عمر میں تیس پینتیس برس کی عمر کی عورت سے شادی کر لے تو اس کی زندگی ایک بار پھر کھل اٹھے۔"

"ہاں کیوں نہیں"۔۔۔ نجمہ نے تائید کی۔۔۔ "اتنا بوڑھا تو نہیں، ہاتھوں میں کیا اور چہرے پر کیا، ابھی بڑھاپے کی ایک لکیر بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ بے چارے کا غم نے حلیہ بگاڑ دیا ہے۔"

"بہر حال آپا!"۔۔۔ طاہرہ نے آہ لے کر کہا۔۔۔ "کوشش کریں گے کہ اسے گھر لے چلیں۔ اپنے دونوں ننھوں میں پیارے دکھ بھول جائے گا۔ بخدا اس قسم کے انسانوں پر تو میں جان بھی نثار کر دوں۔ جانے کتنے دکھ اٹھاتے پھرتا ہے!۔۔۔۔ بھائی جان کو تو اعتراض نہ ہوگا؟"

"ارے نہیں"۔۔۔ نجمہ نے کہا۔۔۔ "بلکہ انہوں نے خود کہا تھا کہ اسے گھر رکھ لو۔ سچی بات تو یہ ہے طاہرہ کہ اپنا بھائی شہید ہو گیا تھا اور والد صاحب کی تو مجھے صورت ہی یاد نہیں، میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ میں اسے باپ اور بھائی کی جگہ گھر رکھ کر خدمت کرنا چاہتی ہوں۔"

بابا جب سکول کے کونے سے گھوم کر بڑے سکول کے احاطے میں داخل ہونے لگا تو وہ رک گیا اور گھوم کر پیچھے دیکھا نجمہ اور طاہرہ اپنے سکول کی طرف چل پڑی تھیں۔ بابا طاہرہ کو جاتے دیکھتا رہا، سر سے پاؤں تک پھر پاؤں سے سر تک اور اس کے ایک ایک قدم کو دیکھا۔ جب طاہرہ برآمدے میں داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو بابا کے منہ سے آہ نکلی ۔۔۔ "مس طاہرہ!"۔۔۔ اور ساتھ ہی ایک مسکراہٹ جس میں جانے کتنے ارمان رو رہے تھے۔ اس کی مسکراہٹ میں آنسوؤں کی چمک تھی۔

دوسرے روز طاہرہ باقاعدگی سے کلاس لینے لگی۔ پہلے دن ہی اس نے بچوں کو ایک کہانی سنائی تو کہانی ختم ہونے کے بعد پچھلی نشستوں سے ننھی سی آواز آئی ۔۔۔ "آپا! آپ بہت اچھی ہیں"۔۔۔ طاہرہ نے محسوس کیا جیسے ارشد کا خیال، نعیم کی معصوم یاد، اس کی موت اور موت سے پہلے کی اذیت ناک زندگی اور بیوگی کا تصور ان بچوں کی ننھی ننھی باتیں سنتے اور ان کے معصوم چہروں کو دیکھتے ہی ختم ہو گیا ہو۔

اس نے اعصاب سے ایک بوجھ کو اترا ہوا پایا اور اس نے سکون سے لبریز آہ لی۔ رات کے واہمے کا اثر، جذبات کا ابھار اور اس ابھار میں دکھ بھری یادیں ہلکا سا دھواں بن کر کلاس کے کمرے کی فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ اس کے سامنے ایک نہیں کئی طاہرہ، آپا! آپا! اسے معصوم نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ طاہرہ پر اس تھکے ہوئے مسافر کی سی کیفیت طاری ہو گئی جو منزل

ٹھنڈی چھاؤں میں سستا رہا ہو۔

تفریح کی گھنٹی بجی تو نجمہ سٹاف روم میں اس کا انتظار کرتی رہی اور طاہرہ کھیل کے میدان میں جوزی بابا کے ساتھ بچوں سے کھیل رہی تھی۔ آج اس نے جوزی بابا کو گھوڑا نہ بننے دیا۔ وہ بچوں کو لکڑی کے گھوڑوں والے جھولے پر لے گئی۔ بچوں کو جھولے پر بٹھا کر وہ اور جوزی بابا گھماتے رہے۔ جب دونوں تھک گئے تو ایک طرف کھڑے ہو گئے اور بچے ایک دوسرے کو جھولے دینے میں مصروف ہو گئے۔

"مس طاہرہ! آپ نے کتنا کرم کیا ہے کہ میرے پاس آ گئی ہیں"۔۔۔ جوزی بابا نے ہانپتے سانس کو سنبھالتے ہوئے کہا۔۔۔ "یہ سالہا سال مجھے محبت [illegible] آیا ہے لیکن استادوں اور استانیوں کی اکثریت مجھے پسند نہیں۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ اچھا ہے لیکن ان کے دلوں میں بچوں کی وہ محبت نہیں جو ہونی چاہیے۔ وہ بچوں کو پیار سے پڑھاتے ہیں لیکن اس پیار میں پیشہ ورانہ عنصر غالب ہوتا ہے بےساختگی نہیں ہوتی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر مجھے پسند نہیں کرتے۔ بعض مجھے سنکی کہتے ہیں، بعض نے نیم پاگل تک کہہ دیا ہے۔ یہ تو خیر کسی حد تک درست ہے کہ میں بچوں کے معاملے میں نیم پاگل ہوں۔ بچوں کو خصوصاً بچیوں کو دیکھ کر میں دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ میں انہیں گود میں اٹھا کر چاٹ لینا چاہتا ہوں۔"

طاہرہ ہلکی سی ہنسی ہنس پڑی۔ بابا نے پوچھا۔۔۔ "مس طاہرہ! آپ واقعی مس ہیں یا شادی شدہ؟"

"نہیں بابا جان"۔۔۔ طاہرہ نے جواب دیا۔۔۔ "میں غیر شادی شدہ ہوں اور شادی کا کوئی ارادہ بھی نہیں۔"

بابا اسے گہری پُراشتیاق نظروں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے خد و خال میں کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہا ہو۔

طاہرہ نے کہا۔۔۔ "میں زندگی کا ایک ایک لمحہ اور جوانی کی تپش کا ایک ایک ذرہ ان بچوں پر صرف کرنا چاہتی ہوں۔ میں تنہا ہوں، بابا جان! اس دنیا میں اکیلی ہوں۔"

"اور نجمہ صاحبہ؟"

"میری منہ بولی بہن ہیں"۔۔۔ طاہرہ نے جواب دیا۔۔۔ "دنیا میں میرا واحد سہارا۔ اگر نجمہ آپا نہ ہوتیں تو میں آج اس سکول میں نہ ہوتی۔ جانے کون سی گمراہیوں اور گناہوں کے اندھیرے میں گم ہو چکی ہوتی۔۔۔۔ اوہ معاف کیجیے گا بابا جان! میں نے اپنی الم کہانی شروع کر دی ہے۔ میں آئی تھی آپ کی باتیں سننے اور اپنی سنانے لگ گئی۔"

"سنائیے، مس طاہرہ!"۔۔۔ بابا نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔۔۔ "یہ باتیں مجھے سنائیے۔ میں بھانپ گیا ہوں کہ آپ کے سینے میں گھٹن ہے اور دل غم کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ میں خود اسی حال میں ہوں۔ طاہرہ! مجھے اپنی باتیں کھل کر سنائیے۔ یہی ایک ذریعہ ہے دل کے قرار کا ورنہ آپ مرجھا جائیں گی۔ میں تو ایسے انسان کی تلاش میں رہتا ہوں جو میرے دل کے بوجھ کو ہلکا کرے۔ میری سنے، دل والے ہی دل والوں کی سنتے ہیں۔ میں بڈھا ہوں۔ دو تین برس اور جی لوں گا۔ آپ جوان ہیں، اسی عمر میں آپ نے غموں کو دل میں رکھنا شروع کر دیا تو آپ قبل از وقت بوڑھی ہو جائیں گی۔ دل اور روح مرجھا جائیں گے۔ میں جانتا ہوں آج کل کسی کو معاشی اور معاشرتی حالات فرصت نہیں دے رہے کہ وہ دوسروں کی سنے اور جس کے پاس فرصت ہے اس کے پاس دل نہیں۔ میں بھی اپنی کہانی کسی کو سنانا چاہتا ہوں لیکن کوئی سننے والا نہیں۔ سنکی اور نیم پاگل کی کون سنے گا مس طاہرہ!"

یں گی۔

"لیکن میں سناؤں گا نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ کا دل جوان ہے۔ اس میں جوان امنگیں ہیں۔ اس کی ایک ایک دھڑکن میں شباب بھرے ارمان ہیں، اور میری کہانی میں سوائے دکھ اور درد کے کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کے اس دل پر ایک لمحے کے لیے بھی اپنا بوجھ نہیں ڈالوں گا۔"

طاہرہ نے دیکھا۔ جوزی بابا مسکرا رہا تھا۔

"نہیں یہ بات نہیں" — طاہرہ نے بچیوں کے لہجے میں کہا — "آپ مجھے بیگانہ سمجھ رہے ہیں۔"

"بیگانہ؟" — بابا نے قدرے حیرت سے کہا — "مس طاہرہ! ایک بات کہوں، برا نہ مانیے گا؟"

"کہیئے نا بابا جان! میں تو کہنے اور سننے کے لیے آپ کے پاس آتی ہوں" — طاہرہ نے ایسے لہجے میں کہا جس میں بے تکلفی اور اپنائیت تھی جسے بابا نے نمایاں طور پر محسوس کیا اور اس کا حوصلہ کھل گیا۔

"مس طاہرہ میں آپ کو بیگانہ نہیں سمجھ رہا"..... وہ ذرا سا خاموش ہو گیا پھر بولا — "میں نے کل نجمہ صاحبہ کے ساتھ آپ کو دیکھا تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے اس سے پہلے آپ کو کئی بار دیکھا ہے۔ جیسے آپ ہمیشہ میرے دل میں اور میں آپ کے دل میں رہا ہوں۔ معلوم نہیں آپ کا عقیدہ کیا ہے لیکن میں اس حقیقت کا قائل ہوں کہ بعض انسانوں کے دل روزِ ازل سے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو جان نہیں سکتے لیکن جوں ہی وہ زندگی کے کسی موڑ پر یا کسی دوراہے پر اتفاق سے، بظاہر اتفاق سے، اکٹھے ہو جاتے ہیں تو وہ پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے کو کہہ دیتے ہیں — "ہم تو برسوں اکٹھے رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن کہاں؟" — آپ ذرا اس فلسفۂ قدرت کو سمجھنے کی کوشش کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کس طرح انسان کو پا لیتا ہے۔ میں نے آپ کو دیکھ کر قلب و دماغ میں کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ خدا جانے آپ کے احساسات کیا تھے؟ شاید آپ میرا تماشہ کرنے آئی تھیں؟"

"نہیں، بابا جان! یہ غلط ہے" — طاہرہ نے مسکرا کر کہا — "میں آئی تو آپ کو دیکھنے ہی تھی لیکن میں نے آپ کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کا نمایاں احساس ضرور پایا تھا۔ اور میں نے محسوس کیا تھا کہ میں شاید آپ کی خدمت کے لیے ہی پیدا کی گئی ہوں۔ اس احساس کا محرک غالباً آپ کا بچوں کے ساتھ والہانہ پیار ہے کیونکہ مجھے بھی بچوں سے آپ ہی کی طرح پیار ہے۔ اس ہم خیالی نے میرے اور آپ کے درمیان غیریت اور بیگانگی کا فرق پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔"

"بہرحال کچھ تو تھا" — بابا نے ہنس کر کہا — "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے..... اوہ! مس طاہرہ گھنٹی بج رہی ہے۔ آج معلوم ہوتا ہے گھنٹی جلدی بج گئی ہے۔"

رات جب طاہرہ سونے کے لیے لیٹی تو اس کے خیالوں میں جوزی بابا داخل ہو گیا۔ طاہرہ نے سوچا کہ بابا صرف نام کا بابا ہے، ویسے تو وہ اچھی خاصی تندرست عمر میں ہے۔ وہ بابا کے دکھوں کا مداوا بننا چاہتی تھی۔ طاہرہ کو خیال آیا کہ ایک دن

اس نے عفت کو بھی سہارا دیا تھا۔ گو عفت کا معاملہ جوزی بابا سے مختلف تھا لیکن بات ایک ہی تھی۔ وہاں غریبی نے محرومی اور ... پیدا کر رکھی تھی یہاں کسی دکھ نے محرومی اور تشنگی کو جنم دے دیا تھا۔ طاہرہ نے چودہ پندرہ برس کی عمر میں عفت کو مالی اور ذہنی لحاظ سے سنبھال لیا تھا تو اس پختہ عمر میں بابا کو وہ زیادہ اچھی طرح اور آسانی سے سنبھال سکتی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ بابا پیار و محبت کا پیاسا ہے۔ اسے بابا کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے نجمہ سے کہے تھے — "بابا کے پاس ہے ہی کیا؟ اپنے کو نہ ماں ملی، نہ بیوی۔ نہ بہن نہ بیٹی۔"

طاہرہ نے سوچا کہ یہ کس قدر تلخ اور اذیت ناک محرومی ہے۔ طاہرہ خیالوں کے ریلے میں بہتی جا رہی تھی اور ذہن دُور دُور کی کڑیاں ملا رہا تھا۔ اسے پھر عفت یاد آئی۔ ارشد بھی یاد آیا اور اس کا دل بوجھل ہونے لگا۔ لاہور کے وہ چھ پناہ گزین خاندان جنہیں طاہرہ نے آباد کیا تھا، اُسے یاد آئے۔ اس لیے نہیں کہ دنیا کو خیالوں میں احسان جتا رہی تھی بلکہ گھڑی دو گھڑی گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہی تھی۔ اسے نعیم کی یاد نے تڑپا دیا۔ یہ یاد جب بھی آتی تھی اپنے ساتھ ہزار اذیتیں لے کر آتی تھی اور طاہرہ کا انگ انگ ملا کر رکھ دیتی تھی۔

طاہرہ کا دل ڈوبنے لگا اور پھر بھاگ کر جوزی کے خیال میں محو ہو گئی جو درد نعیم کی یاد نے پیدا کر دیا تھا۔ طاہرہ نے اس کا رُخ جوزی بابا کی طرف موڑ دیا۔ خیالات خود بخود کڑیاں ملاتے جا رہے تھے کہ وہ چونک اٹھی اور بلند آواز سے کہا — "ارے! اوہ" اپٹ کر بستر سے نکل کر میز پر گئی اور کاغذ کے پرزے پر لکھا — "پچیس روپے کا منی آرڈر" — اسے پشاور والی بچی کو پچیس روپے منی آرڈر کرنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔

"اگر جوزی بابا یہاں آ جاتے تو کتنا اچھا ہو" — طاہرہ نے اپنے آپ سے کہا اور کروٹ بدل لی۔ بابا کا بچوں سے یہ پیار اس کے دل و دماغ پر سوار ہو گیا تھا وہ بابا کے ہاتھ تو ہاتھ اس کے پاؤں بھی چوم لینا چاہتی تھی۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ سکول جمعہ کے روز گیارہ بجے بند ہو جاتا تھا۔ طاہرہ نے صبح سویرے سویرے نجمہ سے کہا — "آپا! میں آج چھٹی کے بعد وہیں سے جوزی بابا کے ہاں چلی جاؤں گی اور ذرا دیر سے واپس آؤں گی۔"

"تو میں بھی ساتھ چلوں گی" — نجمہ نے کہا، مگر کچھ سوچ کر کہنے لگی — "لیکن نہیں۔ تمہارے بھائی جان بھی جلدی آ جائیں گے اور بچے انہیں پریشان کرتے رہیں گے۔ ان کی موجودگی میں وہ مائی کے پاس نہیں رہتے" — مائی ان کی نوکرانی تھی اور بچے اس کے ساتھ خوب مانوس تھے۔ نجمہ کی غیر حاضری میں وہ اس کے ساتھ لگے رہتے تھے۔

"میں آج اس کی کہانی سن کے ہی آؤں گی لیکن اپنی نہیں سناؤں گی" — طاہرہ نے کہا — "کل تفریح کے وقت میں نے اپنی داستان شروع کر دی تھی لیکن فوراً نجیب ہو گئی۔ سوچا بے چارہ خود دکھیارہ آدمی ہے۔ میں اپنی بپتا سنا کر اسے اور کیوں پریشان کروں..... سنیں آپا! اگر وہ مان جائے تو اسے ساتھ لیتی آؤں؟"

"ہاں لیتی آنا" — نجمہ نے شوق سے کہا — "میں تو چاہتی ہی یہی ہوں۔"

گیارہ بجے چھٹی کی گھنٹی بجی تو طاہرہ جلدی جلدی بڑے سکول کے احاطے میں جا پہنچی۔ جوزی بابا بچوں کے جلوس میں آ رہا تھا۔ طاہرہ کو دیکھتے ہی اس نے قدم تیز کر لیے اور بچوں کو الوداع کہہ کر طاہرہ سے آ ملا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کے گھر تک چلوں؟" — طاہرہ نے پوچھا۔
"اوہ! کیوں نہ چلیں؟" — وہ تو جیسے اسی خواہش کو دل میں دبائے ہوئے تھا کہ ذرا سا اشارہ ملتے ہی خواہش اُبھر آئی۔
—"مس طاہرہ! آئیے آج غریبوں کا کھانا کھا کر بھی دیکھیے۔"
"ہاں بابا جان! کھانا تو ضرور کھاؤں گی۔ میں نے نجمہ آپا سے کہہ دیا تھا کہ میں بابا کے ہاں جا رہی ہوں۔ دیر سے لوٹوں گی۔"
"آپ کو یہ خیال کیسے آ گیا مس طاہرہ؟"
"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔"
"اوہ! خوب!" — بابا نے ہنس کر کہا — "آپ نے خوب یاد دلایا۔ میں کل تفریح کے وقت آپ سے کہہ رہا تھا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ آپ اپنی بات سناتے سناتے چپ ہو گئی تھیں۔ آپ صرف اسی قدر کہہ کر چپ ہو گئی تھیں کہ میں بھی دنیا میں تنہا ہوں۔"
"آپ کو بچیوں سے بہت پیار ہے" — طاہرہ نے کہا۔
"بچیوں کو میں پیار کا صحیح حقدار سمجھتا ہوں۔ لڑکیاں، بے زبان اور صبر والی مخلوق" — جوزی بابا بولا — "والدین جہاں جی چاہے اور جس کے ساتھ چاہیں باندھ دیں۔ ساری عمر کے لیے جس کے رحم و کرم پر انہیں ساری عمر کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے وہ جیسا چاہے سلوک کرے۔ اولاد ہوئی تو بڑی ہو کر جانے وہ کیا سلوک کرے۔ عورت تو ہر حال میں مظلوم ہے۔ عورت کے بغیر ہم جی بھی نہیں سکتے۔ عورت کو ہم لونڈی بھی بنا لیتے ہیں۔ عورت کے بغیر ہمیں در و دیوار ویران بھی دکھائی دیتے ہیں اور جب گھر میں لڑکی پیدا ہو جاتی ہے تو ہم افسوس کرتے ہیں کہ خدا نے بیٹا نہ دیا۔ یکے بعد دیگرے تین چار لڑکیوں کا باپ تو گھبرا ہی جاتا ہے۔ میں نے ایسے ایسے باپ بھی دیکھے ہیں جو پہلی لڑکی کی پیدائش پر بیوی سے کھچے کھچے رہنے لگتے ہیں کہ اس نے بیٹا کیوں نہ جنا۔ مس طاہرہ! میں نے تقریباً تمام والدین کو بیٹیوں سے پیار کرتے دیکھا ہے لیکن کتنے ماں باپ، بلکہ باپ، ایسے ہیں جو بیٹی کے مرنے پر دلی رنج کا اظہار کرتے ہیں، دو چار روز آنسو بہاتے ہیں اور چوری چھپے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ایک ذمہ داری ختم ہوئی.... مس طاہرہ! خدا شاہد ہے میں ان بچیوں کو دیکھتا ہوں تو جی میں آتی ہے کہ خدا مجھے اتنی دولت اور ہمت دے کہ میں ان بے زبانوں کو اپنی پناہ میں لے لوں۔ انہیں پیار سے پالوں اور پال کر ایسی راہ پر ڈال دوں کہ وہ مرد کی محتاج نہ رہیں.... لیکن مس طاہرہ! اپنے پاس سوائے ان جذبات کے کچھ ہے ہی نہیں.... اور لیجیے۔ وہ غریب خانہ آ گیا۔" بابا نے جیب سے چابی نکالی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا طاہرہ سے آگے نکل گیا اور کوارٹر کا دروازہ کھولا۔
کوارٹر کے دو کمرے تھے۔ ایک کو بابا نے بیٹھک بنا رکھا تھا۔ فرنیچر اسی قدر تھا، ایک چارپائی، دو کرسیاں، ایک چھوٹی میز، ایک بڑی میز۔ انگیٹھی کے ایک کونے پر قائداعظم کی تصویر فریم میں لگی ہوئی رکھی تھی اور دوسرے کونے میں علامہ اقبال کی۔ درمیان میں چینی کا پھولدان رکھا تھا جس میں تازہ گلدستہ سجا ہوا تھا۔ اس گلدان کے سہارے ایک دستی تصویر رکھی تھی۔ یہ تصویر ایک بچے کی تھی جو چند ماہ کا ہو گا۔ کسی مصوّر کا تخیل تھا اور بہت ہی پیارا۔ بچے کی مسکراہٹ بھی ایسی کہ مسرت کے فلسفے کو بند کر کے رکھ دینے کو جی چاہتا تھا۔ بچے کی مسکراہٹ میں طلوعِ صبح کی پُراُمید اور دھیمی دھیمی چمک تھی۔ بچہ پیٹ کے بل لیٹا سر اوپر اٹھائے ہوئے۔

"کتنی پیاری تصویر ہے" — طاہرہ نے تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔
"یہ برلی کے ایک مصوّر کا شاہکار ہے" — جوزی بابا نے کہا — "صبح اٹھتا ہوں تو سب سے پہلے بچے کی اس مسکراہٹ [کو دیکھت]ا ہوں۔ پھر اقبال اور پھر قائداعظم کو۔ اس طرح وقت خوردہ جسم میں جان آ جاتی ہے۔ پھر دن خوب گذرتا ہے.... اچھا! تو میں [دروازے] کا بند و بست کرتا ہوں" — اور وہ کمرے سے دوڑ کر نکل گیا۔ اس کے دوڑنے کے انداز میں جوانی کی جھلک تھی۔
طاہرہ نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ سوائے اس مختصر سے فرنیچر اور ان تین تصویروں کے کمرے میں کوئی خاص [چیز ن]ہیں تھی، دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود اس کمرے میں اس نے انوکھی سی جاذبیت [دیکھ]ی کی۔ ہر ایک چیز اس طرح سلیقے اور قرینے سے رکھی تھی جیسے اسے اسی جگہ پر ہونا چاہیے تھا۔ بڑی میز پر کتابیں رکھی [تھیں] تو وہ بھی ایک ترتیب سے۔
طاہرہ نے اٹھ کر دوسرے کمرے میں جھانکا۔ وہاں ایک چارپائی بغیر بستر کے پڑی تھی۔ ایک کونے میں ایک لوٹا اور چند برتن [رکھے] تھے اور اللہ کا نام تھا۔ طاہرہ کو بابا کے قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بابا کمرے میں داخل ہوا تو پیچھے پیچھے [ہوٹل] کا ملازم ٹرے میں کھانا اٹھائے آیا۔ منہ ہاتھ دھو کر دونوں کھانے پر بیٹھ گئے۔ بابا باتیں کرتا رہا اور طاہرہ دلچسپی سے سنتی [رہی۔] کھانے سے فارغ ہو کر بابا نے ملازم کو کھانے کے برتن لے جانے کو کہا۔
جب ملازم جا چکا تو بابا نے طاہرہ سے کہا — "آپ چاہیں تو تھوڑی دیر لیٹ جائیں اور میں یہاں بیٹھا باتیں کرتا اور سنتا [رہوں] گا۔"
"نہیں! آپ لیٹ جائیے اور میں بیٹھی رہوں گی۔"
"تو کیوں نہ دونوں بیٹھے رہیں" — بابا نے اس طرح کہا جیسے کسی بچے سے ہمکلام ہو — "اچھا! تو پہلے اپنی بات سنائیے [مس] طاہرہ! آپ کی ادھوری سی بات نے مجھے رات بھر پریشان رکھا ہے۔"
"بابا جان! میری بات کوئی لمبی کہانی تو نہیں" — طاہرہ تو پہلے ہی چاہتی تھی کہ جوزی بابا کے دکھے ہوئے دل پر بوجھ [نہ ڈا]لے۔ اب پتہ چلا کہ وہ اس قدر پریشان رہا ہے تو وہ اور زیادہ محتاط ہو گئی۔ وہ بات کو گول کر کے کہنے لگی — "بات اتنی سی ہے [کہ میں] ۱۹۴۷ء کے فسادات کی کچلی ہوئی ہوں۔ گھر کے تمام افراد شہید ہو گئے تھے اور میں بچ بچا کر نکل آئی تھی۔ لاہور ریفیوجی کیمپ [میں نجمہ] آپا سے ملاقات ہو گئی تو یہ پنڈی لے آئیں۔ یہاں آ کر انہوں نے ایک چھوٹے سکول میں ملازم کروا دیا تھا۔ اب کافی تجربہ [حاص]ل کر چکی ہوں۔ کچھ اپنے طور پر پڑھتی بھی رہی ہوں۔ آخر اس سکول میں کوشش کر کے لگ گئی ہوں بس اتنی سی بات تھی۔ اگر آپ [جان]نا چاہیں کہ سکھوں نے ہمارے گھر پر کس طرح حملہ کیا۔ میں کس طرح بچ گئی، میں کس طرح نکل آئی اور لاہور کس طرح پیدل سفر [کی]ا تو سنا دیتی ہوں لیکن وقت ضائع ہو گا اور ہم دونوں کا دل دکھے گا۔ گڑے مُردے کیوں اکھاڑے جائیں۔ آپ اپنی [سنائ]یے۔ میں دراصل آپ کی روداد سننے آئی ہوں" — طاہرہ گہری سنجیدگی سے بولی — "بابا جان! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ [کسی بڑے] عظیم صدمہ یا کئی صدموں کی چوٹیں کھائے ہوئے ہیں جنہیں آپ بچوں کے پیار سے سہلاتے رہتے ہیں۔ میں بھی آپ [کے حا]لات کو آپ کی خاطر پریشان رہی ہوں۔"

"مس طاہرہ! اگر آپ بُرا نہ منائیں تو کہوں"

"دیکھئے بابا جان!" — طاہرہ نے قدرے سٹپٹا کر کہا۔ "آپ کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ دیا کریں، للٰلہ یہ نہ کہا کریں اگر آپ بُرا نہ منائیں تو کہوں، خدا کے لیے اس تکلف اور غیریت کو ختم کیجئے۔ میں جس بے تکلفی سے آپ کے پاس آئی ہوں، اُسے مجروح نہ کیجئے۔"

جوزی بابا ہنس پڑا اور کہنے لگا — "بے تکلفی کا شکریہ مس طاہرہ! یہ فقرہ میرا تکیہ کلام بن گیا ہے۔ ہاں! آپ نے پوچھا تھا کہ میں کون اور کیا ہوں.... مس طاہرہ! اگر آپ کو میرے ساتھ ذرہ بھر بھی ہمدردی ہے تو مجھے ماضی کے قصے دہرانے کے لیے نہ کہیئے۔ آپ کو تو دُکھ ہوگا ہی، میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ اب تو یہ قصے میں نے کبھی اپنے دل میں بھی نہیں دہراتے۔ میں انہیں بچوں کی ہنسی اور کھیل کود میں دفن کرتا رہتا ہوں۔ خدارا مجھ سے گزری باتیں مت پوچھیئے۔ زخم ہرا ہو جاتا ہے اور اس زخم کا کوئی علاج نہیں۔ کوئی علاج نہیں مس طاہرہ! آپ کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر صرف اس قدر بتا دیتا ہوں کہ جب گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو دُور افق تک ایک ریگزار نظر آتا ہے جس میں نخلستان تو دُور کی بات ہے سراب بھی نظر نہیں آتا جس کے دھوکے میں اپنے آپ کو تسلی دے سکوں۔ لوگوں کے ماضی کے تصورات حسین ہوتے ہیں اور وہ حقائقِ حیات سے اکتا کر ان تصورات میں پناہ لیتے ہیں اور جب میں گھبراتا ہوں تو پیچھے گھوم کر نہیں دیکھا کرتا۔ جس مکان میں جن اور چڑیلیں آ بسیں وہاں سے انسان بھاگ جاتے ہیں۔ وہاں مکڑیاں جالے بُن لیتی ہیں اور چڑیلیں اور چمگادڑ گھونسلے بنا لیتے ہیں۔ پھر وہاں کبھی بھولے سے بھی کوئی نہیں جھانکتا۔ میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسا ہی ایک مکان ہے جس میں میں نے کبھی جھانکنے کی ہمت نہیں کی...." جوزی بابا پر جذباتی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی اور طاہرہ اس کیفیت میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ بابا کہہ رہا تھا.... "اس مکان میں میں نے اپنے ہاتھوں جنوں اور چڑیلوں کو آباد کیا تھا۔"

"کیوں؟"

"اسے اجاڑنے کے لیے۔"

"کیوں؟"

"اس کے مکینوں کو بھگانے کے لیے۔"

"کیوں؟"

"خود بھی بھاگ جانے کے لیے۔"

"پھر؟"

"پھر یہ گھر اُجڑ گیا۔ سب بھاگ گئے۔ میں بھی بھاگ گیا۔ میں بھاگتا ہی گیا حتیٰ کہ میں پاگل ہو گیا۔ جب ہوش ٹھکانے آئے تو سینے میں آگ لگی ہوئی تھی جسے کوئی بجھا نہ سکا۔ اور میں نے ایک دن گلی میں کھیلتی ایک بچی کو اٹھا لیا۔ میں نے اسے چُوما تو وہ مسکرا دی۔ میرے آنسو بہہ نکلے اور آگ بجھنے لگی۔ کچھ بچی کی مسکراہٹ سے، کچھ آنسوؤں سے۔"

"پھر"

"اور پھر مس طاہرہ! مجھے ایک لمبی چھلانگ لگانے دیجئے۔ میں گزرے ہوئے بے شمار برسوں سے ان پر نگاہ ڈالے بغیر آتا ہوں.... پھر میں یہاں آ گیا اور یہاں آ کر پھر بچے مل گئے اور...." بابا نے دکھی ہوئی مسکراہٹ سے کہا — "مس طاہرہ مل گئی ہے۔"

"بابا جان" — طاہرہ نے کہا — "بات بنی نہیں۔"

"بگڑی ہوئی بات بنا نہیں کرتی، مس طاہرہ!.... کون بناتے.... کون سنوارے" — جوزی بابا کی آواز کو رقت نے دبا لیا۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں اور اس نے سر پیچھے کر کے کرسی کی پیٹھ پر رکھتے ہوئے زیرِ لب کہا۔

میلے فیر ملدا قِسمتاں دے کِتھے شمع تے کِتھے پتنگ ہوسی

"بابا!" — طاہرہ جیسے کرسی سے اُچھل پڑی ہو۔ اس نے ذرا حیرت سے پوچھا — "آپ بریلی کے رہنے والے ہیں اور پنجابی تو آپ اچھی خاصی جانتے ہیں۔"

"بہت کچھ جانتا تھا مس طاہرہ!" — بابا نے غم ناک اور خوابناک آواز میں کہا — "بہت کچھ جانتا تھا، بہت کچھ بھولا ہوں، بہت کچھ پاتا تھا، سب کچھ کھو دیا۔"

جوزی بابا کی آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں اور آنکھوں کے کونوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ طاہرہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اسے سنبھالا دینے آئی تھی، لیکن باتوں باتوں میں اسے رلا دیا۔

وہ بلا تکلف اور بلا جھجک اٹھ کر بابا کی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس پر جھک گئی اور کہا — "میرا مطلب یہ تو نہ تھا، بابا جان!" — طاہرہ فرطِ محبت سے اُس پر اس قدر جھک گئی تھی کہ بابا اپنی پیشانی پر طاہرہ کی سانسوں کا لمس محسوس کرنے لگا۔

"میں نے کہا تھا نا مس طاہرہ! ان تاروں کو نہ چھیڑو" — بابا نے سر گود میں رکھے ہوئے طاہرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "اس ساز میں درد کے نغموں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں نے کسی کو کبھی اپنی زندگی کے ان تاروں کو چھونے نہیں دیا۔"

بابا نے جذبات سے مغلوب ہو کر دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے اور اپنے گالوں پر رکھے ہوئے طاہرہ کے دونوں ہاتھ چوم لیے۔ بولا — "جانے آپ میں کیا سحر تھا کہ میں اپنے آپ سے باہر ہو گیا ورنہ میں نے تو کسی سے کبھی اس قسم کی بات نہ کی تھی۔"

"اُٹھیئے لیٹ جائیے" — طاہرہ نے اسے کندھوں سے تھام کر کہا۔

وہ اُٹھ بیٹھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ طاہرہ بھی اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

بابا نے چت لیٹے ہوئے گہری آہ لی اور بولا — "مس طاہرہ! میں نے اُس روز پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا کہ ہم دونوں میں کوئی نہ کوئی روحانی لگاؤ ضرور ہے۔ قدرت کا نظام کس قدر پُر رحم ہے کہ وہ دکھ دے کر دکھ کا مداوا بھی پیدا کر دیتا ہے۔ میں نہ جان سکا تھا کہ ہم دونوں میں کون سا روحانی رشتہ ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ آپ بھی تنہا اور دکھی ہوں۔ آپ کی بھی تنہائی بچوں کے پیار میں سکون پاتی ہیں اور میری بھی۔ فرق صرف عمر کا ہے۔ کہانی ایک ہے، دل دو ہیں۔"

"باباجان!— طاہرہ نے کہا۔ "ایک بات مانیئے! ہمارے گھر چلیئے اور وہاں رہیئے.... دیکھئے انکار نہ کیجئے آپ ایک بار نجمہ آپا کی خواہش ٹھکرا چکے ہیں۔ وہاں کا ماحول اور فضا آپ کو روحانی سکون دے گی۔ میرے علاوہ وہاں نجمہ آ ہے، اطہر بھائی جان ہیں، بڑے شگفتہ مزاج اور ملنسار آدمی ہیں۔ ان کے دو ننھے ننھے بچے ہیں۔ سنجدا اس قدر پیارے بچے ہیں کہ آپ دن رات انہی کے ساتھ کھیلتے رہیں گے۔ چلیئے! میری درخواست منظور کر لیجیئے۔"

"نہیں مس طاہرہ!— بابا نے کہا۔ "مجھے اس تنہائی میں پڑا رہنے دیجئے۔ یہی تنہائی مجھے کھانے کو دوڑتی ہے او اور یہی تنہائی میرے کھچے تنے اعصاب کو سہلا بھی لیتی ہے۔ اب میری عادتیں نہ بگاڑو۔ میں نجمہ صاحبہ کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ بڑی اچھی ہیں۔ میں ان کا گھر دیکھ آیا ہوں۔ بچے بھی دیکھ آیا ہوں۔ مجھے وہاں کا ماحول بہت ہی پسند آیا ہے لیکن میں کسی بستے ر گھر میں داخل ہونا نہیں چاہتا۔ وہ تو نجمہ صاحبہ کی ضد تھی کہ میں وہاں چلا گیا تھا، ورنہ کسی آباد گھر میں جا کر مجھ پر ہول طاری ہو جاتا۔ اور جانے کون میرے ضمیر کو لعنت ملامت کرنے لگتا ہے۔ میں خود ہی اپنے آپ کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دیتا ہوں اور آپ سے کہتا ہوں کہ کسی آباد گھر میں داخل ہونے کا حق تم سے چھین لیا گیا ہے۔ تم بھوت ہو۔ تم آسیبی سایہ ہو۔ نکل جاؤ ورنہ یہ گھر اجڑ جائے گا.... مس طاہرہ! اسے مجرم ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔"

"باباجان! یا تو مجھے ساری بات سنا دیجیئے یا ایسی پہیلیاں نہ بجھایئے"— طاہرہ نے بچوں کی سی شوخی سے کہا اور ہاتھ بابا سینے پر رکھ دیا۔ بابا نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ طاہرہ کے ہاتھ پر لے آیا۔ ہاتھوں کے لمس نے بابا کو جذبات گہرائیوں میں پھینک دیا۔

"مس طاہرہ!— بابا نے گہرائیوں میں سے کہا۔ "میں اس قدر جذباتی کبھی نہیں ہوا تھا۔ اپنے آپ کو اس طرح بے قا کبھی نہ ہونے دیا تھا لیکن آج آپ کے سامنے جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہوں اور روتا ہی رہوں۔ یہ آپ کا جادو ہے مس طاہرہ!"

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا اور آنکھیں نیم وا، منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ دو چار لمحوں بعد اس نے طاہرہ کے ہاتھ کو ذرا دبایا اور بے خودی کی کیفیت میں طاہرہ کی طرف دیکھ کر ملتجی لہجے میں کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو...." اس نے طاہرہ کا ہاتھ ذرا سا اٹھایا اور اپنے ہونٹوں کی طرف لے چلا۔

طاہرہ نے اپنا ہاتھ اس کے حوالے کر دیا تھا بلکہ وہ بھی ہی خود سپردگی کے عالم میں۔ بابا کے احساسات اور اس کی کیفیت نے اسے بابا کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ دوسرے لمحے طاہرہ کا ہاتھ بابا کے ہونٹوں پر تھا۔ طاہرہ نے دوسرے ہاتھ سے اس کے سفید بالوں کو سہلانا شروع کر دیا اور بابا کے آنسو جاری ہو گئے۔ طاہرہ جانتی تھی کہ یہ آنسو سکون اور اطمینان کے ہیں۔ بابا کا غم آنکھوں کی را بہہ رہا تھا۔ طاہرہ دکھے دلوں کو سہلانا خوب جانتی تھی۔ اس نے بابا کو رونے ہی دیا۔ اس کا ایک ہاتھ بابا کے ہونٹوں پر تھا جسے بابا نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا بالکل ایسے جیسے بچہ بوتل سے دودھ پی رہا ہو۔ دوسرا ہاتھ اس کے بالوں میں رینگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بابا نے طاہرہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"معاف رکھنا مس طاہرہ! جوزی بابا کبھی کبھی پاگل ہو جاتا ہے"— بابا نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "معاف کر

نے بابا کو...." اس نے سکون کی آہ لی اور کہا۔ "ایک عمر کے بعد ایک عورت نے میرے جسم کو چھوا ہے"— بابا نے طرف دیکھتے ہوئے التجا کی۔ "کیا آپ اسی طرح کبھی کبھار آیا کریں گی؟"

"کیوں نہ آیا کروں گی باباجان!"— طاہرہ نے بیٹیوں کے پیار سے کہا۔

گھر آ کر طاہرہ نے نجمہ کو بابا سے ملاقات کی تفصیلات سنائیں۔ نجمہ کو بابا کی اس جذباتی حالت کا پہلے علم نہیں تھا۔ وہ اور متاثر ہوئی۔ نجمہ کا تو خاوند بھی تھا، بچے بھی تھے، اسے دل اتنی فرصت ہی کہاں دیتا تھا کہ وہ اظہارِ ہمدردی سے بڑھ کر کسی عملاً کچھ کر سکے لیکن طاہرہ نے تو جیسے بابا کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ اس نے نجمہ کو بتایا کہ بابا یہاں نہیں آئے کا آنے کا؟— جب طاہرہ نے اس سوال کا جواب بابا کے الفاظ میں دیا تو نجمہ سن ہو گئی۔

تھوڑی دیر نجمہ اور طاہرہ بابا کی گزری ہوئی زندگی کے متعلق قیاس آرائیاں کرتی رہیں۔ انہوں نے بہت کچھ سوچ ڈالا لیکن کسی ایک پر نہ پہنچ سکیں۔ انہوں نے سوچا کہ کسی لڑکی سے محبت میں ناکامی ہوئی ہو گی اور بابا نے تمام عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ یا یتیم ہو گیا ہو گا اور کسی ایسے ویسے یتیم خانے میں پرورش پائی ہو گی۔ اگر فسادات میں اس کے گھر کے افراد شہید ہوئے تو وہ چھپاتا کیوں؟ ہو سکتا ہے وہ اس عظیم حادثے کو یاد کرنے سے گھبراتا ہو۔

دونوں سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگیں اور جوزی بابا ایک معمہ بن گیا۔

رات کو بابا ڈیڑھ دو گھنٹوں کے لیے پانچویں جماعت کی دو لڑکیوں اور ساتویں جماعت کے تین لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ یہ پڑھاتی کمزور تھے اور بابا انہیں بغیر فیس کے پڑھایا کرتا تھا جس میں احسان اور نیکی کا عنصر نہیں تھا بلکہ وہ اسی بہانے گھر میں تھوڑی دیر کے لیے رونق پیدا کر لیا کرتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے پڑھاتا اور گھنٹہ پون گھنٹہ ان کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کود کرتا تھا۔ اگر ہوسٹل کی چھٹی ہوتی تو یہ بچے بابا کے گھر سے کبھی بھی نہ نکلتے۔ بچوں کی موجودگی میں بابا کبھی ناخوش نہیں ہوا تھا۔ بچوں نے اسے جب بھی مسکراتے ہوئے دیکھا۔ لیکن آج رات جب بچے اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو بابا غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ بچوں کے فوراً ہی سمجھ گئے کہ بابا آج بہت خوش ہے۔ اس کی خوشی کا اندازہ تو انہوں نے اس سے کیا کہ بابا نے انہیں کہا۔ "بچو! آج پڑھائی نہیں ہو گی۔"

"آج بابا بہت خوش ہے"— ایک بچی نے شوخی سے کہا۔

بابا کھل کر ہنسا۔

"بابا آج اس قدر خوش کیوں ہیں؟"— ایک لڑکے نے پوچھا۔

"ارے بدھو میاں!"— بابا نے اس کے گال تھپکا کر کہا۔ "بڈھے شہزادے کو اس کے دل کی رانی مل گئی ہے۔ نے اسے بیٹی بنا لیا ہے۔"

جب بچوں کے سلاموں اور شب بخیر کا شور و شرابا کمرے سے نکل گیا تو بابا کے کمرے میں خوشگوار سکوت طاری ہو گیا۔ یہ کمرہ بچوں کے چلے جانے کے بعد ہر رات یوں ہی خاموش ہو جایا کرتا تھا لیکن اس میں نہ غم ہوتا تھا نہ مسرت۔ آج رات کمرے کی ساکن رات کے لمحات ستاروں کی طرح جھلمل جھلمل کرتے بجھتے جا رہے تھے۔ بابا نے چارپائی پر لیٹے لیٹے پرسکون سی

انگڑائی لی اور اُٹھ کے کمرے میں ٹہلنے لگ گیا۔ انگیٹھی پر آئینہ رکھا تھا۔ اس کی نگاہ پڑی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوگیا سی دیر اپنے چہرے کو دیکھتا رہا اور مُسکرا دیا۔ اس مُسکراہٹ میں ایک گونہ طنز بھی تھی۔

"تیس برس!" — اُس نے زیرلب سرگوشی کی — "تیس برس کی صحرانوردی! اور کیا ملا تجھے کہ تُو اس قدر خوش ہے؟ سراب.... اب بھاگتا رہ اس کے پیچھے.... بوڑھا شہزادہ۔ شہزادی ملی تو پچاس برس کی عمر میں جب دل بھی مرجاتا ہے روح بھی جاتی ہے.... لیکن...." اس نے عکس کو قریب ہو کر دیکھا۔ "تیری روح تو جوان ہے۔ انسان پہلے جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہے اور رُوح پہلے بوڑھی ہوتی ہے پھر جوان ہوتی ہے۔ تیرا دل بوڑھا نہیں ہُوا.... یا ہو گیا ہے؟ تُو اس قدر خوش کیوں ہے پیاسے کو شبنم مِل گئی ہے؟ پاگل! وہ تو جوان لڑکی ہے۔ آج نہیں تو کل اپنے گھر چلی جائے گی۔ اپنا گھر بسالے گی اور تُو شہزادی کی تلاش میں ندی ندی کے پانی میں جھانکتا پھرے گا!"

وہ پھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی رگ رگ میں طاہرہ سمائی ہُوئی تھی۔ اس نے خیالوں میں طاہرہ کے چاروں رُوپ د — ماں، بیٹی، بیوی، بہن — طاہرہ میں اسے سارے رُوپ نظر آتے۔

"جانے اس لڑکی میں کیا بات ہے کہ وہ چلی گئی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے قدرت کا نظام ہی درہم برہم ہو گیا ہے۔ طاہرہ!.... مِس طاہرہ!.... طاہرہ!.... کِس قدر خوبصورت نام ہے!"

وہ کمرے کے وسط میں رُک گیا اور چھت کو دیکھنے لگ گیا۔ اس کے دل و دماغ پر دو متضاد خیال بیک وقت چھ ہُوئے تھے۔ وہ خوش بھی تھا، ناخوش بھی۔ اس نے طاہرہ میں ایسی جھلک دیکھی تھی جیسے طاہرہ اس کے لیے پیدا کی گئی ہو اور یہی یہ خیال کہ وہ پچاس سالہ بڈھا ہے اور طاہرہ جوان لڑکی۔

"اس کی عمر تیس سے ذرا ہی کم ہوگی۔ اٹھائیس نہ ہُوئی تو انتیس برس ہوگی.... بابا کے ذہن میں جھجکا ہُوا ایک خیال آیا۔ میں؟ اُف!.... بیس برس کا فرق.... لیکن دل کو کون دیکھتا ہے.... خیر.... گزار دے۔ زندگی کے باقی برس بھی یوں ہی گزار د عورت کے لمس کی محرومی میں ہی گزار دے.... طاہرہ کو بیٹی بنالے مگر کب تک؟ وہ اپنے گھر چلی جائے گی!"

جوزی بابا کے دل و دماغ میں افراتفری سی بپا ہوگئی اور وہ غصے میں آگیا۔ غصہ کس پر تھا؟ شاید اپنے آپ پر۔ وہ آئینے کے سامنے جا رُکا اور عکس سے .... "یہ تیری سزا ہے کمبخت! تُو اپنے کیئے کی سزا بھگت رہا ہے۔ آدم کا بیٹا ہے نا تُو؟ اسے جنت راس نہیں آئی تھی۔ تُو نے بھی جنت کو ٹھکرا کر صحراؤں کی ریت پھانکنا قبول کیا تُو اُس وقت بھی پاگل تھا۔ اب بھی پاگل تُو بھوت ہے۔ تُو نے جنت کو اجاڑا تھا۔ اپنی جنت کو۔ اس ویران جنت کی اجڑی ہوئی آہوں نے تیری تمام زندگی کو جلا ڈ دیکھ لیا اپنا نصیب؟ اپنی تقدیر؟ بنے ہُوئے نصیب کو تُو نے خود بگاڑا تھا۔ مرمر کو ٹھکرا کر تُو نے پتھر پتھر کی ٹھوکریں کھائیں اور پتھر بن گیا.... عمر کے اس فرق کو کیوں سوچا تھا تُو نے؟ شادی کا ارادہ تھا؟"

بابا نے عکس کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور زیرلب کہا — "تجھ سے تو یہ حق تیس برس گزرے چھین لیا گیا یاد کر اُس وقت کو.... پچھتاتا رہ تمام عمر.... خُدا کرے تیری عمر طویل ہو!"

عکس کے چہرے پر غم و غصّہ کی گہری پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ ہونٹ لرز رہے تھے — "کیا کہتا پھرتا ہے لوگوں کو داستان زبان سے دہرانا نہیں چاہتا؟ ہر مجرم اقبالِ جُرم سے گھبراتا ہے۔ تُو اب محبّت کو ڈھونڈتا ہے۔ محبت سمجھے ملی د چھین لی گئی تھی۔ وہ بجلی کی ایک چمک تھی۔ چمکی اور گئی۔ اور تُو؟ تُو وہ سیاہ گھٹا ہے جس کے دامن میں بجلیاں پرورش پاتی ہیں اور دل کو جلاتی ہیں لیکن تیرے سینے کی پُردرد بجلی نے تیرا اپنا نشیمن جلا ڈالا۔ یہ تو ایک فریب ہے.... ایک سراب.... طاہرہ!"

عکس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ تاثرات پرغم کے گہرے سائے چھا گئے اور عکس کے ہونٹوں نے لرز کر کہا — "طاہرہ! ل طاہرہ!.... بجلی کی ایک اور چمک، یا چمک کا دھوکہ.... طاہرہ!.... مِس طاہرہ! کیا تم ہر روز اس کٹیا میں آسکتی ہو؟"

بابا نے سر کو جھنجھوڑا۔ آنکھیں کھولیں تو وہ کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ ہاتھ کمر کے پیچھے رکھے ہُوئے تھے۔ اس نے گہری ل میں درد بھی تھا، سکون بھی تھا۔ اسے طاہرہ کا وعدہ کہ میں آیا کروں گی، یاد آرہا تھا — "کیا کرو گی آکے یہاں؟" — اُس نے با.... تیز خیالوں کے جالے میں اُلجھ گیا۔ ایک تار ہٹاتا تو دوسرے میں اُلجھ جاتا۔

"تُو کون ہے؟" — بابا نے دل ہی دل میں پُوچھا — "تُو کیا ہے؟.... کہاں سے آئی ہے؟.... کہاں کا ارادہ ہے؟.... جس دل کو میں نے کچل دیا تھا وہ پھر مچل اٹھا ہے۔ طاہرہ! مِس طاہرہ!.... وہ بھی تیری ہی طرح حسین تھی، تیری ہی طرح جوان .... میں نے اُسے پاکر کھو دیا اور کھو کر کچھ نہ پایا۔ آج تُو میری راہ میں آئی ہے۔ طاہرہ! وہی جوانی لے کر! تیرے ہاتھوں کے لمس ہی وہی کیف ہے جو اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ تیری سانسوں میں بھی وہی عطربیز بُو ہے جو اُس میں تھی — یعقوبؑ کو ہوا کے جھونکے میں یوسفؑ کی بُو آتی تھی — آج تیری آنکھوں کی چمک میں مَیں نے اُس کا جلوہ دیکھا ہے۔ تیری گردن کے خم میں مَیں نے ل جھلک دیکھی ہے جب تُو بات کرتی ہے تو تیرے ہونٹوں کے کونے اسی طرح مسکراتے ہیں جس طرح اُس کے مُسکرایا ، تھے۔ وہ محبّت کا پیغام بن کے آئی تھی اور دکھ درد دے کے چلی گئی — ایک دھوکا — آج تُو آئی ہے — ایک اور دھوکا در فریب.... قدرت انسان کا تماشہ کرتی ہے!"

چند لمحوں بعد بابا پھر آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عکس کی آنکھوں میں آنسُو تیر رہے تھے۔ بابا نے ... کو ذرا سا دائیں طرف کیا تو اسے بچّے کی تصویر نظر آئی۔ تصویر کی روح افزا مسکراہٹ دیکھ کر بابا کے آنسُو مُسکرا اُٹھے۔ اس نے آئینے میں دیکھا۔ اب عکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا دھوکا ہُوا — صبح کاذب کی طرح — اس نے پھر بچّے کی تصویر کو دیکھا اور ... ہٹ کا دھوکا بیساختہ مسکراہٹ بن گیا۔ بابا کی روح بھی مُسکرا اٹھی اور اس کا رُواں رُواں بیدار ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے ... پہلے کی کیفیت ایک خواب تھا۔

اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ ذرا آگے جُھکا اور تصویر کے ہونٹوں پر بوسہ دے کر ذرا بلند آواز سے کہا — "تیرا بابا ابھی ہے!" — اُس نے آئینے میں دیکھا۔ عکس کے چہرے پر مُسکراہٹ کا تاثر بکھرا ہُوا تھا — "یہ ہے تیری جزا۔ سزا بھی۔ جزا بھی رکھے فلسفے کو اب نہ بھولنا ورنہ جل جائے گا تُو!"

بابا نے سکون آمیز آہ لی اور دل ہی دل میں کہا — "طاہرہ بچی ہے۔ کاش! وہ میری بچی ہوتی۔ نہ میں تنہا ہوتا نہ اسے تنہائی ہوتا۔ اے خُدا!" — اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر دل میں دعا کی — "ایک بچی دے دے جسے میں اپنی بچی کہہ سکوں۔ یوں بچہ میرا اپنا لختِ جگر ہے لیکن ان کے ماں باپ انہیں مجھ سے چھین کر لے جاتے ہیں۔ بہت سزا بھگت لی ہے مجھ میرے

خدا اب میں اپنے گناہ کی تلافی چاہتا ہوں۔ دے دے میرے اللہ! کوئی تیمم بچی دے دے!.... طاہرہ ہی دے دے"

طاہرہ کے نام پر وہ اپنے آپ میں سکڑ گیا۔ وہ دو چار ثانیے چھت کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا — "طاہرہ.... مس طاہرہ.... طاہرہ جوزی!" — اور وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

طاہرہ نے جوزی بابا کی ساری باتیں نجمہ کو سنا ڈالی تھیں پھر بھی وہ بابا کی ہی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ نجمہ اور اطہر اپنے کمرے میں سو چکے تھے اور طاہرہ جب دوسرے دن کے سبق کی تیاری کر کے بستر میں لیٹی تو بابا کا خیال پھر اس کے ذہن میں آ گیا۔ طاہرہ جو شاید دوسروں کے لیے ہی جینے کے لیے پیدا کی گئی تھی، جوزی بابا کے آنسو ہمیشہ کے لیے خشک کر دینا چاہتی تھی۔ یہ پہلی رات تھی کہ اسے نعیم یاد نہ آیا۔ اس کمرے کو دیکھ کر جس میں اس نے زندگی کی ایک اور صرف ایک حسین رات گزاری تھی، اب بھی ہول طاری ہو جاتا تھا۔ پنڈی میں آئے اسے دوسرا مہینہ ہو چلا تھا لیکن وہ بھول کر بھی اس کمرے میں نہیں گئی تھی۔ دو تین بار کسی نے اس کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا تو اس نے نوکرانی سے کہا تھا — "مائی اس کمرے کا دروازہ کھلا نہ رہنے دیا کرو" — نجمہ کے ساتھ اس نے کئی بار جلال آباد کی باتیں، امی خاتون اور ماسی ساجدہ کی باتیں کی تھیں۔ اس کے آنسو بھی نکلے تھے لیکن یہ کیفیت محض ہنگامی ہوتی تھی، اسے دوام حاصل نہ تھا۔ طاہرہ ان یادوں کو جلدی ہی اگل دیا کرتی تھی۔

اب اس نے جوزی بابا کو قریب سے جو دیکھا تو اسے اس بوڑھے کے روپ میں چھوڑی ہوئی ساری منزلیں نظر آنے لگیں۔ بابا کے پیکر میں اسے امی خاتون سے لے کر نعیم تک ایک انسان جس کے دم سے طاہرہ کے چہرے پر رونق رہتی تھی، دکھائی دیا۔ بابا کے کردار اور طبعی رجحان میں اسے اپنی شخصیت کا پرتو بھی نظر آ رہا تھا اور اس کی سرگرم عمل طبیعت ایک بار پھر کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

اس نے اپنی گزری ہوئی زندگی پر نگاہ ڈالی تو اسے اجڑی ہوئی محفلوں کے نشان نظر آتے۔ لٹے ہوئے قافلوں کے نقوش یاد دکھائی دیتے۔ اسے اپنے دل کے ٹکڑے جگہ جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے۔ اس نے لپک کر خیالوں میں ایک ایک ٹکڑا چننے کی کوشش کی اور ان کو جوزی بابا کے قدموں میں نچھاور کرنے کو یک جا کر لیا۔

وہ جوان تھی اور جوانی کی امنگیں دیکھی تھیں، محسوس کی تھیں۔ ہر جوان لڑکی کی طرح اس نے بھی تصوروں کے لرزتے ہوئے تار دل پر جھولے جھولے تھے۔ ان تصوروں کو حقیقت کا روپ بھی دے لیا تھا۔ اس نے محبت بھی کی تھی، راتوں کو چھپ چھپ کر، رات کے سکوت میں، ارمانوں کے ہنگاموں میں — اس نے شادی بھی کی تھی۔ جوانی کی یہی تو دو تمنائیں ہوتی ہیں۔ اس نے دونوں کو پا کر کے دیکھ لیا تھا۔ کہاں گئی وہ محبت؟ کیا حشر ہوا اس شادی کا؟ اس نے زخمی دلوں پر مرہم رکھا اور لوگوں نے اس کا دل زخمی کر ڈالا۔ لیکن طاہرہ کو ان ناکامیوں اور نامرادیوں کا افسوس نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا اسے یقین تھا، کہ اسے یہی کچھ کرنا چاہیئے

تھا اور اب وُہ تارک الدنیا ہونا چاہتی تھی۔

یوں تو اس نے نجمہ سے کہا تھا کہ وہ ارشد کے ساتھ اس لیے شادی نہیں کرے گی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا انجام بھی نعیم والا ہی ہو لیکن درپردہ خیال یہ تھا کہ اب اس کی جسمانی اُمنگیں مر چکی ہیں اور اب وہ ان لذتوں میں ازسرِنو پڑنا نہیں چاہتی۔ اس نے آج بابا کو تفصیلاً دیکھا اور اس کی باتیں سنیں تو اسے ایک گونہ اطمینان ہُوا کہ وہ سینے کی تپش کو بابا کی خدمت میں بجھاتے گی۔ یہی اس کی عبادت تھی، یہی رکوع، یہی سجود ـــــ بابا اور بچے۔

"بیٹا! سات برس گزر گئے ہیں۔ کیا اب بھی طاہرہ کا انتظار کرو گے؟" ـــــ امّی نے ارشد سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ـــ "میرے بڑھاپے کو دیکھو۔ جانے کس وقت دم نِکل جائے۔ اپنی آنکھوں تجھے بستا رستا تو دیکھ لوں۔"

ارشد خاموش اور گُم سُم بیٹھا سن رہا تھا۔ امّی نے کوئی نئی بات نہیں کی تھی۔ آج امّی پھر کہہ رہی تھی ـــ "طاہر پرویز کو دیکھتی ہُوں تو دل ڈُوب جاتا ہے بیٹا! تُو نے اس کے دل میں بھی طاہرہ کو بٹھا دیا ہے۔ وہ بھی طاہرہ امّی، طاہرہ امّی کرتا رہتا ہے۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس کی امّی کہیں گئی ہُوئی ہے اور آجائے گی۔ جانتے ہو آج کیا کہہ رہا تھا؟" ارشد نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے کہا ـــــ "کہہ رہا تھا میری طاہرہ امّی میرے لیے نیا سوٹ لائے گی۔ رات ابّا جان کہہ رہے تھے بس تمہاری امّی آنے ہی والی ہے۔ ارشد بیٹا اپنے حال پر اور اپنے بیٹے کے حال پر رحم کرو۔ کل بھی ان کا پیغام آیا تھا۔ شادی کر لو اور طاہر کو بتا دیں گے کہ یہی تمہاری طاہرہ امّی ہے۔"

ارشد کے لیے یہ باتیں نئی نہیں تھیں۔ وہ سات سال سے یہ سُن رہا تھا اور یہ باتیں اسے زبانی یاد ہو گئی تھیں اور اسے سب کو ٹالنے کی عادت ہو گئی تھی۔ یہ فقرہ اس کے مُنہ سے لاشعُوری طور پر نکل جاتا تھا ـــ "طاہرہ واپس آجائے گی۔" ـــ اس کے ابّا جان نے اب اسے شادی کے متعلق کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بھائی یُوسف کا رویّہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ صرف بھابی اور امّی اس کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔

آج طاہر پرویز کی ساتویں سالگرہ اور عفت کی ساتویں برسی منائی جا رہی تھی۔ یہ ایک خاموش سی تقریب تھی۔ خوشی کے ساتھ غم بھی شریکِ محفل تھا۔ ارشد نے یہ تقریب ہر سال کی طرح منائی۔ طاہر پرویز کو نئے کپڑے پہنا کر عفت کی قبر پر لے گیا۔

"ابّا جان! یہ میری امّی کی قبر ہے اور آپ کہتے ہیں کہ میری امّی طاہرہ ہے جو واپس آجائے گی۔ یہ تو سمجھائیے نا کہ بات کیا ہے؟" ـــ بچے نے پوچھا۔

"یہ تمہاری خالہ کی قبر ہے" ـــــ ارشد نے کہا ـــ "تمہاری امّی، طاہرہ ہی ہے اور یہ اس کی سگی بہن کی قبر ہے۔ بڑی امّی جان تمہاری دادی ہیں۔ تمہاری صرف ایک امّی ہے۔ طاہرہ، وہ آجائے گی۔" ـــــ اس طرح طاہر پرویز کے دماغ سے ایک ٹیڑھا سوال نکل گیا۔

ارشد یوں تو طاہرہ کے خیال میں اُلجھا رہتا تھا۔ تنہائی میں طاہرہ کے تصور کے ساتھ باتیں بھی کیا کرتا تھا۔ جب طاہر پرویز ذرا چھوٹا تھا تو اس کے ساتھ بھی طاہرہ کی باتیں کیا کرتا تھا لیکن طاہر کا شعور بیدار ہوتے ہی وہ محتاط ہو گیا تھا۔ وہ اب اکیلے میں طاہرہ سے ہمکلام ہوتا تھا۔ اسے طاہر پرویز کی تربیت اور شخصیت کی تشکیل کا پورا پورا خیال تھا۔ وہ بچے کے ساتھ اب بھی اسی طرح کھیلتا تھا مگر

ں، لان میں، برآمدے میں اور اتوار کو اسے راوی میں کشتی رانی کے لیے لے جاتا تھا لیکن اب اسے اپنے ساتھ سلاتا نہیں تھا۔
ہوتا وہ اسی کے کمرے میں تھا۔ اس عمر میں وہ کشتی کھیہ تو نہ سکتا تھا لیکن کشتی کا رُخ اچھی طرح موڑ سکتا تھا۔ ارشد چپّو مارتا اور طاہر کشتی
کے سرے پر بیٹھا کشتی کا رخ موڑنے والا چپو سنبھال لیتا تھا۔ ارشد پسینے میں شرابُور ہانپتی کانپتی آواز میں بچے کے ساتھ بے تکلف
ستوں کی طرح باتیں کرتا رہتا تھا۔

اس نے طاہر پرویز کو اسی عمر میں فٹ بال کا کھلاڑی بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر اقبال کی کئی نظمیں اسے زبانی یاد کرا دی تھیں جو وہ ترنّم سے
نایا کرتا تھا۔ اس یومِ آزادی پر ارشد نے اسے چند فقروں کی تقریر لکھ دی تھی جو اس نے سکول کے یومِ آزادی کے جلسے میں سُنائی
ائی تھی۔ پچھلے مہینے اسے ارشد نے سکاؤٹ بنوا دیا تھا۔ جب پہلے دن طاہر پرویز سکاؤٹوں کی وردی پہن کر گھر سے نکلا تھا

نو ارشد پر رقّت طاری ہو گئی تھی۔ ارشد نے اسے اپنے ہاتھوں وردی پہنائی تھی اور کہا تھا ـــــ "اب تیری طاہرہ امّی کی روح بھی خوش
ہو گئی ہو گی۔ اُسے تو قُدرت نے سکاؤٹ کے رُوپ میں ہی پیدا کیا تھا۔ وہ کہہ گئی تھی، میرے بیٹے کو سکاؤٹ بنانا۔"

"ابّا جان!" ـــ طاہر پرویز نے جوشِ مسرّت سے کہا تھا ـــ "جس دن امّی کو آنا ہو گا مُجھے پہلے بتا دینا۔ مَیں یہی وردی پہن لوں گا
ور امّی کو خودی کا سترِ نہاں والی نظم سناؤں گا۔"

"بہت اچھا، بیٹے!" ـــــ ارشد نے لپک کر اسے اٹھا لیا تھا اور بیساختہ اُس کا مُنہ چُوما تھا۔ اس کے آنسو پھُوٹ آئے
تھے اور جب طاہر پرویز تانگے میں بیٹھ کر سکول چلا گیا تھا تو وہ کتنی ہی دیر طاہر پرویز اور طاہرہ کے تصور میں گُم رہا تھا۔

لمبے لمبے سات سال گزر گئے تھے۔ "آشا بھون" میں کئی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ ارشد کے ابّا جان پنشن پر آگئے تھے اور دن
زیادہ تر وقت برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے طاہر پرویز اور یوسف کے بچوں کے ساتھ باتوں ہنسی کھیل اور مُطالعے میں گزارتے
تھے۔ ارشد کی امّی کے بال سفید ہو گئے تھے اور کمر جھک آئی تھی۔ بھابی کے ہاں ایک اور بچہ پیدا ہُوا۔ نُوردین کی شادی ایک مہاجر لڑکی
ے ساتھ کر دی گئی اور اس نے اپنی دُنیا بسا لی تھی۔ عشق پیچاں کی بیل "آشا بھون" کی ساری پیشانی کو ڈھانپ چکی تھی۔ کئی پودے کھِل
ل کر جھڑ چکے تھے اور ان کی جگہ نئے پودے کھِل رہے تھے۔ اس کوٹھی کی رونق اب بچوں کے دم سے تھی۔ بھابی کے
ل اور طاہرہ پرویز نے سرسبز لان کو فٹ بال کا میدان بنا لیا تھا۔ پرانے درخت جھڑتے جا رہے تھے اور نئی پود اُبھرتی
ہی تھی۔

یہاں کی دنیا ہی بدل گئی تھی لیکن ارشد کی داخلی دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے جذبات اور احساسات وہی تھے جو
ت برس پہلے تھے۔ طاہرہ کا انتظار وہی تھا۔ طاہرہ کی یاد اسی طرح جوان تھی۔ جُوں جُوں طاہر پرویز بڑا ہوتا جا رہا تھا ارشد کے دل میں
ہرہ کی یاد اور انتظار جواں ہوتا جا رہا تھا۔ ارشد کی سرگرمیاں تین نقطوں پر مرکوز ہو گئی تھیں ـــــ عفّت کی قبر، طاہرہ کا انتظار اور طاہر
ز۔ اس کی زندگی اسی مثلث میں گزر رہی تھی۔

"طاہرہ لوٹ آئے گی..... عفّت نے کہا تھا کہ میرا بچہ طاہرہ کے سوا کسی کو نہ دینا..... یہ بچہ طاہرہ کا ہے..... میں طاہرہ کا
ر کر رہا ہوں" ـــــ اور ایسے ہی خیال اب اس کے لاشعُور میں داخل ہو چکے تھے اور اس کی ہر حرکت اور ہر بات میں اس کی
ی کرتے تھے۔

تین مہینے اور گزر گئے۔

وقت اور زمانہ تین ماہ اور آگے نکل گئے لیکن ارشد اسی مثلث میں قید رہا۔ اس کے دل و دماغ نے جیسے زمانے کو روک رکھا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی اس کے غم میں تیزی سے بوڑھے ہوتے جا رہے تھے لیکن ارشد اس غم میں جوان تھا اور یہی غم اس کی جوانی کی امنگوں کو زندگی دے رہا تھا۔ "طاہرہ واپس آ جائے گی" یہ اس کا یقین ہی نہ تھا بلکہ عقیدہ بن گیا تھا جیسے خدا کی ہستی کا یقین ہو۔ خواہ وہ نظر نہ ہی آئے لیکن انسان اسی کے بھروسے پر زندہ رہتا ہے۔ یہی عالم ارشد کے عقیدے کا تھا۔ اب تو وہ اس جنونی کیفیت میں پہنچ چکا تھا کہ اگر اسے یقین دلایا جاتا کہ طاہرہ مر گئی ہے تو بھی وہ تمام عمر اسی کے انتظار میں جان بہ رہتا۔ ساڑھے سات سالوں میں تو سمندر خشک ہو کر صحرا بن سکتے ہیں لیکن ارشد کے سینے میں وہی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور اس کی

صحرا نوردی بھی وہی تھی۔ سمندر بھی وہی، صحرا بھی وہی تھا۔ اس کے آنسو بھی نکلتے تھے، وہ آہیں بھی بھرتا تھا۔ تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں بھی کرتا تھا اور کچھ جنونی حرکتیں کرتا تھا لیکن اس کے قدم ڈگمگاتے نہیں تھے۔ وہ ذہنی طور پر نارمل اور مستعد تھا۔ کام دفتر کا ہو یا گھر کا، پوری دلچسپی اور یکسوئی سے کرتا تھا۔ وہ اس جنون کو طاہر پرویز کی تربیت میں استعمال کر رہا تھا اور طاہر پرویز ایک مثالی کردار بنتا جا رہا تھا۔

"دیکھو، طاہری! تمہاری اس حرکت سے طاہرہ امی سخت خفا ہوں گی۔"

"طاہری، امجد کہہ رہا تھا کہ تُو نے اسے گالی دی ہے؟ طاہرہ امی کیا کہیں گی؟"

"دیکھو طاہری! طاہرہ امی سے یوں لپٹ کے ملنا! ہاں؟"

"طاہرہ امی کو کشتی کی سیر بھی کرایا کرنا۔"

"نہ طاہری! یہ نظمیں پرانی ہو گئی ہیں۔ اب طاہرہ امی کے لیے یہ نظم یاد کر لو۔"

کچھ عرصے سے ارشد نے نجمہ کو خط لکھنے بند کر دیئے تھے۔ پہلے وہ اپنے تاثرات نجمہ کو لکھ دیا کرتا اور اُسے سکون نصیب ہوتا تھا لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے جب طاہر پرویز چھوٹا سا تھا۔ جب سے اس نے اچھی باتیں کرنی اور سمجھنی شروع کر دی تھیں، ارشد کو نہ فرصت ملتی تھی اور نہ وہ ضرورت ہی سمجھتا تھا کہ نجمہ کو طویل خطوط لکھے۔ اسے یہ یقین تو تھا ہی کہ نجمہ اپنے طور پر طاہرہ کی تلاش میں مصروف ہو گی اور اسے جب بھی سراغ ملا وہ بذریعہ تار اطلاع دے گی۔ اسے یقین تھا کہ نجمہ اس کے جذبات سے خوب واقف ہے۔

ان تین مہینوں میں جوزی بابا اور طاہرہ ایک دوسرے میں جذب ہو چکے تھے۔ دو تنہا اور تھکی ماندی ہستیوں نے ایک دوسرے میں سکون پا لیا تھا۔ طاہرہ اتوار کا بیشتر وقت بابا کے گھر میں گزارتی تھی۔ جمعہ کا پچھلا پہر بھی وہیں گزرتا تھا۔ بعض اوقات وہ رات کو بھی سونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے بابا کے ہاں چلی جاتی تھی۔ کبھی اکیلی اور کبھی نجمہ کے ساتھ۔ نجمہ کا بڑا بچہ تو ضرور ساتھ ہوتا تھا۔

بابا کے کمرے میں اب پردے لگ گئے تھے۔ چارپائی کی جگہ نواری پلنگ آ گیا تھا۔ دو اور کرسیاں آ گئی تھیں۔ کتابوں کا ایک ریک۔ میز پوش بھی، اور دیواروں پر تصویریں بھی آویزاں ہو گئی تھیں۔ یہ سامان طاہرہ اور بابا کی تنخواہ میں سے خریدا گیا تھا۔ کمرہ

[ا]ل سفیدی ہو گئی تھی اور جس کمرے کی تنہائی میں دکھ اور درد تھا وہاں اب مسرت و اطمینان رقص کرتے تھے۔ اجڑی ہوئی محفل [ج]یسے آباد ہو گئی تھی۔ بابا کا پژمردہ چہرہ کھل اٹھا تھا۔ کمرے میں بچوں کے قہقہے بلند تر ہو گئے تھے۔ تفریح کے وقت پہلے بابا اکیلا [ب]چوں کے نرغے میں ہوتا تھا۔ تین ماہ سے طاہرہ بھی اس نرغے میں نظر آنے لگی تھی۔ جہاں سکول کے عملے کے بعض افراد [ا]نہیں داد و تحسین دیا کرتے، وہاں چند ایک استاد اور استانیاں ایسی بھی تھیں جو انہیں گھور گھور کر دیکھا کرتی تھیں۔

نجمہ کے بچے تو جیسے اب نجمہ کو بھول ہی گئے تھے۔ سکول کے بچے جیسے سکول میں آ کر خدا کا شکر ادا کرتے تھے [ج]و وہ گھروں سے نکلے۔ بچوں کے لیے اب نت نئی کہانیاں جنم لینے لگیں۔ کتنے نئے کھیل ایجاد ہوتے اور ایک ڈرامہ [ب]ھی کھیلا گیا۔ جوزی بابا اور طاہرہ نے مل کر سکول میں طرح نو ڈال دی۔ حسنِ اتفاق سے ہیڈ مسٹریس اور ہیڈ ماسٹر ان دونوں کے [ر]جحان، رویے اور نیت کو سمجھ گئے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے لگے تھے۔ مہینے میں ایک بار کوئی نہ کوئی کلاس جوزی بابا، طاہرہ [او]ر نجمہ کے ساتھ پکنک پہ جاتی تھی۔ سکول میں بزمِ ادب قائم کی گئی اور سکول میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔

بابا اور طاہرہ اس حد تک ایک دوسرے میں گھل مل گئے جیسے انہوں نے ایک دوسرے کی رگ رگ اور دل کی ایک [دھ]ڑکن پڑھ سن لی ہو۔ جیسے وہ ایک دوسرے کے حال و احوال سے سالہا سال سے واقف تھے، حالانکہ دونوں نے [بھو]لی بھولے سے بھی ایک دوسرے کو اپنی گزری ہوئی زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کی روداد نہیں سنائی تھی۔ انہیں اب ایسی [ض]رورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ طاہرہ نے اب بابا سے کبھی نہ پوچھا تھا کہ بابا! میں اچھی طرح جانتی ہوں آپ کا دل کوئی عظیم صدمہ [کو]ئی چوٹیں کھائے ہوئے ہے جنہیں آپ بچوں کے پیار سے سہلاتے رہتے ہیں ۔۔۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے بابا نے [ا]سے ساری داستان سنا ڈالی ہو۔

بابا نے بھی اب طاہرہ سے کبھی نہیں کہا تھا "مجھے سنائیے مس طاہرہ! دل کا غبار یوں ہی ہلکا ہو گا، ورنہ آپ جل بھن جائیں [گ]ی۔۔۔" بابا بھی جیسے طاہرہ کی زیست کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھ چکا تھا۔ صرف ایک اضطراب تھا۔ دونوں کے دلوں میں جس کی [چ]بھن وہ کر لیتے تھے۔ ان کی سرگرم عمل طبیعتیں چوٹوں کو سہلا لیتی تھیں۔

صرف ایک تشنگی تھی، ایک لطیف تشنگی، جسے دونوں نے محسوس کیا تھا۔ کئی بار طاہرہ نے بابا کا سر گود میں رکھ کر دبایا تھا۔ [کئ]ی بار طاہرہ کی مرمریں انگلیوں سے کھیلا تھا۔ وہ دونوں پلنگ پر ایک دوسرے کے قریب بھی بیٹھے تھے۔ اس کے [با]وجود انہیں کبھی کبھی ایک تشنگی بے قرار کر دیتی تھی۔ وہ آپس میں ہر بات کہہ سن لیتے تھے لیکن اس بے قراری کا انہوں نے کبھی [کھ]ل کر ذکر نہیں کیا تھا۔ بعض اوقات بابا طاہرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تھا یا اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کے [پھو]ٹتے سرچشموں میں محو ہوتا تو اس کی نظریں یوں بے کل ہو جاتی تھیں جیسے عمرِ رفتہ کو تلاش کر رہی ہوں۔ بعض اوقات بابا اپنی کیفیت [م]حسوس کر کے جھینپ بھی جاتا تھا۔ دو تین بار اس نے اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوسا بھی لیکن یہ کیفیت کبھی نہ کبھی آنکھوں کی [ر]اہ آ ہی جاتی تھی۔

طاہرہ کی خود سپردگی اور وارفتگی کا یہ عالم کہ تین چار موقعوں پر شدت سے چاہا ۔۔۔ "کاش میری عمر ایک ہی جست میں دس [دس] برس پھلانگ جائے" ۔۔۔ بلکہ اس نے ایک بار اپنی اور بابا کی عمر کا جائزہ لیا تھا، تجزیہ کیا تھا، لیکن فرق مہیب تھا۔ اس

کے باوجود طاہرہ اس خیال کو دل سے نہ نکال سکی اور دونوں کے سینوں میں ایک لطیف تشنگی پرورش پاتی رہی۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ بابا اسے "مس طاہرہ" کہتا تھا اور طاہرہ نے کبھی نہ کہا تھا کہ وہ اسے بیٹی طاہرہ کیوں نہیں کہتا۔

طاہرہ کا ماضی اور ماضی کی ہولناکیاں بابا کی محبت میں سوگئی تھیں اور طاہرہ ہلکی پھلکی ہوگئی تھی لیکن اس کا دل ایک کھٹکے سے آزاد نہ ہوسکا۔ اسے بعض اوقات رات کی تنہائی میں محسوس ہوتا جیسے اس کی ہستی کے دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہو۔ جیسے کوئی زور زور سے اس کے دل کے کواڑ کھٹکھٹا رہا ہو۔ جیسے کوئی باہر بارش اور طوفان میں کھڑا بند دروازے کو پیٹ پیٹ کر پناہ مانگ رہا ہو۔ اس دستک کو طاہرہ نے کئی بار محسوس کیا اور یہ احساس بعض اوقات ایک خوف سا بن جاتا اور اس کا دل اس کی گرفت میں آجاتا تھا۔ اس خوف سے ذرا پہلے یا ذرا بعد اسے لاشعوری یا غیرارادی طور پر ارشد کا خیال آیا کرتا تھا اور ساتھ ہی نجمہ کا یہ سوال — "اگر ارشد بغیر اطلاع آگیا تو؟"

اطہر اور نجمہ نے اسے یقین دلا رکھا تھا کہ ایسی صورت میں وہ اسے ارشد سے چھپاتے رکھیں گے لیکن ارشد کے اچانک آجانے کے خوف سے وہ آزاد نہ ہوسکی۔ حالانکہ ارشد کے ساتھ شادی نہ کرنے کا وہ پختہ عزم اور فیصلہ کرچکی تھی۔

ایک رات وہ ارشد کے اچانک آجانے کے خوف سے نبرد آزما تھی اور وہ ایسی صورتِ حال کا تجزیہ کر کے اس خوف کو ختم کرنے میں مصروف تھی۔ یہ خیال اور خوف اس کے ذہن کی گہرائیوں میں اُترتا ہی جارہا تھا۔ اُس نے جھنجھلا کر سر ہاتھوں میں دبا لیا، کتاب کھول لی لیکن اس کے سامنے ارشد کا تصور نکھرتا ہی گیا۔ اسے وہ رات بھی یاد آتی جب اس نے ارشد کی تصویر سے باتیں کی تھیں اور بے خودی میں تصویر کو چوم لیا تھا۔ آج پھر اس پر ویسی ہی کیفیت طاری ہوتی جارہی تھی اور یہ خوف حقیقت بنتا جارہا تھا — "ارشد اچانک سامنے آگیا تو تم انکار نہ کرسکو گی۔"

ایسے میں اس نے یہ بھی محسوس کیا جیسے وہ اڑ کر ارشد کے پاس پہنچ جانا چاہتی ہو۔ دبا ہُوا سا ایک جذبہ اس کی ذات میں آج پوری طرح بیدار ہوگیا تھا۔ طاہرہ ارشد کی محبت کو یوں سمجھ رہی تھی جیسے زخم کا صرف نشان باقی رہ گیا ہو، مگر راتوں کی تنہائی میں اسے ارشد یاد آتا تو وہ اس احساس سے پریشان ہوجاتی تھی کہ یہ ملے ہُوئے زخم کا نشان نہیں بلکہ یہ زخم ہے جو شاید کبھی مل نہ سکے، کبھی مندمل نہ ہوسکے گا۔ یہ زخم روزِ اوّل کی طرح تازہ تھا۔ طاہرہ کی ہستی کا دروازہ زور زور سے کھٹک رہا تھا اور وہ اسے کھولنے سے گھبرا رہی تھی۔

"خیر! دیکھا جائے گا" — طاہرہ نے اپنے آپ سے کہا۔ کوئی راہِ فرار نہیں تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو "خیر دیکھا جائے گا" کہہ کر اس پریشان خیالی سے گلو خلاصی کرانی چاہی تو اسے لطیف سا قرار محسوس ہُوا۔ ایسا قرار جو اسے ارشد کی قربت میں ہی مِلا کرتا تھا۔

دوسرے دن اس نے نجمہ کے ساتھ ارشد کا ذکر چھیڑ دیا۔ کچھ دیر طاہر پرویز کی باتیں ہُوئیں اور نجمہ نے محسوس کیا جیسے طاہرہ کے دل میں ارشد کی یاد نے چٹکی لی ہے۔

"طاہرہ! ارشد کو بلالیں؟"

"ارے نہیں آپا!" — طاہرہ نے مسکرا کر کہا اور سنجیدہ بھی ہوگئی — "دیکھئے، اب میں نے اپنے آپ کو کس طرح سنبھال لیا

ہے۔ میرے پاؤں پھر نہ اُکھاڑ دینا۔"

"دیکھ لینا طاہرہ! میں تمہیں بتلائے دیتی ہوں" — نجمہ نے یقین کے لہجے میں کہا — "اگر ارشد تمہارے سامنے آگیا اور اس نے شادی کا کہہ دیا تو بخدا تم انکار نہ کرسکو گی۔ تم اس کے سامنے بات ہی نہ کرسکو گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا" — طاہرہ نے ہنس کر کہا اور باتوں کا رخ بابا کی طرف موڑ دیا۔

وقت اسرارِ حیات کو چھپاتا اور آشکار کرتا گزرتا جارہا تھا۔ ایک اور مہینہ گزر گیا۔

نجمہ کے پیٹ میں ایک اور زندگی کا آغاز ہورہا تھا۔ اس دفعہ اسے زیادہ تکلیف ہونے لگی تھی۔ قے اور سر کی گرانی نے اُسے بے حال کردیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے دس پندرہ روز آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اُس نے ہدایت کے مطابق پندرہ روز کی چھٹی لے رکھی تھی۔ اس کی چھٹی کا دسواں روز تھا اور جمعرات کی شام تھی۔ طاہرہ جوزی بابا کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ہر روز کی طرح کمرے میں مقدس سا پیار اور مسرت موجزن تھی۔ دنیا کے ٹھکراتے ہُوئے اور ہارے ہوئے دو دل سستا رہے تھے۔ ہار بھی ایسی جس میں کئی فتوحات مُسکرا رہی تھیں۔ اس شکست میں فتح و نصرت کے نغمے تھے اور ان ہارے ہُوؤں نے جانے کتنے شکست خوردہ دلوں کو تازہ دم کر کے کارزارِ حیات میں اتار دیا تھا۔ قدرت اس ہار پر پھول نثار کر رہی تھی۔ بڑھاپا اور جوانی پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ جوانی بڑھاپے کے لرزے کو تھام رہی تھی اور بڑھاپا جوانی کی بے تابیوں کو سہلا رہا تھا۔

"بابا جان! اب یہ کمرہ خوبصورت ہوگیا ہے" — طاہرہ نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہُوئے کہا — "اور کچھ اضافہ کرنا ہو تو بتایئے.... اگر صوفہ سیٹ ہوتا تو لطف ہی آجاتا۔"

"اضافہ!" — جوزی بابا نے چاروں دیواروں پر نگاہ دوڑاتے ہُوئے کہا — "ایک اضافے کی ضرورت بڑی ہی شدید ہے.... ان تصویروں میں۔"

"کیا؟"

"اِن تصویروں میں آپ کی تصویر نہیں ہے مس طاہرہ!"

"اوہ! میری تصویر!" — طاہرہ نے مسکرا کر کہا — "میری تصویر تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ کبھی اتروانے کا خیال ہی نہیں آیا.... میں موجود ہوں پھر آپ تصویر کو کیا کریں گے۔"

"آپ ہر روز اور ہر وقت میرے پاس تھوڑے ہی ہوتی ہیں" — بابا نے شگفتہ لہجے میں کہا — "کسی کی تصویر اپنے پاس رکھنا عقیدت کا، احترام کا اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔"

طاہرہ سوچ میں پڑگئی کہ لڑکے اور لڑکیاں کتنے شوق سے اپنی تصویریں اترواتے اور ہر کسی کو دکھاتے پھرتے ہیں مگر اس کے پاس اپنی کوئی تصویر نہیں کبھی اتروائی ہی نہیں۔ اب جوزی بابا نے اس سے تصویر مانگی تو بھی اس کے دل میں یہ خواہش پیدا نہ ہُوئی کہ وہ اپنی تصویر اتروا لے۔

"مس طاہرہ" — جوزی بابا نے کہا — "میں آپ کو نجمہ صاحبہ اور اطہر صاحب سے جُدا نہیں کرنا چاہتا، ورنہ ہر روز خیال آتا ہے کہ آپ کو اپنے پاس رکھوں۔ آپ چلی جاتی ہیں تو جیسے میرا سکون ہی چلا جاتا ہے۔ بچوں میں دل لگتا ہے۔ وہ بھی پڑھ لکھ

ور ہنس کھیل کر چلے جاتے ہیں۔ اگر آپ کی تصویر ہوتی تو سونے سے پہلے اسی سے دو چار باتیں کر لیا کرتا۔ آپ کا وجود میرے مزاحم کو نئی زندگی دیتا ہے، وہ نہ میں بعض اوقات بچہ سا جاتا ہوں.... آپ شاید سوچ رہی ہوں گی کہ اس بڈھے کو میری تصویر کا کیا شوق رچایا ہے۔ اسے میرا پاگل پن ہی کہہ لیجئے۔ لوگ تو مجھے پاگل ہی کہتے ہیں۔"

"اللہ نہ کرے میں آپ کو پاگل سمجھوں۔ بہرحال یہ کمی پوری کی جا سکتی ہے۔" طاہرہ نے ہنس کر کہا۔ "میرے پاس میری امی کی تصویر ہے۔ اُن کی جوانی کی تصویر۔ وہ بالکل میرے مشابہہ ہے۔ اس حد تک مشابہہ کہ میں خود اسے دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی تصویر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ دھوکا کیا بعض اوقات یقین سا ہو جاتا ہے۔ یہ اُن کی بیس برس کی عمر کی تصویر ہے۔ بڑی اچھی آتی ہے۔ بابا جان! ہونٹوں پر ایسی ہی مسکراہٹ ہے جیسی اس بچے کی تصویر میں ہے۔ کل ساتھ لیتی آؤں گی.... بابا جان!" — طاہرہ نے چونک کر کہا — "کل تو جمعہ ہے۔ آدھے سے زیادہ دن آپ کے ساتھ گزرے گا۔ اچھا کل وہ تصویر لیتی آؤں گی۔" — طاہرہ یک لخت سنجیدہ ہو گئی اور ذرا سا سوچ کر بولی — "لیکن بابا جان! وہ تصویر کسی کو دینے والی تو نہیں۔ اس تصویر کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی دوسری طرف میری نانی اماں نے دو چار فقروں میں ایک کہانی لکھی ہوئی ہے۔ بہرحال میں آپ کو دکھاؤں گی۔"

"اگر اس تصویر میں آپ کی ذرا سی بھی جھلک ہے تو لیتی آنا مس طاہرہ!" — بابا نے کہا — "مجھے ہر اُس چیز سے پیار ہے جس میں آپ کی جھلک ہے۔"

"بابا جان! اب اجازت دیجئے!" — طاہرہ نے بابا کے ہاتھ تھام کر کہا — "نجمہ آپا کی طبیعت اچھی نہیں۔"

"خدا انہیں صحت یاب کرے۔" — بابا طاہرہ کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور طاہرہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ طاہرہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ صحن میں اور گرد و پیش پر رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ بابا کو طاہرہ کمرے کے پردوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی دُھندلی سی روشنی میں ایک لطیف سائے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ بابا نے طاہرہ کو دیکھا اور اس کا جو ہاتھ دروازہ کھولنے کو بڑھا تھا واپس آ گیا۔ اس نے طاہرہ کے ہاتھ کو چھوڑ دیا اور اس کے سامنے آ کر اس کے کندھوں کو تھام کر بیتابی سے کہا — "مس طاہرہ!"

طاہرہ جوزی بابا کے اس لہجے کو اب اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔ وہ جان گئی کہ بابا کے جذبات امڈ آتے ہیں۔ ایسے میں وہ بابا کو تنہا نہیں چھوڑا کرتی تھی لیکن اسے نجمہ کی تکلیف کا خیال تھا اور وہ جلدی گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ طاہرہ نے بابا کی طرف دیکھا اور اس پر بے پناہ محبت غالب آ گئی۔ وہ آگے بڑھی اور بے ساختگی سے سر اس کے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ طاہرہ نے پہلی بار بابا کے جسم کی تپش اور سختی کو محسوس کیا۔ بابا نے جھک کر اپنا گال طاہرہ کے ریشمی بالوں پر رکھ دیا اور دوسرا ہاتھ اس کے کندھے پر پھیرنے لگا۔

"اوہ، مس طاہرہ!" — وہ چونک کر ایک طرف ہٹ گیا اور طاہرہ کی ٹھوڑی کو تھام کر روندھی ہوئی آواز میں کہا — "اپنے بابا کو معاف کر دینا۔ کبھی کبھی ایسی کیفیت میں آ ہی جاتا ہوں.... اپنے بابا کو بھول نہ جانا.... کل تصویر لیتی آنا۔" — اس نے طاہرہ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور کہا — "شب بخیر۔"

وہ رات طاہرہ اور بابا کی بڑی لمبی رات تھی۔ متضاد خیالات دونوں کے سینے بلا رہے تھے۔ بابا نے کمرے میں ٹہلتے

ٹہلتے بہت کچھ سوچا۔ وہ کچھ بھی سوچا جو اسے شاید نہیں سوچنا چاہیئے تھا اور کوئی ایک ٹھنڈ وہ اپنے آپ سے اس سوال پر بحث کرتا رہا — "پوچھ لوں؟ وہ بُرا منائے گی۔ وہ ناراض نہ ہو جائے.... عمر کا یہ اتنا زیادہ فرق" — بابا نے کئی بار اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ اس کے دل و دماغ میں تصادم ہوتے رہے۔ جذبات اور حقیقت مجو اختلاط بھی رہیں، برسرِپیکار بھی ہوئیں۔ بابا نے آنکھیں بند کر کے زیرِ لب کہا — "طاہرہ بیٹی!"

کچھ ایسی ہی ذہنی حالت طاہرہ کی رہی، بلکہ وہ اس حد تک پہنچ گئی — "بابا محض نام کا بابا ہے۔ بالوں کی سفیدی تو انسان کو بوڑھا نہیں کر سکتی..... بوڑھا ہی سہی، مجھے اس کے جسم سے تو محبت نہیں، اس کی روح جوان ہے لیکن بے سہارا۔ میں اسے سہارا دے سکتی ہوں۔"

طاہرہ گذشتہ تین چار ماہ سے بابا کے چہرے پر لوٹتی ہوئی جوانی کے آثار دیکھ رہی تھی — "بابا کا دل جوان ہے۔ اسے ایک جوان ساتھی کی ضرورت ہے.... بابا پسند نہیں کرے گا.... بات کر دیکھوں؟ ناراض نہ ہو جائے.... اور لوگ، لوگ کیا کہیں گے کہ اس عمر میں ایک بڈھے سے شادی کر لی۔ شاید اس کے پاس دولت ہے، کہنے دو.... نہیں! شادی بابا کو جلدی بوڑھا کر دے گی، وہ ختم ہو جائے گا۔ جانے کیا ہو جائے، تشنگی میں جو لذت ہے شاید پا لینے میں نہ ہو.... لیکن تشنگی کیسی؟ کون سی تشنگی؟.... میں کہاں پہنچ گئی ہوں؟.... شادی!...."

اسے نعیم یاد آ گیا اور ڈاکٹر کے الفاظ بھی یاد آئے — "دیکھیئے مسز نعیم! نعیم صاحب سے دور رہیئے ورنہ ان کا دل جواب دے جائے گا۔ انہیں صحت یاب ہونے دیجئے۔"

رات گزرنے کے ساتھ ساتھ طاہرہ کے خیالات اُلجھتے اور اُکھڑتے جا رہے تھے۔ دماغ تھک گیا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ آنکھیں بابا اور نعیم کے خیال کو اپنے دامن میں لے کر بند ہو گئیں اور اس نے خواب میں ارشد کو دیکھا۔

خواب میں ارشد اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔ اس قدر قریب کہ اس نے اپنے رخسار پر اس کے سانسوں کو محسوس کیا۔ طاہرہ نے رخسار پر ہاتھ رکھ کر ارشد سے کہا — "نہیں! ارشد! نہیں۔ اب بھول جاؤ مجھے اور چلے جاؤ۔ میں اب تیرے ہاتھ نہ آ سکوں گی" — اور ایک دھواں سا اُٹھا۔ جب دھواں فضا میں تحلیل ہو گیا تو اس نے دیکھا، ارشد ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ طاہرہ کا سر اس کی آغوش میں رکھا ہے۔ وہ اسے کہہ رہا تھا — "تم نے کہا تھا کہ تم میرے ہاتھ نہیں آ سکو گی!"

طاہرہ نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھ اُوپر کر کے ارشد کے چہرے کو گالوں سے تھام کر نیچے کر لیا اور کہا — "نہیں پگلے! میں نے کہا تھا تم آ جاؤ گے تو میں تم سے بھاگ نہ سکوں گی۔ میں انکار نہ کر سکوں گی۔"

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خواب کو ذہن سے اُگل دیا مگر اس نے محسوس کیا کہ وہ خواب اس کے ارد گرد اس طرح بھنا رہا ہے جس طرح بھنورا کلی پر بھنبھناتا ہے۔

طاہرہ نے جب امی ساجدہ کی تصویر نکال کر پرس میں ڈالی تو وہ ہنس پڑی اور سوچا — "بابا کبھی یقین نہیں کرے گا کہ یہ تصویر

میری نہیں۔"

اس نے کتنی بار دیکھی ہُوئی تصویر کو پھر دیکھا لیکن اسے اس کے سوا کچھ یاد نہ آیا کہ وہ یہ تصویر جوزی بابا کے لیے لے جارہی ہے۔ اور وہ اسے کہے گا ـــــ "مس طاہرہ! آپ نے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ یہ تصویر آپ کی والدہ کی ہے؟ اس لیے کہ آپ یہ تصویر مجھے دینا نہیں چاہتی تھیں۔"

وہ تصور میں بابا کے اس پیچ و تاب سے لُطف اندوز ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے اچھی طرح سٹپٹا کر تصویر کی دوسری طرف دکھائے گی۔ امّی ساجدہ اور امّی خاتون کی تحریر دیکھ کر بابا اپنی غلط فہمی پر شرمندہ ہوگا۔ طاہرہ نے سوچا کہ بابا کے ساتھ کتنا دلچسپ مذاق ہوگا۔

سکول شروع ہونے سے پہلے اس نے بابا کو بتایا کہ وہ تصویر لے آئی ہے لیکن گھر چل کر دکھائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ سکول شروع ہونے میں چند منٹ رہ گئے ہیں، مذاق ادھورا رہ جائے گا۔ گیارہ بجے چھٹی ہُوئی تو طاہرہ حاضری کے رجسٹر کو بند کرنے میں مصروف تھی کیونکہ یہ مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ وہی نہیں، آج تمام انچارج اُستانیاں اور اُستاد اسی کام میں مصروف تھے۔

طاہرہ فارغ ہو کر باہر نکلی تو بابا کے کوارٹر کا رخ کیا۔ دیکھا کہ بابا ایک لڑکے کو ساتھ لیے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔ بابا نے رجسٹر کا کام جلدی ختم کر لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ طاہرہ آجائے گی۔ اس لیے اس نے طاہرہ کا انتظار نہ کیا۔ طاہرہ نے قدم تیز کر لیے اور دس قدم دور ہی سے آواز دی۔ "جوزی بابا!"

بابا نے گھوم کر دیکھا اور وہیں رُک گیا۔ اس نے جیب سے چابی نکالی اور لڑکے کو دے کر کہا ـــــ "دیکھو بیٹا! وہ دو نمبر کوارٹر دیکھتے ہو نا؟ بھاگ کر چلو اور دروازہ کھولو۔ یہ چابی باہر کی ہے اور یہ اندر کی۔" ـــــ لڑکا چابیاں لے کر بھاگ گیا۔ اتنے میں طاہرہ آگئی۔

"آداب عرض مس طاہرہ" ـــــ بابا نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آج تو ہمیں بارہ بج گئے ہیں۔۔۔۔ چلئے۔ بُھوک زیادہ لگ رہی ہے۔ میں سکول سے نکلا تو دیکھا۔ یہ بچہ پھاٹک کے پاس حیران و پریشان کھڑا تھا۔ میں نے ذرا سا پیار کیا تو اس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگا میں پچھلے ہفتے دوسری جماعت میں داخل ہُوا ہوں۔ ہر روز نوکر لینے آجاتا تھا۔ آج ابّا جان نے کہا تھا کہ نوکر نہیں آئے گا اور وہ خود کار لے کے آجائیں گے۔ انہیں شاید معلوم نہیں تھا کہ جُمعہ کے روز سکول گیارہ بجے بند ہوتا ہے۔ مجھے بھُوک لگی ہے اور ابّا جان ابھی تک آئے نہیں۔ میں نے اسے کہا ـــــ میرے ساتھ چلو۔ چل کے کھانا کھاؤ۔ اور چپراسی سے کہہ آیا ہوں کہ پھاٹک پر انتظار کرے۔ ایک صاحب بچے کی تلاش میں آئیں گے۔ انہیں میرے کوارٹر میں لے آنا۔۔۔۔ عجیب باپ ہوتے ہیں بعض! بچہ بے چارہ پریشان ہو رہا ہے۔ شاید نئے نئے آئے ہیں یہاں۔ سکول کے اوقات کا بھی علم نہیں ہوگا۔"

جب بابا اور طاہرہ کوارٹر تک پہنچے تو لڑکا کوارٹر اور کمرے کا دروازہ کھول چکا تھا۔ ادھر سے ملازم بھی کھانا لیے چلا آرہا تھا۔ بابا کو بچے کا زیادہ خیال تھا۔ طاہرہ نے سوچا کہ کھانے میں دیر نہ کی جائے۔ بچے کو جانے کس قدر بھوک لگی ہوگی۔ وہ تینوں کھانے پر بیٹھ گئے۔ بچہ واقعی بہت بھوکا تھا لیکن اس دوسری جماعت کے بچے نے جس تمیز اور سلیقے سے کھانا کھایا، وہ طاہرہ نے بہت پسند کیا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

طاہرہ کے دماغ میں تصویر والا مذاق سمایا ہُوا تھا۔ اس نے بابا سے کہا ـــــ "بابا! آج ہماری اور آپ کی لڑائی ہو جائے گی۔ آپ کہیں

گے یہ تصویر میری ہے اور میں کہوں گی امّی کی ہے۔"

"پھر فیصلہ کون کرے گا؟" ـــــ بابا نے ہنس کر کہا ـــــ "لاؤ! دکھاؤ تو سہی۔"

"کھانا کھا کے دکھاؤں گی اور فیصلہ بھی ہو جائے گا۔"

"فیصلہ میں کروں گا۔" بچے نے شوخی سے کہا اور طاہرہ اس کی شوخی سے اس قدر متاثر ہُوئی کہ اس نے لپک کر بچے کی گردن کے گرد بازو لپیٹ لیے لیکن وہ بابا کے ساتھ مذاق میں اس قدر محو تھی کہ بچے کے ساتھ زیادہ پیار نہ کر سکی ورنہ طاہرہ کو اس قسم کا صاف سُتھرا، بھولا بھالا، خوبصورت اور شوخ بچہ مل جائے تو وہ اسے چاٹ نہ لے۔ ایسے بچوں کا تو وہ مارے پیار کے بُرا حال کر دیا کرتی تھی۔ بابا کو بھی طاہرہ کا یہ مذاق والا مُوڈ اس قدر بھلا لگا کہ وہ اسی میں محو ہو گیا ورنہ بچوں کے معاملے میں وہ دنیا کو ہی بھُول جاتا تھا۔ ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے کہ طاہرہ نے اسے سرسری بتایا کہ وہ ایک نادار بچی کی تعلیم کے لیے پچیس روپے ماہوار بھیجا کرتی ہے تو بابا نے معاً کہا تھا ـــــ "آئندہ ماہ سے دس روپے مجھ سے بھی لے کر بھیج دیا کریں" ـــــ اور اب بچی کے لیے پینتیس روپے جانے لگے تھے۔ اس کے بعد بابا نے طاہرہ سے بچی کا حلیہ اور ناک نقشہ پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح کہ جیسے وہ اس بچی کا تصور باندھ کر اس سے پیار کرنا چاہتا ہو۔

"بیٹا" ـــــ بابا نے بچے سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہارے ابّا جان کو واقعی آج کی چھٹی کے وقت کی غلط فہمی ہے ورنہ وہ اب تک آجاتے۔ وہ اب دو بجے آئیں گے" ـــــ بابا نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا ـــــ "ساتھ والے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ تمہارے ابّا جان آجائیں گے تو ہم تمہیں جگا لیں گے۔ میں چپراسی کو ان کے انتظار میں بٹھا آیا ہوں۔ جاؤ میرے بچے شاباش!"

بچہ دوسرے کمرے میں چارپائی پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

"کتنا پیارا بچہ ہے کسی کا" ـــــ طاہرہ نے کہا۔

"اچھا تو جناب اب تصویر نکالیئے" ـــــ ملازم برتن لے جا چکا تھا تو بابا نے کہا۔

طاہرہ نے پرس میں سے تصویر نکالی اور مُسکرا کر دُور سے بابا کو دکھائی۔ بابا کھُل کر ہنسا اور بولا ـــــ "گویا آپ اتنی دیر سے مجھے بنا رہی تھیں۔ بہت خوب، مس طاہرہ اب لڑائی نہیں ہوگی۔ یہ تصویر اب اس کمرے کی زینت بنے گی۔"

"میں سچ کہتی ہوں۔ یہ تصویر میری امّی کی ہے" ـــــ طاہرہ نے تصویر پیٹھ پیچھے کر کے بچوں کی سی شوخی سے کہا۔

"یہاں قریب تو لائیے نا!" ـــــ بابا نے ہمراز سہیلیوں کے انداز سے کہا۔ "یہاں میز پر رکھیے۔ ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ماں بیٹی میں مشابہت ہوتی ہے لیکن کہیں نہ کہیں تو فرق ہوگا۔"

طاہرہ نے آگے ہو کر تصویر بابا کے سامنے میز پر رکھ دی۔ بابا نے اسے ہر پہلو سے دیکھا اور طاہرہ بابا کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر عیاں طور پر تبدیلیاں آرہی تھیں اور جارہی تھیں۔ بابا تصویر میں اس طرح محو ہو گیا جیسے سوئیر دیکھتے دیکھتے اس کا دم نکل گیا ہو اور وہ بیٹھے بیٹھے اکڑ گیا ہو۔ طاہرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی جارہی تھی۔

"آپ کی اب عمر کیا ہے؟ تیس سال پوری نہیں ہوئی نا؟ ۔۔۔۔ ہونہہ!" ـــــ بابا نے تصویر پر نظریں جمائے ہوئے کہا ـــــ

ہوں!.... آپ کی یہ تصویر اٹھارہ یا انیس برس کی ہے۔"

"میری امّی کی۔"

"مس طاہرہ کی۔"

"غلط!"

"صحیح۔"

طاہرہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"کس قدر مشابہت!" ــــ بابا نے زیرِ لب کہا جیسے طاہرہ کی بات مان گیا ہو۔ طاہرہ ابھی تک ہنس رہی تھی اور بابا اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز میں کہہ رہا تھا ــ "وہی ناک، وہی نقشہ، مسکراہٹ بھی وہی" ــــ بابا کے چہرے پر یاس کی پرچھائیاں چھانے لگیں۔ گردن کا خم وہی، ہونٹوں پر مسکراہٹ وہی۔

بابا نے آہ لی اور طاہرہ کی طرف دیکھا، پھر تصویر کو دیکھا، بولا ــ "ماننے کو جی نہیں چاہتا مس طاہرہ! ماننے سے جی گھبراتا ہے۔"

"اچھا، تو تصویر کی دوسری طرف دیکھئے" ــ طاہرہ نے شوخی سے کہا۔

بابا نے تصویر کو اُلٹا کیا اور اس پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی۔ طاہرہ کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں اور اس کی ہنسی کانوں تک پہنچ گئی تھی، لیکن بابا نے ایک جھٹکے سے تصویر کو اپنی آنکھوں سے دُور کر دیا اور خود اس طرح گھبرا کر بجلی کی تیزی سے سر پیچھے کیا جیسے اس نے ہاتھ میں سانپ پکڑ رکھا تھا اور اس نے اس پر حملہ کر دیا ہو۔ ساتھ ہی بابا نے دوسرا ہاتھ اس قدر زور سے میز پر مارا جیسے بندوق چلی ہو۔ ایسا دھماکا کہ طاہرہ گھبرا گئی۔ اس نے دیکھا کہ بابا کے ہونٹ نمایاں طور پر پھڑکنے لگے تھے اور جس ہاتھ میں اس نے تصویر پکڑ رکھی تھی وہ اس طرح کانپ رہا تھا کہ تصویر کو تھامنا مشکل ہو رہا تھا۔

بابا نے تصویر کو پھر سیدھا کیا، پھر اُلٹا کیا، پھر سیدھا کیا، پھر اُلٹا کیا اور بابا کا چہرہ اس قدر لال سُرخ ہو گیا کہ طاہرہ نے اس کے چہرے پر یہ رنگ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی مُسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ جان گئی کہ بابا آج پھر جذبات میں ڈوب گیا ہے۔

بابا ڈوب رہا تھا۔ ڈوب ڈوب کر اُبھر رہا تھا۔ اس پر وہی کیفیت طاری تھی جو ڈوبنے والے کی ہوتی ہے۔ وہ تصویر پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں کی پُتلیاں ایک جگہ ٹھہر گئی تھیں۔ اس کے ذہن میں طُوفانی لہریں اُٹھ آئیں اور چٹانوں سے ٹکرانے لگیں۔ اس کے سینے سے بگولے اُٹھنے لگے اور آسمان کی طرف بڑھنے لگے۔ اس کے دماغ میں تیز رفتار ریل گاڑی کا شور بلند ہونے لگا۔ اس کا دل آٹا پیسنے والی مشین کی طرح ٹک ٹک ٹک ٹک کا واویلا بلند کرنے لگا۔ اس کا جسم پن چکی کے چکر کی لپیٹ میں آ گیا اور اس کے سامنے زمین و آسمان ایک چکر کی صورت میں گھومنے لگے۔ تیز بہت تیز۔ باد و باراں کا شور اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔ بجلیاں کڑکنے لگیں۔ وہ شور، وہ غُل، وہ قیامت کہ بابا کی اس اندرونی حالت کا عکس اس کے چہرے پر ظاہر ہونے لگا۔ اس کا سر ڈول گیا۔

طاہرہ کو یوں محسوس ہُوا جیسے بابا بے ہوش ہو کر گرنے والا ہو۔ اس نے بابا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے بھی دیکھے۔

بابا کا سارا جسم تھر تھر کانپ اُٹھا۔ پیشتر اس کے کہ طاہرہ جوزی بابا کو اس ذہنی حالت سے نکالتی بابا نے تصویر میز پر رکھ دی اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے اُٹھ کر باہیں طاہرہ کی طرف پھیلا دیں۔ آنکھیں بند کر لیں۔ لرزتے ہوتے ہونٹ جانے کیا کہنے والے تھے کہ اس کی آواز کسی چیز نے حلق میں ہی دبوچ لی۔ اس کے ہونٹ تڑپ اُٹھے۔ طاہرہ حیران و پریشان آہستہ آہستہ بابا کی طرف بڑھی۔ بابا کے سینے سے ایک دلدوز آواز نکلی۔ یوں کہ جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹ رکھا تھا اور یک لخت چھوڑ دیا ہو۔

"میری بچی!" ــــ بابا آنکھیں بند کیے اور باہیں پھیلائے ایک قدم آگے بڑھا اور کانپتی آواز میں کہا ــ "میری بیٹی طاہرہ!"

طاہرہ اُس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھی تو بابا نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اپنے سینے کے ساتھ چپکا لیا اور اس کا منہ اُوپر کر کے ان پر بوسوں کی بارش کر دی۔ گالوں پر، آنکھوں پر، پیشانی پر، کندھوں پر، گردن اور بالوں پر۔ بابا کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ وہ ہر بوسے کے ساتھ کہہ رہا تھا ــ "میری بچی۔ طاہرہ بیٹی۔ میری اپنی بیٹی۔"

طاہرہ سمجھ نہ پائی کہ بابا اس قدر جذباتی کیوں ہو گیا ہے۔ اس پر تو جیسے کسی دَورے کا اثر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بابا کو پلنگ پر بٹھا دیا اور خود فرش پر بیٹھ گئی۔ بابا کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اس طرح بے تابی سے رو رہا تھا جیسے ماں کی آنکھوں کے سامنے بچہ دم توڑ رہا ہو۔

"بابا جان!" ــ طاہرہ نے اسے جھنجھوڑا۔

"جوزی بابا!" ــ جیسے وہ اسے نیند سے جگا رہی ہو۔

"کیا ہُوا بابا میرے ساتھ بات کیجئے۔"

"بابا نہ کہو، طاہرہ بیٹی! اب بابا نہ کہو" ــــ جوزی بابا نے اپنے سامنے دوزانو بیٹھی طاہرہ کا سر اپنی گود میں رکھ کر کہا ــ "ایک بار ابا جان کہو پھر میرا گلا گھونٹ دینا.... میں تیرا باپ ہُوں...." طاہرہ نے اُوپر دیکھا... "میں جوزی بابا نہیں ہوں۔ یہ میرا بہروپ ہے۔ میں جمال بیگ ہُوں۔ تیری امّی ساجدہ کا قاتل خاوند" ــــ طاہرہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی ــــ "میرے منہ پر تھوک دے، میری بیٹی! اپنے مجرم باپ کے منہ پر تھوک دے".... بابا طاہرہ کو کندھوں سے پکڑے ہلکان ہو رہا تھا ــــ "تیری امّی خاتون میری ساس تھی.... تُو ہلال آباد میں پیدا ہُوئی تھی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں، بابا جان؟" ــــ طاہرہ کے لیے بابا اور بابا کی باتیں سراپا معمہ بن گئیں۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ بولی ــــ "...ی خاتون نے بتایا تھا میرے ابا جان جنگ میں مارے گئے تھے۔"

"نہیں نہیں، نہیں" ــــ بابا نے زور زور سے سر ہلا کر کہا ــــ "وہ کمبخت باپ ابھی زندہ ہے۔ سُن، میری بچی! وہ جنگ میں ...یں مارا گیا تھا۔ آج سے تیس برس پیشتر اس بدبخت کے سینے میں ایک جنگ چھڑی ہُوئی تھی جس میں اس نے اپنی نو زائیدہ بچی کو دھکیل ...تھا۔ اس نے سوچا بچی اس آگ میں جل بھن جائے گی لیکن وہ زندہ رہی، باپ کو شرمسار کرنے کے لیے۔ باپ اپنے گناہوں ...سزا بھگتنے کے لیے زندہ رہا.... میں جمال بیگ ہوں، طاہرہ بیٹی میں جوزی بابا نہیں ہوں۔"

"مجھے کچھ سمجھائیے!" ــ طاہرہ نے اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے کہا ــ "خدارا کچھ سمجھائیے۔"

"تُو میری بچی سُن!" ــ بابا نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہُوئے کہا ــ "میرے قریب بیٹھ اور سُن...."

اور بابا نے اسے بتایا کہ اس نے کس طرح ساجدہ کے ساتھ شادی کی تھی اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اسے لڑکیوں ...س قدر نفرت تھی۔ وہ پاگل تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر لڑکی پیدا ہو۔ آخر اس کے گھر لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر اس نے کس

طرح امی خاتون پر حملہ کیا اور ساجدہ زچگی کی خطرناک حالت میں دونوں کے درمیان آکر گر پڑی تھی۔ بابا نے طاہرہ کو اس حادثے کی تفصیلات سنائیں۔ خاتون، ساجدہ اور جلال آباد کی باتیں سنائیں۔

طاہرہ کا ایک ہاتھ جو بابا کے کندھے پر تھا سرکتا سرکتا، بابا کی گردن کے پیچھے سے گزرتا اس کے دوسرے کندھے تک پہنچ گیا۔ پھر یہ بازو بابا کی گردن کے گرد لپٹ گیا اور طاہرہ کے دوسرے بازو نے بابا کے سینے کی طرف سے آگے بڑھ کر بازو وں کا گھیرا بنا لیا۔ پھر گھیرا تنگ ہونے لگا اور طاہرہ کے رخسار بابا کے گالوں کو چھونے لگے۔ "اوہ! میرے ابا جان!" — طاہرہ کے سینے سے جیسے سسکی نکلی ہو۔

"تمہاری نانی اماں خاتون تمہیں اٹھا کر بھاگ گئی تھی۔ اس وقت تمہاری عمر بمشکل دو گھنٹے تھی" — بابا کہہ رہا تھا — "میں نے دیکھا کہ ساجدہ مر گئی ہے تو میں گھر سے نکل گیا... یہ لمبی داستان ہے طاہرہ بیٹی! کہ میں نے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں۔ پھر کسی وقت سناؤں گا۔ میں جلال آباد سے بنگال تک پہنچ گیا۔ پھر پاؤں ایسے اکھڑے کہ ہندوستان کے کئی شہر گھوم لیے۔ ساجدہ مرحومہ اور نوزائیدہ بچی میرے دل و دماغ پر آسیب بن کر سوار ہو گئیں۔ انہوں نے ہر جگہ میرا تعاقب کیا اور میں پاگل ہو گیا۔ مکمل ایک سال پاگل رہا۔ خود بخود طبیعت سنبھل گئی تو ایک معمولی سے سکول میں دوسری جماعت کی ماسٹری مل گئی۔ میں ایک آگ میں جلتا رہتا تھا۔ جب میں نے پہلے دن سکول میں پہلے بچے سے پیار کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینے کی آگ بجھنے لگی ہے۔ اسی دن میں نے گلی سے گزرتے ایک ننھی سی بچی کو اٹھا کر چوما تو وہ مسکرا دی اور میں نے اپنے آپ میں لطیف سی خنکی محسوس کی۔ پھر میں نے ہر بچے سے پیار کیا۔ پھر میں نے اپنی رگ رگ میں بچوں کے پیار کو سمو لیا۔ مجھے ہر بچی کے روپ میں ساجدہ اور اس کی بچی کی جھلک نظر آتی تھی۔ طاہرہ بیٹی! میں نے ہر بچی کی معصومیت میں تجھے تلاش کیا ہے۔ میں نے ہر بچی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی ہے۔ اس طرح میں اس آگ کو بچوں کے پیار سے بجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔ شروع شروع میں تو میں کسی بچے کو چومتا تھا تو میں رو پڑتا تھا.....

"تمہیں یاد ہو گا طاہرہ بیٹی! پہلے روز جب تم نجمہ صاحبہ کے ساتھ کھیل کے میدان میں مجھے دیکھنے آئی تھیں تو میں نے بلا شک و شبہ سمجھ لیا تھا کہ ساجدہ پھر دنیا میں آگئی ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا ہو گا لیکن میری وہ حالت دیکھنے اور محسوس کرنے والی تھی۔"

طاہرہ نے باپ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اس نے جھک کر باپ کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔ اس قدر طویل بوسہ طاہرہ اسی بوسے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ کمرے کی فضا خاموش تھی جس میں بابا کی آہیں اور ہلکی ہلکی سکون آمیز سسکیاں تحلیل ہو رہی تھیں۔

اگر باہر دروازے پر دستک نہ ہوتی تو شاید طاہرہ باپ کی پیشانی سے اپنے ہونٹ باقی عمر الگ نہ کرتی۔ طاہرہ نے اٹھ کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن اسے خیال آیا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ وہاں سے اٹھنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے کہا — "آ جائیے۔ اندر آ جائیے" — اور آنچل سے آنسو پونچھ کر بابا سے ذرا پرے ہو گئی۔

"اس بچے کے والد صاحب باہر کھڑے ہیں" — چپراسی نے کمرے میں آکر کہا۔

"انہیں اندر ہی بھیج دو" — طاہرہ نے کہا۔ "بچہ سو گیا ہے۔ ذرا سونے ہی دو اسے" — طاہرہ نے دوپٹہ سر پر لے لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

نووارد کے تیز قدموں کی آہٹ کمرے کے دروازے پر پہنچی تو طاہرہ نے اس طرف دیکھا۔ اس نے دیکھا اور آنکھوں کو ذرا سا سکیڑا، پھر غور سے دیکھا۔ کچھ ایسی ہی حالت نووارد کی ہوئی۔ طاہرہ کی داخلی کیفیت وہی ہونے لگی جو کچھ دیر پہلے تصویر کو الٹ کر کے بابا کی ہوئی تھی۔

"ارشد؟" — طاہرہ جیسے چیخ اٹھی ہو۔

"یہ تم ہو، طاہرہ؟" — ارشد نے آہستگی سے کہا اور حیرت زدگی کے عالم میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

طاہرہ نے دیوانگی کے عالم میں بازو پھیلا دیئے اور باپ کی موجودگی کو نظر انداز کر کے بہت تیزی سے آگے بڑھی اور ارشد کے ساتھ لپٹ گئی۔ طاہرہ کا باپ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس منظر کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اری تم؟" — ارشد نے طاہرہ کو الگ کرتے ہوئے اس کے کندھوں کو تھام کر کہا۔ وہ بوکھلا چلا تھا۔ بولا — "میری تبدیلی آٹھ نو روز ہوئے پنڈی ہو گئی ہے۔ آتے ہی اس قدر مصروف ہوا کہ نجمہ کے گھر تک نہ جا سکا" — وہ ذرا سا رک کر بولا — "لاؤ بھئی! میرا بچہ تو بتاؤ کہاں ہے؟ طاہر پرویز؟"

"ارے رے رے تب — طاہرہ نے ہڑبڑا کر کہا — "یہ طاہر پرویز ہے؟"

اور وہ دوسرے کمرے کی طرف اس طرح بھاگی کہ کرسی کو گرایا، میز سے ٹکرائی اور سوتے ہوئے طاہر پرویز پر جا گری۔ اس نے اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی اور سات ساڑھے سات سال کا بچہ گھبرا کر جاگ اٹھا اور رونی سی صورت بنائی۔ طاہرہ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور واپس اس کمرے میں آئی۔ وہ رو رو کر بچے کو چوم رہی تھی — "او ہو میری عفت کی نشانی! اوہ! میری قربانی کی یادگار۔"

"اوہ! ارشد معاف رکھنا!" — طاہرہ نے کہا اور اپنے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی — "ان سے ملو۔ یہ میرے ابا جان جمال بیگ۔"

"کیا کہا؟" — ارشد نے حیرت سے پوچھا — "تمہارے ابا جان؟"

"ہاں! میرے ابا جان!" — طاہرہ نے کہا — "تیس برس کے بعد آج اچانک ملاقات ہو گئی ہے۔ یہ کہانی بعد میں سنائیں گے۔"

ارشد اس طرح آگے بڑھا جیسے خواب کی دنیا میں چل رہا ہو۔ اس نے بابا کے گھٹنے چھو کر مصافحہ کیا۔

"ابا جان! یہ ارشد ہے" — طاہرہ نے کہا — "یہ بھی جلال آباد کے رہنے والے ہیں۔"

"لو، بیٹا طاہری" — ارشد نے مسرت سے بھرپور لہجے میں بیٹے کو کہا — "یہ رہی تمہاری طاہرہ امی۔ تم نے تو پہچانا ہی نہیں۔"

اور طاہر پرویز نے جسے ابھی تک طاہرہ نے اٹھایا ہوا تھا، طاہرہ کی گردن کے گرد بازو لپیٹ کر اس زور سے بھینچا کہ طاہرہ کا دم گھٹنے لگا۔ اور طاہرہ نے اس کا رخسار اپنے رخسار کے ساتھ لگا لیا۔

"طاہرہ! اب تو کھل کر باتیں ہوں گی" — ارشد نے کہا — "میں اور میرے بیٹے نے پورے سات سال..."

تمہارا انتظار کیا ہے۔ پورے ساڑھے سات سال۔ یہ مسٹر تو ہر وقت طاہرا امی، طاہرا امی کرتے رہتے تھے۔"
"اور میں تو شادی کر کے بیوہ بھی ہو چکی ہوں" ــــ طاہرہ نے یوں کہا جیسے اُس کے مُنہ سے نکل گیا ہو۔
"کوئی بچہ؟" ــــ ارشد نے پوچھا۔
"کوئی نہیں۔"
جمال بیگ نے چونک کر طاہرہ کی طرف دیکھا اور ارشد بلا جھجک طاہرہ کے باپ سے مخاطب ہُوا ــــ "ان کا تعارف میں کراؤں صاحب؟" ــــ ارشد نے ساڑھے سات سال بعد اپنی مخصوص شگفتہ مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہُوتے کہا ــــ "یہ ہیں مس طاہرہ! اور ایک دو دن میں یہ مسز ارشد بن جائیں گی۔ میرے بچے کی ماں۔"
طاہرہ نے طاہر پرویز کے سر کے اوپر سے ارشد کو دیکھا۔ ا[illegible] کے ذہن میں تجمہ کا یہ سوال جاگ اٹھا ــــ "اگر ارشد بغیر اطلاع کے آگیا تو؟" ــــ طاہرہ کے دل نے کہا ــــ "تجمہ آپا تُم نے کہا تھا کہ ارشد بغیر اطلاع کے آگیا تو تم انکار نہ کر سکو گی" ــــ طاہرہ نے شرما کر آنکھیں طاہر پرویز کی اوٹ میں کر لیں۔
اور چند لمحوں بعد طاہر پرویز پلنگ پر بیٹھے ہُوتے جمال بیگ کی گود میں بیٹھا تھا۔ اسی پلنگ پر دائیں طرف طاہرہ بیٹھی تھی اور بائیں طرف ارشد۔ جمال بیگ کا ایک ہاتھ طاہرہ کی گردن کے گرد تھا اور دوسرا ارشد کے کندھوں پر۔ باپ نے دونوں کو اپنے قریب کر لیا اور اس کے آنسو پھر جاری ہو گئے ــــ اطمینان اور سکون کے آنسو۔
"آج ساجدہ نے مجھے معاف کر دیا ہے" ــــ بابا نے کہا اور ارشد اور طاہرہ کو اور قریب کر لیا۔ ☆ ☆ ☆

اب "طاہرہ" کا دوسرا حصّہ پڑھیں

طاہرہ کی کہانی ختم ہوئی۔ یہاں سے طاہر کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ یہ آپ ہمارے ناول "خاکی وردی، لال لہو" ــــ میں پڑھیں جو دو جلدوں میں ہے۔ اس میں آپ کو جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء، جنگِ دسمبر ۱۹۷۱ء، مقبوضہ کشمیر میں کمانڈو ایکشن اور پاکستان میں بھارت کے بڑے حسین جاسوسوں کی سرگرمیاں ملیں گی۔